اکیسویں صدی کا چیلنج اور ہندوستانی مسلمان

بندگلی سے آگے کی راہ

ڈاکٹر سید ابوذر کمال الدین

ISBN - 978-93-5619-901-9

نام کتاب : اکیسویں صدی کا چیلنج اور ہندوستانی مسلمان
بندگلی سے آگے کی راہ
مصنف : ڈاکٹر سید ابوذر کمال الدین
اشاعت اول: 2021
اشاعت دوم: 2022
قیمت : -/599 روپے
کمپوزنگ : مولانا آصف حسین قاسمی مظفر پور/ خالد فیصل، نئی دہلی
مطبوعہ : ایچ ایس پرنٹرس، غازی آباد، یوپی

ملنے کا پتہ: **مرکزی مکتبہ پبلیکیشنز**، D-307، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر،
نئی دہلی-110025، فون: 7290092403
اردو بک ریویو، 1739/104، فرسٹ فلور، ایم پی اسٹریٹ
پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی-110002، فون: 9953630788

ناشر

Dr. Syed Abuzar Kamaluddin
Blessing Kamal Lane, Azad Road, Chandwada
Muzaffarpur, Bihar - 842001
Mob.: 91 - 9934700848
E-mail: dr.abuzarkamaluddin@gmail.com
Website: abuzarkamaluddin.com

انتساب

ان لوگوں کے نام جو سنجیدگی

سے

ہندوستان میں ملی بقا اور استحکام

کے لیے سرگرم ہیں

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دوسرے ایڈیشن کا دیباچہ

''اکیسویں صدی کا چیلنج اور ہندوستانی مسلمان- بند گلی سے آگے کی راہ'' اس کتاب کی دوسری اشاعت کے وقت میرا دل اللہ کے شکر و سپاس کے جذبے سے لبریز ہے کہ مالک نے میرے جیسے ایک غیر معروف شخص کی تحریروں کو یہ شرف قبولیت بخشی کہ لوگوں نے نہ صرف اس کتاب کو ہاتھوں ہاتھ لیا بلکہ خوب خوب سراہا اور اپنے نیک کلمات اور دعاؤں سے نوازا۔ اردو میں ایسی بہت کم کتابیں ہیں جس کی اس انداز سے پذیرائی کی گئی ہے۔

عام طور پر اخبارات اور جرائد میں کتابوں پر جو تبصرہ شائع ہوتے ہیں وہ مخصوص لوگوں سے باضابطہ لکھوائے جاتے ہیں اور اس کا مقصد محض کتابوں کی تشہیر ہوتا ہے۔ لیکن کسی کتاب کا اصل مبصر اور ناقد قاری ہوتا ہے جس نے از خود وہ کتاب پڑھی ہے اور اس نے ذاتی تحریک پر اس پر تبصرہ کیا ہے۔ میں نے کسی بڑے اہلِ قلم، عالم یا دانش ور اور اخبار کے مدیر سے اس کتاب پر تبصرہ کی درخواست نہیں کی۔ اس کتاب کو براہِ راست عوام کی عدالت میں رکھ دیا۔ طوالت کے خوف سے میں یہاں ان تمام تبصروں کو نقل نہیں کروں گا۔ مگر نمونے کے طور پر چند تبصرے ضرور آپ کے سامنے رکھوں گا تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ لوگوں نے کس انداز سے اس کی پذیرائی کی ہے۔

ایک قاری نے اس کتاب کو 5 میں سے 5 ریٹنگ دیتے ہوئے یہ تبصرہ کیا: ''میں نے اب تک ان دس سالوں میں اس عنوان پر اتنی جامع کتاب نہیں پڑھی یا سنی۔ مجھے بے حد خوشی

ہے کہ ہمارے معاشرے کے دانش ور کھل کر اپنے قلم سے حالات بدلنے کی جدوجہد کررہے ہیں۔ مبارک باد پیش کرتا ہوں، امید رکھتا ہوں کہ وہ ایسی خدمت مزید جاری رکھیں گے۔''

ایک صاحب لکھتے ہیں جیسے جیسے پڑھتا جارہا ہوں ویسے دماغ کی بندگلی سے آگے کی راہ کھلتی جارہی ہے۔

ایک اور صاحب تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''آپ نے مسلمانوں کو احساس کمتری سے نکالنے کی بہترین کوشش کی ہے۔ یہ کتاب وقت کی ضرورت ہے۔''

ایک اور صاحب نے ''اسے قوم کے لیے نادر تحفہ بتایا۔''

ایک صاحب نے مبالغے سے کام لیتے ہوئے میرا موازانہ سرسید سے کردیا ہے چہ نسبت عالم خاک را عالم پاک۔ یہ موازنہ صحیح نہیں ہے۔ ہماری یہی کمزوری ہے جو بسا اوقات ہمیں غلط راستے پر لے جاتی ہے۔ ہمیں ایسی انتہا پسندی سے بچنا چاہیے۔ بہرحال انھوں نے اس کتاب کو دورِحاضر کے پس منظر میں ایک اصلاحی کتاب مانا ہے۔

ایک اور صاحب نے اس کتاب کو ''چراغِ راہ'' قرار دیا ہے۔

اس طرح متعدد احباب نے اپنی آراء اور مشورے سے نوازا ہے۔ کئی احباب کی رائے ہے کہ اس کتاب کو انگریزی اور ہندی دونوں زبانوں میں شائع ہونا چاہیے۔

اس وقت ہم لوگ ورچوئل ورلڈ میں رہتے ہیں اور آج کل آن لائن کا زمانہ ہے۔ اس نے بازار کی سرحد کو وسیع کردیا ہے۔ چنانچہ ہندوستان کے طول وعرض میں جہاں جہاں اردو لکھنے پڑھنے والے لوگ موجود ہیں چاہے وہ منی پور اور امپھال میں ہوں یا اڑیسہ کے دور دراز علاقے میں یا تامل ناڈو، گوا، پانڈوچیری، کیرلہ، کشمیر، مہاراشٹر، پنجاب، یوپی، دہلی، راجستھان، بھوپال یا بہار میں سب جگہ سے لوگوں نے یہ کتاب منگوائی ہے۔ آمیزن (Amazon) پر اس کتاب کی ریٹنگ 5 میں سے 4.6 اور فلپ کارٹ پر بھی اس کتاب کی ریٹنگ 5 میں 4.6 ہے۔ 14 لوگوں نے 5 میں 5 ریٹنگ دی ہے۔ آٹھ لوگوں نے پانچ میں چار ریٹنگ دی ہے۔ اس طرح اس کتاب کے بارے میں عام قاری کا تاثر آپ کے سامنے ہے۔

جس سے حوصلہ پا کر میں نے اس کتاب کے دوسرے ایڈیشن کی طباعت کا فیصلہ کیا ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ لوگ پہلے ایڈیشن کی طرح اس کتاب کے دوسرے ایڈیشن کا بھی اسی گرمجوشی سے استقبال کریں گے اور اس کتاب کے مزید ایڈیشن شائع ہوں گے (ان شاء اللہ)۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی آبادی بیس کروڑ ہے، جس میں اردو جاننے والوں کی آبادی پانچ کروڑ سے زائد ہے جو ملک کی کل لسانی آبادی میں چھٹا بڑا گروہ ہے اور یہ آبادی ملک کے ہر حصے اور خطے میں پھیلی ہوئی ہے۔ لیکن اردو داں طبقہ میں مطالعہ کا شوق بہت کم پایا جاتا ہے، جس کی وجہ سے بہت کم لوگ اردو کتابیں خریدتے اور پڑھتے ہیں۔ اس صورت میں کوئی کتاب جتنی چھپی وہ چند مہینوں میں بک جائے اور اس کی دوسری اشاعت کی ضرورت محسوس ہو تو اس کو معجزہ تو نہیں لیکن حیرت انگیز ضرور کہا جا سکتا ہے۔

میں اس کتاب کو اردو کے بجائے ہندی اور انگریزی دونوں زبانوں میں لکھ سکتا تھا بلکہ بعض لوگوں کا مشورہ ہے کہ اس کو ان دونوں زبانوں میں ضرور منتقل کیا جائے۔ الحمدللہ میں ان دونوں زبانوں میں لکھنے پر قادر ہوں۔ ان شاء اللہ اس جانب بھی توجہ دی جائے گی۔ میں نے انگریزی میں قرآن پاک اور سیرتِ رسول پر دو وقیع کتابیں لکھیں ہیں جو جلد شائع کی جائیں گی۔ لیکن میں نے اس کتاب کو اردو زبان میں اس لیے لکھنے کا فیصلہ کیا کیونکہ مجھے اردو جاننے والی مسلمان عوام سے کھل کر بات کرنی تھی اور ان کو حالات کی سنگینی اور مثبت لائحۂ عمل سے واقف کرانا تھا اور ان کی ذہنی اور فکری تربیت کرنی تھی۔ لوگوں نے اس کتاب کو جس طرح ہاتھوں ہاتھ لیا اس نے میرا حوصلہ دو چند کر دیا ہے۔ اردو زبان کی حفاظت بھی ملّی بقا کے ایک وسیع تر پروجیکٹ کا حصہ ہے۔ مجھے یہ معلوم ہے کہ مسلمانوں کی مالی حالت بہت اچھی نہیں ہے اور بیشتر لوگ روز کمانے اور روز کھانے والے ہیں۔ لیکن یہ بات نا قابلِ یقین ہے کہ پانچ کروڑ اردو داں لوگوں میں ایک فیصد یعنی پانچ لاکھ لوگ اتنے صاحب مال اور پڑھے لکھے نہیں ہیں کہ سال میں ہزار دو ہزار کی اردو کتاب خرید کر نہ پڑھ سکیں۔ یہ محض شوق اور توجہ کی بات ہے ورنہ اتنی رقم تو لوگ ہفتہ میں چائے، پان، سگریٹ پر خرچ کر دیتے ہیں۔ دنیا میں کوئی زبان

محض حکومت کے بھروسے پر زندہ نہیں رہ سکتی ہے اور اس وقت تو بالکل نہیں جب حکومت ایسا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتی ہے جب اس گرتی دیوار کو ایک دھکا اور نہ دیا جاسکے۔ اس وقت ہمارا حساس اور بیدار ہونا ضروری ہے۔ اس کے لیے اردو پڑھو اور اردو پڑھاؤ کو ایک تحریک کی شکل میں لے کر چلنے کی ضرورت ہے۔ سال میں کم سے کم دو چار چھوٹی بڑی کتاب جس کی مجموعی قیمت ہزار دو ہزار سے زائد نہیں ہوگی ضرور خریدیں، خود پڑھیں، گھر والوں کو پڑھائیں اور دوستوں اور عزیزوں کو پھل اور مٹھائی کے ساتھ کوئی اچھی کتاب بھی خرید کر تحفے میں دیں۔ آپ کا یہ چھوٹا سا قدم اردو کی بقا اور ترویج میں میل کا پتھر ثابت ہوگا۔ مطالعہ کا شوق کسی قوم کی ذہنی بالیدگی میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ پھر ہمیں اپنی بات کہنے اور اپنا موقف پیش کرنے میں مدد ملے گی اور ہم بھی سر اٹھا کر چل سکتے ہیں۔ میں امید رکھتا ہوں کہ میری اس اپیل پر دھیان دیا جائے گا۔

یہ کتاب 2019 کے پہلے مرتب ہو چکی تھی، اس میں جن انتباہ اور چیلنجز کا ذکر کیا گیا تھا وہ 2019 کے بعد اور ابھر کر سامنے آگئے ہیں اور جو باتیں پہلے حاشیہ بردار لوگ کہتے تھے اب وہ باتیں دستوری عہدوں پر فائز اور دستور کی وفاداری کا عہد لے کر منصب اقتدار پر بیٹھنے والے لوگ کھلے عام کہہ بھی رہے ہیں اور کر بھی رہے ہیں، جس نے حالات کی سنگینی کو دوچند کر دیا ہے۔

یہ وقت مایوس اور دل شکستہ ہونے کا نہیں ہے بلکہ یہی وقت صبر واستقلال کا ہے اور پوری مضبوطی سے اپنے موقف پر جم جانے کا ہے۔ اور حکمت وبصیرت اور فراست ایمانی سے کام لیتے ہوئے اپنی اندرونی کمزوریوں کا ایمانداری سے جائزہ لے کر اس کی اصلاح کی طرف توجہ دینے کا ہے۔ اپنے بچوں، نوجوانوں، پس ماندہ آبادیوں اور اپنی عورتوں میں زندگی کی نئ رمق پیدا کرنے کا ہے۔ ان کی تعلیم، تربیت، اخلاق وصحت اتحاد اور بھائی چارہ، ان کے حقوق کی حفاظت اور ان کو امپاور کرنے کا ہے، تاکہ وہ سماج کی کمزور نہیں بلکہ مضبوط اکائی بن سکیں۔

ہم پر ایک بھاری ذمہ داری ہے کہ کچھ لوگ ہندوؤں اور مسلمانوں کو لڑانا چاہتے

ہیں۔انہیں ایک دوسرے سے الگ کر کے رکھنا چاہتے ہیں۔ وہ ایسی زبان استعمال کرتے ہیں، ایسے اشتعال انگیز نعرے لگاتے ہیں۔ اتنی بے ہودہ اور بے تکی باتیں کرتے ہیں جن کو سن کر غصہ آ جانا فطری ہے۔ مگر اس وقت ہمیں اپنی زبان، جذبات اور قلم پر قابو رکھنا ہے۔ یہ مشکل کام ہے۔ مگر ہم کو اس کی تربیت نفسی کرنی ہے اور ہماری جو غالب اکثریت ہے اس سے عزت، محبت، خدمت اور اخلاص کے ساتھ پیش آنا ہے اور ان سے اپنے روابط مضبوط کرنا ہے۔ اچھی طرح جان لیجیے ہندو ایک شریف قوم ہے۔ ایک چھوٹا سا گروہ ہے جو بہت منظّم ڈھنگ سے اور پورے ذرائع ابلاغ کی مدد سے ایک جارحانہ ماحول بنانے میں سرگرم ہے۔ اس کے باوجود بھی ملک کی غالب اکثریت اس کے جھانسے میں آنے کو تیار نہیں ہے اور بھائی چارہ کے ماحول میں رہنا چاہتی ہے۔ ہمارا فرض بنتا ہے کہ ان طاقتوں کا ہاتھ مضبوط کریں اور ان کے ساتھ مل کر نفرت کے اس سیلابِ بلا کو روکیں۔ ہم اگر خدانخواستہ اس جوابی نفرت کے شکار ہو گئے تو یہ بہت نقصان کا سودہ ہوگا۔ اس کے لیے ہمارا دل بڑا ہونا چاہیے، ہاتھ فراخ ہو، جذبات پر پوری طرح کنٹرول ہو، زبان قابو میں رکھیں، سمجھ داری سے کام لیں۔ متحد اور مضبوط بنیں اور خدمت اور محبت کو اپنا شعار بنائیں۔ وقت کی سیاست نے سماج میں جو نفرت، تشدد اور ٹکراؤ کا ماحول بنا رکھا ہے، سماج کو ان زہریلے عناصر سے پاک کر کے سیاست کو بدلنے میں اپنا مثبت رول ادا کریں تاکہ موجودہ فرقہ وارانہ سیاست سماج پر غالب نہ ہو بلکہ انسانی اور دستوری اقدار پر مبنی سماج اس نفرت انگیز سیاست پر غالب آجائے، تاکہ ملک دستور اور قانون کی حکمرانی کے ساتھ سب کے ساتھ ترقی کی راہ پر پُر امن طریقے سے گامزن ہو۔

مجھے امید ہے جس طرح لوگوں نے پہلے ایڈیشن کا دل کھول کر استقبال کیا تھا، دوسرے ایڈیشن کا بھی اسی طرح استقبال کریں گے اور یہ کتاب اردو کی Best Seller Book ثابت ہوگی۔

بھلائی کا طالب

ابوذر کمال الدین

پیش لفظ

ساری تعریفیں اللہ تبارک وتعالیٰ کے لیے ہیں جو مالک الملک ہے۔عزت، ذلت، عروج واقتدار، زوال وپستی سب اس کے دست قدرت میں ہے اور جو لوگوں کے درمیان زمانے اور حالات کو بدل بدل کر آزماتا رہتا ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب پر وہ بوجھ نہ ڈالے جس کو ہم برداشت نہ کرسکیں اور ہمیں موجودہ بے بسی اور بے کسی سے نکال کر قوت و استحکام عطا کرے (آمین) اور درود وسلام ہو اللہ کے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر جنہوں نے مشکل حالات میں بہادری سے کھڑے رہنے کی تعلیم دی۔آپ کا اسوہ ہمارے لیے بہترین نمونہ عمل ہے۔اللہ کی سلامتی اور رحمت ہو ان بندوں پر جنہوں نے بنا کردند خوش رسمے بخاک و خوں غلطیدن۔خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را۔

ہندوستان میں مسلمان اپنی چودہ سو سالہ تاریخ کے درمیان مختلف ادوار اور احوال سے گذرے ہیں۔کبھی انہیں عروج وغلبہ نصیب ہوا تو کبھی وہ زوال وشکست سے دوچار ہوئے۔ ہندوستانی مسلمانوں میں وہ لوگ جو عرب، ایران، ترکستان اور افغانستان سے آئے ان کی تعداد کبھی چند لاکھ سے زائد نہیں رہی۔لہٰذا ہندوستانی مسلمان خالص ہندوستانی النسل ہیں اور ہندوستان میں بسنے والی تمام دیسی نسلوں کی اولاد ہیں۔لہٰذا ان کے بارے میں یہ خیال کرنا کے یہ باہری لوگ ہیں ایک تاریخی مغالطہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آریائی اور

دراوڑقوموں کی طرح یہ بھی خالص ہندوستانی ہیں بلکہ انہی کا حصہ ہیں۔ دوسری حقیقت یہ ہے کہ مذہب الگ ہونے سے قومیت الگ نہیں ہوتی بلکہ جس طرح سکھ،جین، بودھ الگ الگ مذہبی معتقدات اور روایات رکھنے کے باوجود ہندوستانی قوم کا حصہ ہیں اسی طرح مسلمان بھی اپنا الگ عقیدہ،طریق عبادت، اپنی شریعت، زبان وتہذیب رکھنے کے باوجود ہندوستانی قوم کا اٹوٹ حصہ ہیں جس کوکسی طرح (بانٹ اور کاٹ کر) ہندوستان کے جسم واحد سے الگ نہیں کیا جاسکتا ہے۔ جس طرح ہمالیہ، وندھیانچل،گنگا، جمنا، برہمپتر، کاویری ہندوستان کی جغرافیائی سچائی ہیں جو ہندوستان کے جغرافیائی منظرنامے (Land scape) کوڈیفائین اورڈیزائن کرتی ہیں ٹھیک اسی طرح ہندو، مسلمان،سکھ،عیسائی، پارسی،دلت اور آدی باسی، نارتھ انڈین اور ساؤتھ انڈین ہندوستان کے سماجی، مذہبی،تمدنی، معاشی،تہذیبی اورنسلی منظرنامے کوڈیفائن اور ڈیزائن کرتے ہیں۔ آج ہم جس کو ہندوستان کہتے ہیں وہ اپنی جغرافیائی حدود میں بسنے والی انہی اقوام کے مجموعہ کا نام ہے۔ یہ سب کے سب ہندونہیں ہیں لیکن قومیت کے اعتبار سے سب ہندوستانی ہیں اور ہندوستان ان سب کا وطن مالوف ہے۔لہٰذاان میں سے کسی ایک کی نفی تصور ہند (Concept of India یا Idea of India) کی ناقص اور نامکمل تشریح ہوگی جو تاریخی لحاظ سے غلط اور سماجی لحاظ سے گمراہ کن بلکہ تباہ کن ہوگی۔ جولوگ اس تصور کے خلاف کوئی اورتصور رکھتے ہیں وہ ملک میں فتنہ اور فساد پیدا کرنا چاہتے ہیں جس پر کارگر طریقہ سے روک لگانے کی ضرورت ہے۔

آزادی کی جنگ کے دوران۲۴-۱۹۲۳ میں پہلے ساورکر اور پھر لالہ لاجپت رائے نے صرف یہی نہیں کہ دوقومی نظریہ کی وکالت شروع کی بلکہ ہندوستان کی تقسیم کا نقشہ بھی پیش کردیا۔ جب خلافت تحریک ناکام ہوگئی اورلکھنؤ معاہدہ بھی فیل ہوگیا تو کانگریس اورمسلم لیگ جواب تک معاون جماعتیں تھیں متحارب خیموں میں بٹ گئیں اور دونوں کا سیاسی رخ پوری طرح بدل گیا۔ ۱۹۳۷ کے صوبائی انتخابات کے بعد ہندوستان کا سیاسی افق پوری طرح تبدیل ہوگیا اور۱۹۴۰ میں مسلم لیگ نے باضابطہ قرارداد پاس کرکے مسلمانوں کے لیے ایک الگ خطہ

ارض کی مانگ کی۔ جس تصور کو ۱۹۳۰ کی دہائی میں ناقابل حصول (Chimerical)، خیالی اور ناممکن العمل (Impracticable) سمجھ کر رد کر دیا گیا تھا وہ ۱۹۴۰ کے آتے آتے ممکن الحصول لگنے لگا۔ دراصل دو جنگ عظیم کے نتیجہ میں انگلینڈ گرچہ فاتح بن کر ابھرا لیکن اس کی حاکمیت پر زوال کے آثار نمایاں ہونے لگے تھے۔ اس کے مقابلے امریکہ اور روس دو بڑی طاقت بن کر ابھرے۔ دوسری طرف ہندوستان کی جنگ آزادی فیصلہ کن دور میں داخل ہو چکی تھی۔ اپنے تمام تر سیاسی اختلافات کے باوجود کانگریس اور مسلم لیگ دونوں جلد آزادی کے خواہاں تھے۔ اس لیے انگریزوں نے جاتے جاتے اپنی فطرت کے عین مطابق فرقہ پرستی کے ابھرتے ناسور کے علاج کے طور پر قطع اعضاء کا فیصلہ سنا دیا اور بالکل غیر فطری طور پر ملک کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔

اس غیر فطری تقسیم کے نتیجہ میں زبردست قتل و غارت گری ہوئی۔ مغربی اور مشرقی پاکستان میں ہندو اور سکھ اس کی زد میں آئے اور مین لینڈ (Main Land) ہندوستان میں بالخصوص یوپی، بہار، دہلی، مشرقی پنجاب میں مسلمان اس کی زد میں آئے۔ لگ بھگ ایک کروڑ لوگ بے گھر ہو گئے لاکھوں لوگوں کی جانیں گئیں، ہزاروں عورتوں کی عزت لوٹی گئی، لاکھوں بچے یتیم ہو گئے اور اربوں کھربوں کی املاک تباہ ہوئیں۔ کہا جاتا ہے کے ہندوستان کی جنگ آزادی ایک غیر خونی انقلاب تھا جو ستیہ اور اہنسا کے اصولوں پر لڑا گیا مگر آزادی کا سورج لاکھوں انسانوں کی لاشیں اپنے گردن پر لے کر طلوع ہوا جس کو فیض احمد فیص نے داغ داغ اجالا اور شب گزیدہ سحر سے تعبیر کیا ہے۔

ہندوستان میں مسلمان گوندھے ہوئے آٹے میں نمک کی طرح ہیں جس طرح آٹے سے نمک کو الگ نہیں کیا جا سکتا اسی طرح ہندوستان سے مسلمان کو الگ کرنا ناممکن ہے۔ یہ تو ایک تقسیم تھی اگر ہندوستان کے 72 ٹکڑے کر دئے جائیں تب بھی اس کے ہر ٹکڑے میں مسلمان ہوگا۔ لہٰذا ہندوستان اور مسلمان لازم و ملزوم ہیں جس کو کسی طور الگ نہیں کیا جا سکتا ہے۔ جس طرح ہمالیہ پہاڑ کو اپنی جگہ سے ہٹانا ناممکن ہے ٹھیک اسی طرح ہندوستان سے مسلمانوں کے وجود کو ختم کرنا ناممکن ہے۔ لہٰذا اب جبکہ یہ حقیقت عمرانی اور تاریخی طور پر ثابت

ہو چکی ہے تو دونوں قوموں اور ہندوستان کی بھلائی اسی میں ہے کہ دونوں قومیں ایک دوسرے کے تشخص (Individuality)، ایک دوسرے کے تخصص (Speciality) اور ایک دوسرے کے شرف و امتیاز (Dignity & Diversity) کا احترام کرتے ہوئے اور ایک دوسرے کو آزادی، برابری اور انصاف کی فضاء میں مواقع اور اہلیت کی بنیاد پر Space دیتے ہوئے ملک کی تعمیر وترقی میں حصہ داری کا پورا موقع فراہم کریں تا کہ ایک طرف ملک کی سالمیت مستحکم ہو سکے اور دوسری طرف محبت، خیر سگالی اور باہمی تعاون کی بنیاد پر سماج میں امن اور انصاف قائم کرنے میں مدد ملے۔ یہ کام ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے حق میں ضروری ہے اور ان دونوں کے ساتھ ملک کے حق میں بھی ہے۔ لہٰذا جس کے دل میں اپنے وطن اور وطن والوں سے تھوڑی بھی ہمدردی ہے اور وہ سچا دیش بھکت ہے، وہ اس کے علاوہ کوئی اور رائے یا حکمت عملی اختیار ہی نہیں کرسکتا ہے۔

لیکن افسوس ہے کہ آزادی کے بعد ہم ملک کو ایک اچھا اور خوبصورت دستور دینے میں کامیاب تو ہو گئے مگر انصاف، برابری، آزادی اور بھائی چارہ پر مبنی ایک پرامن، عدل پرور سماج اور سیاسی نظام دینے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ اقتدار چاہے ملکی ہو یا غیر ملکی اس کا مفاد اور مزاج ایک جیسا ہوتا ہے۔ حکمراں ہمیشہ عوام کے اتحاد اور طاقت سے خائف رہتے ہیں۔ لہٰذا ان کو مذہب، زبان، علاقہ، رنگ، نسل، جنس، ذات، برادری، اکثریت اور اقلیت گو یا مختلف خانوں میں بانٹ کر رکھتے ہیں اور سماج کے ایک طبقہ کو دوسرے طبقہ کے خلاف برسرپیکار رکھنے کی سیاست کرتے رہتے ہیں تا کہ لوگ اپنے حقیقی اور ضروری مسائل سے صرف نظر کرتے ہوئے جذباتی اور وجودی مسائل میں الجھے رہیں اور انہیں حکمرانی کا موقع ملتا رہے۔ اس طرح ایک مفادی گروہ (Vested interest) بنا کر اپنا الو سیدھا کرتے رہتے ہیں۔

جس وقت بھارت آزاد ہوا انگریزوں کے دوسو سالہ نظام کی وجہ سے ملک پوری طرح غریب اور قلاش ہو گیا تھا نتیجتاً بھوک مری، مہاماری، غربت، جہالت، سماجی اور معاشی نابرابری کی وجہ سے وہ ایک انتہائی غریب اور پسماندہ ملک شمار کیا جانے لگا۔ بھارت کے ان

ہمالیائی مسائل کا حل ڈھونڈھ نکالنا آسان نہیں تھا۔لہٰذا لوگوں نے تمام دوسری ضمانتوں کے علی الرغم عافیت اسی میں سمجھی کہ لوگوں کو مذہب، ذات، برادری، زبان اورعقیدے کے نام پر باہم دست وگریباں رکھا جائے اوران کے حقیقی مسائل سے ان کی توجہ ہٹا کر ضمنی مسائل کی طرف ان کا رخ موڑ دیا جائے جس میں وہ کامیاب رہے اور یہ تاریخی حقیقت ہے کہ لوگ اپنے بنیادی مسائل کو چھوڑ کر کچھ جذباتی مسائل میں الجھادئے گئے اور وہ ان مسائل میں الجھ کر ترقی کے دور میں پیچھے رہ گئے۔

جیسا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے کے ہندوستان میں مسلمان گوندھے ہوئے آٹے میں نمک کی طرح ہیں لہذ اتقسیم ملک کے باوجود بھارت میں مسلمانوں کو چھانٹ کر الگ کر دینا ناممکن تھا۔تقسیم کے نتیجہ میں صرف اتنا فرق پڑا کہ جومسلم اکثریتی علاقہ تھا وہ پاکستان بن گیا لیکن مین لینڈ انڈیا میں جومسلمان تھے جہاں تھے وہ تمام تر نفسیاتی دباؤ کے باوجود وہیں رہے۔ مسلم اشراف اور مڈل کلاس کی ایک چھوٹی سی تعداد بھارت چھوڑ کر پاکستان چلی گئی۔مسلمانوں کی لیڈرشپ پہلے بھی کم اور کمزور تھی، تقسیم کے بعد ان کی جو سیاسی اور مذہبی لیڈرشپ تھی اس کی بڑی تعداد پاکستان چلی گئی۔نتیجہ یہ ہوا کہ جتنے مسلمان مسلم اکثریت ملک پاکستان میں تھے اس سے کہیں زیادہ مسلمان مین لینڈ انڈیا میں بطور اقلیت ایک لیڈر لیس کمیونٹی کے طور پر باقی رہے۔اس صورتحال سے شہ پاکر یہاں کے فسطائی عناصر نے فسادات اور دیگر ہتھکنڈوں کا سہارا لے کر مسلمانوں پر دباؤ بنانا شروع کیا کہ وہ اس ملک کو چھوڑ کر چلے جائیں یا پھر ہندو قومیت میں ضم ہو جائیں یا پھر مزدور بن کر رہیں۔اس طرح مسلمانوں کوایک وجودی بحران میں (Existential Crisis) میں مبتلا کر دیا گیا۔اندلس اور اسرائیل کے ڈرامے کو ہندوستان میں Enact کرنے کی ایک منظّم سازش رچی جارہی ہے اور ان کو مسلسل دباؤ میں رکھنے کی سیاست پورے زور شور کے ساتھ چلائی جارہی ہے۔

بھارت نے آزادی کانگریس کی قیادت میں حاصل کی۔کانگریس کے قیام کا سہرا ایک برٹش ریٹائرڈ آئی سی ایس افسر اے.او.ہیوم کو جاتا ہے جس نے ابتداءً انتظام ملکی میں

ہندوستانیوں کی شمولیت کی وکالت کی۔ اس کے اولین مؤسسین میں انگریز، ہندو، مسلمان، پارسی غرض سبھی شریک تھے۔ ابتداء میں تو یہ صرف تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کی جماعت تھی جو مختلف قسم کے سیاسی اور سماجی مراعات کے لیے جدوجہد کر رہی تھی ۔لیکن دھیرے دھیرے یہ ملک کی آزادی کی تحریک کا ہراول دستہ بن گئی۔ کانگریس گرچہ اپنی ساخت اور ترکیب میں تمام ہندوستانیوں کی ایک مشترک اور سیکولر پلیٹ فارم تھی لیکن جیسے جیسے یہ تحریک آگے بڑھی چونکہ ہندوستان میں ہندو اکثریت میں تھے اس کا اکثریتی کلچر ابھر کر سامنے آنے لگا۔ اس کی وجہ سے مسلمانوں کے اندر طرح طرح کے خدشات ابھرنے لگے جس کو صحیح طریقہ سے ایڈریس کرنے کے بجائے اس کو کھلی چھوٹ دی گئی۔ اس نے ماحول کو کشیدہ کرنا شروع کیا۔

کانگریس کی چوٹی کی قیادت جو اعلیٰ طبقات پر مشتمل تھی اور مغربی تعلیم یافتہ، لبرل، سیکولر اور اصلاح پسند تھی، اس نے اپنے سیاسی نیٹ ورک کی توسیع کے لیے ان لوگوں کو بھی قائدانہ مقام پر فائز کرنا شروع کیا جو ان کی طرح لبرل اور سیکولر سوچ نہیں رکھتے تھے بلکہ غالی فرقہ پرستانہ ذہنیت کے حامل تھے۔ ایک زمانے میں جناح بھی کانگریس میں ہی شریک تھے اور ہندو مسلم اتحاد کے بڑے علم بردار مانے جاتے تھے۔ لیکن جب کانگریس کنسٹی ٹیوشنل میتھڈ کو چھوڑ کر اجی ٹیشنل میتھڈ اپنانے لگی اور اس کی قیادت میں ایسے لوگ شامل ہونے لگے جو آزادی کی جدوجہد کے ساتھ ساتھ ہندوؤں کے غلبہ اور مسلمانوں کے ساتھ معاندانہ رویہ رکھنے کے حامی تھے تو انہوں نے کانگریس سے اپنا رشتہ توڑ لیا اور یہاں سے ایک نئی تاریخ شروع ہوئی۔

آزادی اور تقسیم ملک کے بعد فرقہ پرستی کے بڑھتے سیلاب کو روکنے کے لیے گاندھی، نہرو اور مولانا آزاد سینہ سپر ہو گئے۔ مگر ابھی بھارت کی نوآزاد ریاست کو چھ مہینہ بھی نہیں ہوئے تھے کہ ایک غالی فرقہ پرست ناتھورام گوڈسے نے گاندھی کا قتل کر دیا۔ گاندھی ہندوستان کے ایک زبردست سیاسی اور اخلاقی قائد تھے۔ لہٰذا فرقہ پرستوں نے وسعت قلبی اور رواداری کی سب سے مضبوط دیوار کو ڈھا دیا جس کے بعد ان کو اپنے غلبہ کی ایسی راہ داری نصیب ہو گئی جو بعد میں بڑی شاہراہ بن گئی۔

نہرو نے اس طوفان بلا کے خلاف اپنی جدوجہد جاری رکھی اور بہت حد تک ملک کو اپنے دستوری آئڈیل سے ہٹنے نہیں دیا۔ مگران کے اردگرد جو لوگ ان کی کابینہ کے ساتھی تھے، پارٹی کے اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے اور جو ریاستی ذمہ داران تھے ان کی اکثریت خاص کر ہندی بیلٹ میں نہرو کے آئڈیل اور کانگریس کی تحریری پالیسیوں اور دستور میں یقین نہیں رکھتے تھے۔ لہٰذا انہوں نے فرقہ پرستوں کو درپردہ چھوٹ دے دی کہ فسادات کا ٹانڈو جہاں چاہیں اور جیسے چاہیں جاری رکھیں۔ حکومت، انتظامیہ اور پولیس بہر صورت ان کی پشت پناہی کرے گی۔ دوسری طرف انہوں نے ایک غیر تحریری ضابطے کے ذریعہ مسلمانوں کو سماجی، معاشی، سیاسی، تعلیمی اور انتظامی معاملات سے دور رکھنے کی پالیسی اپنائی۔ نتیجہ کے طور پر ہر گزرتے دن کے ساتھ مسلمان حاشیہ پر کھسکتے چلے گئے اور اس وقت وہ سیاسی، معاشی اور سماجی انڈکس کی بنیاد پر ملک کی سب سے پسماندہ اکائی ہیں۔

جس وقت بھارت کا دستور نافذ کیا جا رہا تھا اس وقت دستور کی ڈرافٹنگ کمیٹی کے چیئر مین ڈاکٹر بھیم راؤ رام جی امبیڈکر نے انتباہ دیتے ہوئے کہا تھا کہ صرف اچھا دستور بنا لینا کافی نہیں ہے۔ سب سے اہم کام اس کا ایماندارانہ نفاذ ہے اگر ایماندرانہ نفاذ ہو تو ایک ناقص دستور بھی مثالی نتائج پیدا کرسکتا ہے بصورت دیگر ایک اچھا دستور خوبصورت اور پرشکوہ الفاظ کا قبرستان ہوگا جس کی کوئی عملی افادیت نہیں ہوگی۔ اس وقت بھارت کا مسئلہ دلت، بیک ورڈ اور اقلیتوں کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ دستور کے عدم اور غیر ایماندارانہ نفاذ کی وجہ سے پیدا شدہ بحران کا مسئلہ ہے۔ اس وقت ملک کی اقلیتیں خطرے میں نہیں بلکہ ملک کا دستور خطرے میں ہے جس کو لوگ ردی کا پلندہ سمجھ کر دریا برد کر دینے پر آمادہ ہیں۔

بہر حال کانگریس، سوشلسٹ، سیکولر اور لبرل ڈیموکریسی میں یقین رکھنے کے باوجود اکثریتی احساس (Majoritarian impulse) کے ساتھ کام کرنے والی جماعت رہی اور جیسے جیسے اس کے درمیان سے گنگا جمنی تہذیب میں یقین رکھنے والے لوگ اٹھتے چلے گئے اس کا اکثریتی رجحان اس کی پالیسی اور طرز عمل پر غالب آتا چلا گیا۔ مولانا آزاد اور پنڈت نہرو

کے انتقال کے بعد کانگریس بے لنگر کا جہاز ہوگئی جس کی سمت و رفتار ناخداؤں کے عزم و ارادے اور قوت بازو کے بجائے سمندر میں اٹھنے والی لہریں اور ہوا کا رخ طے کرنے لگیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کانگریس اپنے آئیڈیل سے بھٹک گئی اور اب کسی طرح اقتدار میں بنے رہنا اس کا مطمع نظر ہوگیا۔

بھارت میں جارح ہندو فرقہ پرستی کا رجحان تو انگریزی عہد میں شروع ہوگیا تھا۔ ۱۹ویں صدی کی آخری چوتھائی میں یعنی ۱۸۷۵ میں آریہ سماج کا قیام عمل میں آیا جس نے شدھی تحریک کا آغاز کیا اور 1892 میں گائے کے تحفظ کے نام پر فرقہ وارانہ فسادات کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ 1915 میں ہندومہاسبھا کا قیام عمل میں آیا اور 1925 میں راشٹریہ سیوم سیوک سنگھ کا قیام عمل میں آیا۔ یہ تمام تنظیمیں سماجی، مذہبی، تہذیبی اور تعلیمی امور پر زور دیتی تھیں اور ہندوسماج کی اصلاح، تعمیر، ترقی اور اتحاد کے ساتھ ایک خاص چیز جو ان کی بناوٹ اور تحریک کا حصہ تھی وہ اسلام اور مسلم دشمنی ہے۔ بلکہ یہ تنظیمیں جن دو بنیادی ستون پر قائم ہیں ان میں ایک ستون ہندو احیا پرستی ہے اور دوسرا مسلم دشمنی بلکہ دوسرے ستون سے ہی پہلے ستون کو طاقت ملتی ہے۔

انگریزوں کی پھوٹ ڈالو اور راج کرو کی پالیسی نے اس کو مزید تقویت دی۔ لہٰذا ان کی جانب سے سیاسی اصلاحات کے نام پر جو اقدامات کئے گئے اس نے آگ میں گھی ڈالنے کا کام کیا اور دونوں قومیں اور ان کے مختلف گروپ ایک دوسرے کے متحارب بن کر کھڑے ہونے لگے۔ 1905 میں تقسیم بنگال، 1909 میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے تحت جداگانہ انتخاب، 1932 میں کمیونل ایوارڈ اور 1937 میں صوبائی انتخابات ان سب نے نہ صرف دونوں قوموں کو مکمل طور پر تقسیم کر دیا بلکہ فرقہ پرستی کو پوری طرح Institutionalised کر دیا۔ تقسیم ہند کے بعد جو لوگ دوقومی نظریہ میں یقین رکھتے تھے اور الگ مسلم ہوم لینڈ کے علم بردار تھے وہ تو پاکستان چلے گئے۔ مگر جو لوگ ہندوستان میں دوقومی نظریہ کے حامی اور وکیل تھے انہوں نے آزادی کے بعد اپنی رائے سے رجوع کرنے کے بجائے اس کی زوردار طریقے سے وکالت

شروع کردی اور یہاں کی تمام مذہبی لسانی، تہذیبی اور نسلی اقلیتوں کے وجود سے انکار کرتے ہوئے بھارت کو خالص ہندو راشٹر بنانے کی مہم شروع کی جس میں وقت کے ساتھ تیزی آتی چلی گئی۔ اس کی واضح مثال آر ایس ایس کا یہ کہنا کہ ہندوستان میں رہنے والے سبھی لوگ ہندوستانی نہیں بلکہ ہندو ہیں۔ یہ ان کی الگ شناخت کو ختم کر کے تمام لوگوں کو ہندو قوم میں ضم کرنے کا جارحانہ اظہار ہے۔

جب کانگریس نے سیکولر اور Inclusive تصورات کو کمزور کر کے اکثریت نوازی کا چولا زیب تن کر لیا تو وہ جس مکتب کے مبتدی طالب علم تھے اس سے پہلے اور ان سے بہتر اس مکتب کے فارغین دوسرے خیمے میں موجود تھے جنھوں نے کانگریس کو زک دے کر اس کے ہاتھ سے اقتدار اچک لیا۔ کانگریس اس وقت حیران پریشان بے سمت و مقام صحرا میں بھٹک رہی ہے جہاں سے اسے باہر نکلنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا ہے۔

راشٹریہ سویم سیوک کے دوسرے سرسنچا لک گرو گوالکر نے 1939 میں اپنی کتاب We or our nation Defined میں جس ہندوستانی قومیت کا تصور پیش کیا تھا اس میں بھارت میں غیر ہندو قوموں کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی یہاں تک کہ ان کو شہری حقوق سے بھی محروم کر دینے کی پرزور وکالت کی گئی تھی۔ ان کے مطابق ان قوموں بالخصوص مسلمانوں اور عیسائیوں کو بغیر کسی شہری حقوق و اختیارات کے ہندوؤں کے دست نگر بن کر رہنا ہوگا بصورت دیگر ان کو ملک چھوڑ کر جانا ہوگا۔

آزادی کے بعد جب کانگریس نے آر ایس ایس اور اس قبیل کی دیگر جماعتوں کے خالص نسل پرستانہ اور فسطائی تصورات کو رد کرتے ہوئے بلا لحاظ مذہب، زبان، جنس، رنگ نسل اور جائے پیدائش کے تمام ہندوستانیوں کو ایک قوم مانتے ہوئے تمام افراد اور گروہ کو برابری کا حق دیا تو ان کا غصہ ساتویں آسمان پر پہنچ گیا۔ گاندھی کے قتل کے پیچھے یہی محرکات کارفرما تھے۔

آزادی کے بعد کانگریسی لیڈروں کی قربانیوں اور خدمات کے عوض ممنون قوم نے تمام ریاستوں اور مرکز میں کانگریس کو بھاری اکثریت سے فتح یاب کیا اور پورے ملک میں

کانگریس کی حکومت قائم ہوگئی۔ یہ سلسلہ 1947 سے 1967 تک اسی طرح چلتا رہا۔ اس درمیان کانگریس کی صف اول کی لیڈرشپ اپنی طبعی عمر پوری کر کے رخصت ہو چکی تھی یا ہو رہی تھی اور خاندانی وراثت کا دوسرا دور شروع ہو گیا تھا جو ان نظریات کے مخلص حاملین نہیں تھے جو تحریک آزادی کے درمیان کانگریس کی شناخت مانی جاتی تھی۔ دوسری طرف اتنے دنوں تک اقتدار میں رہنے کی وجہ سے ان کے اندر حکمراں اور برتر ہونے کا احساس ہونے لگا اور عوام سے ان کا رابطہ ٹوٹنے لگا۔ عوامی خدمات اور فلاح پر توجہ دینے کے بجائے انہوں نے ذات، پات، فرقہ واریت، علاقائیت، جوڑ توڑ، دھونس دھاندلی، اقربا پروری اور کرپشن کا سہارا لینا شروع کیا۔ جس نے ملک کے پورے سیاسی کلچر کو بدل کر رکھ دیا۔ یہی وہ وقت تھا جب اپوزیشن پارٹیوں نے اپنے منفرد نظریات کو بالائے طاق رکھ کر کانگریس کے خلاف محاذ کھڑا کیا۔ 1967 میں کم وبیش نو ریاستوں میں غیر کانگریس سرکاریں بن گئیں جس سے یہ ظاہر ہو گیا کہ اگر اپوزیشن پارٹیاں متحد ہو کر الیکشن لڑیں تو کانگریس کو مرکز میں بھی شکست دی جا سکتی ہے۔

لہٰذا کانگریس کے خلاف محاذ آرائی کا ایک نیا دور شروع ہوا جس میں رائٹ، لیفٹ اور سینٹر سب طرح کے لوگ شریک ہوگئے۔ 1971 کی بھارت پاک جنگ میں جب اندرا گاندھی نے پاکستان کو شرمناک شکست دی اور اس کے مشرقی بازو کو کاٹ کر بنگلہ دیش کے نام سے ایک آزاد ملک بنا دیا تو ان کی مقبولیت اوج ثریا پر پہنچ گئی اور پھر انہیں بھاری کامیابی حاصل ہوئی۔ لیکن جب 1975 میں الٰہ آباد ہائی کورٹ نے الیکشن سے متعلق بدعنوانی کے مقدمے میں ان کو قصوروار مانتے ہوئے ان کے انتخاب کو رد کر دیا اور چھ سال کے لیے ان کو نااہل قرار دے دیا تو اندرا گاندھی نے اپنا اقتدار بچانے کے لیے ملک میں اندرونی ایمرجنسی نافذ کر دی۔

بہت سی جماعتوں پر پابندی لگا دی گئی اور تمام سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں کو جیل میں ڈال دیا۔ یہ ہندوستان کی تاریخ کا بہت ہی غیر معمولی واقعہ ہے، جس نے ملک کی پوری سیاست کا رخ تبدیل کر دیا۔ 19 مہینہ کی کالی لمبی رات کے بعد جب ایمرجنسی ہٹی تو آناً فاناً تمام اپوزیشن پارٹیوں نے جنتا پارٹی کے نام سے ایک مشترکہ محاذ بنا کر الیکشن میں حصہ لیا اور

پہلی بار کانگریس کے ہاتھ سے اقتدار پھسل کر جنتا پارٹی کے ہاتھ میں آ گیا۔ جنتا پارٹی جلد بازی میں بنا ایک وفاق تھا جس میں کوئی جوڑنے والی چیز نہیں تھی۔لہٰذا لیڈروں کی آپسی چپقلش اور سربراہی کی خواہش کی وجہ سے یہ تجربہ ناکام رہا۔ پھر اس کے بعد جو الیکشن ہوا اس میں اندرا گاندھی دوبارہ اقتدار میں آ گئیں۔اس بار اندرا گاندھی نے اپنے چھوٹے بیٹے سنجے گاندھی کو اپنی وراثت کو آگے بڑھانے کی ذمہ داری دی جس نے کانگریس کی سابقہ روایات کو پامال کرتے ہوئے دل بدل،غنڈہ گردی اور چاپلوسی کی سیاست کو فروغ دیا۔ سنجے کے ایک ہوائی حادثے میں ہلاک ہونے کے بعد اندرا گاندھی نے اپنے بڑے بیٹے راجیو گاندھی کو اپنی وراثت سونپنے کا فیصلہ کیا۔ اسی درمیان پنجاب میں بھنڈاروالا کی تحریک کا قلع قمع کرنے کے لیے امرتسر کے گولڈن ٹیمپل پر چڑھائی کر دی گئی جس کے نتیجہ میں سکھوں کی سب سے عظیم اور مقدس عبادت گاہ کو کافی نقصان ہوا۔اس سے سکھوں کے جذبات میں خاصہ ابال پیدا ہوا اور اندرا گاندھی کے دو سکھ سکیوریٹی گارڈ نے ان کو گولیوں سے بھون کر ہلاک کر دیا۔اس کے ردعمل میں صرف دہلی میں تین ہزار سے زائد سکھ مرد،عورت اور بچے مارے گئے اور پہلی بار سکھوں کو آزاد ہندوستان میں اپنے اقلیت اور غیر محفوظ ہونے کا احساس پیدا ہوا۔

اب کانگریس کی قیادت راجیو گاندھی کے ہاتھ آئی۔ راجیو گاندھی مزاجاً ایک شریف آدمی تھے۔ان کی صاف ستھری شبیہ تھی،مگر وہ تجربہ کار آدمی نہیں تھے۔لہٰذا خود کانگریسیوں نے ان کو گھیر کر ان سے ایسے ایسے غلط سیاسی فیصلے کرائے جس کی وجہ سے انہیں اقتدار سے ہاتھ دھونا پڑا اور بعد میں ایک دہشت گردانہ حملہ میں ان کی جان چلی گئی۔

1967 اور 1987 کے درمیان پچھلے بیس سالوں میں دریائے گنگا میں بہت سا پانی بہ چکا تھا اور ملک کا سیاسی منظرنامہ پوری طرح بدل چکا تھا۔ایک طرف کانگریس میں ٹوٹ پھوٹ جاری تھی،اس سے ٹوٹ ٹوٹ کر لوگ یا تو کسی دوسری پارٹی میں شامل ہو رہے تھے یا پھر اپنی پارٹی بنا کر اس کے اقتدار کو چیلنج کر رہے تھے۔دوسری طرف کئی ریاستوں میں علاقائی پارٹیوں نے اپنی حکومت قائم کر لی تھی اور مرکز میں بھی نئے اتحاد بن اور بگڑ رہے تھے۔

دراصل ہندوستان میں جو بھی سیاسی پارٹیاں ہیں ان کو تین خانوں میں بانٹا جاسکتا ہے۔ ایک دائیں بازو کی پارٹیاں ہیں، دوسری بائیں بازو کی پارٹیاں ہیں اور تیسری سینٹرسٹ پارٹیاں ہیں۔ جن سنگھ جو بعد میں بی جے پی بنی، شیوسینا اور اکالی دل یہ رائٹ ونگ پارٹیوں کی مثالیں ہیں۔ جبکہ کمیونسٹ اور سوشلسٹ پارٹیاں بائیں بازو کے خیمہ میں آتی ہیں۔ کانگریس اور علاقائی پارٹیاں سینٹرسٹ پارٹیاں شمار کی جاتی ہیں۔ ان میں جو علاقائی پارٹیاں ہیں وہ زیادہ تر کاسٹ بیسڈ اور لیڈر بیسڈ پارٹیاں ہیں جن کا کوئی مضبوط کیڈر نہیں ہے۔ بھارتیہ جنتا پارٹی اور لیفٹ پارٹیاں نظریات پر مبنی کیڈر بیسڈ پارٹیاں ہیں۔ سوویت یونین کے زوال کے بعد کمیونسٹ پارٹیوں کا زور واثر کم ہوا ہے اور اس وقت وہ حاشیہ پر ہیں۔ اس لحاظ سے کانگریس نے جو جگہ خالی کی ہے اس پر بھارتیہ جنتا پارٹی نے قبضہ کرلیا ہے جس کے پاس اس وقت سب سے بڑا کیڈر بیس ہے۔

اندرا گاندھی کے قتل کے بعد جو ہمدردی کی لہر چلی اس نے تمام حزب اختلاف کو حاشیہ پر لا دیا اور بی جے پی سمٹ کر دو سیٹوں پر محدود ہوگئی۔ اس کے بعد بی جے پی نے اپنی حکمت عملی بدلی اور ایودھیا میں بابری مسجد بنام رام جنم بھومی کا قضیہ کھڑا کر کے پورے ملک میں ایک زبردست مہم کا آغاز کیا اور شہر شہر گاؤں گاؤں گھوم گھوم کر رام مندر تحریک سے لوگوں کو جوڑنا شروع کیا۔ ادھر راجیو گاندھی اپنی سیاسی ناتجربہ کاری کی وجہ سے پے در پے ایسی غلطیاں کرنے لگے جس کی وجہ سے ان کے پاؤں کے نیچے سے سیاسی زمین کھسکنے لگی، نتیجتاً مسٹر کلین، بوفورس سودے میں کرپشن کے الزامات میں گھر گئے اور 1989 کے الیکشن میں انہیں شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ وی پی سنگھ کی قیادت میں ایک مخلوط حکومت بنی جس میں بی جے پی نے باہر سے حمایت دینے کا فیصلہ کیا۔

جب وی پی سنگھ نے منڈل کمیشن کی سفارشات کو تسلیم کرتے ہوئے بیک وارڈ کے لیے ریزرویشن کا اعلان کیا تو اپر کاسٹ کے پاؤں تلے سے زمین کھسکتی نظر آئی اور ان کا غم و غصہ سڑکوں پر پھوٹ پڑا۔ عوام بالخصوص نوجوانوں میں زبردست اشتعال کا فائدہ اٹھاتے

ہوئے لال کرشن اڈوانی نے سومناتھ سے ایودھیا کی رتھ یاترا شروع کی اور رام مندر تحریک کو اپنا سیاسی ہتھیار بنالیا۔اس یاترا کا دومقصد تھا۔ایک ہندوسماج میں جوٹکراؤ اور بکھراؤ کی فضا بن چکی ہے اور بیک وارڈ اور فوروارڈ جس طرح ایک دوسرے کے سیاسی، سماجی، تعلیمی اور معاشی حریف بن کر کھڑے ہوگئے ہیں اس کو روکا جائے اور ہندوسماج کا رخ اندرونی کش مکش سے پھیر کراس کوفرقہ وارانہ کش مکش کا رخ دیا جائے۔

اڈوانی جی کی یہ رتھ یاترا ماسٹر اسٹروک ثابت ہوئی اور اپر کاسٹ، بیک وارڈ، دلت اور آدیباسی سبھی اپنے آپسی اختلاف کو بھول کر رام مندر کے مسئلہ پر ایک ہوگئے جس کا زبردست سیاسی فائدہ بی جے پی کو ہوا۔وہ پارٹی جوسمٹ کردوممبران پر رہ گئی تھی جب اڈوانی جی کی گرفتاری ہوئی اور رتھ یاترا روکے جانے کے خلاف بی جے پی نے وی پی سنگھ سے اپنی حمایت واپس لی اس کے بعداس کا ستارہ چمکنے لگا۔

وی پی سنگھ کی حکومت کے سقوط کے بعد جو الیکشن ہوا اس میں راجیوگاندھی دہشت گردانہ حملہ میں مارے گئے۔اس واقعے نے لڑکھراتی کانگریس کوسہارا دیا اوراس الیکشن میں کانگریس سب سے بڑی پارٹی بن کرابھری۔نرسمہاراؤ جوایک طرح سے سیاست سے ریٹائر ہوکرآندھراپردیش لوٹ گئے تھے کانگریس کے قدآور لیڈر بن کر ابھرے اوران کی قیادت میں کانگریس کی اقلیتی سرکار بنی جس کوکئی پارٹیوں نے باہر سے سپورٹ کیا۔

نرسمہاراؤ رام مندر موومنٹ سے ہمدردی رکھتے تھے۔ان کی واجپئی سے اچھی دوستی تھی۔لہٰذا درپردہ سازش کر کے بابری مسجد کو ڈھانے کا منصوبہ تیار کرلیا گیا۔اس وقت یوپی میں بی جے پی کی قیادت میں کلیان سنگھ کی حکومت تھی۔ایودھیا میں کارسیوا کے نام پر ہزاروں لوگوں کوجمع کیا گیا۔سپریم کورٹ میں ریاستی اورمرکزی حکومت نے حلف نامہ دیا کہ بابری مسجد کوکوئی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا اور علامتی کارسیوا کر کے اس مہم کوختم کر دیا جائے گا۔

مگر سنگھ پریوار پوری تیاری کے ساتھ آیا تھا،لہٰذا ٦ دسمبر١٩٩٢ کو پورے سرکاری تحفظ میں تمام تر وعدوں اور یقین دہانیوں کو طاق پر رکھتے ہوئے دن دھاڑے پوری عالمی میڈیا کی

موجودگی میں جسے بی بی سی نے لائیو ٹیلی کاسٹ کیا بابری مسجد ڈھادی گئی۔ پولیس، پیراملٹری فورس اور فوج کے لوگ تماشائی بنے رہے۔ یہ کوئی معمولی واقع نہیں تھا۔ یہ محض ایک مسجد کے ڈھانے کا معاملہ نہیں تھا بلکہ یہ ملک کی سیکولر بناوٹ، دستور کے آئیڈیل اور قانون کی حکمرانی کو ڈھانے کا معاملہ تھا۔ اس نے مسلمانوں میں نہ صرف عدم تحفظ کا احساس پیدا کیا بلکہ مستقبل کے ہندوستان کی ایک ایسی جھلک دکھائی جوفسطائی عزائم سے بھرپور تھی۔

اس واقعہ نے ہندوستان کا سیاسی اور سماجی منظرنامہ پوری طرح بدل دیا۔ اکثریت کی فرقہ پرستی کی آندھی میں کمزور طبقات بالخصوص مسلمانوں پر دستور کی جوموہوم چھتری تھی وہ اڑگئی اور مسلمان بے بس نظر آنے لگے کیونکہ تمام دستوری اداروں یہاں تک کہ عدلیہ نے بھی ایک طرح سے سپر ڈال دیا۔ ملک ایک ایسی جارح فرقہ پرستی کے دور میں داخل ہوگیا جس میں نازیت کی تمام علامتیں موجود تھی جس کو ہندوراشٹرواد کا نام دیا گیا۔

نرسمہا راؤ نے سنگھ کے کارندے کے طور پر کام کیا جس سے کانگریس کا اندرونی کردار کھل کر سامنے آ گیا۔ ملک کی تمام سیاسی پارٹیاں اس سیلاب میں بہ گئیں۔ سنگھ نے رام مندر کے مسئلے کو اتنا جذباتی بنا دیا کہ کوئی معقول بات سننے اور ماننے کو تیار نہیں تھا اور کوئی سیاسی پارٹی اپنے اکثریتی بیس کو ناراض کر کے سیاست میں باقی نہیں رہ سکتی تھی۔ لہٰذا نام نہاد سیکولر پارٹیوں نے منافقت کا لبادہ اوڑھ لیا۔ اس ماحول میں مسلمان خود کو یکا اور تنہا محسوس کرنے لگے۔ مسلم قیادت تو کمزور اور بکاؤ تھی لیکن عوام نے بالغ نظری کا ثبوت دیا اور صبر وتحمل کو اپنے ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ زخم کھانے کے باوجود اپنے حواس قائم رکھے اور سپر ڈالنے سے انکار کر دیا نیز پرامن اور قانونی طور پر اپنی جدوجہد جاری رکھی۔

رام مندر تحریک کی وجہ سے ہر الیکشن کے بعد بی جے پی مضبوط ہوتی گئی، یہاں تک کے ۱۹۹۸ کے عام انتخابات میں وہ سب سے بڑی پارٹی بن کر ابھری۔ صدر جمہوریہ شنکر دیال شرما نے ایوان میں اکثریت نہیں ہونے کے باوجود واجپئی کو حکومت سازی کا موقعہ دیا۔ واجپئی نے حکومت بنائی مگر وہ ایوان میں ضروری اکثریت حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکے

بالآخر تیرہ دنوں کے بعد انہیں استعفیٰ دینا پڑا۔

اس کے بعد ۱۹۹۹ میں دوبارہ انتخاب ہوئے۔اس بار بھی کسی پارٹی کو واضح اکثریت نہیں ملی۔ بی جے پی دوبارہ سب سے بڑی پارٹی بن کر ابھری۔ اس کے بعد اس نے کمال ہوشیاری دکھاتے ہوئے وہ تمام متنازع مسائل جن کی بنیاد پر وہ ایوان میں سب سے بڑی پارٹی بن کر ابھری تھی ان کو کنارے کر دیا یعنی رام مندر، یونی فارم سول کوڈ اور دفعہ ۳۷۰ کی تنسیخ کو چھوڑ کر ایوان میں دیگر قومی اور علاقائی پارٹیوں سے وفاق کر کے نیشنل ڈیموکریٹک الائنس (این.ڈی.اے) بنا کر حکومت سازی کا تجربہ کیا جو بہت کامیاب رہا۔اس طرح پہلی بار ملک میں بی جے پی کی قیادت میں غیر کانگریس سرکار قائم ہوئی۔

واجپئی نے حکومت میں آنے کے بعد اپنی پارٹی کے نظریات میں کوئی تبدیلی نہیں کی لیکن خود کو ایک لبرل حکمراں کے طور پر پیش کیا۔انہوں نے در پردہ دستور کو بدلنے کی کوشش کی مگر اس وقت کے صدر جمہوریہ کے.آر. نارائنن اور سپریم کورٹ نے ان کی کوششوں کو ناکام کر دیا۔اپنی اس مہم میں ناکام ہونے کے بعد انہوں نے اپنے کیڈر کو پیغام دیا کہ جب تک ایوان میں انہیں واضح اکثریت حاصل نہیں ہوتی وہ اپنے خوابوں کا ہندوستان نہیں بنا سکتے ہیں۔

بی جے پی کا ووٹ بینک برہمن اور بنیا رہے ہیں۔ رام مندر مومنٹ میں شہری متوسط طبقہ اس کا حمایتی ہو گیا۔لہٰذا جب واجپئی کی قیادت میں حکومت بنی تو اس نے شہروں پر زور دیا اور انڈیا شائننگ کا نعرہ دیا۔ جب کہ بھارت آج بھی گاؤں کا دیش ہے اور ملک کی ستر فیصد آبادی گاؤں میں رہتی ہے۔لہٰذا جب فیل گڈ ماحول سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے وقت سے پہلے عام انتخابات کا اعلان کر دیا تو پانسہ پلٹ گیا اور ۲۰۰۴ میں ان کی حکومت ختم ہو گئی۔

سونیا گاندھی نے کانگریس کی قیادت اپنے ہاتھوں میں لے لی تھی۔اس کا زبردست اثر ہوا۔کانگریس کو اگر چہ ایوان میں واضح اکثریت نہیں ملی مگر حکومت سازی کا موقعہ ملا۔سونیا کے غیر ملکی ہونے کو لے کر بی جے پی نے بڑا ہنگامہ کھڑا کر دیا تھا۔لہٰذا سونیا نے کمال ہوشیاری

کا مظاہرہ کرتے ہوئے بالکل ایک غیر سیاسی شخصیت من موہن سنگھ کو وزیراعظم بنا دیا۔ اس طرح عملاً ملک کی کمان اپنے ہاتھوں میں لے لی۔ یہ حکومت یونائٹڈ پروگیسو الائنس (یو. پی.اے) کے نام سے قائم ہوئی جس میں بائیں بازو کی جماعتوں کے علاوہ بہت سی علاقائی پارٹیاں بھی شامل ہوئیں۔

من موہن سنگھ کی قیادت میں یو. پی.اے. کی حکومت دس سال تک چلی اور اس نے معاشی میدان میں ملک کو مستحکم کرنے میں اہم کردار نبھایا۔ اس کے باوجود کہ من موہن سنگھ بہت ہی ایماندار اور صاف ستھری شبیہ کے آدمی تھے خود کانگریس اور یو. پی.اے کی حلیف پارٹیوں کے لیڈران پر کرپشن کے سنگین الزامات لگے۔ دوسری طرف بڑھتی مہنگائی، بے روزگاری اور کسانوں کے مسائل نے ملک کے ایک بڑے طبقے کو کانگریس مخالف بنا دیا۔ رہی سہی کسر سنگھ پریوار کی ایما پر چلی کرپشن مخالف آندولن نے پوری کردی اور ایک نہایت ایماندار آدمی کی قیادت میں چلی ایک کامیاب سرکار اپنے ساتھیوں کی غلط کاریوں کی وجہ سے عوام کی نظر میں Discredit ہوگئی۔

اس بیچ بی جے پی نے گجرات کے وزیراعلیٰ نریندر دامودر داس مودی کو اپنا وزیراعظم کا امیدوار بنانے کا اعلان کیا۔ نریندر مودی نے اپنی سخت گیر ہندوتوادی شبیہ کے ساتھ کورپوریٹ ہاؤسز اور میڈیا کی مدد سے ایک لبرل اور آزاد معیشت میں ترقی اور خوشحالی کا ایسا خواب دکھایا جس سے مسحور ہوکر ان کے ووٹ بینک کے علاوہ دلت، آدی باسی اور نوجوانوں نے اس طرح ووٹ ڈالے کے بی جے پی ۲۰۱۴ میں واضح اکثریت کے ساتھ حکومت بنانے میں کامیاب ہوگئی۔ اس کے باوجود کہ اس کو ایوان میں واضح اکثریت مل گئی تھی، اس نے حلیف پارٹیوں کو ساتھ رکھا۔ بی جے پی کو صرف مرکز میں ہی نہیں بلکہ ۳۲ میں سے ۲۱ ریاستوں میں کہیں خود اور کہیں دوسری پارٹیوں کے ساتھ حکومت بنانے کا موقع ملا اس طرح ہندوستانی جھنڈے کا سفید اور ہرا رنگ غائب ہوگیا اور ملک کے دوتہائی حصہ پر بھگوا رنگ غالب آگیا۔

نریندر مودی نے جو دعوے اور وعدے کئے تھے اور ترقی اور وکاس کا جو خواب دکھایا

تھا ان میں سے کوئی بھی پورا نہیں ہوا۔ اس لیے عوام میں اس حکومت کے خلاف زبردست بے اطمینانی پائی جاتی ہے۔ لیکن ہندوستانی سیاست کی ایک خاص بات یہ ہے کے یہاں الیکشن کبھی حقیقی مسائل پر نہیں ہوتا بلکہ جذباتی ایشوز پر لڑے جاتے ہیں۔ ماحول کو اتنا جذباتی بنا دیا جاتا ہے کہ لوگ اپنے مسائل بھول کر اس سیلاب میں بہہ جاتے ہیں اور جس پارٹی اور حکومت سے ناراض ہوتے ہیں اسی کو ووٹ دیتے ہیں گویا جو سانپ کاٹتا ہے اسی کو دودھ پلاتے ہیں۔ اور اگر معاملہ ہندو مسلمان کا بنا دیا جائے تو کوئی بھی الیکشن جیتنا بہت آسان ہے۔ ۲۰۱۹ کے نتائج نے اس کو ثابت کر دیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ہندوستان فسطائیت کی جس ڈگر پر تیزی سے بڑھتا جا رہا ہے اس سے اس کو کیسے روکا جائے اور موجودہ حالات میں ہماری دفاعی اور اقدامی حکمت عملی کیا ہوگی؟ اس وقت ملک فسطائیت کی جس بلیٹ ٹرین پر سوار ہے اس کو ریورس گیئر میں ڈال کر پیچھے کی طرف نہیں چلایا جاسکتا۔ اِلاَّ یہ کے وہ خود کسی موڑ پر ایک ایسی جانب مڑ جائے جہاں جمہوریت، لبرلزم ساجھا وراثت، اور دستوری حقوق کا تحفظ شروع ہوتا ہو۔ اس کے لیے ہمیں کنٹرول روم کو اپنے ہاتھ میں لے کر ٹرین کو محفوظ اور پسندیدہ سمت اور پٹری پر لے جانے کی جدوجہد کرنی ہوگی۔ اگر ہم ٹرین کے سامنے آ کر اس کو روکنے کی کوشش کرینگے تو یہ حماقت اور ہلاکت ہوگی۔

اس وقت ہندوستانی مسلمان تاریخ کے انتہائی نازک موڑ پر کھڑے ہیں جہاں آگے کنواں اور پیچھے کھائی ہے۔ اس پرخطر مقام سے کیسے بہ عافیت آگے بڑھا جائے یہی اس وقت کا بلین ڈالر کا سوال ہے۔

ہمت ہار جانا، بزدلی دکھانا، سپر ڈال دینا، اپنی خودی اور خودداری سے باز آجانا اور اپنے ضمیر و ایمان کا سودہ کر لینا یہ کوئی حل نہیں ہے۔ اس سے تو موت بہتر ہے۔ پھر کوئی فرد یا کوئی چھوٹا سا گروہ تو یہ طرز عمل اختیار کرسکتا ہے لیکن اٹھارہ بیس کڑور پر مشتمل اتنی بڑی قوم ایسی ذلت آمیز زندگی گزارنے کا کوئی اجتماعی فیصلہ نہیں کرسکتی ہے۔ اسے ہر حال میں جہد و قربانی کی راہ اپنانی ہوگی اور اپنے مضبوط قوت ارادی، مسلسل محنت اور بیش بہا قربانیوں کے ذریعہ آگے

بڑھنے کا حوصلہ پیدا کرنا ہوگا۔

میرے خیال میں ہندوستان کے موجودہ حالات کا موازنہ قریبی طور پر ۱۸۵۷ کے بعد کے حالات سے کیا جاسکتا ہے جس وقت پوری قوم ہلا ماری گئی تھی اور اس پر عرصہ حیات تنگ کر دیا گیا تھا۔ اس کی جان، مال عزت، آبرو، دین، شریعت، ثقافت، زبان وتہذیب سب ملیا میٹ کر دیئے گئے تھے اور ایسا لگا تھا کہ ہندوستان سے مسلمانوں کا وجود مٹا دیا جائیگا۔

کارگاہِ حیات میں شکست و فتح اور عروج وزوال قوموں کا مقدر ہیں۔ دنیا میں کبھی کسی قوم کے حالات یکساں نہیں رہتے۔ قران کی گواہی موجود ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے صاف اعلان کیا ہے کہ ہم لوگوں کے درمیان وقت اور حالات کو الٹتے پلٹتے رہتے ہیں۔ لہٰذا اگر عروج ہے تو زوال بھی ہوگا اور اگر زوال ہے تو عروج بھی ضرور حاصل ہوگا۔ رات ودن کی گردش ہمیں روز یہی پیغام دیتی ہے۔ ہر کالی رات کے بعد ایک روشن دن نمودار ہوتا ہے۔ اس لیے اگر موسم خزاں ہے تو موسم بہار بھی دور نہیں۔ اس لیے شکست یہ نہیں ہے کہ ہم کوئی جنگ ہار گئے بلکہ اصلی شکست یہ ہے کہ ہم نے شکست تسلیم کر لی اور جیت کی جدوجہد ترک کر دی۔ دنیا جہد وعمل، صبر وصداقت اور علم وحکمت سے عبارت ہے۔ حالات چاہے جتنے سخت ہوں آزمائش چاہے جتنی بڑی ہو اگر ہم نے ہمت نہیں ہاری ہے تو دیر یا سویر حالات ضرور بدلیں گے۔ بس ہر وقت اور ہر حال میں امید کی شمع روشن رکھنی ہے۔

ایسا دنیا میں کہیں نہیں ہوا اور کبھی نہیں ہوا کہ کوئی قوم پوری کی پوری فنا کے گھاٹ اتار دی گئی ہو۔ دنیا کی تاریخ ظالموں کے ظلم سے بھری پڑی ہے اور ایسی ایسی خوں چکاں داستانیں سننے اور پڑھنے کو ملتی ہیں جن کو سن اور پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور ایک آدمی سوچ نہیں سکتا کہ ایسے بھی مظالم ہوئے ہوں گے۔ لیکن پھر وہ حالات بدلے اور وہ قوم دوبارہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ہمارے سامنے بنی اسرائیل کی مثال موجود ہے۔ قرآن گواہی دیتا ہے کہ فرعون نے انہیں کیسے ذلت آمیز حالات سے دوچار رکھا تھا۔ وہ ان کے بیٹوں کو قتل کروا دیتا تھا اور ان کی عورتوں کو زندہ رکھتا تھا۔ لیکن قرآن گواہی دیتا ہے کہ فرعون مٹ گیا اور وہ قوم ایک

آزمائشی مدت کے بعد پھر ابھری۔ قدیم تاریخوں میں ہمیں ایسی بے شمار مثالیں ملتی ہیں۔ ہم اس وقت اس تفصیل میں جانا نہیں چاہتے۔

ہماری قریب کی صدیوں یعنی ۱۹ ویں اور ۲۰ ویں صدی میں دنیا کے کئی ممالک میں ایسے ظالم اور سفاک حکمراں ہوئے ہیں جنہوں نے ظلم و بربریت کی انتہا کردی تھی۔ اس میں ہٹلر، موسلینی، اسٹالن، پول پاٹ اور ہیرو ہتو جیسے لوگوں کے نام مشہور ہیں جنہوں نے اپنی انا کی تسکین کے لیے اور انا ولا غیری کے جذبے کے تحت لاکھوں انسانوں کو گیس چیمبر میں ڈال کر، کنسنٹریشن کیمپ میں رکھ کر سائبریا کی برفیلی وادی میں ڈھکیل کر یا ان کو فائرنگ اسکوائڈ کے سامنے کھڑا کرکے ہلاک کردیا۔ مگر یہ سب کے سب فنا کے گھاٹ اتر گئے اور وہ قوم باقی رہی۔ پہلی اور دوسری جنگ عظیم میں کم وبیش دو کروڑ لوگ ہلاک ہوئے لیکن قومیں باقی رہیں۔

دنیا کی تاریخ وتہذیب اس بات پر گواہ ہے کہ قومیں طبعی طور پر فنا نہیں ہوتی ہیں اور نہ خارجی عوامل کی وجہ سے مٹتی ہیں۔ قوم اس وقت فنا ہوتی ہے جب اس کے عقائد مٹ جاتے ہیں اور اس کی زبان وتہذیب مٹ جاتی ہے، اس وقت اس کی پہچان گم ہو جاتی ہے اور وہ فنا کے گھاٹ اتر جاتی ہے۔ پھر تاریخ سے اس کا نام ونشان مٹ جاتا ہے۔ لہٰذا قومیں اپنی اندرونی وجوہات سے فنا ہوتی ہیں۔ مشہور تاریخ داں ٹوئن بی نے اسی بات کی تصدیق کرتے ہوئے اپنی کتاب ''تمدنوں کی تاریخ'' میں ایک الہامی جملہ لکھا ہے کہ کوئی قوم اور کوئی تہذیب ہلاک نہیں کی جاتی بلکہ وہ خودکشی کرتی ہے۔ اب اگر ہم خودکشی پر آمادہ ہیں تو کوئی ہمیں حیات نہیں دے سکتا اور اگر ہم زندہ رہنا چاہتے ہیں تو کوئی ہمیں مار نہیں سکتا۔ شہید کی موت قوم کی زندگی ہوتی ہے ہمیں یہ بات گرہ باندھ لینی چاہیے اور اسی جذبے سے تاریخ کا مطالعہ کرتے ہوئے حال اور مستقبل کی پیش بندی کرنی چاہیے۔

مسلمانوں نے ۱۸۵۷ کے بعد اپنے باقیات کو سمیٹا اور نئے حالات میں نئے انداز سے پیش بندی شروع کی۔ قوم جب اس طوفان بلا سے باہر نکلی تو اسے سمجھ آیا اب حکومت ہمارے ہاتھ سے جا چکی ہے اور حالات بالکل بدل چکے ہیں۔ محکومی اور مظلومی پوری طرح مسلط

ہے۔ فی الوقت یہی ہماری تقدیر ہے۔ اس میں اپنی بقا اور استحکام کی راہ تلاش کرنی ہے۔ اس وقت اسے سمجھ میں آیا کہ یہ وقت لال قلعہ اور تاج محل تعمیر کرنے کا نہیں ہے بلکہ تعلیمی ادارے قائم کرنے کا ہے۔ ایک طرف مولانا قاسم نانوتوی نے ۱۸۶۰ میں دیوبند میں دینی تعلیم کی ترویج کے لیے دارالعلوم قائم کیا تو دوسری طرف ۱۸۷۵ میں سرسید نے اینگلو محمڈن اورینٹل کالج قائم کیا جو ۱۹۲۰ میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بنا۔ یہ دونوں ادارے ہندوستان میں مسلم نشاۃِ ثانیہ کے باب میں میل کا پتھر ثابت ہوئے اور مسلمانوں کو نئی امید اور نئی روشنی سے روشناس کرایا۔

آزمائش سیلاب کی طرح آتی ہیں۔ ابھی آدمی ٹھیک سے سنبھلا بھی نہیں تھا کہ پانی کا ایک تیز بہاؤ آیا اور سب کچھ بہا کر لے گیا۔ ۲۰ ویں صدی کا آغاز جنگ عظیم اول سے ہوا۔ پھر ۲۰ ویں کی چوتھی دہائی کے اخیر میں جنگ عظیم دوم شروع ہوگئی۔ یہ وہ دور تھا جب ہندوستان میں جنگ آزادی تیز ہوگئی۔ شروع میں ہندو اور مسلمان دونوں شانہ بہ شانہ جہد آزادی میں شریک رہے۔ وقت کی سیاست نے کروٹ بدلا۔ دو حلیف قومیں حریف خیموں میں بٹ گئیں۔ آپس میں مارکاٹ شرع ہوگئی۔ حالات اتنے بگڑے کہ ملک جب آزاد ہوا تو اس کے دو ٹکرے ہوگئے۔ ایک بار پھر مسلمانوں کے پاؤں اکھڑنے لگے اور وہ ایک زبردست گرداب میں دھکیل دئے گئے۔ اس کے بعد جو حالات پیدا ہوئے اس کا ذکر اوپر گذر چکا ہے۔

ہم اس وقت اس موڑ پر کھڑے ہیں جہاں ہمیں فسطائیت کا دیو ہیکل پورے کا پورا نگل جانا چاہتا ہے۔ یہی وہ وقت ہے جس میں ہمیں اپنے حواس درست رکھنے ہیں۔ ہمت نہیں ہارنی ہے، ہار نہیں ماننی ہے، صبر و حکمت سے کام لینا ہے۔ اتحاد اور تعاون کی فضا پیدا کرنی ہے۔ اپنے انسانی وسائل کی حفاظت کرنی ہے اس میں علم و ذہانت کے جوہر بھرنے ہیں۔ اس کے اندر فولادی عزائم کی آبیاری کرنی ہے ان کو منظّم کر کے پرامن اور صبر آزما جدوجہد کے لیے آمادہ کرنا ہے۔ علم، صبر، محبت، خدمت، خیر سگالی کے اعلیٰ صفات سے متصف ہو کر جہاد زندگانی میں قدم رکھنا ہے اور جب تک حالات نہیں بدل جاتے اپنی جدوجہد جاری رکھنی ہے۔ آزمائش آئے گی اور آزمائش ہمارا مقدر ہے۔ مایوسی کفر ہے۔ گھٹا ٹوپ اندھیرے میں بھی امید کی شمع

روشن رکھنی ہے۔

ہم اس وقت اکیسویں صدی میں ہیں۔موجودہ صورتحال کا مقابلہ ماضی کے کسی دور اور کسی حالت سے نہیں کیا جاسکتا۔ نہ قدیم ہندوستان سے نہ عہد وسطیٰ سے اور نہ عہد برطانیہ سے۔۱۹۴۷ کے بعد کا ہندوستان بالکل نیا ہندوستان ہے،لہٰذا ماضی کا کوئی ماڈل،کوئی تجربہ اور کوئی طرزِعمل ہمارے لیے لائقِ عمل اور مفید نہیں ہوگا۔ شاذو نادر بعض واقعات اور بعض معاملات سے کچھ روشنی اور ہدایت مل سکتی ہے مگر اس پر پوری طرح تکیہ نہیں کیا جاسکتا ہے،یہ بالکل نادر حالات ہیں جس پر آؤٹ آف باکس جا کر سوچنا ہوگا اور ایک نئ حکمت عملی کے ساتھ کام کرنا ہوگا۔اس میں ہمیں منفی اور مثبت دونوں طریق عمل اختیار کرنے ہوں گے۔مسلمان اس وقت منتشر الخیال لوگوں کا مجموعہ ہیں۔ایک طرف ہماری غالب اکثریت ہے جو انتہائی غربت اور جہالت کی زندگی گزار رہی ہے اور تمدنی وتہذیبی لحاظ سے بالکل پسماندہ بلکہ اکثریتی گروہ کی پسماندہ ترین اکائیوں کے ہم پلہ ہے جس کو اپنے وجود وحالات کا کوئی شعور نہیں ہے۔ دو وقت کی روٹی فراہم کرنا اور کسی طرح اپنے بچوں کا پیٹ بھرنا اس کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ ہے۔لہٰذا دن رات کی سخت محنت کے بعد بھی اس کی بنیادی ضروریات پوری نہیں ہوتیں۔ حالات کا مقابلہ کرنا اور ملت کے مستقبل کے بارے میں سوچنے کا نہ اس میں شعور ہے اور نہ اس کی فرصت۔ضرورت ہے کہ ان کے مسائل سے ہمدردی رکھتے ہوئے ان سے جڑا جائے اور ان کو جوڑا جائے اور ان کو غربت و جہالت کے اندھے کنویں سے باہر نکالا جائے۔

جب تک ہم ملت کے سوادِاعظم کو جوڑ کر ان کو آگے نہیں لائیں گے اس وقت تک ہمارے حالات نہیں بدلیں گے کیونکہ ہندوستان میں موجودہ مسلمان ملت غریب اور پسماندہ برادریوں کے مجموعہ کا نام ہے۔کسی جمہوری ملک میں جمہوری جدوجہد کے ذریعے ہی عوام کے مسائل حل کئے جاسکتے ہیں۔اس جدوجہد میں عوام کی شمولیت ضروری ہے۔لہٰذا ہماری پہلی حکمت عملی اپنی پسماندہ آبادیوں کو غربت و جہالت سے باہر نکالنا ہے اور ان میں اتفاق اور اتحاد پیدا کر کے اپنے انسانی اور جمہوری حقوق کے لیے جدوجہد پر آمادہ کرنا ہے۔

ہماری آدھی آبادی خواتین پر مشتمل ہے اور ہم نے انہیں بڑی حد تک عضو معطل بنا کر رکھا ہے۔ کوئی قوم آج کے دور میں اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتی جب تک اس کی خواتین میں تعلیم عام نہ ہو اور انہیں زندگی کے جملہ معاملات میں پوری حصہ داری نبھانے کا موقع نہ دیا جائے۔ مسلمانوں نے روایتی طور پر خواتین کو کمزور اور کمتر سمجھ کر ابھی تک ان کو اجتماعی معاملات میں شریک کرنے اور آگے آنے کا موقع نہیں دیا ہے۔ ماضی میں اس کے تمدنی وجوہات رہے ہوں گے اب جبکہ موجودہ صدی میں پورا چوکٹھا تبدیل ہو گیا ہے اس لیے اگر ہم اب بھی ماضی کی روایت پرست اور رجعت پرست معاشرہ کا اتباع کرتے ہوئے لکیر کے فقیر بنے رہیں گے تو گویا ہم اپنے ہاتھ سے اپنے پاؤں پر کلہاڑی مار لیں گے۔ اس کے بعد اگر ہم مفلوج ہو جاتے ہیں تو اس کا الزام دوسروں پر نہیں دیا جا سکتا۔ طرز کہن پہ اڑنا اور آئین نو سے ڈرنا یقیناً قوموں کی تاریخ میں ایک کٹھن مرحلہ ہے مگر اس مخمصے سے ہم کو باہر آنے کی ضرورت ہے۔ خواتین کی تعلیم، آزادی، اختیار اور شرکت وشمولیت کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ انہیں اسلام سے باغی بنا دیا جائے یا ان کو اسلامی تعلیمات اور اسلامی اقدار توڑ کر اور چھوڑ کر آگے بڑھایا جائے بلکہ پچھلی چودہ صدیوں میں اسلامی تعلیمات پر جو گرد وغبار جمع ہو گئے ہیں اور غیر صحت مند روایات نے انہیں جس طرح محبوس ومحصور کر رکھا ہے اس ماحول سے ان کو نکالا جائے۔ اس کے مقابل قرآن وحدیث کی تعلیمات کی روشنی میں جدید حالات اور تقاضوں کے تحت ایک صحت مند اور محفوظ ماحول میں ان کو اپنی شخصیت، صلاحیت اور رول وکردار کو تعین کرنے کے مواقع اور آزادی فراہم کی جائے تا کہ ان کی اجتماعی قوت اور صلاحیت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ملت کی بقا اور استحکام میں ان کو پوری طرح شریک کرتے ہوئے آگے کا لائحہ عمل طے کیا جا سکے۔ بقول اکبر الہ آبادی مرد کی عقلوں پر جو پردہ پڑا ہوا ہے وقت آ گیا ہے کہ اس کو ہٹا کر کھلے دل ودماغ سے حالات اور ماحول کا مثبت اور معروضی انداز سے جائزہ لے کر ایک قابل عمل حکمت عملی تیار کی جائے۔

آج سے ڈیڑھ سو سال پہلے حالی نے اپنے مسدس میں لکھا تھا بچے آوارہ اور بے کار

جوان ہیں، ایسے گھرانے کوئی دن کے مہمان۔ اس وقت مسلمان ایک نوجوان ملت ہے۔ 0-45 سال کی عمر کے لوگ مسلمانوں میں کم و بیش ۸۶٪ ہیں جن میں ۱۹-۰ سال کے ۴۶٪ ہیں اور ۴۵-۲۰ سال کی عمر کے ۴۰٪ ہیں ان کی تعلیم، اخلاقی اور اسلامی تربیت، صحت اور روزگار میں بہتری کیے بغیر ملت کے اچھے مستقبل کی بات کرنا ایک خام خیالی ہوگی۔ یہ ہمارے سب سے قیمتی انسانی وسائل ہیں۔ جن کی آبیاری کے بغیر ہم موجودہ ذلت وشکست سے باہر نہیں آسکتے۔ قوموں کی تقدیر ماں کی گود اور کلاس روم میں سنواری جاتی ہے۔ لہٰذا اپنے انسانی وسائل کو بہتر تعلیم سے آراستہ کرنا ہے تاکہ وہ اپنے علم و ذہانت اور محنت ولگن کے بل پر تمام تر نامساعد حالات اور رکاوٹوں کے باوجود آگے بڑھنے کے اہل ہوسکیں۔ دوسری طرف انہیں صحت اور جسمانی قوت کے اعتبار سے بھی مضبوط اور توانا بنانا ہے تاکہ ان کے اندر محنت اور سخت کوشی کی صلاحیت پیدا ہو اور وہ پرعزم ہوکر بناڈرے آگے بڑھنے کا ہنر پیدا کریں۔ تیسری طرف انہیں اچھے اخلاق اور مہذب اطوار سے آراستہ کرنا ہے تاکہ وہ فضولیات اور غیر اخلاقی عادات و معاملات سے محفوظ رہتے ہوئے زندگی کے جملہ میدانوں میں علم و ذہانت، صحت و طاقت اور اچھے اخلاق و کردار کے ساتھ آگے آئیں اور حالات و ماحول پر مثبت اثرات مرتب کرتے ہوئے انہیں اپنے حق میں ہموار کرنے کا داعیہ پیدا کریں۔

یہ ہمارا اندرونی محاذ ہے جس پر ہمیں سب سے زیادہ توجہ دینی ہے۔ اگر ہم نے ٹائم باؤنڈ پروگرام بنا کر اس جانب پیش قدمی کی تو اس وقت ہم جس پس ماندگی، بے وقعتی اور ذلت ونکبت میں گرفتار ہیں اس سے باہر نکل کر آزاد اور استحقاق کے ماحول میں اپنا مثبت کردار ادا کرپائیں گے۔

مسلمانوں میں ہمیں کئی طرح کے لوگ ملتے ہیں۔ انہیں اسکول آف تھاٹ کہنا تو غلط ہوگا کیوں کہ ان کا طرز عمل کسی مضبوط سوچ کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ قنوطیت اور مایوسی کے نتیجہ میں پیدا طرز عمل ہے۔ ایک وہ لوگ ہیں جنہوں نے حالات کے سامنے پوری طرح سپر ڈال دیا ہے، اپنی شناخت اور انفرادیت گم کر کے خالص مالی وجوہات سے اور ڈر کر بہت تھوڑے سے

فائدے کے لیے اپنا دین وایمان بیچ دیا ہے اور اپنے اندر خوئے غلامی پیدا کر لی ہے۔ یہ وقت شناس، حالات شناس اور ابن الوقت قسم کے لوگ ہیں جو ہر دور ہر زمانے میں رہے ہیں۔ اس دور اور اس زمانے میں بھی ہیں لیکن ان کی تعداد زیادہ نہیں ہے۔

ایک دوسرا گروہ ہے جس نے حالات اور زمانے کی پرواہ کئے بغیر اپنے آپ کو تمام تر معاملات ومسائل سے بالکل الگ تھلگ بلکہ غیر متعلق رکھ کر خود کو ایک خول میں بند کر لیا ہے اور عالم بےخودی میں اپنے دن رات گذار رہا ہے۔ یہ دنیا پرست اور جاہ پرست لوگ نہیں ہیں بلکہ دیندار لوگ ہیں۔ مگر انکا تصور دین اتنا محدود ہے کہ انفرادی طور پر تو اچھے لگتے ہیں مگر اجتماعی معاملات میں ان کی نیکی اور دینداری اس پھٹے ہوئے بوسیدہ شامیانے کی طرح ہے جو نہ دھوپ سے بچاتا ہے اور نہ پانی سے۔ ہمارے درمیان دینداروں کی ایک بڑی تعداد اسی قبیل سے تعلق رکھتی ہے۔

مسلمانوں میں ایک تیسرا گروہ ہے جس کو پتہ نہیں کہ ملک کی تاریخ اور اس کا جغرافیہ بدل چکا ہے۔ وہ آج بھی ازمنہ وسطیٰ اور برٹش عہد سے باہر نہیں نکلا ہے اور پوری طرح Reactionary ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کو علم وحکمت اور عقل وذہانت چھو کر نہیں گذری۔ ان میں کچھ تو وہ ہیں جو مسند ارشاد پر فائز ہیں اور انہیں یہ منصب وراثت میں ملا ہے اور کچھ لوگ ان کی صحبت اور تربیت کے پروردہ ہیں۔ یہ عناصر غیر محسوس طور پر فسطائی طاقتوں کے آلہ کار بن گئے ہیں۔ کیونکہ فسطائی عناصر ان کے اقوال واقدام کو جواز بنا کر ملک میں فرقہ وارانہ ماحول کو گرمانے اور حالات کو بگاڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس وقت اسلام اور مسلمانوں کو جتنا نقصان دانا دشمنوں سے نہیں پہنچ رہا ہے اس سے کہیں زیادہ نقصان نادان دوستوں کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ یہ Reactionay forces رجعت پسند اور دہقانی ذہنیت رکھتے ہیں اور اپنے مزاج کے اعتبار سے Status quoist ہیں۔ حالات اور مسائل کا حکمت ودانائی سے مقابلہ کرنے کے بجائے بغیر اپنی طاقت کو تولے اور کسی تیاری کے ہر کسی سے دو دو ہاتھ کر لینے پر آمادہ ہوتے ہیں۔ ان کی مثال اس ڈون کیوزوٹ کی طرح ہے جو ناک کی سیدھ میں چلنے کی

ضد کی وجہ سے بجلی کے کھمبے سے ٹکرا کر اپنی ناک توڑ لیتا ہے۔

ہمیں یہ بات اچھی طرح نوٹ کر لینی ہوگی کہ اس وقت ہندوستان میں نہ مسلمانوں کی حکومت ہے اور نہ برطانوی حکومت ہے۔ اس لیے اب تیسری طاقت (Third party inter vention) کی مداخلت کا دور ختم ہو چکا ہے۔ اس وقت بھارت میں دستوری جمہوریت ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ بھارت میں ہندو غالب اکثریت ہیں مگر دستوری طور پر بھارت کوئی قومی مذہبی ریاست نہیں ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ ہندو راشٹر یہ نہیں ہے جہاں ہندو دھرم کی حکمرانی ہو بلکہ یہ ایک کثیر قومی سیکولر سوشلسٹ عوامی جمہوریہ ہے جہاں ہر فرد اور ہر مذہب کو دستوری طور پر مکمل اور برابر کے حقوق حاصل ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ اکثریت کے غالی عناصر جو جارح فرقہ پرستی اور فسطائیت میں یقین رکھتے ہیں وہ ملک کے نظام اور دستور کو بدلنا چاہتے ہیں اور اس ملک کو ہندو راشٹر بنانا چاہتے ہیں جہاں اقلیتوں کے وجود کی نفی کرتے ہوئے اور ان کو تمام شہری حقوق سے محروم کرتے ہوئے ان کو دوسرے درجہ کا شہری بنانے کی کوشش کی جارہی ہے۔

جس طرح مسلمانوں میں بہت سے گروہ اور طبقات ہیں، اسی طرح ہندوؤں میں بھی بہت سے گروہ اور طبقات ہیں جو الگ الگ فکر اور نظریہ کے حامل ہیں۔ ہندوؤں کی غالب اکثریت ہندوتوادی سوچ کی مخالف ہے۔ ہندوستان میں سیکولرزم نہ مسلمانوں کی وجہ سے قائم ہے اور نہ مسلمان اس کو قائم رکھ سکتے ہیں۔ ہندوستان میں سیکولرزم اس وجہ سے ہے کہ ہندوؤں کی اکثریت، سنگھ پریوار کو چھوڑ کر، سیکولرزم کے حق میں ہے اور وہی اس کو قائم رکھ سکتے ہیں۔ ہم ان کے معاون اور حلیف ہو سکتے ہیں۔

ہندوستان میں جمہوریت عوام کے ووٹ سے چلتی ہے۔ سنگھ پریوار کا پورا زور اس بات پر ہے کہ ہندوؤں کو سماجی، تہذیبی اور سیاسی طور پر اس طرح گول بند کر دیا جائے کہ جمہوری طریقے سے اس ملک میں ایسی حکومت قائم ہو جائے جو ملک کے موجودہ دستور اور سیکولر ڈھانچے کو بدل دے۔ لہٰذا اس وقت وسیع تر ہندو سوسائٹی سے بے تعلق ہو کر الگ تھلگ رہ کر

تمام سماجی اور ثقافتی رشتے کو توڑ کر ایک خول میں بند کر لینا خودکشی ہوگی۔ اس لیے جہاں ایک طرف ہمیں اپنی ملت میں ربط و اتحاد کی فضا پیدا کرنی ہے وہیں دوسری طرف وسیع تر ہندو سماج سے اس کے پرامن، خیر پسند، رواداری اور اقدار انسانی پر یقین رکھنے والے لوگوں سے خود کو جوڑنا اور ان سے جڑ کر آگے بڑھنا صحیح حکمت عملی ہے۔ بلکہ عام ہندو سماج سے ہم جس گاؤں، شہر، محلے اور علاقے میں رہتے ہیں ان سے وسیع تر انسانی بنیادوں پر تعلق بڑھانا اور مضبوط کرنا ہی صحیح پالیسی ہوگی جو دور رس نتائج پیدا کرے گی۔ اس کام کو ہم جتنا بڑے اور موثر پیمانے پر کرنے کو تیار ہوں گے اتنا ہی ہمارے لیے بہتر ہوگا۔

ہندوستان ہمارا وطن ہے۔ اس سے محبت رکھنا، اس کی وفاداری کرنا اور یہاں کے لوگوں کا بھلا چاہنا ہمارا ایمانی اور انسانی فریضہ ہے۔ اللہ کے رسول نے فرمایا جو تمہارا حق نہ دے تم اس کا حق دو جو تم سے کٹے تم اس سے جڑو اور ہر حال میں انصاف پر قائم رہو۔ ہندوستان میں یہی فرمان رسول ہماری سماجی سیاست کی بنیاد ہوگی جس کو اپنا کر ہمیں اس ملک کی تصویر اور تقدیر بدلنے کا دم خم پیدا کرنا ہے۔

دنیا میں کوئی مقصد بغیر جدو جہد اور قربانی کے نہ کبھی حاصل ہوا ہے اور نہ اب حاصل ہوگا۔ اکیسویں صدی میں ہمیں ہتھیار سے نہیں حکمت سے لڑنا ہے اور ذوق یقیں پیدا کرنا ہے۔ یہی چیز ان زنجیروں کو کاٹ سکتی ہیں جس میں ہم اس وقت جکڑے ہوئے ہیں۔ اگر مسلمانوں کے نقطہ نظر سے پچھلی تین سو سالہ تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو بقول اقبال ہم پر تین سو سال سے ہند کے میخانے بند ہیں اور وقت گزرنے کے ساتھ ہم روز بروز پست بہ دیوار ہوتے ہوئے پشت بہ دیوار ہو چکے ہیں۔ اس پر بھی لوگ ہمارا پیچھا نہیں چھوڑ رہے ہیں اور ہمارے بچے کھچے آثار و باقیات کو بھی ختم کر دینا چاہتے ہیں۔ مینائے منزل میں جو ذرا سی درد تہ جام ہے اس کو بھی حرام کرنے کا فتوی دیا جا رہا ہے۔ اس وقت ہندوستان میں مسلمان بنے رہنا جہاں ہمارے لیے سب سے بڑا چیلنج ہے وہیں بے شمار مواقع بھی پیدا کرتا ہے۔ ہمیں دونوں پہلوؤں پر دھیان دیتے ہوئے آگے بڑھنا ہے۔ یہی اکیسویں صدی کا پیغام ہے۔ زیر نظر کتاب اسی

مرکزی فکر کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہے۔ یہ کوئی مبسوط اور مستقل تصنیف نہیں ہے بلکہ یہ چند مہماتی مقالات کا مجموعہ ہے۔ میں پچھلے پچاس سال سے پبلک لائف میں ہوں۔ اس دوران میں نے ملک اور بیرون ملک میں ہزاروں تقریریں کی ہیں اور سینکڑوں مقالات لکھے ہیں جو ہندوستان کے اور ملک کے باہر بہت سے اخبارات و جرائد میں شائع ہوتے رہے ہیں۔

اس کتاب میں جو مقالات شامل ہیں وہ پچھلے چالیس سالوں میں بالخصوص شاہ بانو اور بابری مسجد کے انہدام کے بعد جو حالات اور مسائل پیدا ہوئے اور جو ایشوز زیر بحث آئے ان کو دھیان میں رکھ کر لکھے گئے ہیں۔ اس مجموعہ میں شامل بیش تر مقالات وہ ہیں جو ملک کے کسی حصے اور فورم میں منعقد سیمنار اور سمپوزیم میں پڑھے گئے یا لکچر کے طور پر پیش کئے گئے انہیں ضروری حذف و اضافہ کر کے یہاں شائع کیا جارہا ہے۔ ان مقالات میں بعض باتوں کی آپ کو تکرار لگے گی کیونکہ یہ مختلف وقتوں میں اور مختلف سامعین کے سامنے پیش کئے گئے تھے تاہم ہر جگہ اس کو ایک نئے انداز میں پیش کیا گیا ہے اس لیے تکرار کے باوجود آپ بور نہیں ہوں گے بلکہ اس سے آپ کو انبساط ہی حاصل ہوگا اور آپ کی فکر کو جلا بھی ملے گا۔

اس مجموعہ میں کل اٹھارہ مضامین ہیں جن کو آسانی کے لیے چار بڑے ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔

باب اول میں پانچ مضامین ہیں جن کا مرکزی نکتہ نئی صدی کا چیلنج اور مسلمان ہیں۔
باب دوم میں تین مضامین ہیں جس میں کمیونل ہارمونی اور وسیع تر انسانی سماج سے بہتر سماجی اور انسانی رشتوں پر زور دیا گیا ہے۔ اس میں خاص بات یہ ہے کہ اس مسئلے پر خالص اسلامی تعلیمات کی روشنی میں گفتگو کی گئی ہے۔ باب سوم میں ملت، ملی قیادت، ملی سیاست، ملی ایشوز، مسلمانوں کی سیاسی حصہ داری اور سیاسی منظر نامے نیز ریزرویشن جیسے سماجی مسائل پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔ باب چہارم میں جن ایشوز اور معاملات میں مسلمانوں کو کارنر کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور جس کو مسلمان کے وجود و شناخت پر حملہ کہا جاسکتا ہے جیسے دہشت گردی، اردو زبان اور مدارس اسلامیہ ان پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

یہ تمام مضامین کافی غور و مطالعہ اور بڑی محنت اور جانکاری کے ساتھ اس جذبے سے لکھے گئے ہیں تاکہ ہمارے سوچنے سمجھنے والے لوگوں بالخصوص پڑھے لکھے نوجوانوں کے سامنے پوری بات مثبت، تعمیری، غیر جذباتی مگر ترغیبی انداز میں آجائے تاکہ ملت کی جو ناؤ اس وقت بھنور میں پھنسی ہے اس کو ہم سب مل جل کر باہر نکالیں۔ میں بساط بھر اپنے حصہ کی ذمہ داری نبھانے کے لیے آمادہ ہوں اقبال کے الفاظ میں اللہ سے دعا ہے۔

میرا دل میری رزم گاہ حیات　　گمانوں کا لشکر یقین کا ثبات
یہی کچھ ہے ساقی متاع فقیر　　اسی سے فقیری میں میں ہوں امیر
میرے قافلے میں لٹا دے اسے
لٹا دے ٹھکانے لگادے اسے

کسی کتاب کی تالیف کوئی آسان کام نہیں ہوتی بلکہ برسوں کے مطالعہ اور غور و فکر کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اس کتاب کی تالیف میں میں نے جن جن صاحبان علم و فکر سے استفادہ کیا ہے یا ان کی کتابوں سے فائدہ اٹھایا ہے ان کا ذکر کرنا ناممکن ہے کیونکہ ان کی تعداد سینکڑوں میں ہے۔ لہٰذا ان تمام اصحاب علم و فن کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ میں اپنے رفیق صدیق جناب ڈاکٹر فاروق احمد صدیقی کا بے حد ممنون ہوں جنہوں نے اس مسودہ کو بغور پڑھا اور زبان و بیان میں جہاں جہاں سقم تھا اس کو دور کرنے میں میری مدد کی۔ میں اس کتاب کے کمپوزر مولانا محمد آصف اقبال قاسمی امام زکریا کالونی مسجد کا بھی شکر گزار ہوں کہ بڑی محنت سے انہوں نے کمپوزنگ کا کام کیا اور کوشش کی کہ اس میں کمپوزنگ کی کوئی خامی نہ رہے۔

بڑی ناسپاسی ہوگی اگر میں اہل خانہ کے گوناگوں تعاون کا تذکرہ نہ کروں۔ سب سے پہلے میں اپنی شریک حیات محترمہ راشدہ ناہید (ام۔اے۔بی ایڈ) کا شکر گزار ہوں جنہوں نے ہر نرم و گرم حالات میں میرا ساتھ دیا، ہمت افزائی کی اور مجھے بہت حد تک گھریلو ذمہ داریوں سے فارغ رکھا تاکہ میں بے فکر ہو کر علمی اور سماجی کام جو میرے بس میں ہیں کرسکوں۔ آج میں جس مقام پر ہوں اس میں ان کے تعاون اور نگہداشت کا بڑا دخل ہے۔ بقول شاعر:

اے جان ! اگرتم ساتھ نہ دو
تو تنہا مجھ سے کیا ہوگا

میں اپنے صاحبزادے خالد کمال رومی (آئی۔آئی۔ایم) کا بھی بے حد ممنون ہوں جو اپنے والد سے بے پناہ محبت رکھتے ہیں اور ہر وقت اس بات کے لیے کوشاں رہتے ہیں کہ میری فکر زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچے۔ یہ میری تحریروں کے اولین قاری اور ناقد ہیں۔ ان کے تبصروں اور مشوروں سے میری تحریر زیادہ معتبر اور موثر ہو جاتی ہے۔ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ صالح نوجوان ہیں جو اپنے قبیلے کے ذہن و مزاج سے واقف ہیں۔ لہٰذا نوجوانوں کے ذہن و نفسیات کو جاننے اور سمجھنے میں میری مدد کرتے ہیں۔

میں اپنی بیٹی ڈاکٹر ایمن کمال (ام۔ بی۔ بی۔ ایس) کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں جس کی باتوں سے مجھے کام کرنے کا حوصلہ ملتا ہے۔ میرے بچے میری زندگی کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ اللہ انہیں سلامت رکھے اور ہر طرح کی آفات سے محفوظ رکھے۔ (آمین)

میں اپنی بیٹی نما بہو عزیزی سیدہ ضوفشاں زریں زفیر (آئی۔آئی۔ایم) کا بھی بے حد ممنون ہوں جن کی نیک خواہشات ہمیشہ میرے ساتھ رہتی ہیں اور مجھ سے بے پناہ محبت اور احترام سے پیش آتی ہیں اور میرے بیٹے کی طرح ان کی بھی یہ خواہش رہتی ہے کہ میری فکر زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچے۔

میں اپنے داماد ڈاکٹر اکرم عیاض (آرتھوپیڈک سرجن) کا بھی بے حد ممنون ہوں جن کے طبی مشورے مجھے قابل کار رکھنے میں معاون ہوتے ہیں، سب سے زیادہ میں اپنے ڈیڑھ سال کے نواسے ایان اکرم عیاض کا شکر گزار ہوں جس کی موجودگی نے میرے گھر کو گلزار بنا رکھا ہے۔ 23 مئی 2019 کو میرے بیٹے کے گھر ایک نئے مہمان کی آمد ہوئی جن کا نام سید شاذ خالد رکھا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان دونوں بچوں کو حیات وصحت دے اور یہ دونوں ملت کے لیے اور پوری انسانیت کے لیے نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوں۔ لہٰذا میں اپنی ان تحریروں کو اپنی آئندہ نسلوں کے نام معنون کرتا ہوں۔

اللہ نے مجھے ایک بھرا پرا گھر دیا ہے۔نہایت باصلاحیت اور صالح اولاد دیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ سبھوں کو اپنے حفظ وامان میں رکھے اور زندگی میں ایمان وصحت اچھے اخلاق اور کردار کے ساتھ سرسبز بنائے اور اعلیٰ سے اعلیٰ مقام پر فائز کرے اور اللہ تعالیٰ ہمارے اس چمن کو ہمیشہ شاداب رکھے۔(آمین)

اس کتاب میں جو مقالات شامل کئے گئے ہیں وہ محض ذہنی کشتی نہیں ہے بلکہ اس میں خون جگر اور سوز دروں شامل ہے۔ یہ ملت کو موجود ذلت ونکبت، پسماندگی اور کسمپرسی سے نکال کر ایک باوقار اقدامی کردار ادا کرنے کی ترغیب بھی ہے۔ میں نے کوئی روڈ میپ پیش نہیں کیا ہے لیکن اہم تنصیبات کی نشاندہی ضرور کردی ہے جو ایک واضح راستے کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔انشاءاللہ آئندہ تحریروں میں ایک مکمل روڈ میپ بھی پیش کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

اکیسویں صدی میں اپنے نوجوان عزیزوں کو یہ پیغام دیتا ہوں کہ۔

بڑھے جا یہ کوہ گراں توڑ کر
طلسم زماں ومکاں توڑ کر

اور اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ:

جوانوں کو سوز جگر بخش دے
میرا عشق میری نظر بخش دے

ابوذر کمال الدین

باب اول

- نئی صدی کا چیلنج اور مسلمان
- امت مسلمہ کا مستقبل، ہدف، چیلنجز اور ترجیحات
- بند گلی سے آگے کی راہ

نئی صدی کا چیلنج اور مسلمان

بیسویں صدی گذر چکی ہے اور اکیسویں صدی کا آغاز ہو چکا ہے۔ دنیا کی تمام قومیں اور ممالک اپنے اپنے نقطۂ نظر سے نئی صدی کے استقبال کے ساتھ ساتھ آنے والے چیلنجز کا جائزہ لیتے ہوئے اس کے مقابلے کی تیاری کر رہے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس وقت مسلمان کہاں کھڑے ہیں اور کیا سوچ رہے ہیں؟ وقت ایک بہتے ہوئے دریا کی مانند ہے جسے آپ کسی پن روک خانہ (water-tight compartment) میں تقسیم نہیں کر سکتے۔ وقت کے بہاؤ کو روکا بھی نہیں جا سکتا ہے۔ آپ کے پاس اس معاملہ میں دو ہی اوپشن (Option) ہیں یا تو وقت کے آگے چلئے تو آپ پیش رو (Forward) کہلائیں گے، یا وقت کے ساتھ چلئے تو آپ جدید (Modern) کہلائیں گے۔ اگر آپ وقت کے ساتھ نہیں چلیں گے تو پیچھے رہ جائیں گے اور پسماندہ (backward) کہلائیں گے۔ اگر آپ نے نادانی میں وقت کی رفتار کو روکنے کی کوشش کی تو وقت کا بھاری بھرکم پہیہ آپ کو کچلتا ہوا آگے نکل جائے گا اور آپ قصۂ پارینہ ہو جائیں گے۔

وقت کی رفتار کے ساتھ چلنے یا آگے چلنے کا کیا مفہوم ہے؟ اس کا ایک مفہوم تو یہ ہے کہ بڑھو تم اُدھر کو ہوا ہو جدھر کی۔ یعنی اپنی کشتی کو سمندر کے بہاؤ کے رخ پر کر دو اور وہ جہاں جا کر رکے اسے ہی ساحل مراد مان لو۔ عقائد و اقدار سے عاری، بے سمت و بے مقام محض

آسانی کی غرض سے کشتی کو ہوا کے رخ پرڈال دیناجہالت اور نادانی ہے۔ اپنے عقائد اوراخلاق کا جامہ اتار کر غالب اقوام کی نقالی میں اپنی تہذیبی روایات کومسمار کر کے آگے بڑھناوقت کے آگے چلنانہیں ہے۔ بلکہ یہ شکست خوردگی ہے۔ جسے ترقی معکوس کہاجائے گا۔ اس لیے نئی صدی کی دہلیز پر کھڑے ہوکرہمیں سنجیدگی سے سوچنااور فیصلہ کرنا ہے کہ ہم کس طرح وقت کوہموار اور ہم نوا بنا کراس کے ساتھ اوراس کے آگے چل سکتے ہیں؟

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اکیسویں صدی میں ہمارے لیے کیا چیلنجز ہیں اور ہم کس طرح ان کا مقابلہ کر سکتے ہیں؟ جیسا میں نے پہلے عرض کیا وقت ایک سیل رواں ہے جس کا تجزیہ(Analysis) تو کیا جاسکتا ہے تقسیم(Classify) نہیں کیا جاسکتا۔ ماضی کولوگ بعض وسیع عوامل(Broad Parameters) کی بنیاد پر کئی خانوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ لیکن حال کواس طرح تقسیم کرنا ممکن نہیں ہے۔ اس لیے اس پر پوری جامعیت کے ساتھ غور کرنا ہوگا اور پورے کینوس کو ذہن میں رکھ کرایک جامع منصوبہ تشکیل دینا ہوگا۔ اکیسویں صدی میں ہمارے سامنے دوطرفہ چیلنج ہے۔

(۱) ماضی کا ورثہ (Legacy of the Past) اور

(۲) حال کا چیلنج (Challenge of the present)

یوں تو تمام صدیاں حادثات، واقعات اورانقلابات سے پُر رہی ہیں۔ لیکن بیسویں صدی میں جتنے حادثات، واقعات اورانقلابات رونما ہوئے ہیں اور جس تیزی کے ساتھ ہوئے ہیں، ماضی میں کبھی اس سرعت ورفتار سے نہیں ہوئے۔ ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ ماضی بعید میں انسانی سوسائٹیاں غیر متصل اکائیوں(Detached Units) کے طور پر تھیں۔ اس لیے اگر کوئی واقعہ کہیں رونما ہوتا تھا تواس کے اثرات مقامی اوروقتی ہوتے تھے۔ زیادہ تر صورتوں میں عالمی برادری اس سے ناواقف رہتی تھی یااس کے بہت کم اثرات پڑتے تھے۔ بیسویں صدی میں ترسیل اور ذرائع ابلاغ میں جوبیش بہا ترقیاں ہوئی ہیں انھوں نے پوری دنیا کوایک گاؤں میں تبدیل کر دیا ہے۔ چنانچہ دنیا کے جس کسی بھی حصے میں کوئی چھوٹا اور بڑا واقعہ رونما ہوتا

ہے تو پلک جھپکتے ہی ساری دنیا کو اس کی خبر ہو جاتی ہے۔اوراس سے ایک عالم متاثر ہوتا ہے۔ اکیسویں صدی میں یہ صورت حال اور تیز ہوگی اور دنیا مزید سمٹ کر اور قریب آ جائے گی۔

وقت نہ تو کسی کا انتظار کرتا ہے اور نہ کسی کا لحاظ کر کے اپنی سمت ورفتار کا تعین کرتا ہے۔ بلکہ افراد واقوام وقت کے لحاظ سے اپنے آپ کو Adjust کرتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ کسی قوم کے لیے ایک صدی کی مہلت بہت ہوتی ہے۔اس کے بعد صورتحال تبدیل ہو جاتی ہے۔ویسے تو حالات جس تیزی کے ساتھ بدل رہے ہیں اس میں ایک لمحہ کی بھی اہمیت ہے کیونکہ اثرات وعواقب کے لحاظ سے چاہے وہ صدیوں پر محیط ہو لیکن کوئی واقعہ کسی لمحہ میں ہی رونما ہوتا ہے۔ حادثات وانقلابات اچانک ہوتے ہیں۔ اس لیے اسے حادثہ یا انقلاب کہا جاتا ہے۔ اس لیے ایک ایک لمحہ کی اہمیت ہے۔بقول مولانا آزاد،قوموں اورملکوں کی زندگی میں ایک لمحہ ایسا آتا ہے کہ اگر اس وقت صحیح فیصلہ کیا گیا تو قوم صدیوں آگے چلی جاتی ہے اور اگر غلط فیصلہ ہوا تو صدیوں پیچھے چلی جاتی ہے۔

یہ جائزہ لینا مشکل ہے کہ پچھلی صدیوں میں مسلمان قوم نے کہاں کہاں اور کیا کیا غلطیاں کیں اوران کے کیا اثرات ونتائج مرتب ہوئے؟ لیکن ایک بات یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ من حیث المجموع بالعموم ہم نے پچھلی دو تین صدیوں میں غلط فیصلے اور غلط طریقے اختیار کئے،جس کی وجہ سے اجتماعی طور پر مسلمان مسلسل انحطاط کا شکار ہوتے رہے۔

اس میں ایک بنیادی غلطی یہ ہوئی کہ ہم نے اپنے آپ کو جدید علم وتحقیق سے بڑی حد تک دور رکھا۔ جس کے نتیجے میں پوری اسلامی دنیا میں بالعموم او ر ہندوستان میں بالخصوص مسلمان فنی تعلیم اور سائنسی معاملوں میں اپنی ہم عصر قوموں سے بہت پیچھے رہ گئے اورانہیں علم وتحقیق کے میدان میں مانگے کی تکنیک پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے۔ بلکہ اس کا سب سے اندوہناک پہلو یہ ہے کہ مغربی تہذیب کی چکاچوند سے ہم اس قدر متاثر ہوئے کہ اس تہذیب کی فنی اور علمی خصوصیات کو اختیار کرنے کے بجائے،ہم نے اس کے تمدن کی ظاہری چمک دمک کی بھونڈی نقالی شروع کردی اوراپنی زبان وتہذیب نیز عقائد وثقافت سے دور ہوتے چلے گئے۔اگرچہ

صورتحال اب بہت حد تک بدلی ہے۔تاہم اب بھی ایک طبقہ اس کی ظاہر داریوں میں گرفتار ہے اور مشرق ومغرب کا ایسا غیر متناسب معجون بن گیا ہے جس پر بجا طور پر یہ شعر صادق آتا ہے کہ ؎

نہ خدا ہی ملا، نہ وصالِ صنم
نہ ادھر کے رہے، نہ ادھر کے رہے

بہرحال ہمارے سامنے ایک بڑا چیلنج یہ ہے کہ ہم علمی میدان میں تیزی سے پیش قدمی کریں کیونکہ خواہ جدید جنگی عمل ہو یا معاشی اور صنعتی ترقی، بازار پر گرفت ہو یا تمدن وثقافت کا فروغ یہ سب بغیر تعلیمی ترقی کے ممکن نہیں ہے۔

ہم نے بہت ساری ذہنی بندشوں (Inhibitions) کی وجہ سے جدید علم وتحقیق سے فائدہ اٹھانے سے گریز کیا ہے اور اب جو آنکھ ملتے ہوئے اٹھے ہیں تو معلوم ہوا کہ دنیا بہت آگے جا چکی ہے۔اب کھوئے ہوئے وقتوں میں اپنی ناکامیوں پر آنسو بہا کر مزید وقت برباد کرنا دوسری بڑی حماقت ہوگی۔ اس لیے اپنے تمام تر وسائل وذرائع کو اکٹھا کرکے ایک زبردست تعلیمی تحریک برپا کرنے کی ضرورت ہے جو ماضی کی کمیوں کی تلافی کے ساتھ ساتھ مستقبل میں تیزی سے آگے بڑھنے کا سامان فراہم کرسکے۔

اس کام کو ہمارے نوجوانوں کو اپنے ہاتھوں میں لینا ہوگا۔اور بنیادی، ابتدائی، ثانوی اور اعلیٰ تعلیم نیز مخصوص فنی وسائنسی تعلیم کے ہر محاذ پر پوری ایمانی قوت اور ذہنی یکسوئی کے ساتھ اپنی ذمہ داری ادا کرنی ہوگی۔جن ملکوں میں مسلمان اقلیت میں ہیں وہاں ان کو اور بھی سنجیدگی کے ساتھ اس محاذ پر محنت کرنے کی ضرورت ہے۔کیونکہ تعداد کی کثرت کو کوئی چیز اگر بے وزن کرسکتی ہے تو وہ قلت کی کیفیت یعنی اہلیت (Quality of the minority) ہے۔ہمیں یہ بات دھیان میں رکھنی چاہیے کہ دنیا کے قریب قریب تمام ملکوں میں اقلیتوں نے اپنی تعداد کی کمی کی تلافی اپنی خصوصیات سے اس طرح کی ہے کہ وہ اکثریت سے کہیں آگے نکل گئی ہیں۔اس معاملہ میں صرف ہندوستانی مسلمان مستثنیٰ ہیں۔جس کی بہت سی نفسیاتی، سماجی اور سیاسی

وجوہات ہیں۔ اسلام جو حرکت، جامعیت اور مرکزیت کا منبع ہے ایک جامد اور محدود تصور حیات بن کر رہ گیا ہے، جس میں جہاد واجتہاد کی روح پوری طرح ناپید ہوگئی ہے۔ اب قوم آگے بڑھے تو کس طرح بڑھے؟ ہمارے سامنے یہ ایک بڑا چیلنج ہے۔ اسلام کی حرکیت اور جامعیت جب تک دوبارہ واپس نہیں آتی ہے قوم میں زندگی اور نمو پیدا نہیں ہوگی اور یہ ہر محاذ پر شکست وریخت کا شکار ہوتی رہے گی۔ اکیسویں صدی میں یہ ہمارے سامنے سب سے بڑا نظریاتی چیلنج ہے جس کا اندر اور باہر ہر دو محاذ پر مقابلہ کرنا ہے۔ مسلمانوں کی ایک بڑی آبادی اپنی جہالت ولاعلمی کے باعث اسلام سے دور ہے تو دوسری بڑی آبادی روایتی دینداری کے چلن سے متاثر ہوکر، اسلام کے کلی اور آفاقی تصور سے نابلد ہے تو تیسرا گروہ موجودہ عہد میں اس کو ناقابل عمل سمجھتے ہوئے اسے عقائد وعبادات اور چند اخلاقی تعلیمات کا مجموعہ مان کر اس طرح قانع ہوگیا ہے کہ اسلام سے ایک موروثی وجذباتی وابستگی کے علاوہ اس کے پاس کچھ نہیں ہے۔ بلکہ اس کی ذہنی ساخت اتنی تبدیل ہوگئی ہے کہ وہ اسلام کی شہادت کی بات سن کر آگ بگولہ ہو جاتا ہے گویا اسلام اس مقصد کی چیز ہے ہی نہیں وہ تو تاریخ کی ایک ایسی انمول باقیات (Antiques) ہے جس کی تعریف تو کی جاسکتی ہے عمل نہیں کیا جاسکتا ہے۔ یہ ہمار ااندرونی محاذ ہے۔

اس کی پشت پر وہ لوگ ہیں جو پیدائشی اور پشتینی اسلام دشمن رہے ہیں۔ وہ مذکورہ بالا گروہوں کی ہر طرح پزیرائی فرما کر اور ضروری مواد ووسائل فراہم کر کے ایک ایسی جوابی تحریک برپا کئے ہوئے ہیں کہ کسی طرح اسلام کو سماج اور اس کے اجتماعی اداروں پر قابض نہ ہونے دیا جائے اور ہر ممکن طریقے سے اس کا راستہ روکا جائے۔ اس وقت چونکہ ساری دنیا میں ایک نظریاتی خلاء ہے اس لیے ان کو اندیشہ ہے کہ اگر مضبوطی سے اسلام کا راستہ نہ روکا گیا تو پہلے قدم کے طور پر مسلمان دنیا پھر سے اسلام کی طرف مُڑ جائے گی اور اس کے بعد اسلام کے اندر جو قوت تسخیر ہے وہ پوری دنیا کو اپنی گرفت میں لے لے گی۔ اس وقت اسلامی بنیاد پرستی (fundamentalism) کا جو غلغلہ ساری دنیا میں بپا ہے اور ہر ملک وقوم باڑھ لگا کر اسلام

کے بڑھتے قدم کو روکنا چاہتی ہے وہ اسی حقیقت کی غماز ہے۔ یہ ہمارا خارجی محاذ ہے۔

اکیسویں صدی میں یہ کشمکش اور شدید ہوگی۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا۔ کیونکہ اندرونی محاذ ہی اتنا بکھرا اور پھیلا ہوا ہے اور متضاد عوامل وعناصر کا مجموعہ ہے کہ ان سب کو جوڑ کر ایک متحدہ محاذ تشکیل دینا ایک عالم فتح کرنے کے مترادف ہے جو اگرچہ ناممکن نہیں مشکل ضرور ہے۔

یہاں بھی اصل امتحان ہماری نوجوان قوت کا ہے۔ ہم کتنا اپنے اندرونی تضادات پر قابو پانے میں کامیاب ہوتے ہیں اور کس طرح متضاد اور باہم متصادم عناصر کو جوڑ سکتے ہیں۔ اسی پر ہماری قومی بقا اور نظریاتی سربلندی منحصر ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اکیسویں صدی ہمارے لیے نظریاتی سربلندی کی صدی ہوگی یا پچھلی صدیوں کی طرح ہم مزید نظریاتی غلامی میں گرفتار رہیں گے۔

یہ ایک ایسا چیلنج ہے جس کا ہماری بڑی آبادی بشمول علماء کرام کو بھی احساس نہیں ہے۔ اس لیے اسے دیوانے کا خواب یا مجذوب کی بڑ ہی سمجھا جاتا ہے۔ تاہم یہ ہماری زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔ اس لیے اگر اب بھی ہم نے ہوش کے ناخن نہیں لیے تو کفر والحاد کا سیلاب ہمارے کھیت اور بازار سے گذر کر تمدنی مراکز تک میں داخل ہوجائے گا اور ہمارے گھر، ہماری مسجدیں، خانقاہیں، مدارس، تعلیمی ادارے، نجی اور عائلی زندگی کچھ بھی اس کے دست وبرد سے محفوظ نہیں رہ پائیں گے۔ اب ہمیں کس وقت کا انتظار ہے؟ کیا اس وقت کا جب شور قیامت برپا ہوگا؟

تو وہ شور قیامت برپا ہو چکا ہے لیکن شاید ہم اتنے بے حس ہوگئے ہیں کہ وہ شور بھی سنائی نہیں دے رہا ہے۔ یہ ہمارے سامنے سب سے بڑا چیلنج ہے کہ ہم کس طرح امت کو اپنی نظریاتی بنیادوں پر اٹھا کھڑا کریں۔ جب تک اس کی نظریاتی بنیاد استوار نہیں ہوگی وہ متحد اور منظم نہیں ہوسکتی ہے اور اس کی اجتماعی قوت بحال نہیں ہوسکتی ہے۔

یہ اسی نظریاتی دیوالیہ پن کا نتیجہ ہے کہ جن ملکوں میں وہ اکثریت میں ہیں، کہنے

کوآزاد اورخودمختار ہیں، جہاں وسائل کی فراوانی ہے، ان ملکوں میں بھی غلامی اور پسپائی ان کا مقدر بن گئی ہے۔اور جہاں وہ اقلیت میں ہیں وہاں توبالکل ہی درماندہ اور پسماندہ ہیں۔ یہ صورتحال کب اور کیسے بدلے گی؟ یہ ایک بڑا سوال ہےلیکن اب بھی اگراس کا جواب نہیں دیا گیا تواکیسویں صدی کے بعد یہ احساس بھی رخصت ہوجائے گا۔اس لیے کہ مشرق ومغرب کا دیواستبداد انہیں اس طرح نگل جائے گا کہ پتہ بھی نہیں چلے گا کہ دنیا میں مسلمان نام کی کوئی قوم کبھی بستی تھی۔ یہ واہمہ نہیں بلکہ وہ حقیقی اندیشہ ہے جوحالات وواقعات پرنظر رکھنے والے ہر شخص کوصاف دکھائی دے رہا ہے۔

اس سے بچنے کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ مسلمان نوجوان فیصلہ کر کے اپنے کھوئے ہوئے نظریاتی علاقوں کی بازیابی کے لیے ایک منظّم تحریک کی شکل میں اٹھ کھڑے ہوں تووقت کی رفتار کو بدلا جاسکتا ہے۔کیا ہم اس چیلنج کوقبول کرنے کے لیے تیار ہیں؟

ہندوستان میں مسلمانوں کودرپیش چیلنج:

میں نے اب تک آپ سے اصولی اور نظریاتی انداز میں عالمی تناظر میں گفتگو کی ہے۔ہمیں بنیادی طور پر دیکھنا ہے کہ اکیسویں صدی میں ہندوستانی مسلمانوں کے سامنے کیا چیلنج ہیں؟

کسی بھی چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لیے ہمیں دوباتوں پر دھیان دینا ہوگا۔ پہلا یہ کہ ہماری کمزوریاں اورمسائل کیا ہیں؟ دوسرا ہماری طاقت، اہلیت اور وسائل کیا ہیں؟

ہماری کمزوریاں اورمسائل:

موٹے طور پر مسلمانوں کے مندرجہ ذیل مسائل ہیں جنہوں نے ان کو اندراور باہر سے کمزور کر رکھا ہے۔

(۱)خوف اورعدم تحفظ کا احساس:

ہندوستان میں ویسے توانگریزوں کے وقت سے ہی یہ مسئلہ پیدا ہوگیا تھا۔مگرآزادی

کے بعد اس کی سنگینی میں اور بھی اضافہ ہوگیا ہے۔ وقفہ وقفہ سے ہونے والے فسادات کی وجہ سے یہ مسئلہ سنگین اور پیچیدہ ہوتا جا رہا ہے اور مسلمان مستقل طور پر خوف اور عدم تحفظ کے ماحول میں جی رہے ہیں۔ اس نے ان کے اندر سے ہمت و حوصلہ چھین لیا ہے اور وہ ہندوستانی ماحول اور معاشرے میں بیچارے بن کر رہ گئے ہیں۔

(۲) ہمہ گیر جہالت:

مسلمانوں کا دوسرا سب سے بڑا مسئلہ جہالت ہے۔ مسلمان مرد و خواتین کی لگ بھگ 40% فیصد آبادی بالکل جاہل اور ان پڑھ ہے۔ ان کو نہ تو اپنے دین کے بارے میں کوئی معلومات ہے اور نہ حالات و مسائل کی آگہی ہے۔ جو لوگ تعلیم سے بہرہ ور ہیں ان کے اندر بھی معیاری اور اچھی تعلیم (کوالٹی ایجوکشن) کی بڑی کمی ہے۔ اس لیے عام طور پر وہ مسابقت کے میدان میں بہت کم آگے آپاتے ہیں۔ تعلیم کی کمی کی وجہ سے اہلیت کی کمی ہے۔ لہٰذا آگے بڑھنے کے راستے محدود اور مسدود ہیں۔

(۳) غربت اور معاشی پستی:

مسلمانوں کے پاس بالعموم نہ کھیت ہیں نہ کارخانے اور نہ کوئی خاص صنعت و حرفت ہے۔ تعلیم کی کمی کی وجہ سے سرکاری سیکٹر میں ان کے لیے روزگار کے مواقع محدود ہیں۔ پونجی کی کمی کی وجہ سے وہ خود کوئی بھی بڑا کام نہیں کر سکتے۔ اس لیے مسلمانوں کی ورک فورس کی 90 فیصد تعداد روزانہ کی مزدوری پر منحصر ہے۔ غربت اور معاشی پستی نے مسلمانوں کے گھر اور سماج میں ایسا ڈیرا ڈالا ہے کہ آپ کسی آبادی سے گذریں اور دور سے اس کو پس ماندہ دیکھیں تو ساٹھ فیصد امکان اس بات کا ہے کہ یہ کوئی مسلمان آبادی ہوگی۔

(۴) سماجی انتشار:

مسلمان سماج کی ایک بڑی خرابی اور کمزوری یہ ہے کہ مسلمان اس وقت ایک منتشر بھیڑ ہیں وہ اتنی ٹولیوں اور خانوں میں بٹے ہوئے ہیں کہ ان کو گننا بھی مشکل ہے۔ مسلمانوں

میں عمومی جہالت 40% فیصد ہے تو دینی جہالت 90% ہے۔ غیر تو غیر خود مسلمانوں میں کچھ لوگ مسلمانوں کی اس کمزوری کا بھرپور فائدہ اٹھاتے ہیں اور اپنے ذاتی مفاد میں ملت کو بانٹ کر رکھنا چاہتے ہیں۔ مسلمانوں میں ایسے لوگ بہت کم ہیں جو ان کے عقائد کی اصلاح کر کے ان کو صحیح دین کی طرف آنے کی دعوت دیں۔ زیادہ تر لوگوں نے انہیں فروعی اور غیر ضروری مسائل میں اتنا الجھا دیا ہے کہ اس جال سے ان کا نکلنا بہت مشکل ہے۔ ہمارے یہاں مسلک اور برادری کا جھگڑا روز بروز شدید تر ہوتا جا رہا ہے۔ جس نے ملت کے سماجی انتشار کو اور گہرا اور بڑا کر دیا ہے۔ اس کی وجہ سے ملت دن بدن کمزور ہوتی جا رہی ہے۔ اسی طرح جماعتی عصبیتوں اور سیاسی دھڑے بندیوں نے ملت کا شیرازہ بکھیر دیا ہے جو اس کی اجتماعی قوت کے لیے نقصان دہ ثابت ہو رہا ہے۔

(۵) سماجی برائیاں:

آج کسی بھی سماج کی کوئی برائی ایسی نہیں ہے جو مسلمان سماج میں نہ در آئی ہے۔ دین سے غفلت، عقائد اور شعائر دینی کا عدم احترام، اسلامی عبادات اور اخلاق سے بے پروائی، ذات پات کا بڑھتا رجحان، اونچ نیچ کا احساس، عورتوں کی حق تلفی اور ان کے ساتھ بد سلوکی، یتیموں اور بیواؤں کے ساتھ برا سلوک، بزرگوں اور عمر رسیدہ لوگوں سے بے پروائی، جہیز کی لعنت، ظلم و شقاوت، عدم رواداری، ذاتی اور شخصی مفاد کو ملکی اور ملی مفاد پر ترجیح، غرض یہ کہ تن ہمہ داغ داغ شد......'' کی صورتحال ہے۔

(٦) قیادت کا فقدان:

مسلمان قوم اس وقت ایک شتر بے مہار کی مانند ہے۔ کہیں اور کسی سطح پر کوئی قیادت نہیں ہے۔ نہ تو ان کے اندر کوئی قابل اعتماد دینی قیادت ہے نہ قابل قبول سیاسی قیادت، یہی حال تعلیم، معاش، صحت عامہ اور سماجی اصلاح کے میدان کا ہے۔ بغیر قیادت کے کوئی قوم کیسے آگے بڑھ سکتی ہے؟ اس لیے مسلمان قوم ایک مقام پر آ کر رک گئی ہے جہاں سے انتشار کی

فوجیں اپنے اپنے کاز کے لیے مردان کار چن چن کے لے جارہی ہیں اور پوری قوم اس پہاڑ کی طرح ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہورہی ہے جس کے پتھروں کو توڑ کر سڑک اور مکان بنانے کے کام میں لگایا جارہا ہے۔ اگر یہی صورتحال باقی رہی تو جس طرح وہ پہاڑ ایک دن ایک نشان چھوڑ کر ختم ہوجائے گا، ملت بھی نشان عبرت بن جائے گی۔ یہ فہرست اور بھی طویل کی جاسکتی ہے۔ مگر باقی سارے معاملات انہیں بنیادی مسائل کا حصہ ہیں۔ اس لیے زیادہ تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ مسائل کے ادراک کے لیے ان بنیادی باتوں پر توجہ دینا کافی ہوگا۔

ہماری طاقت واہلیت:

اب ایک نظر ملت کی اندرونی طاقت، اہلیت اور وسائل پر بھی ڈال لینا ضروری ہے تاکہ ہمارے سامنے دونوں پہلو موجود ہوں جن کی روشنی میں کوئی لائحہ عمل طے کرنا آسان ہوسکے۔

(ا) ٹھوس دینی اور نظریاتی اساس:

مسلمانوں کی سب سے بڑی قوت اسلام ہے۔ اللہ پر ایمان اور اس کا سہارا ہے۔ رسول کی رہنمائی اور ان سے محبت کی پونجی ہے۔ جب تک ایمان سلامت ہے اور اللہ اور اس کے رسول سے ملت کا رشتہ استوار ہے حالات چاہے جتنے سخت ہوجائیں یہ ملت مٹ نہیں سکتی۔ اس کے اندر دب دب کر ابھرنے اور ڈوب ڈوب کر نکلنے کی بے پناہ صلاحیت ہے۔ اس کے لیے اسلام ایک مضبوط قلعہ ہے۔ اور ملت کے ایک طبقہ میں اپنے دین کی طرف واپسی کا زبردست رجحان پایا جاتا ہے۔ یہ اس کی سب سے بڑی پونجی ہے اس لیے کسی کے لیے اس کو مٹا دینا اور ختم کردینا ناممکن ہے۔ ملت چاہے اسلام پر عمل کم کرتی ہے مگر اسلام سے اس کی جذباتی وابستگی ہے۔ خدا کا خوف اور اس کی اطاعت کا جذبہ موجود ہے۔ رسول سے بے پناہ محبت کا اظہار کیا جاتا ہے۔ کتاب اور قیامت کا تصور پوری طرح زندہ ہے۔ اس کو تعلیم وتربیت، اجتماعیت اور دعوت وتحریک کے ذریعہ مضبوط اور مستحکم کرنے کی ضرورت ہے۔

(۲) مضبوط تاریخ وثقافت:

ہندوستان اسلام کا دوسرا گھر ہے۔ جہاں مسلمانوں کی مضبوط تاریخ وثقافت ہے۔ حالانکہ اس کو خالص اسلامی نہیں کہا جاسکتا ہے تاہم اس میں اس کی واضح جھلک دیکھی جاسکتی ہے۔امتداد زمانہ نے اس پر کافی ضرب لگائے ہیں،اس کے باوجود اس کی تمام تر علامتیں زندہ ہیں اوراس کو آگے بڑھانے کی محدود پیانے پر ہی سہی مسلسل کوشش جاری ہے۔اس لیے یہ مصر کے پیرامڈ کی طرح محض شاندار آثار نہیں ہیں۔ بلکہ زندہ،متحرک،متنوع اور وسیع ہوتی ہوئی روایات ہیں جن کو مٹانا اور ختم کرنا آسان نہیں ہے۔آج اسلام،مسلمان اور ہندوستان تینوں اس طرح گھل مل گئے ہیں کہ کوئی چاہ کر بھی ان کو جدا نہیں کرسکتا ہے۔

(۳) بڑی آبادی:

ہندوستان میں مسلمان اگرچہ اقلیت میں ہیں،لیکن یہ اقلیت اکثریت کے مقابلے ہے۔ورنہ مسلمان اس وقت اس ملک میں بیس کروڑ کی تعداد میں ہیں۔لہذا وہ دنیا کے کسی ملک میں آباد مسلمانوں کی تعداد سے کہیں زیادہ ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ انڈونیشیا کے بعد دنیا میں سب سے زیادہ مسلمان بھارت میں رہتے ہیں۔دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ بھارت کے ہر حصہ اور ہر خطہ بلکہ ہر ریاست، ہر شہر اور ہر گاؤں میں آباد ہیں۔ان کی اتنی بڑی تعداد اوراتنے وسیع خطے میں ان کے پھیلاؤ کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ کوئی ہٹلر نما شخص چاہ کر بھی ان کو اس ملک سے نہ تو ختم کرسکتا ہے اور نہ نکال سکتا ہے۔مسلمانوں کے عقیدے کے بعد یہ تعداد ان کی سب سے بڑی قوت ہے جس کی بنیاد پر مستقبل کا کوئی بھی نقشہ بنایا جاسکتا ہے۔

(۴) احساس زیاں اور آگے بڑھنے کی تڑپ:

اپنی تمام تر کمزوریوں اور پچھلے تین سو سالوں سے پے در پے ضرب پر ضرب کھانے کے باوجود مسلمانوں نے حالات کے سامنے سپر نہیں ڈالا ہے۔ان کے اندر اپنی کھوئی ہوئی حیثیت کو پانے کا احساس نہ صرف باقی ہے بلکہ وقت کے ساتھ بڑھتا جارہا ہے۔یہی احساس

اس وقت ملت کی پونجی ہے جس کو بڑھانے اور عام کرنے کی ضرورت ہے۔ عروج وزوال دن رات کی گردش کی طرح ہیں۔ جیسے ہر صبح کی شام ہوتی ہے ویسے ہی ہر شب کا سویرا ہوتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح عروج کے ساتھ زوال ہے اور ہر زوال کے بعد عروج ہے۔ اس لیے زوال کے دنوں میں ہمت ہار کر بیٹھ نہیں جانا چاہیے بلکہ اپنی پوری صلاحیت کو مجتمع کر کے عروج کے لیے جدو جہد کرنا چاہیے۔ مسلمانوں میں ابھی بھی ایک طبقہ ایسا موجود ہے جو آہ سحر گاہی سے وضو کرتا ہے۔ ضرورت ہے اس کے ساتھ تعاون کیا جائے اور اس کے بنائے ہوئے نقشہ میں رنگ بھرنے کی کوشش کی جائے۔

کرنے کا کام:

یہ ہے ہماری کمزوری اور اہلیت کا جائزہ۔ ہمیں اپنی کمزوریوں اور صلاحیتوں کے ساتھ ہندوستان میں اکیسویں صدی کے چیلنج کا مقابلہ کرنا ہے۔ میرے خیال میں ہمیں تمام تر وسائل اور صلاحیتوں کو جوڑ کر مندرجہ ذیل چار کاموں پر توجہ مرکوز کرنا چاہیے۔

(۱) دینی اور سائنسی تعلیم کا فروغ:

ہمیں اس بات کی کوشش کرنی ہوگی کہ مسلمانوں میں ان کے ہر طبقہ اور گروہ میں تعلیم عام ہو اور یہ تعلیم دینی شعور کے ساتھ دی جانی چاہیے تاکہ تعلیم ان کے عقائد، زبان اور ثقافت کی حفاظت کے ساتھ ساتھ عصری ضرورتوں کی بھی کفیل ہو سکے۔ ان میں اعلیٰ پائے کی اہلیت پیدا کرنے کے تمام مواقع اور وسائل بہم پہنچانے کی شعوری اجتماعی کوشش کی جانی چاہیے۔ یہ کوشش ملت کو خود بھی کرنی ہے اور حکومت اور اکثریت کے تعاون سے بھی کرنا ہے۔ ملت کو ایک ٹائم باؤنڈ پروگرام بنا کر اس جانب زوردار مہم چلانے کی ضرورت ہوگی۔

(۲) اتحاد اور سماجی اصلاح:

ملت میں اس وقت انتشار کی آندھی چل رہی ہے اور سماجی بگاڑ وبائی امراض کی طرح پھوٹ پڑے ہیں۔ تعلیم و تحریک کے ذریعہ ان کو دور کرنے کی ایک منظّم کوشش ہونی چاہیے اور

ملت کے تمام طبقات کو ساتھ لے کر ایک اجتماعی جدوجہد کا منصوبہ بنایا جانا چاہیے۔ کم از کم برادرانہ تعاون اور مسلکی رواداری کا رجحان پیدا کرنے کے لیے تحمل و برداشت کی ایک عام سطح پیدا کرنے کا اہتمام کرنا چاہیے۔ اس کام کے لیے صالح اور صلح پسند نوجوانوں کا ایک گروہ اٹھے جو ملت کے تمام مسالک، برادریوں اور جماعتوں کے زعما سے ملاقات کرے اور ان کو کچھ مشترکہ مسائل پر اتحاد فکر وعمل کی دعوت دے۔ یہ شروعات آئندہ کے اصلاح واتحاد کا پیش خیمہ ثابت ہوگا جو دھیرے دھیرے ملت کو جوڑنے میں مددگار ہو سکتی ہے۔

(۳) غیر مسلم آبادی سے بہتر انسانی رشتہ کی کوشش:

اسلام ظلم، ناانصافی، گناہ، تعصب، تنگ نظری، نفرت، بغض وعداوت، حسد اور ناحق طرف داری کا سخت مخالف ہے۔ اسلام انہیں چیزوں کو انسانی سماج سے مٹانے اور ختم کرنے کے لیے آیا ہے۔ ہم پر صرف مسلمانوں کا حق نہیں ہے بلکہ تمام انسانوں کا حق ہے۔ اللہ سب کا رب ہے۔ رسولؐ سب کے رسولؐ ہیں۔ قرآن سب کے لیے کتابِ ہدایت ہے۔ اس لحاظ سے مسلمان امت سب کے لیے خیر امت ہے۔ حضورؐ نے فرمایا: ''ساری انسانیت اللہ کا کنبہ ہے، تم میں بہتر وہ آدمی ہے جو اللہ کے کنبہ کے لیے بہتر ہے۔'' آپؐ کی مشہور حدیث ہے ''انسانوں میں سب سے بہتر وہ ہے جو انسانوں کی بھلائی کرتا ہے۔'' اس لحاظ سے ہم جس ملک اور سماج کا حصہ ہیں اس ملک اور سماج کی بھلائی ہم پر فرض ہے۔ لہٰذا اگر اس ملک میں کہیں کوئی ظلم ہوتا ہے، ناانصافی ہوتی ہے، کہیں کسی کا حق مارا جاتا ہے یا کسی کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی جاتی ہے تو ہمارا فرض ہے کہ اس کے خلاف اپنی جان کو جوکھم میں ڈال کر اٹھیں اور ظالم کا ہاتھ پکڑ لیں۔ ہماری طرف سے اصلاح وتعمیر کی، بھلائی اور بہتری کی جو بھی کوششیں ہوں ان کا دروازہ ملک کی تمام قوموں، برادریوں اور افراد کے لیے بلالحاظ مذہب وملت کھلا رہنا چاہیے۔ بلکہ انہیں اس سے فائدہ اٹھانے کے لیے آمادہ کرنا چاہیے تاکہ فرقہ وارانہ امن وخیر سگالی کا ایک بہتر ماحول بنے اور ایک بہتر انسانیت نواز رشتہ استوار ہو تاکہ ہم نہ صرف ان منفی رجحانات

کو جو کچھ لوگ اس ملک میں پروان چڑھانا چاہتے ہیں، روک سکیں بلکہ اپنی رحمت و برکت والی شناخت پیدا کرنے میں کامیاب ہوں۔ یہ ہماری ملی پالیسی ہی نہیں ہونی چاہیے بلکہ یہ ہمارا دینی فریضہ ہے۔مسلمانوں نے اپنی اس حیثیت کو کافی عرصہ سے بھلا رکھا ہے۔اس لیے ان کو اب ایک لمحہ ضائع کئے بغیر اس حیثیت میں واپس آنا چاہیے۔سماجی سطح پر ہم اکیسویں صدی میں نفرت،تشدد،تعصب اور جان و مال کے زیاں پر اسی طرح قابو پا سکتے ہیں۔

(۴) سیاسی اور معاشی عمل میں بھرپور حصہ داری:

ہمیں اس حقیقت کا کھلے دل سے اعتراف کرنا چاہیے کہ اس وقت مسلمانوں کی جو کیفیت ہے اور مسلم سماج کی جو ہیئت ہے ہندوستان میں مسلمانوں یا اسلام کی حکومت کا دور دور تک کوئی امکان نہیں ہے۔لہٰذا اب جو عہد ہے وہ مشترکہ تہذیب اور مخلوط حکومت کا عہد ہے۔ مشترکہ تہذیب اور مخلوط حکومت کا مطلب یہ ہے کہ ایک ساتھ کئی تہذیبیں باہم منفرد اور مشترک رہیں گی جن کے درمیان تحمل، رواداری اور تعاون کا رشتہ ہوگا۔ دوسرے جو حکومت بنے گی اس میں تمام قوموں، مذہبوں، برادریوں اور طبقوں کے لوگ شامل ہوں گے۔کوئی کسی کی غلامی میں نہیں ہوگا۔انصاف اور برابری کی بنیاد پر ایک دستور اور نظام قانون ہوگا جس میں کسی کے ساتھ کوئی امتیازی سلوک نہیں ہوگا۔

تمام قوموں کو اسی دائرے اور چوکھٹے میں رہ کر اپنے وجود اور حقوق کی بازیابی کرنی ہے اور اس کو مستحکم کرنا ہے۔اس ملک میں ہندوؤں کی اکثریت ہے۔ جمہوری حکومت میں اکثریت کی حکمرانی ہوتی ہے تاہم اقلیتوں کو جو تحفظات فراہم ہیں ان کو مستحکم کرنے اور ان کے حصول کی راہ ہموار کرنے کے لیے سیاسی اور معاشی عمل میں حصہ داری ضروری ہے۔اس معاملے میں عدم شرکت کی کوئی پالیسی دینی و ملی دونوں نقطہ نظر سے نقصاندہ ہوگی۔اس معاملہ میں مسلمان کس پارٹی کا ساتھ دیں، کس پارٹی میں شامل ہوں، سبھی پارٹیوں میں رہیں یا ان کی اپنی کوئی پارٹی ہو۔اس وقت یہ ہمارا موضوع نہیں ہے۔اس لیے ہم اس پر کوئی اظہار خیال

نہیں کریں گے۔ ہم صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہمیں سیاسی اور معاشی عمل میں بھرپور حصہ داری کرنی ہوگی۔ یہ ملی بقا،تقویت اوراستحکام کے لیے ضروری ہے۔

(۵) ٹھوس اجتماعیت اور مضبوط قیادت:

اکیسویں صدی میں ملت کو جن داخلی اورخارجی مسائل کا سامنا ہے اورملت کے سامنے جو امکانات اور چیلنج ہیں ان کا مقابلہ فرداً فرداً نہیں کیا جاسکتا۔ نہ تو انفرادی سطح پر بناؤ کا کوئی منصوبہ کامیاب ہوگا اور نہ پیش آمدہ مسائل سے عہدہ برآ ہوا جاسکتا ہے۔ اس کے لیے ایک ٹھوس اجتماعیت اور مضبوط قیادت درکار ہے۔ یہ سوملین ڈالر کا سوال ہے کہ یہ ٹھوس اجتماعیت اورمضبوط قیادت برپا کیسے کی جائے گی؟ ہمارا احساس ہے کہ ملت میں تمام تر انتشار فکروعمل کے باوجود اتحاد کا زبردست داعیہ موجود ہے۔ جب تک کوئی باضابطہ قیادت ابھر کر سامنے نہیں آتی۔ ایک ورکنگ فورمولہ یہ وضع کیا جاسکتا ہے کہ موجودہ جماعتوں اوران کے قائدین کو اس بات پرآمادہ کیا جائے کہ وہ ایک جگہ بیٹھیں اورایک مشترکہ پروگرام وضع کریں اورایک ایسا پلیٹ فارم بنائیں جس میں ملت کے تمام طبقات دھڑوں اور جماعتوں کی مناسب نمائندگی ہو۔ اور ایک اجتماعی صدارت کے ذریعہ قیادت کےموجودہ خلاء کو پر کرنے کی کوشش کی جائے۔

اگر ان امور پر سنجیدہ کوشش کی جائے تو ہم امید رکھتے ہیں کہ ہم نئی صدی کے چیلنجز کا نہ صرف یہ کہ بہتر انداز سے مقابلہ کرسکتے ہیں بلکہ اس صدی کو یعنی اس موقع کو ہم مستقبل کی ترقی اوراستحکام کا ذریعہ بناسکتے ہیں۔

امت مسلمہ کا مستقبل، ہدف، چیلنجز اور ترجیحات ہندوستان کے تناظر میں

اصولی طور پر امت مسلمہ کوئی قومی، وطنی اور لسانی ملت کا نام نہیں ہے بلکہ ایک محکم نظام عقیدہ کی حامل، ایک پاکیزہ نظام عبادت پر عامل، ایک مضبوط نظام شریعت کی مدعی، ایک عادلانہ ومساویانہ ثقافت کی علمبردار، خیر و پاکیزگی اور حرام وحلال کے واضح تصورات کی ضامن ایک عالمی امت ہے جو دنیا کے ہر ملک اور خطے میں کہیں اکثریت میں اور کہیں اقلیت کی شکل میں موجود ہے۔ یہ اس کا نظام عقیدہ واخلاق ہی ہے جو تمام تر قومی، وطنی، لسانی اور رنگ ونسل کے امتیازات کے باوجود اسے ایک وحدت میں پرو کر ایک امت بنا تا ہے۔ اس وقت شمال جنوب، مشرق ومغرب ہر چہار جانب سے اس کو دبانے اور مٹانے کی کوششیں ہو رہی ہیں نیز اندر اور باہر سے اس کو کمزور کرنے اور اس کی پہچان گم کرنے کی نت نئی سازشیں کی جا رہی ہیں۔ گویا امت مسلمہ اس وقت اپنی تاریخ کے سنگین ترین دور سے گذر رہی ہے۔ تاہم بحث کے کینوس کو محدود کرتے ہوئے ہم اس وقت عالمی امت مسلمہ اور ان کے حالات ومسائل کو زیر بحث نہیں لائیں گے بلکہ مندرجہ بالاعنوان کے تحت ہندوستان کی موجودہ مسلمان ملت کے مستقبل اور چیلنجز پر ہی اپنی توجہ مرکوز کریں گے تا کہ ہم ایک ٹھوس نقطہ نظر اور واضح نصب العین

اپنانے میں کامیاب ہوسکیں۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی تاریخ کم وبیش پندرہ صدیوں پر محیط ہے۔ان ادوار میں کبھی انہیں عروج وعزت اور کبھی زوال وذلت کے دن بھی دیکھنے پڑے ہیں۔

انہوں نے اس ملک اور سماج میں اچھے اور برے دونوں نقوش چھوڑے ہیں۔ایک بات واضح ہے کہ تاریخ کے کسی دور میں اس ملک میں اسلام کی حکومت نہیں رہی بلکہ مختلف مسلم خاندانوں کی حکومت تھی،جنہوں نے کچھ کام اسلام کے مطابق کئے تو بہت سے ایسے کام بھی کئے جو اسلام کے خلاف تھے۔وہ تاریخ کا ایک دور تھا جو گزر چکا ہے۔تاریخ میں جو بات اچھی یا بری ہوتی ہے اسے ہم بدل نہیں سکتے ہیں۔لیکن ایک بات واضح ہے اگر تھوڑی دیر کے لیے یہ مان بھی لیا جائے کہ ماضی میں کسی نے کوئی ظلم کیا تھا تب بھی اس بنیاد پر ایک نسل کے جرائم کی سزا دوسری نسل کو نہیں دی جاسکتی۔لیکن آج کے ہندوستان میں مسلمان حکمرانوں کے ذریعہ کئے گئے اچھے کام پر خطِ سیاہ پھیرنے کے ساتھ ساتھ ان حکومتوں کے دور میں کئے گئے حقیقی اور فرضی جرائم کی ایک فہرست بنا کر سود سمیت مسلمانوں کی نئی نسل سے سارا حساب یکمشت چکتا کرنے کی اعلی سطحی محلاتی سازشوں کا جال بچھایا جارہا ہے۔اس وقت مسلمان ملت ایک ایسی پھانس میں گرفتار ہے جس سے باہر آنا ناممکن نہیں لیکن سخت مشکل ہے اور اسی پر اس کے مستقبل کا دارو مدار ہے۔دیکھنا ہے کہ امت مسلمہ اس پھانس سے باہر نکل پاتی ہے یا اس میں پھنس کر اپنا وجود گنوا دیتی ہے۔یہ بیلین ڈالر کا سوال ہے اور ہندوستان میں مسلمانوں کا مستقبل اس سوال کے مثبت جواب پر منحصر ہے۔

مسلمانوں کو درپیش مسائل ماضی قریب کی بات نہیں ہے بلکہ پچھلی چار صدیاں ان کا تعاقب کرتی آرہی ہیں۔محکومی اور مظلومی کا جو دور انگریزوں کے وقت سے شروع ہوا تھا وہ آج تک جاری ہے۔۱۵؍اگست ۱۹۴۷ء کو آزادی کا سورج طلوع ہونے کے بعد بھی کالی رات کا مہیب سایہ دور نہیں ہوا بلکہ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ اندھیر اور گہرا ہوتا جارہا ہے۔ انگریزوں نے نفرت اور تشدد پر مبنی پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو کی جو پالیسی اپنائی تھی دیسی

حکمرانوں نے اسے دوچند کیا ہے۔ اس وقت ان کے کارناموں کو دیکھ کر میکاولی اور گوبلز کی روحیں بھی اپنی اپنی قبروں میں شرمندہ ہورہی ہوں گی۔انہوں نے اخلاق ،انصاف اور دیانت سے عاری جس طرز حکمرانی کی وکالت کی تھی،ان کے یہ ہندوستانی متبعین اس کواس مقام تک لے گئے ہیں جہاں تک ان کے فکر وذہن کی رسائی ناممکن تھی۔

بھارت جب آزاد ہوا تو دنیا کے تمام دساتیر اور قوانین کی اچھی،خوشنما اور عالمی طور پر متفق علیہ ضابطوں اور شقوں کو جمع کر کے مبنی بر عدل ومساوات ایک ترقی پسند دنیا کا سب سے بڑا اور سب سے عمدہ تحریری دستور بڑے تزک واحتشام کے ساتھ اس عزم کے ساتھ نافذ کیا گیا کہ یہ جدید بھارت کا دستورالعمل ہوگا جس میں ملک کے تمام شہریوں کو بلا لحاظ مذہب، رنگ،نسل ،زبان ،جنس اور علاقہ تمام طرح کی مذہبی،سیاسی ،سماجی ،معاشی اور ثقافتی آزادی حاصل ہوگی اور ملک میں قانون کی حکمرانی قائم کی جائے گی۔حکومت،عدلیہ اور انتظامیہ بغیر فرق وامتیاز کے تمام شہریوں کو یکساں تحفظ فراہم کرے گی اور ان کے ساتھ کسی قسم کا فرق وامتیاز نہیں برتا جائے گا۔سماج کے کمزور سے کمزور فرد اور گروہ کو بھی پوری آزادی، پورا تحفظ اور پوری حصہ داری عطا کی جائے گی۔ بھارت کا یہ دستور اپنے الفاظ ومعنی کے لحاظ سے دنیا کے دستوروں میں ایک شاہکار کا درجہ رکھتا ہے۔لیکن جیسا کہ دستور کی ڈرافٹنگ کمیٹی کے چیرمین ڈاکٹر امبیڈکر نے دستور کے نفاذ کے وقت انتباہ دیتے ہوئے کہا تھا کہ کوئی بھی دستور چاہے کتنا اچھا ہو اگر اس کو نافذ کرنے والے ہاتھ اور ذہن اچھے اور انصاف پسند نہ ہوں تو وہ محض ایک خوبصورت الفاظ کا پلندہ ہوگا جس کی کوئی عملی افادیت نہیں ہوگی۔جبکہ ایک دستور بظاہر بہت بڑا واضح اور خوبصورت نہ ہو لیکن اس کو نافذ کرنے والے ہاتھ اور ذہن انصاف پسند اور ذمہ دار ہوں تو ان سے بھی وہ اچھی باتیں اخذ کرسکتا ہے۔

دوسری بات جو ڈاکٹر امبیڈکر نے کہی کہ حکمرانی کا حق یعنی اقتدار اور اختیار لامحدود نہیں ہوتا بلکہ اسے عوام کے جذبات،ضرورتوں اور امنگوں کے مطابق ہونا چاہیے۔ورنہ لوگوں میں بے چینی اور عدم اطمنان کا باعث ہوسکتا ہے جس سے عوام میں بغاوت کے جذبات پیدا

ہوسکتے ہیں جو اندرونی سلامتی، سماجی امن اور ملک کی سالمیت کے لیے خطرہ ہوسکتے ہیں۔

حکومت بالکل آزاد نہ ہو۔ اس کے لیے مضبوط اپوزیشن، آزاد عدلیہ، آزاد پریس اور بیدار رائے عامہ وہ ضروری چک اینڈ بیلنس ہیں جو اقتدار کی گاڑی کو پٹری سے نیچے اترنے نہیں دیتے ہیں۔ لیکن اس وقت بھارت کی جمہوریت جس سماجی اکثریت کی حکمرانی یعنی Majoritarian Damocracy کے دور میں داخل ہوچکی ہے اس نے چک اینڈ بیلنس کے لیے قائم کئے گئے ان تمام تنصیبات کو منہدم کردیا ہے اور ملک تیزی سے نازیت اور فاشزم کی راہ پر گامزن ہے جس نے کمزور طبقات بالخصوص اقلیتوں کے حقوق اور آزادی پر شبخون مارنے کی پوری منصوبہ بندی کررکھی ہے۔ ملک کا دستور ڈرا سہما اس بچے کی طرح کسی کونے میں کھڑا اپنی جان کی امان مانگ رہا ہے جس کا کوئی سرپرست اور پرسان حال نہیں۔ اکیسویں صدی کی دوسری دہائی کا یہی چیلنج ہے جو اس وقت ہمارا موضوع بحث ہے۔

ہندوستان میں امت مسلمہ کا مفہوم:

یہاں رک کر یہ جاننا ضروری ہے کہ ہندوستان میں امت مسلمہ کا مطلب کیا ہے؟ ہر وہ مرد و عورت جو خود کو مسلمان مانتا ہے اور اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کرتا ہے، جو خدا کی وحدانیت اور حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کو آخری رسول تسلیم کرتا ہے، قرآن پاک کو خدا کی آخری اور مکمل کتاب ہدایت مانتا ہے، اور خانہ کعبہ کو قبلہ تسلیم کرتا ہے وہ مسلمان ہے چاہے وہ کسی بھی ذات برادری، فرقہ، مسلک اور جماعت سے وابستہ ہو اور اس کی جلد کا رنگ، اس کی زبان، معاشی، سماجی اور تعلیمی حیثیت کچھ بھی ہو۔ وہ پڑھا لکھا یا ان پڑھ ہو، غرب یا صاحب ثروت ہو، اعلیٰ ذات اور طبقہ سے تعلق رکھتا ہو یا پسماندہ برادری یا طبقہ کا فرد ہو۔ یہ سب کے سب مسلمان ہیں اور امت مسلمہ کا جزو لاینفک ہیں۔ اس اصول عام سے صرف وہ لوگ مستثنیٰ ہیں جنھوں نے اعلانیہ خود کو اسلام اور امت مسلمہ سے الگ کرلیا ہے یعنی جو کھلے طور پر لوازمات دین کے منکر ہیں۔ رہے کبیرہ اور صغیرہ گناہوں میں ملوث مسلمان تو وہ مسلمان ہیں۔ ان کے لیے توبہ کا

دروازہ کھلا ہوا ہے۔ان کے گناہ کی وجہ سے مسلم سماج سے ان کا حق ساقط نہیں ہوگا وہ مسلمان سماج کا حصہ بنے رہیں گے۔ ۲۰۱۷ میں کیئے گئے تخمینہ کے مطابق ہندوستان میں ۱۸۲ ملین یعنی14.2% مسلمان ہیں جوملک کی سب سے بڑی اقلیت ہیں اور دوسرے لفظوں میں ہندوؤں کے بعد دوسری بڑی اکثریت ہے۔

پسماندہ ترین اکائی مسلمانوں کے گونا گوں مسائل:

آزادی کے بعد ملک کی نام نہاد ترقی پسند اور جمہوریت نواز پارٹیوں اور لیڈروں کے ذریعے تمام جمہوری اور دستوری ضمانتوں کے باوجوں مسلمانوں کو مسلسل حاشیہ پر ڈھکیلنے کا کھیل کھیلا جاتا رہا۔نتیجہ یہ ہوا کہ جہاں ملک کے تمام مذاہب طبقات اور گروہوں کے لوگ وقت کے ساتھ آگے بڑھتے رہے ان کی امپاورمنٹ اور حصہ داری میں اضافہ ہوا،مسلمان پس ماندہ اور کمزور ہوتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ تمام سرکاری اور غیر سرکاری مطالعات اور رپورٹوں کے مطابق بحیثیت مجموعی مسلمان اس وقت ملک کی پسماندہ ترین اکائی ہیں جس کو مثبت عمل (Affirmative Action) کے ذریعہ سہارا دینے کی ضرورت ہے۔ اس کے بجائے منہ بھرائی (appeasement) کا طعنہ دے کر ان کو دکھاوے کے طور پر ہاتھ اٹھا کر بطور بھیک جو کچھ دیا جاتا ہے، اس کو بھی روکنے کی کوشش کی جارہی ہے۔

فرقہ پرستی کا زور:

سب سے خطرناک بات یہ ہے کہ اس وقت مسلمانوں کے خلاف ہر ممکن طریقہ سے نفرت اور تشدد کو وجہ جواز فراہم کرنے کی بھرپور کوشش کی جارہی ہے اور اکثریت کو ان کے خلاف پوری ڈھٹائی کے ساتھ اکسانے کا عمل جاری ہے۔ یہ ہندوتوادی قوتوں کے لیے ایک ایسا آزمودہ نسخہ ہے جو ہر الیکشن میں تیر بہ ہدف ثابت ہوتا رہا ہے۔ اس لیے جہاں جواز اور گنجائش نہیں بھی ہے وہاں بھی کہیں نہ کہیں ایسی صورتحال پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ کسی طرح معاملہ ہندو مسلمان کا ہو جائے۔اس سے تو ان کے لیے الیکشن جیتنا آسان ہو جائے گا پھر

لوگ ان سے ان کی کارکردگیوں کا حساب لینے کے بجائے آنکھ بند کر کے ان کی حمایت پر آمادہ ہو جائیں گے اور ان کے بڑے بڑے جرموں کو بھی معاف کر دیں گے۔اس وقت مسلمانوں کا خون ہندوستانی سیاست کے لیے سب سے کارگر ایندھن ثابت ہو رہا ہے۔بقول اقبال ؎

آگ ہے، اولاد ابراہیم ہے، نمرود ہے
کیا کسی کو پھر کسی کا امتحان مقصود ہے

اس وقت ہندوستان کی ہندو اکثریت کو مسلمانوں کا خوف دلا کر دستور اور قانون کو بالائے طاق رکھتے ہوئے جارح فرقہ پرستی کے تحت گول بند کر کے مسلمانوں کے خلاف ایک فیصلہ کن جنگ لڑنے کے لیے تیار کیا جا رہا ہے۔اور موب لنچنگ اور فرقہ وارارانہ فساد سے آگے بڑھ کر باضابطہ خانہ جنگی کی دھمکی دی جاری ہے اور یہ دھمکی ان کے چند غالی عناصر اور فرنج ایلیمنٹ کی طرف سے ہی نہیں بلکہ اعلیٰ دستوری عہدوں پر فائز لوگوں کے ذریعہ دی جا رہی ہے۔حالات انتہائی سنگین ہیں۔نفرت اور فرقہ واریت کا جو زہر پچھلے ستر سالوں سے بویا جا رہا تھا اب وہ فصل پوری طرح پک کر تیار ہو چکی ہے اور کسی وقت بھی یہ ملک ایک سیکولر راشٹریہ سے ہندو راشٹریہ میں تبدیل ہو سکتا ہے۔

ہمارے داخلی مسائل اور آپسی انتشار:

اس صورت میں ملی دفاع کا طریقہ کیا ہوگا؟ ہندوستان میں مسلمانوں کا رول اور ان کی حصہ داری کیا ہوگی؟ مستقبل کی پیش بندی کیسے کی جائے گی؟ یہ چند بڑے سوال ہیں جن کے صحیح اور واضح جواب پر ہی ہمارے مستقبل کا انحصار ہے ورنہ آگے اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔

مسلمانوں کے دشمنوں کو یہ بات اچھی طرح معلوم ہے۔انہوں نے اسکا گہرائی سے مطالعہ کیا ہے کہ ہندوستانی مسلمان ایک منقسم کنبہ (Divided House) ہیں۔ان کے یہاں ذات اور مسلک کا اختلاف اتنا شدید ہے کہ کلمہ اور کعبہ بھی ان کو ایک پلیٹ فارم پر نہیں لا سکتے ہیں۔

وہ ایک دوسرے کی تکفیر میں بے باک ہیں اور ایک مسلک کے لوگ دوسرے مسلک والوں کو نقصان پہنچانے کے لیے کسی حد تک جا سکتے ہیں اور کسی سے بھی ہاتھ ملا سکتے ہیں۔ بلکہ اس سے ایک قدم آگے بڑھ کر ان کی فوج کا ہراول دستہ بن کر برادر کشی میں پورے جذبہ جہاد کے ساتھ شریک ہو سکتے ہیں، کیونکہ ایسا کرنا ان کے نزدیک عین دین ہے اور جو ان کے مسلک کا نہیں وہ دائرہ دین سے باہر ہے۔ اس لیے اس کے ساتھ کافروں اور مشرکوں کی طرح برتاؤ کرنا تقاضۂ ایمان ہے۔ اسلام دشمن قوتوں نے یہ نسخہ کئی جگہ آزمایا ہے اور ہر جگہ انہیں اس میں صد فیصد کامیابی ملی ہے۔ اس وقت ساری دنیا میں برادر کشی کی جو مہم جاری ہے وہ اس کی واضح دلیل ہے۔ آج ہندوستان میں پوری فنی مہارت کے ساتھ اس نسخہ کو آزمانے کی کوشش جاری ہے اور ایک منصوبہ بند طریقہ سے شیعہ، سنی، دیوبندی، بریلوی، اہلحدیث، اشراف، اجلاف اور مختلف جماعتوں کے درمیان انتشار و خلفشار پیدا کیا جارہا ہے تاکہ مسلمانوں میں آپس میں نفرت اور بدگمانی بڑھے اور وہ کسی طرح ایک دوسرے کے ساتھ آنے کو آمادہ نہ ہوں۔ اگر کبھی کسی مسئلہ پر ایک ساتھ آ بھی جائیں جیسے حضورؐ کی شان میں گستاخی یا مسلم پرسنل لاء کی حفاظت یا دہشت گردی کے الزام میں بے قصور نوجوانوں کی گرفتاری یا القدس پر اسرائیلی حملے تو جتنی جلدی وہ جمع ہوں اس سے زیادہ تیزی کے ساتھ بکھر جائیں۔ ماضی میں اتحاد ملت کی جتنی کوششیں ہوئی ہیں اس نے انتشار میں اضافہ کیا ہے۔ لہٰذا اس صورت میں موجودہ حالت سے عہدہ برآ ہونا ناممکن سا لگتا ہے۔

مسلمان گنتی میں کم ہیں۔ ان کے پاس وسائل بھی نہیں ہیں اور وہ نہ صرف ٹوٹے بکھرے بلکہ باہم متصادم ہیں تو وہ کیسے موجودہ حالات، درپیش فتنوں اور چیلنج کا مقابلہ کر سکیں گے یہ بہت بڑا سوال ہے؟ اس کا میرے خیال سے کسی کے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔ اگر ہے تو اس کو سامنے لانا چاہیے تاکہ لوگ دیکھ سکیں کہ کہاں سے بہتری کی راہ نکالی جا سکتی ہے۔

ملت کے اب تک کے ٹریک رکارڈ کو دیکھتے ہوئے تو مایوسی ہی ہوتی ہے۔ خدا کرے کہ لوگ ہوش کے ناخن لیں اور کہیں سے کوئی امید کی کرن نظر آئے۔

غربت اور جہالت:

مسلمانوں کی غربت اور جہالت وہ سنگ گراں ہے جوان کا راستہ روکے کھڑی ہے اور کسی طوران کوآگے بڑھنے نہیں دیتی ہے۔پچھلی تمام ریاستی اورمرکزی حکومتوں نے ان کو سبز باغ دکھا کران کے ووٹ لیے مگر کبھی بھی اور کہیں بھی انصاف کے ساتھ حصہ داری نہیں دی۔ نتیجتاً وقت گذرنے کے ساتھ مسلمانوں کی پسماندگی بڑھتی چلی گئی۔

ایک ایک کرکے تمام روائتی صنعتیں ان کے ہاتھ سے نکل گئیں۔نئ صنعتوں کے لیے جس فنی مہارت اور سرمایہ کی ضرورت تھی وہ ان کے پاس نہیں ہے۔زراعت میں ان کی حصہ داری پہلے بھی کم تھی ،معاشی تنگی کی وجہ سے زیادہ تر جائدادیں بک گئیں۔مسلمان زیادہ تر یاتو Low Skilled job میں ہیں یاد ہاڑی مزدور ہیں۔جن کی فی کس آمدنی اتنی نہیں ہوتی کہ اپنے بچوں کی ٹھیک سے کفالت کرسکیں۔بیماری اورمناسب غذا کی کمی کی وجہ سے ان کے بچے کمزوراور Stunted ہوتے ہیں جن کی ذہنی اورجسمانی نشونما ٹھیک سے نہیں ہوتی ہے۔جس کی وجہ سے نسل درنسل غربت وجہالت کا چکر چلتا رہتاہے۔ایک غریب ،ان پڑھ اور پسماندہ قوم جوذہنی اورجسمانی اعتبار سے کمزور ہے کیسے موجودہ فتنہ سامانیوں کا مقابلہ کرپائے گی یہ سوچ کر ہی ریڑھ کی ہڈیوں میں سردلہر دوڑ جاتی ہے۔

قیادت کا فقدان:

یہ سارے مسائل اپنی جگہ اس وقت جوسب سے بڑا مسئلہ ہے بلکہ جوام المسائل ہے وہ ہے قیادت کا فقدان۔جس طرح کوئی گاڑی بغیر انجن کے نہیں چل سکتی۔اسی طرح کوئی قوم بغیر قیادت کے آگے نہیں بڑھ سکتی۔مسلمان آزادی کے بعد سے ایک بے قیادت گروہ ہیں۔

مسلمانوں میں سیاسی بیداری (Political Awareness) اورسیاسی شعور (Political consciusness) کی بے حد کمی ہے بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ مسلمانوں میں کبھی کوئی سیاسی عمل شروع ہی نہیں ہوا جس کی وجہ سے مسلمان ووٹ بنک پالٹکس کے شکار ہوتے

رہے اور حلوائی کی ریوڑی کی طرح کبھی اس کے ہاتھ اور کبھی اس کے ہاتھ بکتے رہے۔صحیح بات یہ ہے کہ تمام نام نہاد سیکولر پارٹیوں نے ان کو دھوکہ دیا اور کبھی ان کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔ ان پارٹیوں میں جو مسلم قیادت تھی، کبھی اس نے اپنی پارٹی میں مسلمانوں کے مسائل نہیں اٹھائے اور ان کو ان کا حق دلانے کی کوشش نہیں کی۔ وہ ہر حال میں پارٹی ہائی کمان کے وفادار بنے رہے۔ چنانچہ ان کی حیثیت حقیقی کم اور علاماتی زیادہ تھی۔ اب وہ تعداد بھی کم ہو ہی ہے اور آزادی کے ستر سال کے بعد مسلمانوں کا Political Dis-empowermen دیکھنے کو مل رہا ہے۔مختلف ریاستی اسمبلیوں اور پارلیامنٹ میں ان کی تعداد لگاتار کم ہوتی جارہی ہے بلکہ بہت سی ریاستوں میں معدوم ہوگئی ہے۔

مختصراً یہ وہ حالات، مسائل اور چیلنجز ہیں جن میں ہمیں اپنا ہدف اور ترجیحات طے کر کے آگے بڑھنا ہے۔

پراعتماد مگر محتاط پہل کے لوازم:

۱۹۴۷ سے پہلے جو صورت حال تھی، وہ ملک کی آزادی کے بعد پوری طرح بدل چکی ہے ۔اس لیے اب ہمیں اپنی ذہنیت اور حکمت عملی دونوں بدلنی ہوگی ۔ہمیں یہ بات اچھی طرح سمجھنی ہوگی کہ اس قت ملک میں کوئی تیسری اور خارجی قوت برسر اقتدار نہیں ہے۔لہٰذا اب جو معاملہ ہوگا وہ دونوں قوموں کے درمیان براہ راست ہوگا۔ دوسری بات یہ ہے کہ اقدام کرتے وقت صرف وقتی مصالح اور معاملات کو دھیان میں نہیں رکھنا ہے بلکہ طویل مدتی پہلوؤں پر بھی دھیان دینا ضروری ہوگا۔تیسری بات یہ ہے کہ صرف مقامی مصالح ہی نہیں بلکہ پورے ملک کو دھیان میں رکھ کر کوئی قدم اٹھانے کی ضرورت ہے کیونکہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ کسی مقام کا ایک چھوٹا سا مسئلہ پلک جھپکتے ملک گیر مسئلہ بن جاتا ہے۔اس سلسلہ کی چوتھی اور آخری بات یہ ہے کہ ہمیں جہاں بے خوف، بے باک اور نڈر بننا ہے وہیں حکمت ودانائی اور صبر وتحمل کا ہر معاملہ میں اور ہر مقام پر مظاہرہ کرتے ہوئے کوئی قدم اٹھانا ہوگا۔ یہ ضروری وضاحت اس لیے

کی گئی ہیں تا کہ ہم اب تک جو غلطیاں کرتے آرہے ہیں وہ نہ دہرائیں ورنہ ہم دوقدم آگے جائیں گے اور چار قدم پیچھے، نتیجہ یہ ہوگا کہ سال بہ سال ہماری پسماندگی اور درماندگی بڑھتی ہی چلی جائے گی۔ ہمیں یہ بات سمجھنی ہوگی کہ ہم ایک خوفناک اندھیری رات میں موجوں کے درمیان بیچ بھنور میں پھنسے ہیں اور یہاں سے ہمیں زندہ سلامت نکلنا ہے۔ اس کے لیے کتنی ہمت، کیسی حکمت، کیسی مضبوط قوت ارادی اوراعصاب کی ضرورت ہے، اس کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔ لہٰذا جب کوئی قوم آزمائش میں ہوتی ہے تو اس کے اصلی جوہر ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ اس وقت ہم اس آزمائشی مرحلے میں ہیں اور ہمیں اس بھٹی سے کندن بن کر نکلنا ہے۔ کیا ہم اس کے لیے تیار ہیں؟ اگر ہاں تبھی ہم ہدف اور ترجیح کی بات کریں ورنہ یہ محض ایک خام خیالی ہوگی جس کا کوئی مطلب نہیں ہے۔ ہمیں اپنی قوم کے مردوخواتین، عوام وخواص، علماء اور عام لوگ۔ شہری اور دیہاتی، امیر وغریب، تاجر اور کسان، بزرگ بالخصوص نوجوانوں پر اعتماد ہے کہ وہ اگر ذرا سا شعور اور اجتماعیت سے کام لیں گے تو انشاء اللہ سارے مسئلے حل ہوں گے اور وہ اس آزمائش سے کامیاب وسرخرو ہوکر ابھریں گے۔ اللہ نے اسلام اور مسلمان کی فطرت میں دب دب کر ابھرنے کی جو دائمی صلاحیت بخشی ہے وہ پوری طرح قائم ہے۔ اس لیے حالات و مسائل سے مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ خود پر اور خدا پر بھروسہ کرتے ہوئے باہمت اقدام کی ضرورت ہے۔ جس طرح ہر رات کی صبح ہوتی ہے اسی طرح یہ کالی سیاہ رات بھی بیت جائے گی اور ہماری عزت وسربلندی کا سورج طلوع ہوگا۔

رات تاریک سہی، لمبی سہی، تنہا سہی
چند گھنٹوں سے بڑی پھر بھی کوئی رات نہیں

اہداف اور ترجیحات

ہم اس وقت کوئی طویل مدتی خاکہ پیش نہیں کر رہے ہیں اور نہ کسی نظریاتی بحث میں جانا چاہتے ہیں۔ہم موجودہ جمہوری نظام جیسا وہ اس وقت موجود ہے اور ملک کا جو دستوری ڈھانچہ ہے اس کو قائم اور تسلیم شدہ مانتے ہوئے ملک کے جمہوری اور دستوری ڈھانچہ میں مندرجہ ذیل اہداف کا حصول چاہتے ہیں۔

(۱) تحفظ (Security)

(۲) تقویت (emporwerment)

(۳) حصہ داری (Participation)

ملک کا دستور ملک کے ہر شہری کو بطور فرد اور ملک کی ہر مذہبی ،تہذیبی ،لسانی اور نسلی اکائی کو بحیثیت گروہ جان، مال ،عزت وآبرو ،عقیدہ، مذہب ،زبان وتہذیب اوراس کے تمدنی خصوصیات کے ساتھ اداروں کوان کے ذریعہ چلائے جانے والے اداروں کو تمام تر تحفظ کی ضمانت عطا کرتا ہے۔ملک میں جمہوری آزادی ہے۔دستور اور قانون کی حکمرانی ہے۔مگر افسوس کی بات یہ ہے کہ ملک کے کمزور طبقات بالخصوص مسلمان اقلیت کو جو دستوری تحفظات فراہم ہیں۔وہ عملاً ان کو حاصل نہیں ہیں۔نتیجہ یہ ہے کہ ملک کا دستور وقانون ہاتھی کے دانت کی طرح ہے۔جس کا فائدہ کمزور افراد اور ملک کو حاصل نہیں ہو رہا ہے بلکہ ہر آن شب خون مارنے کی

سازش ہوری ہے۔ ہندوستان میں جس تسلسل کے ساتھ فرقہ وارانہ فسادات ہوتے رہے ہیں ایسا لگتا ہے یہ ایک نارمل بات ہے ۔اس نے نہ صرف اقلیتوں کا دستور اور دستوری اداروں پر سے اعتماد اٹھا دیا ہے بلکہ ان کے اندر مایوسی اور بد دلی کی کیفیت بھی پیدا کی ہے،جس کی وجہ سے وہ اپنی اور ملک کی تعمیر وترقی میں کھل کر حصہ نہیں لے پاتے ہیں۔

لہٰذا اس وقت ہمارا اولین ہدف امن وتحفظ کی فضا قائم کرنا ہے ملک کے بدلتے سیاسی حالات میں یہ ایک ٹیڑھی کھیر نظر آتا ہے ۔کانگریس اپنے دور اقتدار میں اقلیتوں کو تحفظ دینے میں ناکام رہی ہے۔جب سے ریاستوں اور مرکز میں بی جے پی کی حکومت بنی ہے فرقہ پرست عناصر کے حوصلے کافی بڑھ گئے ہیں اور وہ ایک سوچی سمجھی پالیسی کے تحت عدم تحفظ کی فضا بنانے کی کوشش کرر ہے ہیں۔اس طرح کی شر انگیزی سے ان کو سیاسی فائدہ حاصل ہور ہا ہے۔ لہٰذا وہ عدم تحفظ کو نہ صرف بڑھاوا دے رہے ہیں بلکہ اس کو قائم رکھنا چاہتے ہیں۔موجودہ حالت میں یہ بہت بڑا مسئلہ ہے۔جس کے لیے ٹھوس حکمت عملی درکار ہے۔بہر حال عمومی تحفظ کے بغیر آگے کی کوئی بات سوچنا عملاً بے سود ہے۔لہٰذا تمام اہداف میں تحفظ کو اولین اہمیت حاصل ہے۔

دوسرا ہدف تقویت یعنی Empowerment ہے ۔تقویت کا مطلب تعلیم روزگار اور تمام اجتماعی اداروں اور فلاحی منصوبوں میں متناسب نمائندگی ہے۔ جب تک کسی فرد اور قوم کو تعلیمی سہولیات میسر نہیں آئیں گی یا ان کو روزگار کے مواقع میسر نہیں آئینگے اور فلاحی منصوبوں میں ان کی حصہ داری متعین نہیں ہوگی ۔اس وقت تک کسی فرد یا کمیونیٹی کا امپاورمنٹ نہیں ہوسکتا ہے۔اس کے لیے اندرونی اور خارجی ہر دو محاذ پر کام کرنے کی ضرورت ہوگی۔ اندرونی محاذ پر کسی بھی قوت کے حصول کے لیے استحقاق یعنی eligibility کا پیدا کرنا ضروری ہوگا اور خارجی محاذ پر مواقع یعنی opportunity کا ہونا ضروری ہے ۔اور جب یہ دونوں موجود ہوں تو قانون کی حکمرانی Rule of law اور انصاف ومساوات (fair play) ضروری ہے تا کہ صاحب استحقاق (Deserving) کی حق تلفی نہ ہو سکے۔موجودہ حالات میں یہ جوئے شیر

لانے کے مترادف ہے۔لیکن ہمیں انہی حالات میں اپنی تقویت کی راہ استوار کرنی ہے۔

تیسرا ہدف حصہ داری ہے۔جس کا مطلب جمہوری عمل میں، جمہوری اداروں میں اور فیصلے کے عمل میں حصہ داری۔ہم اس ملک کے باوقار شہری ہیں۔ہم کو بحیثیت فرد اور گروہ ووٹ دینے اور ووٹ لینے کا یکساں حق ہے۔ملک کی جمہوریت تبھی حقیقی اور بامعنی مانی جائے گی جب مقامی حکومتوں سے لے کر ریاست اور مرکز میں ہر سطح پر ملک کے تمام شہریوں کی حصہ داری اور نمائندگی طے ہو۔ملک کا کوئی بھی چھوٹا بڑا گروہ نمائندگی سے محروم نہ رہے۔جس درجہ میں یہ محرومی ہوگی اس درجہ میں ہماری جمہوریت نامکمل قرار دی جائے گی۔افسوس کی بات یہ ہے کہ مسلمانوں کی عدم نمائندگی کو بطور پبلک پالیسی اپنایا جارہا ہے اور سیاسی طور پر ان کو حاشیہ پر ڈھکیلنے کی کوشش کی جارہی ہے۔نتیجہ یہ ہے کہ اس وقت مسلمان ملک کی سیاست میں سب سے کمزور گروہ ہوگئے ہیں اور ملک کی تمام پارٹیوں میں ان کی نمائندگی کم ہوتی جارہی ہے۔ساتھ ہی اسمبلی اور پارلیمنٹ میں ان کی تعداد گھٹتی جارہی ہے۔جب تک کسی قوم کا پولیٹیکل امپاورمنٹ نہیں ہوتا، اس وقت تک وہ قوم کسی اور میدان میں طاقت اور قوت حاصل نہیں کرسکتی ہے۔

لہٰذا ان تینوں اہداف کے حصول کے لیے ترجیحی بنیاد پر مندرجہ ذیل حکمت عملی (Strategy) اپنانی ہوگی۔

کوئی ہدف ٹھوس منصوبہ بندی، واضح نقشہ کار Committed team اور نظم وڈسپلن کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتا ہے۔ہمارا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ اس وقت ہمارے پاس ایسا کوئی Mechanism نہیں ہے۔ہم جذبات میں اکٹھا ہوتے ہی، تھوڑی دور چلتے ہیں پھر راہ کی مشکلات اور دشواریوں سے گھبرا کر یا تو بیٹھ جاتے ہیں یا الٹے پاؤں لوٹ جاتے ہیں۔ہم چاہتے ہیں کہ ہم جو سوچتے ہیں وہ آپ سے آپ ہوجائے یا دوسرے لوگ از راہ عنایت ہمارے حصہ کی ذمہ داری ادا کردیں۔دنیا میں کوئی مقصد اس طرح حاصل نہ ہوا ہے اور نہ ہوسکتا ہے۔ہمیں تادیر صبر وعزیمت کے ساتھ سخت محنت اور قربانی کے لیے خود کو تیار کرنا ہوگا تبھی ہم کامیابی کی امید رکھ سکتے ہیں۔ہم جس طرح اب تک کام کرتے آئے ہیں اگر اسی طرح کرتے

رہے تو کسی تبدیلی کی امید فضول ہے۔

ہمیں سب سے پہلے ایک ٹیم بنا کر ایک وسیع رابطہ مہم شروع کر کے عوام وخواص بالخصوص نوجوانوں کو حالات اور مسائل سے آگاہ کرتے ہوئے واضح ملی شعور پیدا کرنے کی کوشش کرنا چاہیے اورانہیں جوڑ اور جمع کر کے ایک ٹائم بونڈ پروگرام کے ساتھ ملک کے طول وعرض میں پھیل جانا چاہیے۔ظاہری بات ہے یہ ایک دن کا کام نہیں ہے۔اس کی ابتدا پہلے چند افراد سے ہوگی پھر اور لوگوں کو جمع کیا جائے گا۔اس کے لیے سرمایہ بھی درکار ہوگا۔مگر ہمیں یہ خاص خیال رکھنا ہوگا کہ ہم جذباتیت سے کام نہ لیں اور ابھی کسی اور کو دعوت مبارزت دینے سے پہلے اپنی صفوں کی کجی کو درست کرنے پر زیادہ توجہ دیں۔ورنہ ہم غیرضروری الجھنوں کے شکار ہو کر اپنی راہ کھودیں گے۔اس لیے ہمیں ٹکراؤ اور بکھراؤ سے بچنا ہے۔

ہماری دوسری حکمت عملی یہ ہوگی کہ ہمیں ہر سطح پر اور ہر مقام پر ایسے لوگوں کی تلاش کرنی ہے جو قائدانہ صلاحیت رکھتے ہیں۔کوئی آدمی کمزوریوں سے خالی نہیں ہوتا۔لہٰذا اگر اس کی کوئی ابھری ہوئی خوبی ہے تو اس پر زیادہ فوکس کرنا چاہیے نہ کہ اس کی کمزوری پر اس طرح لوگوں کو اپنے سے قریب کر کے ان کی اصلاح کی کوشش کی جائے۔جب ہمارے اندر ہر کسی کو اپنانے کا داعیہ پیدا ہوگا تبھی اس کی اچھائی اور برائی سامنے آئے گی۔جتنے زیادہ لوگ جمع ہوں گے ان میں اچھے لوگوں کا انتخاب آسان ہوگا۔ہمارا بنیادی مسئلہ قیادت کا مسئلہ ہے اور قیادت آسمان سے نہیں آئے گی۔وہ اسی سماج اور اسی زمین سے آئے گی۔جیسا سماج ہوگا اسی طرح کی قیادت ہوگی۔آئیڈیل کی تلاش فی الوقت ممکن نہیں ہے۔لہٰذا موجود لوگوں میں جو اچھے ہیں ان کو چن لینا ہے اور ان کو آگے بڑھانا ہے۔ان پر اعتماد کرنا ہے ان کی معاونت کرنی ہے۔اگر اس طرح عملی نقطہ نظر اختیار کیا جائے گا تو ایک حقیقی زمینی قیادت پیدا ہوگی جس کی جڑ عوام میں مضبوط گڑی ہوگی۔اس قیادت کا خریدنا آسان نہیں ہوگا۔ہمیں یہ تجربہ ہر پنچایت، ہر نگر پالیکا، ہر شہر، ہر بلاک، ہر سب ڈویزن، ہر ضلع، ہر کمشنری، ہر ریاست اور مرکزی سطح پر کرنا ہے۔یہ قیادت کسی جماعت اور برادری کی قیادت نہیں ہوگی بلکہ یہ ملی قیادت ہوگی۔فی الوقت تو یہ

خواب وخیال کی باتیں لگتی ہیں۔مگر اس کو واقعیت کی دنیا میں لانا ہی ہمارے مسئلہ کا حل ہے۔

اس کی ایک عملی صورت یہ ہے کہ اس وقت ہندوستان میں مسلمانوں کی جتنی چھوٹی بڑی جماعتیں چاہے وہ جس سطح پر کام کر رہی ہوں ان سب کے قائدین کو ایک جگہ جمع ہونے کی دعوت دی جائے اور وہ جو فورمولہ پیش کریں اس کو ایک ایکسپرٹ گروپ کے حوالے کیا جائے جو اس پر غور وفکر کر کے ایک واضح لائحہ عمل تیار کرے جس پر عمل آوری کے لیے پوری ملت کو آواز دی جائے۔ جب میں یہ باتیں تحریر کر رہا ہوں، مجھے یہ باتیں خام خیالی لگتی ہیں۔سب سے پہلا سوال یہ ہے کہ بلی کے گلے میں گھنٹی کون باندھے گا اور اگر کسی نے اس کی جرات بھی کی تو کون اس کی دعوت پر لبیک کہے گا؟ چاہے انجام جو ہو اذان تو دینی ہوگی۔

اس وقت مسلمانوں میں دو ایسی تنظیمیں ہیں جن میں تمام ملی جماعتیں شامل ہیں اور جن کو مسلمانوں کے وسیع حلقہ کا اعتماد حاصل ہے۔ایک مسلم پرسنل لاء بورڈ ہے اور دوسری مسلم مجلس مشاورت ۔میں چاہوں گا کہ یہ دونوں تنظیمیں اس باب میں پہل کریں اور لوگوں کو ایک جگہ جمع ہونے کی دعوت دیں۔بصورت دیگر مسلمانوں کی جو معروف جماعتیں ہیں جیسے جمعیۃ العلما، جماعت اسلامی اور امارت شرعیہ بہار، اہل سنت والجماعت، جمعیت اہل حدیث، اثنائے عشریہ وغیرہ ان کو مل جل کر کسی ایک جگہ تمام جماعتوں اور قائدین کو بلانا چاہیے اور جماعتوں اور قائدین سے درخواست ہے کہ وہ اپنے گروہی عصبیت اور مفاد کو تھوڑی دیر کے لیے بالائے طاق رکھ کر نیز ذاتی انا کو تج کر ایک متحدہ حکمت عملی کی ترتیب میں اپنا تعاون دیں۔ اگر اس وقت لوگ ذاتی مفاد اور ان کی وجہ سے اتحاد فکر اور اتحاد عمل کا مظاہرہ کرنے میں چوک گئے تو پھر نہیں کہا جاسکتا کہ ہندوستان میں مسلم ملت کن حالات اور آزمائشوں سے دوچار ہوگی۔ اللہ تعالی ہمارے قائدین کو صحیح طرز عمل کی توفیق دے۔اگر امت کے بڑے لوگ اتحاد فکر وعمل کا ہلکا سا بھی مظاہرہ کریں گے تو ملت خود بخود متحد ہو جائے گی۔سترہ اٹھارہ کروڑ کی ایک ملت کسی بات پر متحد اور منظّم ہو جائے تو کوئی قوت اس وقت تک ان پر غالب نہیں آسکتی جب تک سورج پورب کے بجائے پچھّم سے نکلنا نہ شروع کر دے۔

دوسری چیز ملت کی تعلیمی اور معاشی بہتری کی کوشش ہے۔ ڈاکٹر امبیڈکر نے دلت طبقہ کی بہتری کے لیے ایک نعرہ دیا تھا میں سمجھتا ہوں مسلمانوں کے لیے بھی اس نعرہ کی خاص معنویت ہے۔ وہ نعرہ تھا تعلیم حاصل کرو، منظّم ہو اور جدو جہد کرو educate, unite & struggle۔ مسلمانوں کی اجتماعی قوت کی راہ تعلیم سے ہی نکلے گی لہٰذا ہمیں اپنے ہر بچے کو خواہ وہ لڑکا ہو یا لڑکی اچھی اور معیاری تعلیم سے آراستہ کرنے کی ضرورت ہے تا کہ وہ کھلی مسابقت میں کامیاب ہونے کے اہل ہوسکیں۔ ہمیں ریزرویشن کے لیے بھی جدو جہد کرنی چاہیے۔ لیکن ریزرویشن ملے یا نہ ملے ہمارے اندر ایسی صلاحیت اور اہلیت ہونی چاہیے کہ ہم تمام نامساعد حالات سے اور ناروا امتیازات کو شکست دے کر کامیاب ہونے کے اہل ہوں۔ تعلیم کو ایک جذبہ جہاد کے ساتھ حاصل کرنے کی ضرورت ہے. ہمارا ہر بچہ قیمتی ہے اور اس کو زیور تعلیم سے آراستہ کرنا والدین کے ساتھ ساتھ پوری ملت کا فرض ہے۔ تمام ملی جماعتوں کو اپنے بجٹ کا ایک حصہ بچوں اور نوجوانوں کی اعلی اور معیاری تعلیم پر صرف کرنے کے لیے مختص کرنا چاہیے۔ مدارس اور دینی تعلیم پر جو رقم خرچ کی جاتی ہے۔ اس کی ضرورت اور اہمیت مسلم ہے، مگر صرف اس پر اکتفا کرنا صحیح نہیں ہے۔ ہر طرح کی تعلیم پر خرچ کرنا جس سے دین وملت کو قوت حاصل ہو اور ملی عز وشان میں اضافہ ہو عین ثواب اور دینی کام ہے۔ لہٰذا اچھی اور معیاری تعلیم کے لیے پوری تحریک چلانے کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے ضروری وسائل (resources) فراہم کرنا، تعلیمی ادارے قائم کرنا، کوچنگ کلاسز چلانا۔ مسابقتی امتحانات کے لیے طلبا کو تیار کرنا، وظیفہ کا انتظام کرنا اور دیگر ضروریات کی تکمیل وقت کی ضرورت ہے۔

ہم جس روایتی معاشی عمل سے اب تک آشنا رہے ہیں اب بازار اور مصنوعات کی تصویر پوری طرح بدل چکی ہے۔ لہٰذا نئے معاشی نظام میں نئی حکمت عملی اور نئے انٹر پرینیرز کی ضرورت ہے۔ مصنوعی ذہانت (Artificial intelligence) کے اس دور میں اگر ہم دقیانوسی طریقے پر صنعت وتجارت کو جاری رکھیں گے تو ہم بازار میں ایک پل نہیں ٹک سکتے۔ لہٰذا ہمیں جدید ٹکنالوجی اور جدید تجارتی ڈھانچے کے ساتھ ساتھ سرمایہ کی فراہمی اور بازار کی تلاش پر

دھیان دینے کی ضرورت ہے تاکہ ہم بازار میں ٹک کر اپنے کاروبار کوفروغ دے سکیں۔اس وقت سودی نظام پوری طرح سے غالب ہے۔ زندگی کا کوئی شعبہ اس کے اثرات سے پاک نہیں ہے۔ اسلام میں سود حرام ہے، لیکن ہمارے پاس اس کا کوئی بدل نہیں ہے۔ ہندوستان جیسے ملک میں یہ عملاً ناممکن ہے۔ لہٰذا یہ ایک ایسی اضطراری صورتحال ہے جس سے بچ کے نکلنا ناممکن ہے۔اس صورت میں ہمارے پاس اس نظام میں لین دین کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ جاتا۔اگر ہم ایسا نہیں کرتے تو غربت و افلاس سے چھٹکارا ممکن نہیں ہے۔ مسلمانوں کی معاشی کمزوری انہیں مزید کمزور اور بے وزن بنادے گی ۔ہمیں متبادل معاشی نظام کی فکری اور عملی کوشش ضرور کرنی چاہیے لیکن جب تک کوئی قابل عمل متبادل سامنے نہیں آتا ہے۔ہمیں اس معاشی نظام کو اس کے تمام تر حسن و قبح کے ساتھ اپنانے کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں ہوگا۔

اس لیے اس معاملے میں میری رائے میں بے جا فتویٰ بازی سے پرہیز کیا جائے۔ یہ کوئی وقتی یا شخصی مسئلہ نہیں ہے بلکہ یہ ملی اور دائمی مسئلہ ہے۔اسلام میں سود حرام ہے اس کے باوجود پچھلے چودہ سو سالوں میں کوئی ایسا ادارہ جاتی طریقہ (Institutional Mechanism) نہیں سامنے لایا گیا جو موجودہ سودی نظام کا متبادل بن سکے۔اس طرح کی کوششیں بیسویں صدی کے اوائل سے شروع ہوئی ہیں مگر ابھی تک کوئی ایسا کامیاب ماڈل سامنے نہیں آیا ہے جس کی بنیاد پر بلاسودی تجارت ومعیشت کی تشکیل نو ممکن ہو سکے۔ یہ کوشش خوش آئند ہے۔اس کی ہمت افزائی کی جانی چاہیے اور اس تجربہ کو وقت کے ساتھ آگے بڑھایا جائے۔لیکن جب تک کوئی قابل عمل متبادل سامنے نہیں آتا ہے۔مسلمانوں کو جدید معاشی نظام میں بھرپور حصہ داری سے روکنا صحیح نہیں ہے۔اسلام میں جو حرام ہے وہ حرام ہے کسی کے حلال کرنے سے وہ حلال نہیں ہو جائے گا ۔لہٰذا اس بحث کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ بات یہاں صرف اتنی ہے کہ چونکہ موجودہ سودی نظام کا کوئی متبادل نہیں ہے ،اس لیے اس سے اس وقت تک فائدہ اٹھانے کی اجازت دی جانی چاہیے جب تک متبادل نظام وضع نہیں ہو جاتا ہے۔ خاص کر ہندوستان میں جہاں مسلمان اس وقت ملک کی پالیسی بنانے یا بدلنے کی اہلیت نہیں رکھتے ہیں ۔میری

رائے میں مسلمانوں کو موجودہ معاشی نظام کے تحت جو بھی جائز صنعتی اور تجارتی عمل ہیں اس میں بھرپور حصہ داری کے لیے ہمت افزائی کرنی چاہیے۔ اس طرح اگر تعلیمی اور معاشی میدان میں ملت آگے آتی ہے تو اس سے ملی قوت واستحکام میں مدد ملے گی جو وقت کی اہم ضرورت ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ مسلمانوں کو ڈرادھمکا کر اور بانٹ کر جو سیاست ہوتی رہی ہے اس سے باہر نکلنا ہوگا۔ ہم نہ ووٹ بینک ہیں اور نہ کسی کے زرخرید غلام۔ ہمیں دیکھنا ہوگا کہ کون ہمارے کاز کے لیے آگے آتا ہے اور کون ہمارا حق دینے کو تیار ہے۔ ہم کسی اور کی سیاست کے لیے مہرہ نہیں بنیں گے۔ ابھی تک ہم نے سیکولر عناصر پر اعتماد کیا ہے اور انہیں کچھ اور موقع دینا چاہیں گے۔ لیکن انہوں نے اپنی چال نہیں بدلی اور وہ دھوکہ دہی کی سیاست پر قائم رہے تو ہندوستان کی سیاست اب جس رخ پر چل چکی ہے مسلمانوں کو خود اپنا سیاسی محاذ بنانا ہوگا اور ایک واضح حکمت عملی کے ساتھ میدان میں آنا ہوگا۔

کل تک جس بھیڑئے کے آنے کا ڈر دکھا کر ہمارا ووٹ لیا جاتا رہا تھا اب وہ بھیڑیا نہ صرف آ گیا ہے بلکہ اس نے پورے باڑھ پر قبضہ کرلیا ہے۔ بہت سے لوگ جو شیر کی کھال پہن کر اس بھیڑیے کا مقابلہ کرنے کے لیے میدان میں کھڑے تھے جیسے ہی وہ بھیڑیا آیا تو میدان چھوڑ کر بھاگ گئے یا پھر اپنی کھال اتار کر اس کی صف میں جا ملے جوان کے پیچھے ڈرے سہمے کھڑے تھے۔ یہ منظر دیکھ کر حیران ہیں انہیں سمجھ نہیں آ رہا کہ کریں تو کیا کریں۔ جائیں تو جائیں کہاں۔ ہم بھیڑ بکریوں کی طرح خود کو ان بھیڑیوں کے حوالے کرنے کو تیار نہیں ہیں۔

ہم اس ملک کے پیدائشی اور فطری شہری ہیں۔ ہمیں اس ملک سے کوئی نکال نہیں سکتا ہے۔ اس ملک اور اس کے وسائل پر ہمارا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا کسی اور کا۔ یہ ہماری قدرتی رہائش گاہ ہے۔ لہٰذا ہمیں اس ملک میں عزت، برابری اور وقار کے ساتھ رہنے کا پورا حق ہے۔ اور ہمیں اپنے اس حق کے استعمال سے کوئی روک نہیں سکتا ہے۔

ہم اس ملک کے دستوری ڈھانچے اور سیکولر تانے بانے کا احترام کرتے ہیں۔ ہم دستور کے علاوہ نہ اس سے زیادہ اور نہ اس سے کم کسی چیز کا مطالبہ کرتے ہیں۔ ہم نہ کسی

کونقصان پہنچانا چاہتے ہیں اور نہ کسی کونقصان پہنچانے کی اجازت دینا چاہتے ہیں۔ہم ملک کی جغرافیائی وحدت،سالمیت اوراس کی اندرونی سلامتی،سرحدوں کی حفاظت کو ہر قیمت پر قائم اور برقرار رکھنا چاہتے ہیں ۔مسلمان اس ملک اورسماج کے لیے نہ کل خطرہ تھے اور نہ آج خطرہ ہیں اور نہ آئندہ خطرہ ہوں گے۔اس ملک کی وفاداری میں وہ کسی سے کم یا پیچھے نہیں ہیں۔اس لیے ان کے بارے میں جوغلط باتیں پھیلائی جارہی ہیں وہ محض ایک جھوٹا پروپیگنڈہ ہے جوملک دشمن،سماج دشمن طاقتوں نے پھیلا رکھا ہے۔مسلمان اپنی جان دے کربھی ہر قیمت پراس کی حفاظت کریں گے۔ بھارت کواگر پاکستان،بنگلہ دیش،افغانستان یاچین کوئی بھی آنکھ دکھائے گا تو ہم اس کی آنکھ نکال لیں گے۔لہٰذا مسلمانوں کی وفاداری پرکسی کوشک کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے ۔جولوگ ایسا کرتے ہیں وہ خود اس ملک کے غدار ہیں۔ کیونکہ اپنے ہی شہریوں کو غدار سمجھنا ملک سے غداری نہیں تو اور کیا ہے؟ اس کا مطلب صاف ہے کہ وہ جان بوجھ کر ملک میں بدامنی اورانتشار پیدا کرنا چاہتے ہیں۔

جولوگ اپنے حقیر سیاسی فوائد کے لیے یہ حرکتیں کرتے ہیں ان کو Expose کرنے کی ضرورت ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ ہمارے لیے حالات سخت ہیں اورفرقہ پرست عناصر ہرطرف سے اپنا شکنجہ مضبوط کررہے ہین۔لیکن ہمیں ڈرنا نہیں ہے اور نہ احساس کمتری میں مبتلا ہونا ہے۔ ہمیں ہمت وحوصلہ سے کام لینا ہے۔ایک بارجب خوف کی نفسیات طاری ہوجاتی ہے تو رہی سہی قوت مدافعت بھی ختم ہوجاتی ہے۔لہٰذا ہمیں متحد ہونا ہے،منظم ہونا ہے اور ڈٹ کر اور جم کر اس صورت حال کا مقابلہ کرنا ہے۔

ہمیں اپنی اکثریتی آبادی کے ساتھ ایک وسیع تر رابطہ مہم شروع کرنی ہے اور ایک Open dialogue شروع کرنا ہے اور ہر چھوٹے بڑے فورم میں کھل کر اپنے موقف کی وضاحت کرنی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ملک کی اکثریتی آبادی اوراس کا سواداعظم امن پسند،صلح پسند اور Accomodative ہے ۔ایک چھوٹے سے جارح گروہ کی وجہ سے پوری اکثریتی

آبادی سے بدگمان ہونے کی نہ کوئی وجہ ہے اور نہ ضرورت ہے۔ دراصل ہم لوگوں نے ابھی تک ایسے کسی رابطے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اب الگ الگ جزیروں میں رہنے کا وقت نہیں ہے بلکہ ان کے درمیان Communication & connectivity کی ضرورت ہے۔ اس معاملہ میں مسلمانوں کو دعوت ملنے کا انتظار نہیں کرنا چاہیے بلکہ اپنی طرف سے پہل کرنی چاہیے۔ ظاہر ہے شروع میں اس میں دقت ہوگی، لیکن بعد میں جب لوگوں کو اعتماد ہوگا تو وہ آپ کے ساتھ آنے کے لیے تیار ہوں گے۔ پھر یہ جتنی تیز ہوگی حالات میں اتنی ہی بہتری پیدا ہوگی۔ میرا خیال ہے کہ اس وقت مسلمانوں کو اپنی ڈیڑھ اینٹ کی سیاسی مسجد بنانے سے گریز کرنا چاہیے اور تجرباتی طور پر پہلے لوکل سلف گورنمنٹ یعنی گرام پنچایت اور میونسپل کارپوریشن کی سطح پر معاہداتی سیاست کے تحت الیکشن میں حصہ لینا چاہیے۔ یہ تجربہ اگر کامیاب ہوتا ہے تو اس کو ریاستی اور پھر مرکزی سطح پر بروئے کار لایا جاسکتا ہے۔ پہلے ہی مرحلے میں کوئی سیاسی پارٹی بنا کر ریاستی اور پارلیمانی الیکشن میں کود پڑنا سودمند نہیں ہوگا۔

دراصل ملک کی فضا ایسی ہے کہ کوئی غیر مسلم جلدی کسی مسلمان امیدوار کو ووٹ نہیں دیتا ہے اور بغیر غیر مسلموں کا اعتماد یعنی ووٹ حاصل کئے ہوئے کوئی مسلمان جیت نہیں سکتا۔ ریاستی اسمبلیوں اور پارلیامنٹ میں مسلمانوں کی گھٹتی نمائندگی کی یہ بڑی وجہ ہے۔ کوئی مسلمان کسی سیکولر پارٹی کی طرف سے بھی کھڑا ہوتا ہے تب بھی اس کو عام لوگوں کا ووٹ نہیں ملتا ہے کجا کہ کسی مسلمان پارٹی کے امیدوار کو کوئی ووٹ دے۔ ایسی جگہیں بہت کم ہیں جہاں کوئی مسلمان صرف مسلمانوں کے ووٹ سے جیت پائے۔ جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں وہاں اتنے امیدوار کھڑے ہوجاتے ہیں کہ ان کے اجتماعی ووٹ کا وزن کم ہوجاتا ہے اور وہاں سے بھی غیر مسلم امیدوار جیت جاتے ہیں۔ اس لیے مسلمان پارٹی سے بعض لوگوں کو شخصی یا گروہی فائدہ تو ہوسکتا ہے لیکن بحیثیت مجموعی ملت کو کوئی فائدہ نہیں ہوتا ہے۔

اب تک کا تجربہ یہی ہے۔ اس لیے یہ بات طویل مدتی سیاست کے حق میں ہے کہ مسلمان اکثریتی طبقہ سے رابطہ بڑھائیں اور ان کا اعتماد حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ یہ کام

خدمت ،محبت اوران تھک محنت کے ذریعہ ہی ممکن ہے اورہمیں چار وناچار اس حکمت عملی کو اختیار کرنا ہوگا۔

اس پوری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ ہم اپنے بندخول سے باہر آئیں۔صرف مسلمانوں کی فکر نہ کریں اور ان کے درمیان گھوم پھر کر خود کو مطمئن نہ کریں کہ ہم نے خدمت خلق اور انسانی ہمدردی کے تقاضے کو پورا کردیا ہے۔ساری انسانیت اللہ کا کنبہ ہے صرف مسلمان نہیں۔ اس لیے ہمارے رفاہی اور فلاحی کاموں کے دروازے تمام افراداور طبقات کے لیے کھلے ہونے چاہئیں اور جو غیر مسلم آبادی ہے اس کو ترجیحی بنیاد پر اپنے دائرۂ خدمت میں جگہ دینی چاہیے۔ ہمارے بزرگوں اور صوفیا نے تمام دردمندوں اورضرورت مندوں کے لیے اپنے آستانے کو کھلا رکھا تھا۔یہی وجہ ہے کہ بالکل اجنبی ماحول میں ان کے آستانے مرجع خلائق بن گئے تھے جن کے روشن نشانات آج تک موجود ہیں ہمیں اس ماڈل کو پھر سے زندہ کرنا ہے اور پھر سے ایک ایسا چشمہ فیض بننا ہے جہاں بلالحاظ مذہب وملت ہرفرد کی دادرسی کی جائے اور ہرکسی کی ضرورت پوری ہواور ہر شخص اعتماد کے ساتھ ہم سے رجوع کرے۔

کچھ لوگ یہ کہہ سکتے ہیں کہ جب مسلمانوں کے پاس خود وسائل بہت کم ہیں اور مسلمان غربت، جہالت اور درماندگی کے شکار ہیں، ان کی ضرورت خود پوری نہیں ہو پاتی ہے، اس صورت میں اپنے محدود وسائل سے غیر مسلم آبادیوں کی ضرورت پوری کرنے کی بات کیا غلط ترجیح نہیں ہوگی۔ میں کہتا ہوں نہیں ہوگی۔دوسرے یہ سنت رسول کا تقاضہ ہے۔ بدر کی جنگ میں کچھ قیدی گرفتار ہوکر آئے۔یہ کون لوگ تھے جو مسلمانوں کے جان اور دین کے دشمن تھے باضابطہ جنگ کرنے آئے تھے۔انہوں نے جنگ کی، کچھ لوگوں کو شہید کیا۔اللہ نے مسلمانوں کو فتح نصیب کی۔ اور یہ لوگ گرفتار ہوکر آئے۔مسلمانوں کی اپنی حالت کیا تھی۔خود ان کے گھروں میں چولھا نہیں جلتا تھا۔ معاشی تنگی تھی۔مگر اس وقت حضور نے ان قیدیوں کو مسلمان آبادی میں بانٹ دیا کیونکہ اسٹیٹ ان کی کفالت نہیں کرسکتا تھا۔ اورلوگوں نے جان اور ایمان کے دشمنوں کی ایسی ضیافت کی جو تاریخ میں مثال بن گئی۔خود بھوکے رہے اور ان کو کھلایا خود

روکھا سوکھا کھایا مگران کو اچھا کھانا دیا۔ اس اسوہ نے بہت سے لوگوں کے دلوں کی دنیا بدل دی۔ کیا یہ مثالیں محض سیرت کے جلسے میں مزے لے کر بیان کرنے کے لیے ہیں یا ان پر عمل بھی ہوگا؟

ہم چاہے نظریاتی طور پر فرقہ پرست نہ ہوں لیکن عملی طور پر ہمارے اندر بھی فرقہ پرستی آ گئی ہے اور ہم بھی جاہلی عصبیت کا شکار ہیں اور اپنے اور پرائے کے خودساختہ فرق میں مبتلا ہیں۔ یہ ہماری سب سے بڑی اندرونی کمزوری ہے۔ ہمیں اپنے ذہن اور طریق عمل کو انفرادی اور اجتماعی طور پر بدلنا ہوگا تبھی ہم عملی طور پر اس ملک میں Space بنانے میں کامیاب ہوں گے ورنہ فرقہ وارانہ تصادم کی راہ ہمیں ہلاک کردے گی۔

اس وقت ہمیں ایک نئی حکمت عملی اختیار کرنی ہوگی اور سب کی خدمت کے جذبے کے تحت ایک زبردست سماجی پہل کے ذریعہ سماجی امن وہم آہنگی جس کو

Social Initiative for peace & Harmony(SIPH) کا نام دیا جاسکتا ہے

کے ذریعہ سماج میں امن وخیر سگالی کا ماحول بنانا ہوگا۔ ہم اس وقت ذہنی تحفظات میں گرفتار ہیں اس سے باہر نکلنا ہوگا اور اپنی زبان اور اپنے ذہن، اور اپنے معاملات اور محاورات میں شعوری تبدیلی لانی ہوگی۔ مٹھی بھر لوگوں کو چھوڑ دیجئے جن کے ذہنوں کو Indoctrinate کر کے زہر بھر دیا گیا ہے ہندوستان کے عام ہند ومرد وخواتین نہایت شریف ہیں اور بھائی چارہ اورامن وآشتی میں یقین رکھتے ہیں لہٰذا ہمیں اس فرق کو اچھی طرح سمجھ کر ایسی پالیسی، ایسی حکمت عملی اور ایسا طریقہ عمل وضع کرنا ہوگا جس سے ہمارے لیے وسیع تر سماج سے جڑنا آسان ہوجائے گا اس کے لیے ابتدائی قدم کے طور پر ہمیں اپنے تمام فلاحی اور رفاہی اخراجات کا پچیس فیصد لازمی طور پر غیر مسلموں میں جوضرورت مند لوگ ہیں ان پر خرچ کرنا چاہیے۔ زکوٰۃ کے مد میں تالیف قلب کی جوایک شق رکھی گئی ہے شاید اس کو عملی طور پر روبہ کارلانے کا وقت آ گیا ہے۔ لہٰذا موجودہ ہندوستان میں ملی تحفظ کی تمام دفاعی اوراقدامی پالیسیوں اور طریق عمل کے ساتھ ساتھ وسیع تر سماج سے انسلاک یعنی Social cohesion ریل کی دوپٹری کی

طرح مساویانہ طور پر بچھانے کا اہتمام کرنا چاہیے ۔موجودہ حالات میں ملت کی ذہنیت (Mindset) کو اس جانب موڑنا آسان نہیں ہوگا مگر جب انہیں یہ بتایا جائے گا کہ دین وانسانیت اور سیاست کا یہ لازمی تقاضہ ہے تو دیر سویر ملت اس جانب راغب ہوگی۔شاید یہ اس وقت کی اہم ضرورت ہے۔

بند گلی سے آگے کی راہ

علامہ اقبال نے کہا تھا قوت فکر وعمل پہلے فنا ہوتی ہے، تب کسی قوم کی عظمت پہ زوال آتا ہے۔ایک اندازے کے مطابق فکر وعمل کے میخانے تین سو سال سے زائد عرصے سے بند پڑے ہیں۔کوئی قوم اگر اتنے عرصے تک فکری جمود کی شکار رہے تو اس کے اندر زوال پذیری کا پیدا ہونا فطری ہے۔

ٹوئن بی نے اپنی کتاب تاریخ تمدن میں قوموں کے عروج و زوال پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ابتداً جب کوئی مسئلہ پیدا ہوتا ہے تو قوم کا اجتماعی شعور اس پر فوراً قابو پالیتا ہے۔ اس کو اس نے کمزور چیلنج کہا ہے۔جب کوئی ایسا مسئلہ سامنے آتا ہے جس کو حل کرنے میں وقت لگتا ہے مگر قوم اس پر قابو پا لیتی ہے تو اسے حیات نو حاصل ہوتی ہے اس کو اس نے ریکویری کہا ہے لیکن جب مسئلہ سنگین نوعیت کا ہوتا ہے اور تا دیر اس کا حل نکالنا مشکل ہوتا ہے تو قوم بحرانی کیفیت میں مبتلا ہو جاتی ہے ۔اگر قوم اس بحران سے باہر نہیں نکلتی تو وہاں سے اس کا زوال شروع ہو جاتا ہے۔

ڈارون نے اپنے نظریہ تنازع للبقاء میں لکھا ہے کہ کوئی نوع چاہے وہ کتنی ہی مضبوط ہو اگر وقت کے ساتھ ارتقا پزیری کی صلاحیت کھو دیتی ہے تو فنا ہو جاتی ہے۔

قرآن کا نظریہ تاریخ یہ بتاتا ہے کہ زمانہ ایک حرکی عمل ہے جہاں تغیر و تبدیلی ایک

مسلسل عمل کے طور پر چلتی رہتی ہے۔تغیر ہی وہ مستقل عمل ہے جس کودوام حاصل ہے۔ لہٰذا چلتے ہوئے وقت کے ساتھ چلنا اور بدلتے ہوئے وقت کے ساتھ adaptation کے Process کے تحت خود کو آگے بڑھاتے رہنا زندگی کو پیہم جواں اور نمو پزیر رکھنے کے لیے ضروری ہے۔اس کے لیے ہر وقت ایک بیدار دماغ اور جاگتے ذہن کی ضرورت ہے۔

کسی قوم کا سوادِ اعظم ان فیوض و برکات سے مستفید ہوتا ہے جو اس کے تخلیقی،تعمیری اور ایجادی ذہن اسے عطا کرتی ہے۔ نالۂ نیم شبی اور رات کی تاریک ساعتوں میں قندیلِ چشم کو روشن رکھنے کا کام تو منتخب روزگار لوگوں کا وظیفہ ہوتا ہے۔ حدیث کی زبان میں بات کریں تو یہ علماء اور حکمران ہیں۔ان کی ذہانت،حکمت،اخلاق وکردار،علم واجتہاد پر ہی کسی قوم کا حال اور مستقبل منحصر ہے۔علماء سے مراد یہاں صرف سکہ بند قال اللہ وقال الرسول کہنے والے لوگ نہیں ہیں بلکہ اس میں،عرف عام میں انٹلیکچول، مدبر، محقق،سائنسداں اور ہر علم وفن میں مجتہدانہ صلاحیت رکھنے والے لوگ ہیں۔اسی طرح حکمراں میں ہر شعبدہ باز،سیاسی بازیگر نہیں بلکہ سیاسی مدبرین ومفکرین شامل ہیں جو قیادت کے منصب پر فائز ہیں۔

انیسویں صدی کا ہندوستان زبردست غلامی کی زنجیر میں جکڑا ہوا تھا۔ جس سے نجات پانے کے لیے مضبوط سماجی،سیاسی اور اصلاحی تحریکیں چلیں۔ ہندوستانی سماج کی بناوٹ ایسی ہے جس میں ایک قوم، مذہب،تہذیب اور زبان کے لوگ نہیں رہتے بلکہ یہ کثیر مذہبی سماج ہے اور ہر سماج کے اندرونی تضادات ہیں جس کی وجہ سے اس کے اندر اور باہر دونوں سطحوں پر ٹکراؤ پایا جاتا ہے۔ ہندوستان میں ویسے تو بہت سی قومیں آباد ہیں،مگر ہندو اور مسلمان دو بڑی قومیں ہیں۔اگر معروضی انداز سے دیکھا جائے تو ہندوستان کی ہندو قیادت زیادہ بالغ النظر ہے جس نے اپنی اندرونی کمزوریوں اور تضادات پر زیادہ سمجھداری سے قابو پایا ہے اور ایک بالکل بکھری بلکہ غیر متعلق اور باہم متضاد عناصر کو جوڑ کر ایک مضبوط ترقی پزیر قوم بنانے میں کامیابی حاصل کر لی ہے اور یہ عمل آج بھی جاری ہے۔اس لیے ہندوؤں میں سماجی استحکام کا عمل تیزی سے چل رہا ہے جس نے ملک کے اتحاد وسالمیت میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ملک کا اجتماعی شعور

اتنا حساس اور بیدار ہے کہ انتشار کی ہلکی سی رمق کا بھی سنجیدگی سے نوٹس لیا جاتا ہے اور اس کو حل کرنے کی سنجیدہ کوشش ہوتی ہے۔ ہندوستان جیسے متضاد اور متنوع ملک کا باہم جڑے رہنا ایک سیاسی اور تاریخی کرامت سے کم نہیں ہے جس کے لیے اس ملک کی اجتماعی قیادت کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔

دوسری طرف مسلمانوں کے پاس وہ ساری چیزیں موجود ہیں جو ان کو ایک مضبوط اور متحد ملت بنا سکتی ہیں۔ مگر مسلم ذہن وفکر کی تنگ دامانی نے اس کے اندر سیسہ پلائی دیوار بننے کی صلاحیت چھین لی ہے اس لیے قوموں کے اسٹیج پر اس کی ہوا اکھڑ چکی ہے۔ اب تک کی کوئی کوشش وہ عام فکری سطح نہیں بنا سکی ہے جس پر کھڑے ہو کر قوم آگے کا راستہ طے کر سکے، ہاں سینہ کوبی، شکوہ سنجی اور ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچنے میں قوم متحد ہے۔

مشترکہ ہندوستان میں مسلمانوں کی اجتماعی قیادت کی پہلی ناکامی تو یہ تھی کہ وہ ہندوستان کو متحد رکھنے میں ناکام رہی۔ اور دوسری ناکامی یہ تھی کہ تقسیم کے بعد جو حالات پیدا ہوئے ہیں اس سے باہر نکلنے اور اپنی تعمیر وترقی نیز ملی استحکام کی کوئی نئی سبیل پیدا کرنے میں ناکام رہی ہیں۔ ابھی تک مسلمانوں کے بیانیہ (Narrative) اور سوچ میں کوئی بڑی اور واضح تبدیلی نظر نہیں آئی ہے۔

اگر ہم موجودہ ہندوستانی تناظر میں بات کریں تو ہندوستان کے مسلم ذہن پر ژولیدہ فکری اور انتشار عمل پوری طرح مسلط نظر آتا ہے اور قوم ایک مقام پر ٹھٹکی گم سم کھڑی ہے جہاں سے آگے جانے کا کوئی حوصلہ نہیں رکھتی ہے۔ یہ بے حس، بے حرکت جامد وساکت ہے، زندگی تو ہے مگر نمو نہیں ہے۔ فکری جمود نے ساری راہیں مسدود کر دی ہیں۔ صدیوں سے تفقہ اور اجتہاد کے دروازے بند ہیں۔ مجدد الف ثانی، شاہ ولی اللہ، سرسید، مولانا آزاد، علامہ اقبال اور مولانا مودودی نے فکر ونظر کو نئی جہت دینے کی کوشش کی۔ مگر شاید ان کی باتیں ملت کے ایموشنل کوڈ کو ٹچ نہیں کر سکیں۔ اس ملت کو جس طرح ان سے جڑنا چاہیے تھا نہیں جڑ سکی۔ آج مسلمان تعلیم، معاش، سائنس، ثقافت، سیاسی حصہ داری یہاں تک کہ تحفظ اور شناخت کے جن مسائل سے

دوچار ہیں اس سے ہماری اجتماعی قیادت کی ناکامی صاف جھلکتی ہے۔

آزادی کے بعد اب تک کی سات دہائیوں کو ہندوستانی مسلمانوں کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو اسے خوف اور محرومی کا عہد کہا جا سکتا ہے۔ مسلمانوں کی پسماندگی پر گھڑیالی آنسو بہانے والوں کی کمی نہیں ہے۔ مگر اس کے تدارک کے لیے کہیں کوئی سنجیدہ اور ایماندارانہ کوشش نظر نہیں آتی۔ اس لیے ہر آنے والا وقت ان کی محرومی اور مایوسی میں اضافہ ہی کرتا ہے۔ جمہوریت کو دکھوں کا مداوا مانا جاتا ہے کیونکہ بے زبانوں کو ووٹ کی قوت نے جو طاقت عطا کی ہے اس سے ان کی تقدیر بدلنے کی امید پیدا ہوتی ہے۔ مگر ہندوستانی مسلمان جمہوریت کی برکات سے بھی محروم ہیں۔ ایک تو کسی سیاسی پارٹی کے پاس ان کی حالت سدھارنے کے لیے نہ تو کوئی ٹھوس منصوبہ ہے اور نہ کوئی سیاسی قوت ارادی (Political will) ہے۔ Appeasement کا غلغلہ اتنے زور سے بلند کیا گیا کہ عام آدمی تو عام آدمی اچھے خاصے دانشور لوگ بھی اس کا شکار نظر آتے ہیں۔ یہاں تک کہ ہماری انتظامیہ، عدلیہ، پریس اور پالیسی ساز ادارے اور افراد بھی تاریخی اور مذہبی تعصّبات سے اوپر اٹھ کر کچھ سوچنے اور کرنے کی صلاحیت کھو چکے ہیں۔ چنانچہ ہماری سیاست میں مستقل ڈنڈی ماری کا عمل جاری ہے۔ اگر ایک ہاتھ سے کچھ دیا جاتا ہے تو دوسرے ہاتھ سے فوراً چھین لیا جاتا ہے۔ در اصل آزادی کے قبل سے دونوں قوموں میں جس مسابقانہ سیاست کا دور شروع ہوا وہ آج تک جاری ہے۔ جب تک اس میں تبدیلی نہیں آتی کوئی موافقانہ ماحول پیدا کرنا مشکل ہے۔ ہندوستان میں عدلیہ آخری جائے پناہ سمجھی جاتی ہے۔ مگر ہماری عدلیہ کے ذمہ داران بھی اسی سماج و ثقافت سے آتے ہیں۔ اس کی تازہ ترین مثال میگھالہ ہائی کورٹ کے جج جسٹس سودیپ رنجن سین نے اپنے عہدے کے وقار کے برعکس 11 دسمبر 2018 کو حکومت ہند بالخصوص وزیر اعظم نریندر مودی سے کہا ہے کہ ہندوستان کو ہندو ریاست بنایا جائے اور کسی شخص کو اسے اسلامی ملک بنانے کی اجازت نہیں دینی چاہیے۔ لہٰذا ان کا ان تعصّبات سے بالکل پاک ہونا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ ہماری عدلیہ نے بہت سے معاملوں میں اور بعض اقلیتی معاملوں میں بھی لینڈ مارک اور تاریخی فیصلے

دئے ہیں،مگر جومسائل اقلیتوں کی شناخت یاان کے متعین دستور کی اسپرٹ سے ہم آہنگ نظرنہیں آتا، مثال کے طور پر ہندو شیڈول کاسٹ،شیڈول ٹرائبس اور بیک ورڈ کلاسیز کو ریزرویشن دینے کے معاملے میں عدالتوں کوکوئی دقت پیش نہیں آتی۔تمام سرکاری کمیشنوں کی رپورٹ سے یہ واضح اور ثابت ہو چکا ہے کہ مسلمان ملک کے تمام حصوں میں، تمام برادریوں اور طبقات کے مقابلے چند مستثنیات کو چھوڑ کر پورے ملک میں سب سے زیادہ پسماندہ اور حاشیہ پر ہیں۔اس وقت ملک میں جیسی تعصب اور تنگ نظری پائی جاتی ہے جب تک کچھ خاص وقتوں کے لیے ان کی حصہ داری متعین نہیں کی جاتی ، ان کوسماجی اور معاشی طور پر اوپر نہیں اٹھایا جاسکتا ہے۔رنگ ناتھ مشرا نے جوخود سپریم کورٹ کے چیف جسٹس تھے اور ملک کے قانون اور دستور کو اچھی طرح سمجھتے تھے انہوں نے اپنی رپورٹ میں تمام اقلیتوں کو15% اور اس میں مسلمان اقلیت کو10% تعلیم اور روزگار میں ریزرویشن کی سفارش کی تھی۔ یہ سفارش ملک کے دستور اور قانوں سے کسی طرح متغائر نہیں ہے۔کیا ایک ان پڑھ مسلمان کواس لیے تعلیم سے محروم رکھا جائے گا کیونکہ وہ مسلمان ہے؟ ایک بھوکے مسلمان کوسرکاری بھنڈار سے اس لیے غذا نہیں دی جائے گی کیونکہ وہ مسلمان ہے۔ دستور کہتا ہے کہ مذہبی بنیاد پر کسی کے ساتھ امتیاز نہیں برتا جائے گا۔پھر مذہب کی بنیاد پر مسلمانوں کو بنیادی ضرورتوں کی فراہمی سے کیوں محروم رکھا جارہا ہے؟ کسی مسلمان نے اس لیے ریزرویشن کی مانگ نہیں کی ہے کیونکہ وہ مذہباً مسلمان ہے بلکہ یہ مانگ پس ماندگی کی وجہ سے ہے اور اس وجہ سے ہے کہ جب تک ان کا حق اور حصہ متعین نہیں کردیا جاتا اس وقت تک جیسا تعصب ہے، ان کوان کا واجبی حق بھی نہیں ملتا ہے۔ لہٰذا جن بنیادوں پر دیگر مذاہب اور طبقات کوریزرویشن دیا گیا ہے،ان کو بھی انہی بنیادوں پر ریزرویشن دیا جائے ۔مگر آپ نے دیکھا کہ آندھرا پردیش میں جب مسلمانوں کو صرف چار فیصد ریزرویشن کی بات کہی گئی تو اس کوآندھرا ہائی کورٹ نے کالعدم قرار دے دیا۔اتنا ہی نہیں بلکہ اس تجویز پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ اس سے تبدیلی مذہب کو بڑھاوا ملے گا۔یہ Comment اپنے آپ میں اس Religious bias کو ظاہر کرتا ہے جس میں ہمارا اعلیٰ دانشور طبقہ بشمول جج

صاحبان مبتلا ہیں۔ اس صورتحال میں ہمارے لیے آگے کی راہ سخت اورمشکل بھری ہے۔ سارے دروازے بند نظر آتے ہیں، لہٰذا یہاں سے اپنے لیے راہ نکالنااس وقت ہمارے اجتماعی قیادت کے سامنے سب سے بڑا سوال ہے۔

حکومت اوراکثریت کیا کرے گی، یااس کو کیا کرنا چاہیے؟ حکومت اوراکثریت سے ہم کیسے رابطہ رکھیں اورانہیں کس طرح اپنے مسائل کا حل نکالنے کے لیے آمادہ کریں؟ میں ان سوالوں کو آپ کے اجتماعی شعور پر چھوڑتا ہوں۔ ملی سطح پر ہم یہاں جس بند گلی پر کھڑے ہیں وہاں سے آگے کی کیا راہ نکالی جاسکتی ہے یا کون سی راہ نکالنی چاہیے؟ میں اس سلسلے میں کچھ بنیادی نکات کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں، میں یہاں کوئی Blue-print پیش نہیں کررہا ہوں مگر یہ چنداشارات ہیں جو میرے خیال میں مستقبل کی پیش بندی کے لیےضروری ہیں جن کو ملت کے اندرغوروفکر کا موضوع بنایاجانا چاہیے۔

میرے خیال میں اس کا ایک پہلواپنے انسانی وسائل کے تحفظ اورفروغ سے متعلق ہےاوردوسراہندوستان کے مشترک سماج اور سیاست میں نفوذ سے متعلق ہے۔

پہلے معاملے میں مندرجہ ذیل تین طبقات کے سلسلے میں واضح پالیسی،ٹھوس حکمت عملی اورمتعین لائحہ عمل کی ضرورت ہے جس میں سب سے پہلے اپنی نئی نسل کی حفاظت، تربیت اور نشوونماپرغور، دوم خواتین کے سلسلہ میں واضح سوچ اورسوم عام مسلم آبادی بالخصوص مسلم پسماندہ برادریوں اورطبقات کے بارے میں واضح حکمت عملی متعین کرنے کی ضرورت ہے۔

(ا) نئی نسل کی حفاظت اورنشوونما:

انسانی وسائل ہماری سب سے بڑی قوت اورسب سے بڑی طاقت ہیں۔ ہماری تمام تر کمزوری کی وجہ ان وسائل کا زیاں ہے۔ ہماری اب تک کی تین نسلیں واضح منصوبہ بندی کےفقدان کے باعث بے استعمال، غلط استعمال، بےسمتی، انتشار، خوف اوراحساس کمتری کے باعث تباہ ہوچکی ہیں۔ لہٰذا اب بھی اگر ہم نے ہوش کے ناخن نہیں لیےتو اکیسویں صدی میں یا

تو اجتماعی خودکشی مانی جائے گی یا پھر گلا کٹ مسابقت میں خود کو چنگیزی قوتوں کے سپرد کرنا مانا جائے گا۔ اب وہ ہمارے ساتھ جیسا سلوک کریں یہ ہماری خواہش پر نہیں بلکہ ان کے رحم وکرم پر منحصر کرے گا۔ یہ صورت حال کسی قوم کے لیے پسندیدہ نہیں ہے۔لہٰذا اس معاملے میں ہمیں حساس اور بیدار ہونا ہوگا اور اپنی نئی نسل کی حفاظت اور فروغ کے لیے ٹھوس منصوبہ بندی کرنی ہوگی۔نئی نسل سے ہماری مراد دو ہے۔ایک 10-5 سال کے بچے جو ہماری گود اور گھروں میں پروان چڑھ رہے ہیں اور دوسرے 25-11 سال کے نوجوان جو تعلیمی اداروں میں زیر تعلیم ہیں۔ اسکلڈ ،سیمی اسکلڈ اور نان اسکلڈ ہیں۔ اس طرح 25-0 سال پر مشتمل ہماری نئی نسل ہماری کل آبادی کا لگ بھگ 50-45 فیصد ہے۔ اس نسل کو بچانا اس کو صحیح تعلیم وتربیت سے آراستہ کرنا،اس کی صحت پر دھیان دینا اور اس کو مفید پیداواری تعمیری اور ترقیاتی عمل سے جوڑنا وقت کی سب سے پہلی ضرورت ہے۔حکومت نے عام آبادی کے لیے جو فلاحی منصوبے بنائے ہیں ان منصوبوں کی جانکاری ان سے فائدہ اٹھانے کی صورت اور ان سے تعاون اور اشتراک کے ساتھ ملی سطح پر ٹھوس اور کارگر منصوبہ بندی ضروری ہے۔ ہمارے خیال سے اس معاملے میں ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ اکیسویں صدی کی دوسری دہائی ختم ہورہی ہے۔ اس معاملے میں ہمارے پاس ایک دس سالہ ویژن ہونا چاہیے۔ اگر ہم اگلے دس سال میں اس نسل کی حفاظت کرنے اور اس جانب ٹھوس اقدام کرنے میں کامیاب ہوگئے تو میں سمجھتا ہوں کہ اکیسویں صدی کے چیلنجز کا ہم نے مقابلہ کرنے کی اہلیت پیدا کرلی ہے۔ یہ کام کسی ایک تنظیم یا جماعت کا نہیں ہوسکتا، اس کام میں ملت اور حکومت دونوں کو مل کر کام کرنا ہوگا اور اس کے لیے ایک ملی وفاق کی ضرورت ہوگی،ملت کی تمام تنظیموں اداروں اور اشخاص کو سر جوڑ کر بیٹھنا چاہیے اور اپنی نئی نسل کی حفاظت اور استحکام کی ٹھوس منصوبہ بندی کرنی چاہیے۔

(۲) اپنے انسانی وسائل کے تحفظ اور فروغ میں دوسرا مسئلہ ہماری خواتین کا ہے:

انسانی معاشرہ مرد وخواتین کا مجموعہ ہوتا ہے۔ دونوں کے فروغ وبقا پر معاشرے کا

استحکام منحصر کرتا ہے،اس لیے دونوں جنسوں کے درمیان مناسب اور مبنی بر اعتدال نظریہ اپنانے کی ضرورت ہے۔ ہم نے اپنی آدھی آبادی کو بڑی حد تک غیر استعمال رکھا ہے، گویا پوری ملت ایک ٹانگ پر چل رہی ہے، دوسری ٹانگ یا تو مفلوج ہے یا اس طرح باندھ کر رکھی گئی ہے جس کا کوئی فائدہ حاصل نہیں ہو رہا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ ہماری عورتیں گھروں میں کام نہیں کرتیں۔ سوال ان کی بہتر تعلیم و تربیت اور ان کے مفید استعمال کا ہے۔ مسلمان معاشرے میں عورتوں کے بڑے مسائل میں ایک ان کی تعلیم کا مسئلہ ہے جس معاملے میں ہم اب تک کوئی واضح سوچ نہیں بنا پائے ہیں اور ابھی تک ہمارے ذہنوں میں اور ہمارے سماج میں شدید الجھن پائی جاتی ہے۔ واضح رہنمائی نہیں ہونے کی وجہ سے پورا سماج بے سمتی کا شکار ہے اور لوگ اپنے اپنے انداز سے سوچتے اور عمل کرتے ہیں۔ کوئی تو سرے سے تعلیم کا قائل نہیں ہے اور کوئی بالکل بے محابہ بے مہا را باحیت زدہ ماحول کا دلدادہ ہے۔ شہروں اور دیہاتوں میں مسلمان عورتوں میں جہالت کی بڑی وجہ ذہنی انتشار اور واضح رہنمائی کا فقدان ہے۔ تعلیم کے بعد دوسرا مسئلہ صحت اور حفظان صحت کا ہے۔ ہماری عورتوں پر تہری مار ہے ایک غربت، دوسری جہالت ،جس میں حفظان صحت کے اصولوں اور سہولتوں سے ناواقفیت شامل ہے اور تیسری غلط سماجی رسم و رواج۔ ان تینوں نے مل کر عورتوں کی صورتحال کو قابل رحم بنا دیا ہے۔ مسلمان معاشرہ میں عورتوں کا مقام اور کردار اس وقت ایک زبردست نزاعی مسئلہ بن گیا ہے۔ جس نے اسلام پر حملے کا شاہ دروازہ کھول رکھا ہے، اب وقت آ گیا ہے کہ ہم واضح سوچ کے ساتھ آگے بڑھیں۔

تعلیم، صحت، عزت، حفاظت اور ترقی ہر مرد و عورت کا بنیادی حق ہے۔ اس سلسلہ میں حکومت کی جانب سے جو منصوبے چلائے جا رہے ہیں ان سے بھرپور استفادہ کے ساتھ ساتھ ملی سطح پر بھی واضح پالیسی اور حکمت عملی بنانے کی ضرورت ہے۔ اس معاملے میں بھی ملت کے تمام عناصر اور افراد، بشمول ہوشمند خواتین کو سر جوڑ کر بیٹھنا چاہیے اور آئندہ دس سالوں کے لیے ایک واضح خواتین پالیسی کے ساتھ ملک و ملت کے سامنے ایک بہتر ترقی پذیر ماڈل پیش کرنا چاہیے۔ یہ وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اس وقت مسلم پرسنل لاء کے بعض

نکات نزاع کا موضوع بنے ہوئے ہیں۔ مسلکی تعصب اور تشدد نے صورتحال کو دھماکہ خیز بنادیا ہے۔ مسلکی رواداری کے ذریعہ اس کا حل نکالا جاسکتا ہے۔ اجتہاد کے دروازہ کو بالکل بند کردینا ملی انتشار میں اضافہ کرے گا۔ اگر ہم کسی سیلابی دروازے پر پیٹھ لگا کر کھڑے ہوجائیں گے تو اس سے سیلاب کو نہیں روک سکیں گے۔ اسلام جو قیامت تک کا دین ہے اپنے اندر بے پناہ لچک اور وسعت رکھتا ہے اور اس میں ہر طرح کے حالات سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت ہے۔ لہٰذا ایمان، علم وحکمت اور واضح نقطۂ نظر کے ساتھ مسئلہ کا حل نکالا جاسکتا ہے بشرطیکہ ہمارے اندر حالات ومعاملات کی سمجھ ہو اور ہم اجتہادی صلاحیت رکھتے ہوں۔

(۳) پسماندہ برادریوں کے باب میں واضح پالیسی:

مسلمان ہندوستان کی سب سے بڑی اقلیت بلکہ دوسری بڑی اکثریت ہیں جن کی مجموعی آبادی ملک میں سترہ کروڑ سے زیادہ ہے جو کل آبادی کا پندرہ فیصد ہے۔ صرف پانچ فیصد آبادی مسلمانوں کی کل آبادی کا اعلیٰ اور درمیانہ طبقہ ہے باقی پنچانوے فیصد آبادی تعلیم، معاش اور سماجی اعتبار سے پسماندہ ہیں۔ مسلمانوں میں غربت، جہالت اور سماجی پسماندگی ہر جگہ، ہر طبقہ اور ہر برادری میں پائی جاتی ہے۔ ہندوستان کے مخصوص سماجی پس منظر میں مسلمانوں میں بھی ذات پات کی قبیح رسم پوری طرح قائم ہے۔ جس نے طبقاتی تفاوت پیدا کررکھی ہے۔ اس کی وجہ سے مسلم پسماندہ برادریاں محرومین کی فہرست میں سب سے اوپر ہیں۔ مسلم قیادت کی عام ناکامی یہ رہی ہے کہ اس نے ان طبقات کے مسائل کو نہ تو ٹھیک سے سمجھا اور نہ ان سے جڑنے اور ان کو حل کرنے کی ایماندارانہ کوشش کی۔ ہندوستان کے موجودہ جمہوری عمل میں ذات طبقات اور علاقہ پر مبنی سیاسی پارٹیاں بننے لگیں اور انہوں نے اپنی حصہ داری اور حقوق کی جنگ شروع کی تو انہوں نے مسلم پسماندہ برادریوں کو بھی خود سے جوڑ کر ایک قوت بنانے کی کوشش کی۔ یہ عمل تو مسلم لیگ کے توڑ کے طور پر کانگریس نے ۱۹۳۲ء سے ہی Mass contact پالیسی کے تحت شروع کردیا تھا جس کو بعد کے دنوں میں اور پھیلاؤ اور استحکام حاصل ہوا۔ اب

پسماندہ برادریوں کی ایک متبادل متوازی قیادت پیدا ہوگئی ہے جس کو اپنے حالات کو سدھارنے سے زیادہ مسلم مین اسٹریم قیادت سے مقابلہ آرائی میں دلچسپی ہے۔ان کے خیال میں مسلمانوں کو جو Limited Space حاصل ہے اس میں اضافہ تو ممکن نہیں ہے اس لیے جب تک اس قیادت کو دھکا دے کر نیچے نہیں گرایا جاتا ہے، ان کو جگہ نہیں مل سکتی ہے۔اس لیے سماجی انصاف اور حصہ داری کی جنگ، آپسی نفرت، تشدد اور گول بندی کی وجہ بن رہی ہے جس نے مسلمانوں کے رہے سہے بھرم کو بھی ختم کر دیا ہے۔اس وقت دونوں جانب کوئی بالغ نظر اور قابل اعتماد قیادت نہیں ہے جو رابطے اور بات چیت کا ماحول پیدا کر کے ایک مشترکہ حکمت عملی تیار کرنے میں مدد کرے۔لہٰذا مسلمان عوام کو شتر بے مہار بننے سے بچانا، ان کے درمیان اتحاد وتعاون کی فضا پیدا کرنا، ان کے وسائل اور صلاحیتوں کا بہتر استعمال اور ایک مشترکہ اور متحدہ قوت کے طور پر ابھارنا وقت کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔جس کے حل پر ہی ہمارے مستقبل کے تمام امکانات منحصر کرتے ہیں لہٰذا اس سلسلے میں بھی سب کو سر جوڑ کر بیٹھنے کی ضرورت ہے۔ اجتماعی فکر وعمل سے ہی اجتماعی مسائل کا حل نکالا جا سکتا ہے۔

(۴) ہندوستان کے موجودہ سماج اور سیاست میں نفوذ:

چوتھا اہم سوال ہندوستان کے موجودہ سماج اور سیاست میں نفوذ کی راہ اور حصہ داری کا ہے۔ ہم نہ تو سعودی عرب، ایران اور افغانستان میں رہتے ہیں، نہ برما، بنگلہ دیش اور پاکستان میں رہتے ہیں اور نہ ہی روس چین اور جاپان میں رہتے ہیں نہ ہی اسرائیل اور فلسطین میں اور نہ امریکہ، انگلینڈ اور کسی یورپی ملک میں۔اسی طرح نہ ہم ساتویں اور بارہویں صدی میں رہتے ہیں اور نہ مغلیہ عہد اور برٹش ہندوستان میں۔۱۵/اگست ۱۹۴۷ء سے پہلے ملک کا جو سماجی سیاسی منظر نامہ تھا وہ بالکل بدل چکا ہے۔۱۵/اگست ۱۹۴۷ کے بعد ایک نیا ہندوستان ہمارے سامنے ہے۔اس لیے اوپر ذکر کیے گئے کسی ماڈل کا اطلاق ہمارے موجودہ حالات پر نہیں ہوتا ہے۔جزوی طور پر ان میں سے کوئی چیز ہم سے مطابقت رکھ سکتی ہے مگر کلی طور پر بالکل

نئی صورتحال ہے۔ ملک میں دستوری جمہوریت قائم ہے جس میں بلا لحاظ مذہب وملت ہر شخص کو یکساں حقوق واختیار حاصل ہے۔ مذہبی، لسانی، لونی اور تہذیبی اقلیتوں کو خصوصی تحفظات دئے گئے ہیں۔ درج فہرست ذاتوں اور قبائل نیز پسماندہ برادریوں کو ریزویشن دی گئی ہے۔ آزاد عدلیہ ہے۔ اظہار رائے کی آزادی ہے، تنظیم تحریک کی آزادی ہے اور ملک کے قانون اور دستور کی رعایت کرتے ہوئے اپنی فلاح کے لیے کوشش کرنے، تحریک چلانے، احتجاج کرنے اور جدوجہد کرنے کا اختیار حاصل ہے۔ جن طبقات نے بہتر سماجی اور سیاسی شعور کا مظاہرہ کیا ہے لگاتار ان کی حیثیت میں سدھار ہو رہا ہے اور ان کی سماجی، معاشی، سیاسی حصہ داری بڑھ رہی ہے۔ اس معاملہ میں مسلمان سب سے پیچھے ہیں۔ ملک میں فرقہ واریت اور فسطائیت کا رجحان غالب ہے۔ مسلمانوں کے باب میں تمام تر دستوری ضمانتوں کے باوجود حکومت، اکثریت، انتظامیہ، مقننہ، عدلیہ، پریس اور عوام کا ذہن صاف نہیں ہے۔ ہر جگہ ڈنڈی ماری ہے۔ ایک طبقہ کے ذہن میں اکثریت کا زعم اور زور اتنا غالب ہے کہ وہ عملاً اس ملک کو ہندو راشٹر کے طور پر دیکھتا ہے۔ کہنے کو کانگریس اور بی جے پی دو پارٹیاں ہیں۔ لیکن تھوڑے سے کاسمیٹک فرق کے ساتھ دونوں پارٹیوں میں کوئی بڑا فرق نہیں ہے۔ مبنی بر ذات اور علاقائی پارٹیاں اپنی ذات اور علاقے کی وفاداری یا حمایت میں جتنا مسلمانوں کی ضرورت محسوس کرتی ہیں اس کے مطابق اپنی پالیسی بناتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کانگریس یا بی جے پی کی طرف سے جب حکومت میں شمولیت کا بلاوا آتا ہے تو وہ آسانی کے ساتھ ایک خیمے سے دوسرے اور دوسرے سے پہلے میں چلے آتے ہیں۔ اسے کوئی نظریاتی نہیں بلکہ موقع پرستانہ الائنس کہا جاسکتا ہے۔ لفٹ پارٹیاں نظریاتی طور پر مذہب نیوٹرل ہونے کا دعویٰ کرتی ہیں مگر عملاً مسلمانوں کو سماجی، سیاسی اور معاشی اعتبار سے اوپر اٹھانے کے لیے انھوں نے کچھ نہیں کیا۔ اس کی سب سے بڑی مثال مغربی بنگال ہے جہاں پچھلے پینتیس سال سے برسر اقتدار رہنے کے باوجود مسلمانوں کی حصہ داری بے حد معمولی ہے جو اس بات کی غماز ہے کہ پارٹی کوئی بھی ہو ذہنیت ایک جیسی ہے۔

ایک لمبے عرصے تک مسلمانوں میں خوف کی نفسیات کو بنائے رکھنے کے لیے آگ

اورخون کی ہولی کھیلی جاتی رہی ہے اور یہ کھیل اور کتنے دن جاری رہے گا کہنا مشکل ہے۔ ملت کی سطحی جذباتیت، بے شعوری، انتشار اور مؤثر قیادت کا فقدان کے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان کے حقیقی مسائل پر کوئی دھیان نہیں دیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ اس وقت مسلمان تمام معاشی، سیاسی، سماجی، تعلیمی، تہذیبی اور صحت کے اشاریوں کی بنیاد پر ملک کی پسماندہ ترین آبادی ہیں۔ اس کے باوجود سوائے کچھ کاسمیٹک اکسر سائز کے کہیں کوئی ٹھوس منصوبہ بندی نظر نہیں آتی۔ مسلمانوں کو تعلیم اور روزگار میں ریزرویشن دینے کے سوال پر ایک نیا مہابھارت کھڑا کرنے کی دھمکی دی جاتی ہے۔ Action, Confrontational Politics اور Chain Reaction کے ماحول نے ایک دھماکہ خیز صورت حال پیدا کر رکھی ہے۔ اس صورت حال میں ہندوستان کے وسیع تر سماج سے رابطہ، ایک خوشگوار ماحول بنانے کی کوشش، انصاف اور باہمی حقوق کی پاسداری کے تحت جائز حقوق کی حصولیابی کی کوشش اس وقت ہماری سب سے بڑی ضرورت ہے۔

راہ چاہے جتنی کٹھن ہو اور منزل چاہے جتنی دور ہو کوئی مسئلہ لاینحل نہیں ہوتا ہے۔ اس کے حل میں دیر لگ سکتی ہے مگر صبر، حکمت اور Firm Determination سے اس کو حاصل کیا جاسکتا ہے۔ ہم جس نبیؐ کی امت ہیں اس نے نامساعد حالات میں یہی نسخہ سکھایا ہے اور انتہائی تنہائی کی حالت میں فرمایا لَاتَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ۔ لہٰذا مایوس اور دل شکستہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ ہمیشہ پرامید اور حوصلہ مند رہنے کی ضرورت ہے اور خدا پر بھروسہ کرتے ہوئے اپنی کوشش جاری رکھنی ہے۔ ہمیں اپنی ملت کے ایک ایک فرد کے اندر سے خوف اور احساس کمتری کو دور کرنا ہے اور اس کے اندر امید اور حوصلہ جگانا ہے۔ ہمارا موجودہ انتشار عملی اتحاد میں کیسے تبدیل ہو اس کی فکر کرنی ہے۔ ہمیں Reaction اور Reactionary Elements سے بچنا ہے۔ ایک براڈ وژن اور ٹائم باونڈ پلان کے ساتھ ملت کے ہر فرد تک پہنچ کر اس کو باہم جوڑنے کی کوشش کرنا ہے۔ ہمیں صرف سیاسی پارٹیوں سے ہی نہیں بلکہ وسیع تر ہندو سماج سے سماجی رابطہ بڑھانا اور مضبوط کرنا چاہیے اور انہیں انصاف کے تقاضے کے تحت جائز امور میں

تعاون کے لیے آمادہ کرنا چاہیے۔ ہم ہروقت اپنی ہی فکر نہ کریں بلکہ ہمارے ذہن ومنصوبے میں دوسروں کے لیے بھی جگہ ہونی چاہیے۔مصیبت اور آفات کے وقت ہمیں لوگوں کی مدد کے لیے آگے آنا چاہیے، ہر کمزور اور مظلوم کو ہماری ذات میں ایک سہارا نظر آنا چاہیے۔مختصر یہ کہ ملت کو اپنے بند خول سے نکل کر باہر کی دنیا سے ایک واضح خطوط کار کے ساتھ ربط وتعلق بڑھانے کی ضرورت ہے۔ایک بات اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ کوئی ہمیں مٹانہیں سکتا ہے۔وقتی اور مقامی طور پر کچھ لوگوں کو نشانہ بنایا جاسکتا ہے۔مگر پوری قوم کو فنا نہیں کیا جاسکتا ہے۔قومیں تلوار سے نہیں افکار سے بنتی اور مٹتی ہیں اور اپنے افکار کی حفاظت کے لیے ایک علمی تحریک اور اپنے حقوق کی بازیابی کے لیے عملی تحریک چلانے کی ضرورت ہے۔شاید یہی چیزیں بندگلی کو کھول کر آگے کی راہ بنانے میں مددگار ہوسکتی ہیں۔

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

ملی تعمیر کے نکات:

میں ذیل میں چند نکات کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں جو میرے خیال میں ملی تعمیر اور نشاۃ ثانیہ میں مددگار ہوں گے۔

(۱) ملت کی نئی نسل (لڑکے اور لڑکیوں) میں اپنے دین وثقافت کے ساتھ اچھی، معیاری اور مفید عصری تعلیم پر زور

(۲) ملت کے مرد وخواتین کی صحت اور حفظان صحت پر زور۔

(۳) ملت کے اندر امداد باہمی، معاشی استحکام اور معاشی ترقی پر زور۔محنت کی عزت اور بھیک سے نفرت پیدا کرنے کی مہم۔ معاش اور روزگار کے مواقع پیدا کرنے اور اسکل ڈیولپ منٹ اور انٹر پرینر شپ پر زور۔

(۴) ملت میں محنت وجانفشانی کا جذبہ پیدا کرنا۔حوصلہ اور ہمت پیدا کرنا، ہار نہیں ماننا،

ناکامیوں کے باوجود سنبھلنا اور ہمت کرکے اٹھنا، صبر اور ڈسپلن کا ماحول پیدا کرنا۔ یہ سب ہماری ملی تعمیر میں سنگ میل ثابت ہوں گے۔

(۵) ملت میں مسابقت کا داعیہ اور جذبہ پیدا کرنا اور محنت و اہلیت کے بل پر آگے بڑھنے کی کوشش کرنا۔

(۶) ہر حال میں حوصلہ بلند رکھنا۔ ڈر اور خوف کو اپنے دل سے نکال دینا، ڈر کس بات کا، ناکامی کا، پیچھے چھوٹ جانے کا، اپنے واجبی اور جائز حق سے محروم رہ جانے کا، چوٹ اور زخم کا، موت اور بے آبروئی کا، اس وقت یہ سب ہمارا مقدر ہیں۔ ہمارے پاس ہماری محرومیوں کے کھونے کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ اگر ہم اس احساس سے باہر نکل آئیں اور اتحاد، علم اور اجتماعیت کے ساتھ حوصلہ مند جدوجہد کریں تو ایک دنیا فتح کرنے کے لیے ہمارے سامنے ہے جس کو ہم اپنے علم، حوصلہ اور جد و جہد سے حاصل کر سکتے ہیں۔

(۷) ملت کے ہر فرد کو، ہر مرد عورت کو، ہر چھوٹے بڑے کو ہر امیر و غریب کو، ہر سالم اور معذور کو، ہر شہری اور دیہاتی کو، ہر ان پڑھ اور پڑھے لکھے کو، ہر اعلیٰ او ادنیٰ کو قیمتی مانیں، اہم جانیں، انہی کو ملا کر، ان کو جوڑ کر یہ ملت بنی ہے اس لیے ہمارے لیے ہر فرد اہم ہے۔ ہر فرد ضروری ہے۔ ہر فرد قیمتی ہے۔ ہر فرد مساوی ہے، ہر فرد عزت دار ہے۔ کسی کو چھوٹا یا بڑا نہ سمجھیں سب کو برابر کا درجہ دیں اور جو جس صلاحیت کا ہے اس اس کی صلاحیت اور حیثیت کے مطابق ملی تعمیر میں اس سے کام لیں۔ اگر قائد زیرک اور ذہین ہو تو وہ خس و خاشاک کو بھی قیمتی بنا دیتا ہے حضورؐ نے مکہ اور مدینہ کے بدوؤں سے وہ کام لیا ہے جو بڑے بڑے دانشور اور جرنیل بھی نہیں کر سکتے۔ عرب کے ریگستان کے یہ ذرے زمین کے تارے بن گئے۔ تاریخ خود کو دہرا سکتی ہے بشرطیکہ ہم ان کی عزت کریں، ان کی چھپی ہوئی صلاحیتوں کو پہچانیں اور ایک وژن کے ساتھ ان سے کام لیں۔

(۸) ملت میں اتحاد واعتماد کی فضا پیدا کریں، ٹوٹنے، توڑنے، الگ ہونے کے بجائے جڑنے، جوڑنے اور ساتھ چلنے پر زور دیں۔ جو جتنی دور اور جتنی دیر تک ساتھ چلنے پر آمادہ ہو اس کو ساتھ لے کر چلیں۔ ملت میں کھلی بحث کا ماحول پیدا کریں۔ لوگوں کو بے خوفی کے ساتھ اپنی بات کہنے کا موقع دیں، دوسروں کی بات سنجیدگی سے سنیں۔ اختلاف کی صورت میں فتویٰ بازی سے بچیں، ایک دوسرے کو برداشت کرنے کا داعیہ پیدا کریں۔ تشدد اور انتہا پسندی سے بچیں، افہام وتفہیم سے سارے مسئلہ حل کئے جا سکتے ہیں۔ مومن او رکافر اور جنت دوزخ کا فیصلہ دنیا میں نہیں آخرت میں ہوگا۔ یہ فیصلہ ہم اور آپ نہیں خدائے بزرگ و برتر کرے گا۔ اس لیے خدائی منصب اپنے ہاتھ میں نہ لیں اور جب تک آدمی خود کو مسلمان کہتا رہے اسے مسلمان مانیں اور مسلمانوں جیسا معاملہ کریں۔ ہاں اگر وہ خود اسلام کا قلادہ اپنی گردن سے نکال کر پھینک دیتا ہے تو اس کی جو بھی نئی حیثیت ہے اس کو تسلیم کرتے ہوئے اس سے معاملہ کیا جائے گا۔ ہم نہ تو کسی کو دین میں داخل ہونے کا اور نہ خارج ہونے کا فتویٰ دیں، اس سے ملت کمزور ہوگی، لوگوں میں انتشار پیدا ہوگا اور دین کے دشمنوں اور معاندین کو آپ پر انگلی اٹھانے اور دین کا مذاق اڑانے کا موقع ملے گا۔ عورتوں کے حقوق کا ہر وقت ہر حال میں خیال رکھیں اور ان کو اپنے مشترکہ اجتماعی عمل کا حصہ بنائیں۔ ان کی صلاحیتوں سے بھرپور فائدہ اٹھائیں۔

(۹) مقامی سطح سے لے کر اوپر کی سطح تک جہاں اور جیسی گنجائش ہو اور جتنا ممکن ہو اپنے اندر اجتماعیت کو فروغ دیں اور ملک کے موجودہ نظام میں جتنی گنجائش اور مواقع موجود ہیں ان سے بھرپور فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں ملک کے برابر کے شہری ہونے کے ناطہ ہمارے جو بھی شہری حقوق ہیں ان کو حاصل کرنے میں کوتاہی نہ کریں۔ اس کے لیے ایک طرف ملک کے نظام قانون، مزاج، اسکیم اور پروگرام کو جاننا اور دوسری طرف اس سے استفادہ کے طریقہ کو سمجھنا ضروری ہوگا۔ ضرورت اس

بات کی ہے کہ ہمارے درمیان ایسے لوگ ہوں جوان معلومات کوعام لوگوں تک پہنچائیں اورایک بیداررائے عامہ پیدا کرکے اس کو حاصل کرنے کی کوشش کریں ملک کے پولٹیکل سسٹم ،عدلیہ، پریس اورسول سوسائٹی کے ذریعہ جتنے شہری حقوق کاحصول ممکن ہے ان کوحاصل کرنے کی جدوجہد کی جائے اورتمام تر مظلوم محروم، کمزوراور پسماندہ طبقات کامتحدہ اورمشترکہ محاذ بنا کراپنے حقوق کی بازیابی کی کوشش کی جائے۔لیڈرشپ کی صرف اوپری سطح پرضرورت نہیں ہے بلکہ ہرسطح پراور ہرکام کے لیے لیڈر کی ضرورت ہوتی ہے۔لہٰذا اپنے اندر ہرمیدان میں ایسے لوگوں کو ابھاریں اوران کےساتھ تعاون کریں جوکسی بھی معاملے میں قائدانہ صلاحیت رکھتے ہیں اورقوم وملک کی رہنمائی کرسکتے ہیں۔

(۱۰) ہندوستان کا پورا سماج ہندومسلم ،سکھ،عیسائی،دلت ،آدی باسی فارورڈ، بیک وارڈ، یہ سب ہمارا سماج ہے یہ ہمارے لوگ ہیں یہ ہمارے بھائی بند، دوست اور پڑوسی ہیں ہم نہ ان سے کٹ سکتے ہیں اورنہ کاٹ سکتے ہیں۔ یہ آٹے میں نمک کی طرح ہیں جن کو الگ نہیں کیا جاسکتاہے۔ ہماراجینامرنا،خوشی غم،تجارت تعلیم تمام سماجی معاشی اورتمدنی ضرورتیں اس سماج سے جڑی ہیں۔اس لیے یہ ہمارا سماج ہے۔اس کی بھلائی،خیرخواہی،اس کی خدمت،اس سے محبت ہم پرفرض ہے۔لہٰذااس سماج کو اپناسماج سمجھیں۔اس سے جڑیں،اس کو جوڑیں اوردل سے ان کی بھلائی،خیرخواہی میں پوری سرگرمی سے حصہ لیں۔اپنے بندخول سے باہرنکلیں۔سیاست،معیشت، تعلیم،روزگاراورتمام شعبہ ہائے حیات میں اپنی واجبی حصہ داری کے لیےمشترکہ پلیٹ فارم بنا کر جدو جہد کریں۔ظلم و ناانصافی میں کسی کا ساتھ نہ دیں اورحق اورانصاف میں مل جل کر کھڑے ہوں۔ ہم ایک ملک میں رہنے والے ایک کشتی میں سوارلوگ ہیں نفرت ،عصبیت،تعصب،تنگ دلی اورالگاؤ سے ہمارامسئلہ حل نہیں ہوگا،محبت،وسعت ،انصاف،فراخ دلی اور جوڑ سے ہم مضبوط ہوں گے اورآگے

بڑھیں گے۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہ چند نکات ہیں جو اس بند گلی (Cul-de-sac) سے آگے کا راستہ کھولتے ہیں۔ یہ ابھی کچی سڑک ہے، چھوٹی سی پگ ڈنڈی ہے۔ دھول اور کیچڑ سے اٹی ہے اس میں دلدل اور خاردار جھاریاں بھی ہیں لیکن یہی کچی سڑک اور پگڈنڈی آگے کسی شاہ راہ تک جاتی ہے۔ اس لیے ہم کو چاہیے جو زحمت و پریشانی ہو اس شاہ راہ تک پہنچنا ہے یہی ایک راہ ہے۔ لہٰذا ہمیں اسی راہ پر گرتے پھسلتے اور گر گر کر اٹھتے ہوئے آگے بڑھنا ہے۔ بقول شاعر ؎

انہیں پتھروں پہ چل کے اگر آ سکو تو آؤ
میرے گھر کے راستے میں کوئی کہکشاں نہیں ہے

بند گلی کی راہ یہیں سے نکلتی ہے۔

باب دوم

- ملی اختلافات وانتشار-ایک مثبت نقطۂ نظر کی ضرورت
- معمار حرم باز بہ تعمیر جہاں خیز
- ہندوستان میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی
- علم کی بنیاد پر قومی یکجہتی: وقت کی ضرورت
- بین الملل تعلقات اور اسلام

ملی اختلافات وانتشار
ایک مثبت نقطہ نظر کی ضرورت

انسانی وسائل کی قدر و قیمت

انسان اور جانور میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ انسان علم وعقل ،نطق وفہم اور شعور و آگہی سے آراستہ ہوتا ہے جب کہ جانور میں یہ خصوصیات بڑی حد تک محدود ہوتی ہیں ۔لیکن انسانوں میں بھی اللہ نے ہر کسی کوایک جیسی عقل وفہم نہیں دی ہے ۔علم وعقل اورفہم وآگہی کے اعتبار سے جوشخص جتنا بلند ہے حیات وکائنات کے معاملات اورمسائل کووہ اسی اعتبار سے سمجھتا اورفیصلہ کرتا ہے ۔اگرعلم وعقل کے ساتھ ایک شخص بلندیِ کردار سے آراستہ ہوتو اس کی قیمت و وقار میں اور بھی اضافہ ہوجاتا ہے۔اوروہ انسانیت عظمی کا سرسبد گل مانا جاتا ہے ۔جس قوم اور ملک میں ایسے افراد زیادہ ہوتے ہیں اس کی قوت ووقار میں چار چاند لگ جاتا ہے اوروہ دنیا کی ممتاز قوم مانی جاتی ہے ۔جہاں ان کی تعداد کم ہوتی ہے اسی اعتبار سے اس کی اہمیت کم سمجھی اورتسلیم کی جاتی ہے ۔لہٰذا انسانی وسائل کی قدر و قیمت پر ہی کسی قوم کی برتری اوراقبال مندی منحصر ہے۔

نئی سوچ کی ضرورت

عروج وزوال کوئی دائمی چیز نہیں ہیں۔انسانی سماج ایک لمبی دوڑ(Marathan Race) کی طرح ہے۔ایک قوم ایک وقت میں اپنی بعض خوبیوں اورصلاحیتوں کی وجہ سے

دوسری قوم سے آگے ہوتی ہے تو وہ اس ریس میں جیت جاتی ہے۔اور جب تک اس کی برتری قائم رہتی ہے اس کی فتح یابی کا پرچم لہراتا رہتا ہے۔لیکن اگر اس سے تھوڑی سی بھی لغزش ہوئی یا اس نے غفلت برتی تو دوسری قوم کو غالب آنے میں دیر نہیں لگتی۔اس صورت میں تقدیر کو کوسنے یا کسی دوسری قوم کو گالی دینے سے صورتحال کو بدلا نہیں جاسکتا ہے۔بلکہ اس کو بدلنے کی ایک ہی صورت ہے، اپنی کمزوریوں کو سمجھنا اور پھر اس کو دور کرنے کے لیے ٹھوس اور مثبت سوچ کے ساتھ کوشش کرنا۔

مسلمانوں نے اپنی قومی زندگی میں بہت اتار چڑھاؤ دیکھے ہیں۔بعض ملکوں اور علاقوں میں یہ غالب قوت بن کر رہے ہیں اور پھر حالات نے پلٹا کھایا اور وہ مغلوب ومحکوم ہو گئے۔کبھی کبھی اور کہیں کہیں تو وہ بالکل ہی ہلا مارے گئے اور ایک قیامت ان کے سر سے گذر گئی۔پھر حالات بدلے اور وہ محکومی کے دور سے باہر آئے۔دور کیوں جایئے اسی ہندوستان میں تاریخ نے ایسے کئی ادوار دیکھے ہیں۔لیکن آج ہم جس صورت حال سے دو چار ہیں وہ بالکل نئی صورتحال ہے جو نئی سوچ اور نئی پہل کی متقاضی ہے۔

ہمیں اس ملک کی اکثریت سے، سنگھ پریوار سے، Political Establishment سے شکایت ہے اور محاوراتی طور پر ہم اپنے سارے دکھوں اور امراض کا انہیں ہی ذمہ دار مانتے ہیں۔اس بات میں جزوئی صداقت تو ہے مگر یہ مکمل سچائی نہیں ہے۔ان حالات کے لیے سب سے زیادہ ذمہ دار ہم خود ہیں اور جب تک ہم کو خود اس کا احساس نہیں ہوگا اور ہم اپنی حالت آپ سنوارنے کے لیے آگے نہیں آئیں گے اس وقت تک حالت کو بدلا نہیں جاسکتا۔اس لیے ہمیں کچھ بنیادی باتیں طے کرنی ہوں گی۔اور طے کر کے اس کے مطابق اپنی تنظیم نو کرنی ہوگی۔ پھر عمل وتحریک اور جہد وقربانی کے ذریعہ اس نقشہ میں رنگ بھرنا ہوگا۔تبھی اس رات کی صبح ممکن ہے ورنہ دن نکلنے کے بعد بھی بادلوں کا جھرمٹ سورج کی روشنی سے ہمیں محروم رکھے گا۔

انتشار اور اختلاف میں فرق

اس وقت مسلمانوں میں اس بات کا بڑا شور ہے کہ ہر سطح پر اور ہر جگہ انتشار ہے۔یہ

بات کسی حد تک صحیح بھی ہے لیکن اتنا نہیں جتنا شور مچایا جاتا ہے۔ ہر تبدیلی کو، ہر کوشش کو، ہر جماعت کو انتشار کا نام دینا خود انتشار ذہنی کی علامت ہے۔ دراصل لوگ انتشار اور اختلاف کا مطلب نہیں سمجھتے۔ اگر آپ کے ہاتھ میں شیشہ کا ایک گلاس ہے اور وہ چھوٹ کر کسی سخت فرش پر آرہا ہے تو وہ ٹوٹ کر بکھر جائے گا، اس کو انتشار کہتے ہیں۔ مگر کسی بستی میں ایک جماعت تھی جو کچھ کام کرتی تھی اور ایک دوسری جماعت کچھ دوسرے کام کے لیے بن گئی یا پہلی جماعت کے لوگ ٹھیک سے کام نہیں کر رہے تھے اور کچھ لوگوں نے ان کاموں کے لیے کوئی دوسری جماعت بنالی تو اس کو اختلاف تو کہا جاسکتا ہے انتشار نہیں اور ہر اختلاف مردود ہو کوئی ضروری نہیں ہے۔ بعض اوقات بعض معاملات میں اختلاف نہ کرنا غلط ہے اور اختلاف کرنا صحیح۔ ہمارے یہاں احترام کا ایسا چھوئی موئی تصور پایا جاتا ہے کہ کسی مسئلہ پر کسی کے خلاف زبان کھولنا بے ادبی سمجھی جاتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ذہن وفکر پر اس طرح پہرے بٹھا دیئے جاتے ہیں کہ آدمی کچھ سوچ ہی نہ سکے۔ یہ زوال کی پہلی منزل ہے۔ جب فکر میں تنوع اور ارتقاء کی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے تو اس مقام پر ٹھہراؤ پیدا ہوتا ہے اور اس دائمی متحرک کائنات میں ٹھہراؤ موت کی اور حرکت زندگی کی علامت ہے۔ اگر آپ ملت کے زوال کی وجہ تلاش کریں تو فکری جمود کو ملت کے زوال کی سب سے بڑی وجہ پائیں گے۔ لہٰذا ہمیں اپنے نقطۂ نظر پر نظر ثانی کرنی چاہئے۔

مسلمانوں کے مسائل

ہندوستان میں مسلمان مجموعی اعتبار سے اٹھارہ کروڑ ہیں۔ ریاست بہار میں ان کی تعداد ڈیڑھ کروڑ سے زائد ہے۔ (یہ اعداد وشمار 2011 کی مردم شماری سے ماخوذ ہیں) انفرادی حیثیت سے دیکھا جائے تو ہر شخص ایک مسئلہ ہے۔ اس لحاظ سے جتنی آبادی ہے اتنی ہی اس کے مسائل ہیں۔ قومی اور ملی سطح پر کچھ ایسے مسائل ہیں جو انہیں تک محدود ہیں۔ مثلاً مسلمانوں کی دینی اور تہذیبی شناخت کا مسئلہ، جان ومال کی حفاظت کا مسئلہ، شعائر دین، مساجد، مقابر، اوقاف اور پرسنل لاء کی حفاظت کا مسئلہ، اردو زبان، مدارس اور دیگر تعلیمی اداروں کا مسئلہ۔ یہ

ایسے مسائل ہیں جوملت کے وجود، پہچان اور منفرد حیثیت سے متعلق ہیں۔ہندوستان کے موجودہ تاریخی، سیاسی تہذیبی، اور سماجی تناظر میں یہ وہ مسائل ہیں جن کوحل ہونا ہے۔

ہر پڑھا لکھا سمجھدار مسلمان ان مسائل کی اہمیت کو سمجھتا ہے اوراس کے بارے میں فکر مند ہے اور ملک میں ان مسائل کے حل کی جوکوششیں ہورہی ہیں وہ ان کا ساتھ بھی دیتا ہے۔ان میں اختلاف آراء بھی ہیں اورطریقہ کار کا بھی اختلاف ہے۔لیکن اگر یہ اختلاف اس مقصد کونقصان نہیں پہنچا تا تو پھراس کوغلط یا نقصان دہ نہیں کہا جاسکتا ہے۔فسادات ہوتے ہیں یا دیگر آفات سماوی سے سابقہ ہوتا ہے۔اس وقت مختلف جماعتیں ریلیف کا کام کرتی ہیں۔ہماری خواہش ہوتی ہے کہ سب مل کر ریلیف کا کام کریں۔اگرایسا ہوجائے تو بہتر ہے۔مگر ایسا نہ ہو، اورمختلف جماعتیں اورادارے الگ الگ اس کام کوکرتے ہیں تواس کوغلط سمجھنا اورانتشار و اختلاف سے تعبیر کرنا محدود ذہنی ہے۔کبھی کبھی تباہی اتنی بڑی ہوتی ہے کہ تمام متاثرین تک پہنچنا مشکل ہوتا ہے۔کوئی ایک جماعت اپنی تمام کوششوں کے باوجود بہت چھوٹے سے حصے کو بہت کم وقت کے لیے اور بہت محدود پیمانے پرامداد پہنچا پاتی ہے۔ساری دنیا کی حکومتیں اورخود ہمارے ملک کی حکومت اپنے تمام تر وسائل، مضبوط اور مربوط ایجنسیوں کے ذریعہ بھی اس کام کو ٹھیک سے نہیں کر پاتی ہیں۔بے ایمانی گھپلا اورگھوٹالہ سے کام متاثر ہوتا ہے۔مگر ایمانداری سے کام کرکے بھی نقصان کی بھرپائی ممکن نہیں ہوتی ہے۔اس صورت میں اگر ملت میں دس بیس اداروں کی طرف سے یہ کام کیا جاتا ہے تو کیا برا ہے؟ ہاں یہ دیکھنا ضرور چاہیے کہ کچھ لوگ ریلیف کے نام پرخودکو ریلیف تونہیں پہنچارہے ہیں؟ ذمہ داری اورایمانداری سے کام کررہے ہیں یانہیں؟ ان کے کام میں شفافیت ہے یانہیں؟ وہ اپنی رپورٹ دیتے ہیں یانہیں؟ ان کی رپورٹ میں کوئی گھپلا یا گھوٹالا اورٹرانسفر آف فنڈ تونہیں ہوا ہے؟ مسلمانوں کے سنجیدہ باشعور لوگوں کواس پرنظر رکھنی چاہیے۔ملی اورقومی میڈیا کواس کا حساب لینا چاہیے اوراگرکوئی گڑبڑی ہوتی ہے تو ایسے لوگوں کو بے نقاب کرنا چاہیے تاکہ مصیبت زدوں کے لیے دی گئی رقم کا غلط استعمال نہ ہو۔اگراس کام کے لیے جماعت بنتی ہے تو اسکوغلط نہیں سمجھا جاسکتا ہے۔

آزادی کے بعد تھوڑے تھوڑے وقفہ سے جب ملک میں فسادات کا دور تیزی سے شروع ہوا تو مسلمانوں کی جان و مال کی حفاظت کرنے ،ان کی سیاسی قوت کے موثر استعمال کے لیے مشورہ دینے اور دیگر ملی امور میں رہنمائی کے لیے ملت کے تمام سرکردہ افراد اور جماعتوں نے مل کر مسلم مجلس مشاورت بنائی ۔ابتداء میں یہ ادارہ ایک موثر قوت کے طور پر ابھرا۔مگر بعد میں اس کی چوٹی کے قائدین کے انتقال کے بعد ایک خلا پیدا ہوگیا جس سے اس کی کارکردگی متاثر ہوئی اور عملاً یہ ادارہ غیر فعال بن کر رہ گیا۔ چند سال قبل اس کو فعال اور متحرک بنانے کی کوششیں کی گئیں ۔اس وقت یہ دو دھڑوں میں تقسیم ہے ۔(یہ بات اس وقت کی ہے جب مسلم مجلس مشاورت سید شہاب الدین اور مولانا محمد سالم قاسمی کی قیادت میں دو دھڑوں میں بٹ گئی تھی)اس کا جواز کیا ہے یہ تو ان دھڑوں کے قائدین ہی بتا سکیں گے ؟ مگر مجھے ان اختلافات سے کوئی وحشت نہیں ہے بشرطیکہ وہ دونوں صاحبان جن دھڑوں کی قیادت فرما رہے ہیں، وہ اپنا کام تندہی سے کریں ۔جو کام کرے گا آگے بڑھے گا اور اس کا وقار قائم ہوجائے گا اور جو کام نہیں کرے گا وہ پیچھے رہ جائے گا اور خود بکھر جائے گا۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ مسلمانوں کو مشاورت کی ضرورت ہے۔اگر یہ لوگ اس مقصد کو پورا نہیں کرتے ہیں اور کوئی نئی جماعت بنانے سے یا ایک سے زیادہ فورم تشکیل دینے سے اس مقصد کی تکمیل ہوتی ہے تو کیا جانا چاہیے۔ یہ انتشار نہیں ضرورت ہے۔اگر دو تلواریں ایک میان میں نہیں رہ سکتی ہیں تو اس کو الگ الگ میان میں رکھنے میں کیا حرج ہے؟ بس غرض اتنی ہونی چاہیے کہ تلوار اپنا مقصد وجود ثابت کرے ورنہ اس کو گلا کر چھری، چاقو بنا لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

اردو زبان کا مسئلہ

اردو کبھی ہندوستان کی مشترکہ زبان تھی اب یہ صرف شمالی ہند کے مسلمانوں کی زبان بن کر رہ گئی ہے اور یہاں بھی سرکاری ریشہ دوانیوں اور اردو والوں کی نادانیوں کے سبب اس کا دائرہ سکڑتا جا رہا ہے۔اردو کو بعض تاریخی اور سیاسی وجوہات کی بنا پر تمام تر دستوری ضمانتوں

کے باوجود دیس نکالا دینے کی سازش رچی جاتی رہی ہے۔اس کی حفاظت کے لیے ملکی سطح پر انجمن ترقی اردو ہند اور ریاستی سطح پر اسی طرح کی کئی تنظیمیں بنائی گئی ہیں۔اردو زبان کی حفاظت واشاعت ہندوستان کی تمام ملی اور سیاسی جماعتوں کے ایجنڈے میں شامل ہے۔اس کے علاوہ بھی کئی ادبی اور لسانی تنظیمیں ہیں جو مختلف مقامات پر کام کر رہی ہیں۔بعض شخصیات ایسی ہیں جن کا ذاتی کارنامہ بعض اداروں اور انجمنوں سے کہیں زیادہ ہے۔کبھی کبھی ان اداروں کے در میان شخصی ٹکراؤ بھی ہوتا ہے۔اور ایک انجمن کو توڑ کر کئی انجمنیں بنائی جاتی ہیں۔اگر ان سب سے اردو کے کاز میں بہتری آتی ہے یا جمود ٹوٹتا ہے تو اس پر تشویش کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں پھر دہراتا ہوں عوام کو کام چاہیے اور جو کام کرے گا لوگ اس کو اہمیت دیں گے اور جو لوگ کام نہیں کریں گے خود بخود ہٹتے اور دور ہوتے چلے جائیں گے۔اس لیے اردو کے لیے اگر اس کے واقعی مسائل کو حل کرانے کے لیے مقامی، ریاستی اور ملکی سطح پر دس بیس ادارے اور انجمنیں قائم ہوتی ہیں تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے بلکہ اس کو خوش آئند مانا جانا چاہیے۔مثل مشہور ہے کہ جب دھوبی پر دھوبی بستا ہے تو کپڑوں کی دھلائی بہتر ہو جاتی ہیں۔صحت مند مسابقت اچھی چیز ہے اور اس کا استعمال کیا جانا چاہیے۔

پرسنل لاء کی حفاظت

اسلام مکمل دین ہے انفرادی اور اجتماعی زندگی کا کوئی معاملہ اور حصہ ایسا نہیں ہے جس میں اللہ اور اس کے رسول نے رہنمائی نہ دی ہو۔اسلام کے نفاذ کے لیے قوت نافذہ چاہیے جو اس وقت ہندوستان کے مسلمانوں کو میسر نہیں ہے۔اس لیے وہ اسلام کا دیوانی اور فوجداری قانون یا اس کا معاشی نظام قائم نہیں کر سکتے ہیں۔ہمارا ملک ایک سیکولر ملک ہے۔ ہندوستان میں ایک سے زائد مذاہب پائے جاتے ہیں۔مذہب کو عام طور پر دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ایک کا تعلق عقائد، عبادات، اخلاق، اور عائلی معاملات سے ہے اور دوسرے کا تعلق معیشت اور معاشرت نظم ملکی دفاع اور بین الاقوامی تعلقات سے ہے۔ جہاں تک

دوسرے کا تعلق ہے تو چونکہ ملک کا نظام سیکولر ہے اس لیے اس کی بنیاد کوئی مذہبی حکم و قانون نہیں ہوگا بلکہ مصالح عامہ کا لحاظ رکھتے ہوئے عوام کی آزادانہ مرضی سے چنی گئی سرکار اجتماعی علم و مشورے کی بنیاد پر اتفاق رائے یا کثرت آرا کے مطابق فیصلہ کرے گی۔ مگر ایک فرد کے عقائد کیا ہوں گے؟ وہ کس کی عبادت کرتا ہے اور کس طریقہ سے کرتا ہے اور اس کی نجی اور عائلی قانون مثلاً شادی بیاہ، جینا مرنا، نکاح و طلاق، وراثت اور وصیت کا طریقہ کیا ہوگا یہ ہر مذہب، سماج اور تہذیب میں الگ الگ ہے جس سے اس کی شناخت کا پتہ چلتا ہے۔ ملک کے دستور کے لحاظ سے ہر فرد کو جو انفرادی آزادی دی گئی ہے اس میں عقیدہ، طریقہ عبادت اور عائلی قانون کی حفاظت کی آزادی کا حق حاصل ہے ساتھ ہی اس کو محفوظ اور مستحکم رکھنے کے لیے اپنے عقیدہ، زبان اور کلچر کی تعلیم اور اس غرض کے لیے تعلیمی ادارے کھولنے کا حق دیا گیا ہے۔ اور یہ سب بنیادی حقوق کے دائرے میں ہیں جس کو کوئی حکومت، اس کی کوئی ایجنسی یا عدالت تلف نہیں کرسکتی ہے۔ بلکہ اگر اس پر کوئی شب خون مارنے کی کوشش کرے تو عدالت سے رجوع کیا جاسکتا ہے اور عدالت کی ذمہ داری بنتی ہے کہ شہریوں کے بنیادی حقوق کی حفاظت کو متحقق کرے۔ ہندوستان کا دستور بعض حیثیتوں سے مجموعہ اضداد ہے مثلا بنیادی حقوق کے باب میں دستور نے عقائد، عبادات اور مذہبی امور کی بجا آوری کی ضمانت دی ہے اور اپنے زبان و کلچر کی حفاظت کا حق دیا ہے، مگر رہنما اصول کے باب میں یکساں سول کوڈ بنانے کی بات کہی گئی ہے۔ جبکہ یہ بات دستوری طور پر طے ہے کہ بنیادی حقوق کی حیثیت نافذ العمل قانون کی ہے جبکہ رہنما اصول کی حیثیت محض ایک مشورہ کی ہے۔ جو ایک آئیڈیل صورت حال کی طرف رہنمائی کرتا ہے مگر اس کو کسی عدالتی حکم کے تحت بنیادی حقوق کو پامال کر کے نافذ نہیں کیا جاسکتا ہے۔

اب اس دلچسپ صورتحال پر غور کریں۔ کچھ لوگ جن کو مسلمانوں سے کسی نہ کسی درجہ میں بُغض ہے اور بعض تاریخی اور سیاسی وجوہات سے وہ مسلمانوں کی الگ شناخت بالکل پسند نہیں کرتے ہیں، ان کی خواہش ہے کہ اسلامی تہذیب وثقافت کے جو بھی باقیات اس ملک میں ہیں ان کو جلد از جلد ختم کردیا جائے۔ چنانچہ آزادی کے بعد سے مسلسل ایسی سازشیں ہورہی

ہیں تا کہ مسلمانوں کے پرسنل لاء کو تبدیل کر دیا جائے۔مسلمانوں نے ایسی ہر کوشش کا سختی سے نوٹس لیا ہے اوراس کو ہر قیمت پر روکنے کے لیے اپنی آمادگی ظاہر کی ہے۔جس کے نتیجہ میں ملک کی سیاسی جماعتوں اور حکومت کو یہ کہنا پڑا کہ جب تک مسلمان خود نہیں چاہیں گے اس وقت تک ان کے پرسنل لاء میں تبدیلی نہیں ہوگی۔

حکومت نے یہ محسوس کیا کہ اس ملک میں ایک نئے قسم کی قومی کشمکش کا آغاز ہوگا اور بلا وجہ ہزاروں انسانوں کی جان جائے گی ، کیونکہ مسلمان جیتے جی ایسی کسی تبدیلی کو قبول نہیں کریں گے۔تو ان لوگوں نے اپنی حکمت عملی تبدیل کر دی۔اب یہ کوشش چار محاذوں پر ہو رہی ہے۔

پہلی کوشش یہ ہے کہ مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقہ کو ایسی تعلیم و تربیت سے آراستہ کیا جائے جو انہیں دین اسلام سے بیگانہ کر دے اوران کے لیے اسلامی پرسنل لاء کا احترام بے معنی ہو جائے۔اوراس سے الگ اور آزاد ہو کر شادی بیاہ اور دیگر معاملات انجام دیں۔اس طبقہ کی سیاسی اور حکومتی سطح پر پذیرائی کی جاتی ہے تا کہ سادہ لوحوں اور مفاد پرستوں کو ان جیسا بننے کی ترغیب ملے۔دنیا میں جب بھی کوئی فکر غالب ہوتی ہے اس کے بہت سے رفیق وکیل پیدا ہو ہی جاتے ہیں۔اور دنیا میں ان کا زور واثر ان کی چلت پھرت اکثر لوگوں کو گمراہ کر دیتی ہے۔

دوسری کوشش یہ کی گئی کہ مسلمانوں میں ایک نام نہاد اصلاح پسند گروہ ابھارا جائے اوران کی باتوں کو بڑے پیمانہ پر تشہیر کر کے عوام کو گمراہ اور کنفیوز کیا جائے۔

تیسری کوشش حامی گروہ کے اندر انتشار اوراختلاف کو ہوا دے کر ان کو کمزور کرنا ہے۔چوتھی کوشش حقوق انسانی اور حقوق نسواں کے نام پر خواتین جماعتوں اورانجمنوں کو اٹھانا اور ان کے ذریعہ اصلاح وتبدیلی کی مانگ کرانا ہے تا کہ پرسنل لاء میں تبدیلی کی راہ ہموار ہو سکے۔یہ سب کام اس ملک میں ہو رہے ہیں۔لیکن لوگوں کو یہ بات معلوم ہے کہ مسلمان سماج کی اس وقت جیسی بناوٹ ہے یہ کوششیں کامیاب نہیں ہو سکتی ہیں۔اس لیے انہوں نے ایک چور دروازہ ڈھونڈ لیا ہے اور وہ ہے عدالت کا۔عدالت کے پاس جو قوت نافذہ ہے جس کے

سامنے انتظامیہ اور مقنّنہ بھی زیر دست ہیں یہ کہہ کر کہ اب عدالت کا حکم آچکا ہے، اس لیے حکومت سوائے اس کے کہ وہ اس فیصلہ کو نافذ کرے کچھ نہیں کرسکتی۔ اس طرح بغیر سیاسی رنجش مول لیے بڑی آسانی سے یہ کام کیا جاسکتا ہے جس کو محاورے کی زبان میں کہا جاسکتا ہے کہ سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔(۱)

شاہ بانو کیس میں مسلمانوں کا موقف-اصولی مباحث

شاہ بانو کیس کے ذریعہ یہی کوشش کی گئی لیکن مسلمانوں نے اس کا جس سختی سے نوٹس لیا حکومت نے پارلیمنٹ کے ذریعہ قانون بنا کر اس کے اثرات کو کالعدم کردیا۔ شاہ بانو کیس کا سب سے کمزور پہلو یہ ہے کہ مسلمان ابنائے وطن کو اپنی بات ٹھیک سے سمجھا نہیں پائے۔ ان کا عام تاثر یہ ہے کہ مسلمان سماج میں عورت کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ ایک مرد کسی عورت کو خواہ وہ جوان ہو یا بوڑھی بڑی آسانی سے تین طلاق دے کر گھر سے نکال سکتا ہے چاہے اس کا کوئی پرسان حال ہو یا نہ ہو۔ بظاہر یہ بات کچھ عجیب اور بے تکی لگتی ہے۔ پھر اس تاثر کے ساتھ یہ بات بھی انہیں عجیب لگی کہ عام ملکی قانون کے تحت جب عدالت نے آئی پی سی کی دفعہ ۱۲۵ کے تحت سوا سو سے پانچ سو روپیہ مطلقہ عورت کو گذارہ بھتہ دینے کا فیصلہ کیا تو پوری مسلم قوم بھڑ اٹھی اور پورے ملک میں خلفشار پیدا ہوگیا۔ حالانکہ یہ معاملہ کی انتہائی معصومانہ اور ناقص نمائندگی ہے۔ مسلمانوں کا غصہ محض اتنی سے بات پر نہیں تھا۔ اور نہ اتنی سی بات کے لیے اتنے بڑے رد عمل کی کوئی ضرورت تھی۔ مسلمانوں کا غصہ دراصل مندرجہ ذیل وجوہات سے بھڑکا۔

(۱) قرآنی احکام سے اخذ و استنباط یعنی Interpretation کا اختیار کس کو ہے؟
دنیا کا عام دستور ہے کہ جو جس علم وفن میں ماہر ہوتا ہے اسی کو اس فن میں استنباط کا اختیار حاصل ہوتا ہے۔ ایک شخص کسی ایک علم وفن کا ماہر ہے اس سے یہ لازم نہیں آتا

---

(۱) 2014 میں نریندر مودی کی قیادت میں بی جے پی سرکار بننے کے بعد پرسنل لاء میں تبدیلی کی مانگ تیز ہونے لگی اور حکومت نے طلاق ثلاثہ کو قابل تعزیر جرم بنادیا۔ 2019 میں دوبارہ برسراقتدار آنے کے بعد باضابطہ اسے قانونی شکل دے دیا گیا ہے جس کو عدالت میں چیلنج کیا گیا ہے۔

کہ کسی بھی دوسرے علم وفن میں استنباط کا حق رکھتا ہے۔ایک جگہ اس کی حیثیت عالمانہ ہوسکتی ہے مگر دوسرے میدان میں اس کی حیثیت طالب علمانہ ہوگی۔ اگر ہمارے علمائے کرام مغربی فقہ وقانون کا interpretation کرنا شروع کردیں تو لوگ کہیں گے کہ مولوی صاحب! یہ آپ کے بس کا نہیں ہے کیونکہ آپ اس کے ابجد سے بھی واقف نہیں ہیں بلکہ اسلامی عدالتیں بھی ایسا کریں تو ان کا مذاق اڑانے سے باز نہیں آئیں گے۔عدالت عظمیٰ نے جب فقہائے اسلام سے آزاد ہوکر خود سے قرآنی آیات سے اخذ و استنباط شروع کردیا اور وہ بھی ایک ناقص ترجمہ کی بنیاد پر تو علماء نے اسے ایک غلط قدم قرار دیا کیونکہ اس سے قرآن کی منمانی تاویل کا دروازہ کھلتا ہے۔اگر اس کی اجازت دے دی جائے تو قرآن پاک کو تحریف سے کوئی نہیں بچا سکتا۔پچھلے پندرہ سو سالوں میں ایسی مذموم حرکتیں مختلف مما لک میں ہوتی رہی ہیں اور مسلمانوں کے بعض گمراہ فرقوں نے بھی اس کی کوشش کی ہے۔مگر ملت نے ہمیشہ اس کا سختی سے نوٹس لیا ہے اور ایسی ہر کوشش کو ناکام کردیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ قرآن اپنے متن اور مفہوم کے اعتبار سے تحریف سے پاک ہے۔

یہ بات عقلی اور منطقی طور پر بھی غلط ہے۔دور کیوں جایئے خود دستور ہند کی مثال لے لیجئے ۔ہندوستان وہ ملک ہے جہاں کی قومی زبان ہندی ہے۔اس کے علاوہ دستور میں 22 دیگر زبانوں کو قومی زبان کا درجہ دیا گیا ہے۔مگر دستور ہند کی تدوین انگریزی زبان میں ہوئی ہے اس کے سارے مباحث انگریزی میں ہوئے ہیں ۔اگر چہ ملک کے دستور کو ہندوستان کی ہر زبان میں ترجمہ کرکے شائع کیا گیا ہے اور ہندی کو مرکزی اور ریاستی حکومتوں نے سرکاری زبان کے طور پر اپنایا ہے۔جس کا مطلب یہ ہوا کہ سرکاری کام کاج ہندی میں کئے جاسکتے ہیں مگر جہاں تک دستور سے اخذ و استنباط کا مسئلہ ہے تو یہ بات صاف صاف کہی گئی ہے کہ قانونی طور پر دستور کے اخذ و استنباط کے لیے انگریزی زبان،انگریزی لغت ،الفاظ کی بناوٹ ،اس کے مستعملات ،

انگریزی صرف ونحو، دستورساز اسمبلی میں بحث کے آثار ہی اس کے ماخذ ہوں گے۔
جب دستور ہند جوانسانی ذہن کی اختراع ہے جس میں ترمیم وتنسیخ کا دستوری حق حاصل ہے مگر یہ حق صرف ملک کی عدالت و پارلیمنٹ کو ہی ہے اور وہی اس میں اخذ و استنباط کا حق رکھتی ہیں۔ اس صورت میں قرآن پاک جو اللہ کی کتاب ہے عربی زبان میں ہے، تو عربی لغت، صرف ونحو، آثار وروایات، تفاسیر واحکامات سے بالکل آزاد ہوکر کسی کو بھی استنباط کا حق دے دیا جائے اور وہ بھی کسی ایسے ادارے کو جو اس پر ایمان نہیں رکھتا ہے بلکہ اس کو بدلنے کی دلی آرزو رکھتا ہے۔ تو اس پر مسلمانوں کا مشتعل ہونا فطری تھا کیونکہ اس سے قرآن پاک اور اس کے احکامات میں تحریف کا چور دروازہ کھلتا ہے۔ لہٰذا مسلمان ایسی کسی کوشش کو کبھی برداشت نہیں کرسکتے ہیں۔

(۲) مسلمانوں کی مخالفت کی دوسری وجہ یہ تھی کہ عدلیہ نے یہ اعلان کردیا کہ حکومت کے پاس سیاسی قوت ارادی نہیں ہے جس کی وجہ سے یہ ملک میں یکساں سول کوڈ نافذ نہیں کررہی ہے جب کہ عدلیہ کے ہاتھ بندھے ہوئے نہیں ہیں بلکہ عدلیہ اپنے فیصلوں کے ذریعہ سول کوڈ نافذ کرے گی۔ قانون سازی کا اختیار پارلیمنٹ کو ہے عدالت کو نہیں ہے۔ لہٰذا اگر عدالت پارلیمنٹ کا رول ادا کرنے لگے تو مقنّنہ اور عدلیہ کے بیچ ایک عجیب سی صورت حال پیدا ہوجائے گی جو ہندوستان جیسے تکثیری ملک میں جمہوری حقوق اور انسانی آزادی کے نقطہ نظر سے ایک خطرناک بات ہے۔ لہٰذا مسلمانوں نے تمام جمہوری اداروں کو اپنے اپنے دائرہ میں رہ کر کام کرنے کے لیے مہم چھیڑی تاکہ سماج کے کمزور طبقات اور اقلیتوں کو جو قانونی اور دستوری تحفظات حاصل ہیں ان پر کوئی شب خون نہ مار سکے۔

عدلیہ کا یہ Activism مسلمانوں کی نظر میں ملک کی سماجی بناوٹ اور تہذیبی تحفظات کو مجروح کرنے والا تھا اس لیے مسلمانوں نے اس کی مخالفت کی۔ اس معاملے میں مسلمان ملک کی عام آبادی سے دو قدم آگے ہیں اور انہیں ملک کی قومی

جمہوری اداروں کی آزادی، عصمت اوراختیار کے حفاظت کی زیادہ فکر ہے۔تمام ملک کواس معاملے میں مسلمانوں کا احسان مند ہونا چاہیے۔

(۳) تیسری اہم بات یہ تھی کہ دستور میں ایک بنیادی حقوق کا باب ہے اوردوسرا رہنما اصول کا ہے ۔بنیادی حقوق دستور کا ناقابل تنسیخ حصہ ہے جودستور کے بنیادی ڈھانچہ میں آتا ہے اوررہنما اصول ایک آئیڈیل اورمشاورتی حصہ ہے۔بنیادی حقوق عدالت کے ذریعہ نافذ العمل ہوگا مگر رہنما اصول عدالت کے ذریعہ نافذنہیں کرایا جاسکتا ہے۔اگر بنیادی حقوق اوررہنما اصول کے درمیان کوئی نزاع ہوجائے تو بنیادی حقوق کی بالادستی تسلیم کی جائے گی اور ہماری عدالتوں نے ہمیشہ دستور کے بنیادی حقوق کے حق میں متعدد فیصلے دئے ہیں۔مگر پرسنل لاء کے معاملے میں اس نے ساری بات الٹ دی۔ایک طرف دستور کے بنیادی حقوق کے باب میں فرد اور جماعت کواپنے مذہب،زبان،کلچر،عقائد،عبادات اور پرسنل لاء کی حفاظت کا حق دیا ہے۔ دوسری طرف رہنما اصول میں یکساں سول کوڈ کی بات کی گئی ہے تو یہ اپنے آپ میں ایک تضاد ہے۔مسلمانوں نے اپنے احتجاج کے ذریعہ دستور کی اس خلاف ورزی کو روکا۔لوگوں نے مسلمانوں کے اس نقطہ نظر کواس لیے قبول نہیں کیا کیونکہ وہ ہر قیمت پر مسلمانوں کی الگ تہذیبی شناخت مٹا دینا چاہتے تھے۔اب اگر یہ کام دستور کی عصمت مجروح کرکے اوراس کے بنیادی ڈھانچہ کی خلاف ورزی کرکے بھی ہوتی ہے تو ان کواس میں اعتراض نہیں ہے کیونکہ یہ معاملہ مسلمانوں سے متعلق ہے۔اس ملک میں قبائلی،شمال مشرقی علاقوں کے لوگوں، ناگالینڈ والوں اور بعض ہندواقوام کوبھی اپنا پرسنل لاء رکھنے کی اجازت ہے اوران کو ہرقسم کا دستوری اور عدالتی تحفظ حاصل ہے۔مگر یہی مطالبہ مسلمان ایک اقلیتی مذہبی گروہ کی حیثیت سے کرتے ہیں توان سے یہ حق چھیننے کی کوشش کی جارہی ہے۔حالانکہ مسلمان اس کا مطالبہ نہیں کررہے ہیں بلکہ محض حاصل شدہ اختیار وآزادی کا تحفظ چاہتے ہیں۔

مسلمان اس سوچ کے خلاف ہیں اورانہوں نے انہیں وجوہ سے دستور اوراس کے بنیادی معتقدات کی حفاظت کے لیے زوردارمہم چھیڑی۔آخرلوگوں نے ایمرجنسی کی مخالفت کیوں کی تھی؟ جب کہ ایمرجنسی کا کلاؤز دستور میں موجود ہے۔ اس وقت بنیادی حقوق،شہری آزادی، پارلیمانی نظام اور جمہوریت کی حفاظت کا نعرہ کیوں دیا گیا؟ آپ جوکریں سب ٹھیک ہے اورمسلمان جوکریں سب غلط ہیں۔مسلمانوں نے اس مہم کے ذریعہ دستور کے بنیادی ڈھانچے کی حفاظت کی ہےاوراس کے لیے پورے ملک کومسلمانوں کا احسان مند ہونا چاہیے۔

(۴) چوتھی بات یہ ہے کہ یہ فیصلہ ناقص اور نامکمل تھا،اولاً تو یہ مسئلہ ہندومسلم مسئلہ نہیں ہے بلکہ مسلمان سماج کا اندرونی مسئلہ ہے۔اگر آپ عورت کے حقوق کے نقطۂ نظر سے اس مسئلہ سے دلچسپی رکھتے ہیں۔تو اس کو وسیع تر سماجی تحفظ کے دائرے میں رکھ کر دیکھنا چاہیے۔آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟ یہی نا کہ جب ایک عورت کا طلاق ہوجاتا ہےتو بالکل بے یارو مددگار ہوجاتی ہے۔پھراس کا کھانا خرچہ کہاں سےاور کیسے چلے گا۔یہ مسئلہ صرف مطلقہ عورت کانہیں ہے بلکہ ہراس آدمی کا ہےجس کی آمدنی اس کی ضرورت سے کم ہے۔بھارت میں آج بھی لاکھوں مردوعورت بھوکے پیٹ سوتے ہیں ان کی کفالت کون کرے گا؟ جن کے شوہر دائم المریض ہیں کچھ کمانہیں سکتے یا جو بیوہ ہیں ان کی کفالت کیسے ہوگی؟ جن لوگوں کومسلمان عورتوں کی اتنی فکر ہے کیا وہ بتاسکتے ہیں فسادات میں سب سے زیادہ کس طبقہ کا نقصان ہوتا ہے؟ یہ عورتیں اور بچے ہوتے ہیں جوسب سے زیادہ ظلم وزیادتی کا شکار ہوتے ہیں۔کیا کبھی ان کی کفالت کے بارے میں سوچا گیا ہے؟ کوئی قانون بنا؟ کسی عدالت نے ان کے نفقہ کے انتظام کے لیے کوئی فیصلہ دیا؟ میں مانتا ہوں کہ بہت سے طلاق غلط وجوہات سے اور غلط طریقے سے دئے جاتے ہیں۔مگر کیا سب طلاق غلط ہیں؟ کیا طلاق مسلمان سماج کا سب سے بڑا مسئلہ ہے؟ تمام مطالعات سے یہ بات ثابت

ہے کہ مسلمان سماج میں آج بھی طلاق کا رواج ملک کی تمام دوسری برادریوں سے کم ہے۔ لہٰذا اس مسئلے کا سید ھا حل یہ ہے کہ تمام مطلقہ عورتوں کو جونادار ہیں عملاً بیوہ یا بے شوہر تسلیم کیا جائے اوراس کو سماجی تحفظ کے وسیع تر دائرے میں لاکر اس کی کفالت کا معقول انتظام کیا جائے۔ مسلم سماج کو یورپی سماج بنانا مسلمان سماج کی اصلاح نہیں بلکہ اسے بگاڑنا ہوگا جس کی مسلمان کبھی اجازت نہیں دیں گے۔

دراصل یہ سارا مسئلہ مسلمانوں کے حقیقی مسائل سے توجہ ہٹانے اور ہندوستان میں مسلمانوں کے قانونی باقیات کو ختم کر کے ہندوسماج میں ضم کرنے کی سازش سے تعلق رکھتا ہے۔ جس کی وجہ سے مسلمانوں میں اتنا زبردست احتجاج کیا ورنہ ۱۲۵/ روپئے سے لے کر ۵۰۰ روپئے تک کی معمولی رقم کی خاطر یہ شور وغوغا بے معنی ہے۔ جس قوم میں آج بھی زکوٰۃ اور انفاق کا جذبہ دوسری قوموں کے مقابلے زیادہ ہے وہ اتنی حقیر سی رقم کے لیے اتنا شور مچائے یہ ایک غلط تعبیر ہے۔ اس مہم کے ذریعہ مسلمانوں نے اپنے پرسنل لاء کی حفاظت اور دستور کی عصمت کو محفوظ رکھنے کی کوشش کی ہے جس کے لیے پورے ملک کو ان کا شکر گزار ہونا چاہئے۔

دراصل یہ اس وقت میرا موضوع نہیں تھا۔ پرسنل لاء اوراس کے تحفظ کی کوششوں کو سمجھنے کے لیے ان باتوں کا اظہار میں نے ضروری سمجھا تاکہ لوگوں کے سامنے نفس مسئلہ واضح رہے۔ مسلمانوں نے پرسنل ء کی حفاظت کے لیے آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ بنایا جو مسلمانوں کے تمام طبقات جماعتوں اور گروہوں کا نمائندہ ادارہ ہے۔ بسا اوقات یہ بات سننے میں آتی ہے کہ اس ادارے میں نمائندگی کے معاملے میں کچھ افراد اور گروہوں میں عدم اطمینان ہے جس پر بعض حلقوں میں تنقید اور تبصرہ ہوتا رہا ہے۔ اس ادارہ کو ایک طرف جہاں وسیع البنیاد بنانے کی ضرورت ہے تاکہ مسلمانوں کے تمام طبقات کی کماحقہ نمائندگی ہو سکے اوراس کے قائدین میں باری باری سے سب کو موقع ملے وہیں اس کو طالع آزما اور انتشار پسند عناصر سے محفوظ رکھنا بھی ضروری ہے۔ حال میں یہ دیکھنے کو ملا ہے کہ شیعہ حضرات کے ایک گروہ نے اپنے درمیان بعض لوگوں سے اختلاف کرتے ہوئے الگ پرسنل لاء بورڈ بنایا ہے۔ اسی طرح بریلوی حضرات کے

ایک چھوٹے سے دھڑے نے بھی ایک الگ پرسنل لاء بورڈ کا اعلان کیا ہے۔ کچھ ترقی پسند اور اصلاح پسند خواتین نے بھی عورتوں کا پرسنل لاء بورڈ تشکیل دینے کی بات کی ہے۔

میں ایسی کوششوں کو غلط اور نقصان دہ مانتا ہوں کیونکہ اس سے پرسنل لاء کا فورم کمزور ہوگا اور اس کا نقصان کسی فرد اور جماعت کے بجائے پوری ملت اور دین کو ہوگا۔ مگر دوسری بات یہ ہے کہ اس الگ جماعت سازی کا مقصد کیا ہے؟ اگر اس کا مقصد مسلم پرسنل لاء تحریک کو ان طبقات کی سرگرم حمایت فراہم کرنا ہے جو اب تک حاشیہ پر تھے اور اس طرح اس کے دائرہ کو وسیع کرنا ہے تو یہ ایک اچھی کوشش کہی جائے گی جس کا جواز ہے۔ مگر اس کا مقصد شخصی انا کی تسکین اور دوسروں کے ہاتھ میں کھیلنا ہے تو یہ مذموم عمل ہے۔ جن عورتوں نے الگ پرسنل لاء بورڈ بنایا ہے غالباً وہ اصلاح پسند خواتین ہیں جنہوں نے اس لیے یہ بورڈ نہیں بنایا ہے کہ مسلم پرسنل لاء کے احکامات ومصالح سے عورتوں کو واقف کرایا جائے اور ان کے اندر اسلامی شریعت اور شعائر کے احترام کا جذبہ پیدا کیا جائے۔ بلکہ ان کا مقصد مسلم پرسنل لاء کو بدلنا ہے اور عورتوں کو بدگمان کر کے ملک میں انتشار کی فضا پیدا کرنا ہے۔ مسلم معاشرے میں دینی جہالت اور غربت نے جو کلچر پیدا کیا ہے اس کی وجہ سے معاشرہ میں بگاڑ پیدا ہو رہا ہے لہٰذا دینی تعلیم اور غربت کے ازالہ کے بغیر اس مسئلہ پر قابو نہیں پایا جاسکتا ہے۔ جدید تعلیم یافتہ خواتین جن کا اسلام کا مطالعہ بہت معمولی ہے اور وہ اس سے ایمانی تعلق نہیں رکھتی ہیں اور جو غیر اسلامی افراد اور تحریکات کے زیر اثر ہیں وہ دراصل اصلاح کے نام پر پرسنل لاء میں تبدیلی کی وکیل ہیں۔ ایک طرف جہاں ان کو اسلامی احکامات سے صحیح طور پر روشناس کرانے کی ضرورت ہے وہیں دوسری طرف ایسے عناصر پر گہری نظر رکھنا چاہیے تاکہ وہ ملت میں کوئی انتشار اور فتنہ پیدا نہ کرسکیں۔ اس کے لیے خود پرسنل لاء بورڈ کو خواتین پر مشتمل ایک ورکنگ گروپ تشکیل دینا چاہیے تاکہ وہ پورے ملک میں گھوم کر عورتوں کو مسلم پرسنل لاء سے واقف کرائیں اور اس میں درآئی خرابیوں کو دور کرنے میں ان کا تعاون کریں۔ اس کام کے لیے اگر ذیلی یا آزادانہ تنظیمیں بنتی ہیں تو اس کو انتشار نہیں ضرورت کہا جائے گا۔ جس کی ہمت افزائی کی جانی چاہیے۔

بابری مسجد کا مسئلہ اور مسلمانوں کا موقف

بابری مسجد کے نام سے ایک دوسرا مسئلہ ہے جو 1992 سے مسلمانوں کی اجتماعی بے چینی کا سبب بنا ہوا ہے۔ایودھیا میں ایک چار سو سالہ تاریخی مسجد تھی جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ بابر کے ایک سپہ سالار میر باقی نے بنوائی تھی اور جو بابری مسجد کے نام سے مشہور تھی۔ اس مسجد کو رام جنم بھومی بتا کر بعض احیا پرست ہندو تنظیموں نے اس کی بازیابی کی تحریک شروع کی۔ دراصل وہ اس کے ذریعہ ملک کے فرقہ وارانہ ماحول کو مکدر کر کے اقتدار پر قابض ہونا چاہتے تھے اور اس میں ان کو بڑی کامیابی ملی۔ جو جماعت پچھلے چالیس سال سے ملک کی سیاست کے بالکل حاشیہ پر تھی اس کو اس کے ذریعہ یکا یک مرکزی اور ریاستی حکومتوں پر قابض ہونے کا موقع مل گیا۔ ان جماعتوں کی انتہا پسندی اس حد تک پہنچی کے قومی یکجہتی کونسل میں دی گئی یقین دہانی اور سپریم کورٹ میں دائر اپنی ایفی ڈیوٹ میں ہر قیمت پر مسجد کی حفاظت کے وعدے کے باوجود اس وقت کی نرسمہا راؤ کی مرکزی حکومت سے ملی بھگت کر کے انہوں نے پوری بے شرمی کے ساتھ اس مسجد کو ڈھادیا اور اب وہاں رام مندر بنانے کی جنگ چل رہی ہے۔ بابری مسجد کی بازیابی کے لیے اس وقت دو تحریکات چل رہیں ہیں۔ ایک بابری مسجد ایکشن کمیٹی اور دوسری کورڈی نیشن کمیٹی۔ مسلمانوں نے پوری طرح اپنا موقف واضح کر رکھا ہے کہ یہ مسجد کی زمین ہے کسی فرد یا جماعت کی نہیں جس کو کوئی شخص اپنی آزادانہ مرضی سے کسی کو نہیں دے سکتا ہے۔ مسلمانوں کا مطالبہ ہے کہ یہ مسجد ہے لہٰذا اس کو مسلمانوں کے حوالہ کیا جائے اور فریق مخالف اپنا دعویٰ جس کا اس کے پاس کوئی دیوانی ،قانونی اور تاریخی ثبوت نہیں ہے واپس لے لے اور ملک کو بلا وجہ فرقہ وارانہ کشمکش کے حوالے نہ کرے۔ معاملہ عدالت کے زیرغور ہے۔ اگر چہ مسلمانوں کے معاملہ میں اب تک عدالت کا جورخ سامنے آیا ہے اس سے کوئی بڑی امید نہیں کی جاسکتی ہے۔ تاہم مسلمانوں کا موقف یہ ہے کہ عدالت جو بھی فیصلہ کرے گی مسلمان اس کا احترام کریں گے۔ لہٰذا حکومت اور عدالت دونوں سے گزارش کی جاتی ہے کہ جلد از جلد اس معاملہ کی شنوائی کر کے فیصلہ دے تا کہ یہ نزاع ختم ہو جائے۔ گیند اس وقت پوری طرح حکومت اور عدالت کے کورٹ میں ہے اور مسئلہ محض بابری مسجد کی حفاظت کا نہیں بلکہ ملک میں دستور اور قانون کی حکمرانی کی حفاظت کا ہے۔ مسلمان اس جنگ کو قانونی اور سماجی دونوں سطح پر لڑ رہے

ہیں۔ اس لیے اس ایکشن میں کوآرڈینیشن چاہیے اور دونوں کاموں کے لیے الگ الگ جماعتوں کا بننا غلط نہیں ہے۔اس لیے اس کوانتشار ماننا صحیح نہیں ہوگا۔ یہاں دیکھنے کی بات یہ ہے کہ جوعدالت پرسنل لاء کی تبدیلی کے بارے میں پوری طرح مستعد ہے وہ بابری مسجد کے معاملے میں جو دیوانی اورفوجداری مقدمہ دائر ہے اس پر پچھلے پچاس سال سے کوئی فیصلہ دینے سے قاصر ہے۔ بلکہ صحیح طور پر ابھی تک یہ مقدمات کھلے ہی نہیں ہیں۔یہاں Judicial activism کیوں دکھائی نہیں دیتی؟ اس سے صاف ظاہر ہے کہ دال میں کچھ کالا ہے۔اس وقت یہ معاملہ عدالت عظمیٰ کے زیرغور ہے۔امید کی جارہی ہے کہ جلد ہی کوئی فیصلہ آجائے گا۔ (۱)

مسلمانوں میں مسلکی اختلاف

مسلمانوں میں موجود مسلکی اختلافات کو بہت زیادہ ہوا دینے کی کوشش کی جاتی ہے

---

(۱) بابری مسجد کے باب میں عدالتِ عظمیٰ کا فیصلہ 9 نومبر 2019 کو آ گیا ہے۔عدالت نے یہ ماننے کے باوجود کہ مسجد میں مورتی غیر قانونی ڈھنگ سے رکھی گئی تھی اور اس کا انہدام بھی غیر قانونی تھا اور جن لوگوں نے یہ حرکت کی تھی انھوں نے قانون کی نظر میں جرم کا ارتکاب کیا تھا۔ جب ظاہری آثار وشواہد اور ہندو مذہبی کتابوں کے حوالے سے اس معاملہ کو ثابت نہیں کیا جاسکا تو آثار قدیمہ کی کھدائی کا سہارا لیا گیا۔اولاً تو زمین کی حقیقت کا معاملہ آثارِ قدیمہ کی کھدائی سے طے نہیں ہوتا تاہم آثارِ قدیمہ کی کھدائی سے بھی یہ ثابت نہیں ہوا کہ بابری مسجد کسی رام مندر کو توڑ کر بنائی گئی تھی۔ پھر بھی عدالت نے مسجد کی زمین کو مندر بنانے کے لیے دے دیا۔مسلم فریق نے اس فیصلے پر نظر ثانی کی جو بھی درخواست پیش کی، عدالت نے اس پر سنوائی سے انکار کر دیا۔ اس طرح عدالت نے ایک ظلم، نا انصافی اور جرم کو قانونی جواز فراہم کر کے ایک ایسی مثال قائم کی ہے جس سے ہماری عدلیہ کا وقار تمام انصاف پسند اور غیر جانب دار افراد کی نگاہ میں مجروح ہوا ہے۔اور یہ مقدمہ عدلیہ کی تاریخ میں ایک سیاہ باب کی طرح درج ہو چکا ہے۔

عدالت کے اس فیصلے کے بعد 5 اگست 2020 کو وزیراعظم ہند اور یوپی کے وزیراعلیٰ نے پورے سرکاری لاؤ لشکر کے ساتھ رام مندر کی تعمیر کے لیے سنگ بنیاد رکھ دی ہے۔ تاریخ میں ایسے مظالم اور مظاہر اور بھی ہوئے ہیں اور تاریخ بدلی بھی ہے۔ اس وقت اس ڈرامے پر کوئی ردِعمل ظاہر کیے بغیر ہمیں پورے صبر وتحمل اور وقار سے کام لینا ہے اور ملی تعمیر کے مسئلے پر سنجیدگی سے غور کرتے ہوئے نئے عزم کے ساتھ ہندوستان میں اپنے ملی استحکام کی جدوجہد کو جاری رکھنا ہے۔

اور بظاہر یہ دیکھا جاتا ہے کہ مسلمان ایک منقسم گروہ ہے۔اس بات میں جزوی سچائی ہے مگر اس حد تک نہیں جتنا باور کرایا جارہا ہے۔اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ تمام اجتماعی معاملات میں مسلمانوں نے تمام تر اختلافات کے باوجود جس اتحاد فکر و عمل کا مظاہرہ کیا ہے وہ قابل غور ہے۔اختلاف سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔مگر میں بار بار دہراتا ہوں کہ اختلاف ضرور ہے انتشار نہیں۔

میں مانتا ہوں کہ ہر اختلاف نہ غلط ہے اور نہ غیر ضروری بلکہ بعض اوقات اختلاف کرنا ضروری اور لازمی ہوتا ہے۔ اس لیے محض مسالک کی کثرت یا جماعت کی تعداد سے وحشت زدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ دیکھنا یہ چاہیے کہ اس کا مثبت پہلو کیا ہے؟ مسلمان بالعموم دو دھڑوں، شیعہ اور سنی میں بٹے ہوئے ہیں۔ یہ اختلاف مذہبی کم اور تاریخی زیادہ ہے۔ بہر حال اس کو پاٹا تو نہیں جاسکتا ہے، ہاں دونوں کے درمیان تشدد کو کم کیا جاسکتا ہے اور ایک بہتر کورڈینیشن پیدا کیا جاسکتا ہے۔ اس کی کوشش کی جاتی رہی ہے۔مگر بعض وجوہات سے پوری طرح کامیاب نہیں ہے۔ دراصل اس میں سیاست کی دخل اندازی سے بعض مسائل پیدا ہوتے رہے ہیں۔ دونوں فرقوں کے تعمیر پسند اور وسیع النظر لوگوں کو ایک مثبت انداز اختیار کرکے مشترکہ امور و مسائل کے لیے اجتماعی پلیٹ فارم بنانا چاہیے۔شیعوں میں بھی بہت سارے ذیلی گروہ ہیں اور سنیوں میں بھی ہیں، جن کے الگ الگ مسائل ہیں اور جن کو اپنے اپنے فورموں میں حل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

ہندوستان میں سنی مسلمان اکثریت میں ہیں، شیعوں کی تعداد ان کے مقابلے بہت کم ہے۔ یہاں سنی مسلمانوں کو بڑے بھائی کی فراخ دلی اور شیعہ مسلمانوں کو چھوٹے بھائی کا احترام دکھانا چاہیے تاکہ ایک بہتر سماجی رابطہ بن سکے۔

سنی مسلمانوں میں حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی اور اہل حدیث پانچ گروہ ہیں۔ان میں حنفی مسلک کے مسلمان اسی فیصد ہیں، دوسرے نمبر پر اہل حدیث ہیں۔میری معلومات کی حد تک

شافعی، مالکی اور حنبلی مختصر تعداد میں ہیں اور وہ بھی چند مخصوص مقامات پر ہیں۔ حنفی المسلک مسلمانوں میں بعض جزوی اختلافات کے نتیجہ میں برصغیر ہندو پاک اور بنگلہ دیش میں اور ان خطوں کے لوگ دنیا میں جہاں کہیں جا بسے ہیں وہاں دیوبندی اور بریلوی دو گروہ پائے جاتے ہیں۔ جن کے درمیان زور دار کشمکش پائی جاتی ہے۔ ان کے اختلافات کی وجہ سے مسجدیں، خانقاہیں اور مدارس الگ الگ ہوگئے ہیں۔ بسا اوقات قبرستان اور شادی بیاہ میں بھی تعصب اور تشدد دیکھنے کو ملتا ہے۔ ایک گروہ دوسرے گروہ کو شرک و بدعت کا داعی اور قبروں کا پجاری قرار دیتا ہے تو وہ دوسرا گروہ پہلے کو شاتم رسول کہتا ہے۔ یہ سارا اختلاف بعض کتابوں کے بعض جملوں اور عبارتوں کی بنیاد پر ہے۔ جس کو بعض شخصیتوں کے باہمی نزاع نے دو آتشہ بنا دیا ہے۔ یہ کوئی صحت مند صورت حال نہیں ہے۔ تاہم اگر دوسرے نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو ان باتوں کا ایک خوش آئند پہلو بھی ہے جو توازن برقرار رکھنے میں معاون ہوتا ہے۔ اہلِ حدیث حضرات توحید کے سختی سے قائل ہیں جو دین کی بنیاد ہے۔ وہیں بریلوی حضرات احترام نبوی اور محبت رسول کے داعی ہیں جو دین کی روح ہے۔ اور دیوبندی حضرات شریعت وسنت کی پابندی کے وکیل ہیں اور ان تینوں کے مجموعہ سے دین کی پوری تصویر ابھرتی ہے۔ ایک دوسرے پر کی گئی تنقید گویا نظم و توازن کے ساتھ چلنا سکھاتی ہے اور غلط بات پر کھلے عام تنقید دین کے اصل ماخذ کی طرف رجوع ہونے کی دعوت دیتی ہے۔ اس میں دو رائے نہیں کہ غلو اور بعض غالی طبقات کی کارفرمائی کی وجہ سے بعض بے اعتدالیاں بھی پیدا ہوئی ہیں۔ جو باہمی نزاع کا باعث بنتی ہیں تاہم دین کی اصل پر قائم رہنے میں اس سے مدد ملتی ہے اور قرآن وحدیث کی طرف لوٹنے کا رجحان پیدا ہوتا ہے۔ ان کے درمیان اگر اعتدال پسند طبقہ ابھرے جن کا تینوں دھڑوں سے تعلق ہو تو صورت حال کو بہتر بنانے میں مدد مل سکتی ہے۔

اسی طرح جمعیۃ العلماء ہند، جماعت اہل حدیث، تبلیغی جماعت، جماعت اسلامی، امارتِ شرعیہ اور کئی دوسری جماعتیں ہیں جو دینی وملی رہنمائی کا کام انجام دے رہی ہیں۔ اپنے اپنے دائرے میں سب کی اہمیت اور ضرورت ہے یہ جماعتیں آزادانہ اور مشترکہ دونوں طرح

کے اقدامات کر رہی ہیں۔غلط فہمی،تعصب،تنگ نظری اوراپنی اپنی کنسٹی ٹیوینسی کی حفاظت اور پھیلاؤ کا مسئلہ ان کے سامنے رہتا ہے ۔جس کی وجہ سے ان کے درمیان اختلاف بھی ابھر کر سامنے آتے ہیں۔تاہم یہ نہ تو کوئی برائی ہے اور نہ ہی بڑا مسئلہ۔ ہندوستان کیا دنیا کے کسی سماج میں کبھی بھی اور کہیں بھی مکمل یکسانیت ،اتفاق اور ہم آہنگی نہیں ہوتی ۔اس لیے ان باتوں کو اتنی اہمیت دینے کی ضرورت نہیں ہے۔

مسلم سماج میں ذات پات

کہنے کے لیے تو یہ بات اصولی حیثیت سے صحیح ہے کہ اسلام میں ذات پات ،اونچ نیچ،اشراف، اجلاف کا کوئی تصور نہیں ہے، بلکہ اسلام وحدت آدم اور مساوات کا قائل ہے۔ اسلام کے پھیلاؤ میں جو عنصر سب سے اہم رہا ہے اس میں ایک توحید اور دوسرا نظریہ مساوات ہے۔مگر آج کی مسلم سوسائٹی کوئی Monolithic سوسائٹی نہیں ہے۔اس لیے ہمیں زمینی حقیقتوں سے آنکھیں موند کر خیالی دنیا میں پرواز نہیں کرنا چاہیے۔ ہر سماج کی طرح مسلم سماج بھی طبقاتی سماج ہے جہاں جاہلی عصبیتیں موجود ہیں۔جس کی وجہ سے کئی طرح کے سماجی اور سیاسی مسائل پیدا ہو گئے ہیں۔لہٰذا ان مسائل کو قالین کے نیچے دبا کر یہ تاثر دینا کہ سب کچھ ٹھیک ہے فریب خوردگی ہوگی۔مسلمان سماج کے بارے میں حضورؐ کا ایک قول یہ ہے کہ وہ ایک جسم کی مانند ہیں۔جسم کے ایک حصہ کو گزند پہنچتی ہے تو پورا جسم اس کی تکلیف محسوس کرتا ہے۔مگر کیا ہمارا آج کا مسلم سماج اس آئیڈیل پر قائم ہے؟ نہیں تو پھر اس سماج کے بارے میں محض اصولی موقف اختیار کرنا کیسے صحیح ہوسکتا ہے؟ ہمارے یہاں جو بھی نام نہاد اونچا طبقہ رہا ہے جو دولت، اقتدار، تعلیم، عہدہ، زراعت وتجارت سے بہرہ ور ہونے کی وجہ سے مادی طور پر خوشحال اور اقبال مند ہے اس کا اپنے سماج سے عملاً کوئی جذباتی اور نظریاتی رشتہ نہیں ہے۔جس طرح دوسرے سماج کے لوگ غریب اور پسماندہ آبادی کو اپنی ملک سمجھ کر تصرف کرتے ہیں ٹھیک اسی طرح مسلم سماج کے بڑے لوگ اپنی پسماندہ آبادیوں سے معاملہ کرتے ہیں۔یہاں تک کے ان کے مفاد اور

عزت نفس سے کھلواڑ کرنے میں بھی ان کو کوئی عار محسوس نہیں ہوتی۔ اس صورت میں مسلمانوں کے مختلف گروہوں اور برادریوں میں اپنے حقوق کے معاملہ میں تھوڑی بیداری آئی ہے اور وہ مجتمع ہوکر اپنے مفاد کی حفاظت کرنا چاہتے ہیں تو اس میں کیا برائی ہے؟

اس وقت مسلمانوں میں جمعیۃ انصار، جمعیۃ الراعین، جمعیۃ الصدیقین، جمعیۃ القریش، ادریسی برادری، سرجاپوری، شیرشاہ آبادی، مسلمان بھنگی، لال بیگی، میر شکار، صیقل گر اور اسی طرح کی دیگر برادریوں کی الگ الگ تنظیمیں دیکھنے کو مل رہی ہیں اور وہ اپنے سماجی، معاشی، تعلیمی حقوق کے لیے جد وجہد کر رہی ہیں تو اس کو بعض لوگ اختلاف وانتشار قرار دے رہے ہیں جب کہ یہ حالات کا ناقص تجزیہ ہے۔ بلکہ اس طرح کے Dormant groups میں یہ بیداری زندگی اور حوصلہ مندی کی نشانی ہے جس کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے۔ یونائیٹڈ مسلم مورچہ اور پسماندہ مسلم محاذ کے نام سے اور چند اور ناموں سے بعض کوششیں ہو رہی ہیں۔ ان کی بعض لیڈرشپ نے اپنی پہچان بنانے اور سستی شہرت حاصل کرنے کے لیے اور غیر مسلموں کے ایک طبقے کو اپنی طرف رجھا کر ان سے کچھ فائدہ اٹھانے کے لیے بعض ایسی باتیں بھی کہی ہیں جو غلط اور نقصان دہ ہیں اور جن کی وجہ سے اور ان کے بعض حرکات سے لوگوں میں غصہ اور ردعمل بھی پایا جاتا ہے۔ مگر یہ ایک وقتی اور ہنگامی عمل ہے۔ جو مفاد پرستی اور ناپختہ ذہنی کی دلیل کہی جا سکتی ہے۔ لیکن اس کا ایک بڑا اور مثبت پہلو بھی ہے جس کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔

دراصل مسلمان سماج کے کھاتے پیتے لوگوں نے اپنے سماج کے ان کمزور طبقات کی حالت سدھارنے کے لیے کوئی ایماندارانہ کوشش نہیں کی۔ یہاں تک کہ ہماری مذہبی لیڈر شپ نے بھی اس پر توجہ نہیں دی۔ اب جبکہ ان کے درمیان کچھ تعلیم آئی ہے اور ان کا شعور تھوڑا بیدار ہوا ہے تو وہ اپنے ارد گرد کے حالات سے غیر مطمئن نظر آتے ہیں اور اپنی حالت سدھارنے کے لیے اپنی برادری کی تنظیم بنا کر جد و جہد کر رہے ہیں اور برادری میں تعلیمی، سماجی اصلاح، اتحاد واجتماعیت پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں تو یہ مسلم سماج کی کمزوری نہیں

بلکہ قوت کی علامت ہے۔مسلم سماج کا وہ حصہ جواب تک عضو معطل کی طرح تھا اب اس میں کچھ جان آرہی ہے اور وہ بھی حرکت کر رہا ہے یہ خوشی کی بات ہے ۔جو بالآخر مسلمان سماج کو مضبوط کرنے میں مددگار ہوگی ۔یقیناً کچھ لوگ اپنے سیاسی فائدے کے لیے اس فائدے کو نقصان میں بدلنے کی کوشش کر رہے ہیں۔اس وقت ہماری سماجی، ثقافتی اور مذہبی لیڈرشپ کی ذمہ داری ہے کہ ان طبقات سے وسیع تر رابطہ پیدا کرکے ان برادریوں کوملی مین اسٹریم میں لانے کی کوشش کریں اور موجودہ کوشش کے منفی اثرات سے ملت کو محفوظ رکھنے کا اہتمام کریں۔ وقت آ گیا ہے کہ ہم اپنے ٹوٹے پھوٹے ٹھیکروں اور پتھروں کو جمع کر کے ایک مضبوط عمارت کی بنیاد ڈالیں جس میں پوری ملت اور تمام کمزور طبقات کو عزت اور عافیت حاصل ہو۔

مثبت سوچ کی ضرورت

میں نے اس مضمون میں ان تمام پہلوؤں سے بحث کی ہے جس کو لوگ منفی پہلو مانتے ہیں اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ یہ اتنا منفی نہیں ہے جتنا لوگ باور کراتے ہیں اس لیے مسائل کو ان کے Proportion میں رکھ کر دیکھنا چاہیے، نہ تو اس کو ضرورت سے زیادہ کم سمجھا جائے اور نہ ضرورت سے زیادہ بڑھایا جائے ۔اس کا منطقی اور معروضی مطالعہ کر کے مثبت و تعمیری پہلو سے غور کرکے وسعت نظری اور وسعت قلبی کے ساتھ اپنی ملت کے دکھوں کا مداوا تلاش کرنا چاہیے۔جس آدمی کے دل میں پوری ملت نہیں سما سکتی ہے وہ پوری انسانیت کے بارے میں کیسے سوچ سکتا ہے؟ آدمی اپنی سوچ سے چھوٹا یا بڑا ہوتا ہے ۔جو لوگ صرف اپنے بارے میں سوچتے ہیں وہ سب سے چھوٹے لوگ ہیں ۔جو لوگ اپنے خاندان اور دیگر رشتہ داروں کے بارے میں سوچتے ہیں وہ اس سے بڑے لوگ ہیں ۔جو لوگ اپنی ذات اور برادری کے بارے میں سوچتے ہیں وہ اس سے بڑے لوگ ہیں۔جو لوگ اپنے مسلک اور جماعت کے بارے میں سوچتے ہیں وہ اس سے بڑے لوگ ہیں۔جو لوگ پوری ملت کے بارے میں سوچتے ہیں وہ اس سے بڑے لوگ ہیں اور جو لوگ پورے ملک اور تمام قوموں کے بارے میں سوچتے

ہیں وہ اس سے بڑے لوگ ہیں اور جو لوگ تمام ممالک اور انسانیت کے بارے میں سوچتے ہیں وہ سب سے بڑے لوگ ہیں۔اسلام نے جو تصور خدا،تصور رسول،تصور دین اور تصور انسانیت عطا کیا ہے وہ اتنا وسیع ہے جس میں پوری کائنات سمائی ہوئی ہے۔کیونکہ اسلام کا خدا رب العالمین ہے جو تمام جہانوں کا رب ہے،اسلام کا رسول رحمت للعالمین ہے جو تمام جہانوں کے لیے رحمت ہے،اسلام تمام انسانوں کے لیے ہدایت یعنی ھدی للناس ہے اور اسلام لقد کرمنا بنی آدم یعنی تمام اولاد آدم کی عزت بخشی کا قائل ہے۔اس صورت میں ایک صحیح العقیدہ مسلمان، صالح اور مثبت فکر رکھنے والا شخص چھوٹی چھوٹی خانہ زاد گروہ بندیوں میں گرفتار ہوکر کیسے خود کو پہاڑ سے رائی بنانے پر آمادہ ہوسکتا ہے؟

اس لیے حالات کا تقاضہ یہ ہے کہ تمام گروہوں،مسلکوں، برادریوں جماعتوں اور دھڑوں کے بیچ وسیع تر رابطے کی کوشش شروع کی جائے اور ہر ایک کو اپنے دائرے اور مقام پر کام کرنے کے ساتھ ساتھ مشترکہ امور و مسائل میں مل جل کر کام کرنے کی دعوت دی جائے۔ نقطہ نظر میں تھوڑی سی وسعت، لچک اور تبدیلی، قوت و انقلاب کا ایک نیا باب وا کرسکتی ہے۔ کیا ہم کتاب حیات کے اس نئے باب کو وا کرنے کے لیے تیار ہیں؟

معمار حرم باز بہ تعمیر جہاں خیز

اقدار پر مبنی پہل

جمہوریت اگر اخلاق اور اقدار سے خالی ہو تو اس کو ظالمانہ اور فسطائی ہونے سے کوئی روک نہیں سکتا ہے۔ اس لیے جمہوریت کو صحیح خطوط پر گامزن رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ انتخابات کے عمل کو صحتمند اور اخلاقی اقدار کا پابند بنایا جائے۔ اس وقت بہار میں خاص طور سے اور ہندوستان میں عام طور سے الیکشن کے وقت جس دھونس، دھاندلی، پیسہ، ذات پات، فرقہ پرستانہ جذبات اور مجرمانہ ذہنیت کا مظاہرہ ہوتا ہے، اس نے جمہوری قدروں کے لیے سنگین خطرات پیدا کر دئے ہیں اگر ان چیزوں کی بروقت اصلاح نہیں کی گئی تو یہ پورے ملک کو تباہ کر سکتی ہے۔

ہندوستان کسی ایک قوم، مذہب، ذات، اور زبان والوں کا ملک نہیں ہے، بلکہ یہاں بسنے والی ہر قوم اور مذہب کا ملک ہے۔ لہٰذا یہاں کسی ایک قوم کی اجارہ داری قائم نہیں کی جا سکتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ یہاں ہندوؤں کی اکثریت ہے مگر مسلمان، سکھ، عیسائی، بودھ، جین اور دوسری اقلیتیں ہیں اور ان کو دستور نے برابر کا درجہ عطا کیا ہے۔ ان کو مذہبی آزادی عطا کی ہے۔ ان کی زبان اور کلچر کی حفاظت کی ضمانت دی ہے اور ملک کے انتظام وانصرام میں برابر کا شریک بنایا ہے۔ لہٰذا یہ ملک سب کا ہے اور سب کو اس کی حصہ داری ملنی چاہیے۔ تبھی یہاں کی جمہوریت

مستحکم ہوگی اور ملک مضبوط بنے گا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اس ملک میں بہت سی ذات برادریاں ہیں جن کی سماجی اور معاشی حالت میں بہت فرق ہے۔ ہندوقوم میں اعلیٰ ذات، درمیانہ ذات اور چھوٹی ذات کے لوگ پائے جاتے ہیں۔ دیگر قوموں میں بھی ایسی تقسیم موجود ہے۔ ملک کا ایک گروہ دولت، تعلیم، نوکری، سیاسی قوت، اور معاشی حیثیت کے اعتبار سے بہت آگے ہے۔ جب کہ دوسرا گروہ بہت پیچھے ہے۔ جس کی وجہ سے ان کے درمیان سماجی، سیاسی اور معاشی کشمکش برپا ہے لہٰذا ایک گروہ دوسرے گروہ کو دبانا چاہتا ہے اور یہ چیز کبھی کبھی خونریز تصادم کی صورت اختیار کر لیتی ہے

اکثر یہ دیکھا جاتا ہے کہ اکثریت اپنے اندرونی تضاد پر قابو پانے میں ناکام ہوتی ہے تو اس کا رخ اقلیت کی جانب پھیر دیتی ہے اور ایک جذباتی ماحول پیدا کر کے اپنے اندر کے متحارب عناصر کو لڑائی کا ایک دوسرا میدان فراہم کر دیتی ہے تا کہ اس کے اندر پنپنے والے لاوا کو ایک موہوم دشمن پر انڈیل دے۔

جب منڈل کمیشن کے نفاذ کے وقت ہندوؤں کے اعلیٰ ذات اور درمیانہ ذاتوں کے درمیان کشمکش شباب پر تھی اور دونوں ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو رہے تھے تو اکثریت کے شاطر ذہنوں نے فوراً رام مندر تحریک کو اس قدر ہوا دیا کہ اس شور میں منڈل مسئلہ دب گیا اور اس کا رخ مسلم دشمنی کی طرف موڑ دیا۔ پھر اس نفرت کے سیلاب میں کیا برہمن، کیا بیکوارڈ، کیا دلت سب بہہ گئے اور سب نے متحد ہو کر مسلمانوں پر ہلا بول دیا۔ یہ ایک ایسا آزمودہ نسخہ ہے کہ جب کبھی اکثریت کا کوئی طبقہ یا سیاسی جماعت کسی سنکٹ کے دور سے گزرتی ہے وہ اس ہتھیار کا استعمال کرتی ہے۔

جمہوریت میں جہاں اکثریت کی حکمرانی ہوتی ہے اس کو اگر انصاف اور انسانیت سے الگ کر دیا جائے تو اسے چنگیز بننے سے کوئی روک نہیں سکتا ہے اس لیے جمہوریت کو دستوری حدود کا پابند بنانے کے لیے مبنی بر اقدار بنانا ضروری ہے۔ سول سوسائیٹی، عدلیہ اور پریس پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ اکثریت کو انصاف اور قانون کا پابند بنائے اور جمہوریت

کی گاڑی کو پٹری سے نہ اترنے دے۔ ہندوستان میں ہم دیکھتے ہیں کہ جمہوریت کے ان تینوں کھمبوں میں دیمک لگ گئی ہے جس کا اگر بروقت تدارک نہیں کیا گیا تو ہماری جمہوری عمارت بیٹھ جائے گی اور اس کے ملبے پر فسطائیت کا دیو ایک نئے ہٹلر کا روپ دھار کر کھڑا ہو جائے گا جو ہمہ گیر ظلم و تباہی کا پیش خیمہ بنے گا۔ ملک کو ایسے خطرات سے بچانا ہر انصاف پسند اور ملک دوست شہری کی ذمہ داری ہے۔

جامع منصوبہ کی ضرورت

الیکشن جمہوری عمل کو آگے بڑھانے کا سب سے اہم ذریعہ ہے۔ لہٰذا الیکشن کے وقت بہت ہوشیار اور مستعد رہنے کی ضرورت ہے۔ اس وقت سیاست خدمت کا ذریعہ نہیں بلکہ قوت حاصل کرنے کا ذریعہ ہے جس قوت کے ذریعہ عوام کی خدمت مقصود نہیں ہے بلکہ دولت کمانا اور اس کے ذریعہ ہر طرح کی مجرمانہ کاروائیوں کو انجام دینا ہے۔ آج صورتحال یہ ہے کہ مجرموں کے سامنے حکومتی مشنری، پولس، انتظامیہ یہاں تک کہ عدلیہ اور پریس بھی مجبور محض ہو جاتے ہیں۔ مٹھی بھر لوگوں نے پورے ملک کو اور اس کے تمام اداروں کو یرغمال بنالیا ہے۔ اس صورتحال کا تدارک کس طرح کیا جائے کسی کی سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔ ملک ایک اندھی سرنگ میں تیزی سے بڑھتا جارہا ہے۔ دور دور تک روشنی کی کوئی کرن نظر نہیں آتی۔

سیاسی پارٹیاں پیسے لے کر امیدواروں کو ٹکٹ دیتی ہیں۔ ٹکٹ دینے کا یہ سب سے بڑا آدھار ہے۔ جب جرائم پیشہ لوگ جیت کر اسمبلی اور پارلیامنٹ میں جائیں گے پھر اس کے بعد قانون کی حکمرانی کی بات کرنا بے وقوفی کے سوا اور کیا ہے؟ جب ملک میں قانون کی حکمرانی نہیں ہوگی تو جنگل راج ہوگا جہاں کمزوروں کے لیے کوئی جگہ نہیں ہوگی۔ انصاف کی جگہ ظلم کا بول بالا ہوگا۔ کیا ہم ایسا ہی ہندوستان چاہتے ہیں؟ اگر نہیں تو اس کا حل کیا ہے؟

اس وقت جو حالات پیدا ہوئے ہیں وہ ایک دن میں نہیں بنے ہیں۔ اس لیے ایک دن میں اس کی اصلاح بھی نہیں ہوسکتی ہے۔ وقت آ گیا ہے کہ موجودہ صورت حال کے تدارک

کے لیےایک زبردست عوامی تحریک شروع کی جائے۔ ہندوستان کواس وقت پھرایک زبردست پرامن تحریک کی ضرورت ہے۔

جمہوریت میں عوام کی طاقت فیصلہ کن ہوتی ہے۔ اگرعوام کوان عناصر کے خلاف کھڑا کردیا جائے تو ان کے حوصلے پست ہوں گے اور ایک نئی قیادت ابھرے گی۔ ہمیں مذہب، ذات پات اورعلاقائیت سے اوپراٹھ کرتمام عوام کے لئے، ہرچھوٹے بڑے کے لیے ایک جامع منصوبہ بنانا ہوگااور ہرایک کوساتھ لے کرآگے بڑھنا ہوگا۔

مسلمانوں سے سوال

ہندوستان کا موجودہ جمہوری نظام ملک کے ہرشہری اور ہرطبقہ سے یہ سوال پوچھ رہا ہے، وہ ہندوستانی مسلمان سے بھی یہ سوال پوچھ رہاہے۔کیا مسلمانوں کے لیےاب بھی وقت نہیں آیا کہ اپنی تنگنائیوں سے باہرنکل کرملک کے سامنے درپیش جوبڑے سوالات ہیں ان کا خودکومخاطب سمجھیں اوران کا جواب دینے کی کوشش کریں؟ ہم کب تک کمزوراقلیت ہونے کا رونا روتے رہیں گے۔ کیوں نہیں ملک کوجوڑنے،آگے بڑھانے اورنئی سمت دینے کی کوشش کریں۔آخر یہ ہمارابھی تو ملک ہے۔اس پر ہمارابھی توحق ہےاورہم پربھی تو اس ملک کاحق ہے،صرف ہم اپناحق طلب کریں اورملک اور یہاں کےعوام کا حق ادانہ کریں۔ یہ کیساانصاف ہےکیسی ذہنیت ہے،کیسی مسلمانی ہے؟ آیئےاس ملک کوکھلے دل سے اپنائیں اوراپنی ضرورت اورمفاد سے پہلے ملک کے عام لوگوں کی ضرورت اورمفاد کواولیت دیں اور ان کو ان کاحق دلانے کی کوشش کریں۔یہی وہ حکمت عملی ہے جس سے ملک بھی بچے گا ورمسلمان بھی بچیں گے اور جب سب ساتھ ہوں گےتو ملک میں امن وانصاف قائم ہوگااورسب مل جل کرترقی کریں گے۔آیئے ایک ایسے ہندوستان کی تعمیر کے لیے ایک زبردست تحریک برپا کرنے کی کوشش کریں اس کی قیادت مسلمان کریں۔اوراپنے خیرامت ہونے کاثبوت دیں۔حضور کی حدیث ہےانسانوں میں سب سے بہتر وہ ہے جوانسانوں کی بھلائی کے لیے کام کرتاہے۔کسی یتیم کی

مدد، کسی بیوہ کی خبر گیری، کسی بیمار کی تیمار داری، کسی حاجت مند کی حاجت روائی سیکڑوں رکعات نوافل اور ہزاروں بار تسبیح پڑھنے سے بہتر ہے۔ پھر دین کے اس پہلو پر ہم کیوں توجہ نہیں دیتے؟ توجہ دیتے بھی ہیں تو صرف مسلمانوں تک کیوں محدود رہ جاتے ہی؟ عام انسانوں میں جو لوگ ہماری مدد اور خدمت کے مستحق ہیں ان تک پہنچ کر کیوں ان کی مدد نہیں کرتے؟ جب ہم نے خود کو اتنا چھوٹا کرلیا ہے تو دنیا ہم کو بڑا کیسے مان سکتی ہے؟ کہاں تو ہم کہتے ہیں کہ ہم رب العالمین کے بندے ہیں اور رحمت للعالمین کی امت ہیں جس میں ساری دنیا، سارا جہاں، پوری کائنات، انسان، حیوان، چرند و پرند، پیڑ پودے، ندی سمندر، پہاڑ، جنگل اور باغات سب سمائے ہوئے ہیں تو پھر ہماری دنیا اتنی محدود کیوں ہے؟ ہماری سوچ اتنی چھوٹی کیوں ہے ؟ ہم اتنے تنگ نظر کیوں ہیں؟ فارسی کا مشہور مقولہ ہے ۔ ہر کہ خدمت کرد ئی مخدوم شد، ہمارے بزرگوں کی یہی تعلیم اور اسوہ رہا ہے۔ آج جن مزاروں پر ہزاروں لوگ جمع ہوتے ہیں جن میں ہر مذہب اور قوم کے لوگ ہوتے ہیں اس کی یہی توجیہ ہے کہ ان بزرگوں کا در تمام حاجت مندوں کے لیے بلا تفریق مذہب وملت کھلا تھا اور یہی وجہ ہے کہ وہ تمام لوگوں کے لیے باعث احترام اور مرجع خلائق ہیں۔ کیا ہم نے اپنے بزرگوں سے ان کی عقیدت کے سوا اور کچھ نہیں سیکھا۔ علامہ اقبال بہت پہلے کہہ گئے ہیں ؎

سبق پڑھ پھر صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

تو کیا ہم اپنے کو بڑا نہیں کر سکتے، اپنے بازؤں کو پھیلا نہیں سکتے، اپنی نظر اونچی نہیں کر سکتے، اپنے دل کو وسعت نہیں دے سکتے ؟ ضرور دے سکتے ہیں۔ ملت کے مزاج ومنہاج میں تھوڑی تبدیلی لانے کی ضرورت ہے۔ مسلمان آفاقی اور عالمی امت کا نام ہے۔ لہٰذا اس کی سوچ میں آفاق وانفس سمایا ہونا چاہیے۔ یہ ملک ہمارا ہے، یہاں بسنے والی تمام قومیں ہندوستانی قوم کا حصہ ہونے کے ناطے ہماری قوم ہیں اور ان کی بھلائی اور خیر خواہی ہم پر فرض ہے۔ ہم اس عزم کے ساتھ اٹھیں کہ ہندوستانی قوم کی بھلائی کے لیے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھیں گے۔

قرآن پاک میں تمام انبیاء نے اپنی مخاطب قوم کو جو مشرک، بے دین اوران کی منکر تھی'' اپنی قوم'' کہہ کر خطاب کیا ہے اوران کے تئیں اپنی خیر خواہی کی یقین دہانی کرائی ہے۔انبیا کی شخصیت میں تین پہلو بہت نمایاں رہے ہیں۔ ایک بے پناہ انسانی ہمدردی اورخیرخواہی، دوسرے بےغرضی اور بےلوثی اورتیسرے صبر،عزیمت اورحکمت۔خود نبی پاک ﷺ کا اسوہ ان تینوں باتوں پر دلالت کرتا ہے۔لہٰذا ایک مسلمان کو بحیثیت فرد اور بحیثیت ملت ان جذبات سے معمور ہونا چاہیے۔قوم میں وہ تمام لوگ شامل ہیں جو ہم عصر، ہم ملک اور ہم سایہ ہیں چاہے وہ صاحب ایمان ہوں یا نہ ہوں۔ملت ان لوگوں پر مشتمل ہوتی ہے جو ایک عقیدہ اورنظریہ کے پابند ہوتے ہیں۔یعنی جو ایک خاص نظام عقیدہ کے تحت وجود میں آتی ہے۔لہذا اگر ہندوستان کے تناظر میں بات کی جائے تو ہندوستان ہماری قومیت ہے۔ اور ہندوستان میں بسنے والے تمام لوگ اس قومیت کا حصہ ہیں اور ہماری دعوت کے مخاطب اورخدمت کے حقدار ہیں۔ عقیدے کی زبان میں بات کی جائے تو ہم مسلمان امت ہیں جوملک ہندوستان میں رہتے ہیں،لہٰذا اجتماعی ہیئت کا جزو لاینفک ہیں جس کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جاسکتا ہے،قرآن کی رو سے اس امت کولوگوں کی بھلائی کے لیے برپا کیا گیا ہے، بھلائی ایک عام انسانی اخلاقیات ہے لیکن کوئی قوم پوری کی پوری خیرالناس کے لیے اٹھائی گئی ہو یہ اعزاز صرف مسلمانوں کوحاصل ہے۔ایسی ملت کے افراد اتنے تنگ دل اورتنگ ذہن کیسے ہوسکتے ہیں؟ وہ اتنے خودغرض کیونکر ہوسکتے ہیں جو اپنے سوا کسی اور کی طرف دیکھ ہی نہ سکیں؟ دراصل صدیوں کی غلامی نے قوم کا جوہر کردار چھین لیا ہے اور ایک آفاقی امت اس قدر مقامی اورمحدود ہوگئی ہے جس کو اپنے پڑوس کی بھی فکرنہیں ہے اور اپنے فلاحی کاموں کومسلم اورغیرمسلم میں تقسیم کر کے دیکھتی ہے اوراس پر قانع اور مطمئن ہے بلکہ اگر کوئی اس دائرے سے باہر آنے کی تلقین کرتا ہے تو اس کو مشکوک نگاہوں سے دیکھتی ہے اور برا بھلا کہتی ہے۔ بہر حال وقت آ گیا ہے کہ ہم اس تنگنائی سے باہر نکلیں اورفضائے بسیط میں پرواز کا دم خم پیدا کریں۔ساری انسانیت اللہ کا کنبہ ہے اور وہ لوگ اللہ کو زیادہ پسند ہیں جو اس کنبے کی بھلائی کے لیے کوشاں ہوتے ہیں۔ملت کی

کمزوری، بے چارگی اوراخلاقی زوال کی ایک بڑی وجہ اس کی تنگ نظری،کم ہمتی اورخودغرضی ہے۔ہمیں ان رذائل اخلاق سے خودکو باہر نکالنا ہوگا۔قوم کا مستقبل ایک مثبت فکر اورحوصلہ مند سوچ کا متقاضی ہے۔اس کے لیے ہمارے علما اور دانشوروں،سیاسی سماجی کارکنوں،طلباء اورمعلموں اوران تمام سوچنے سمجھنے والے ذہنوں کوایک ایسی فضا بنانی ہوگی جوقوم میں نیا حوصلہ پیدا کرے اور اس کو نئے عزائم سے ہمکنار کرے اس کونئی منزل کی طرف گامزن کرے، بے مقصد قوم بے حوصلہ ہوکر منتشر ہوجاتی ہے۔ہمیں اپنی قوم کو بامقصد اور باحوصلہ بنانا ہے۔ یہ اولوالعزمی کا کام ہے۔بغیر جوکھم اٹھائے کوئی بڑا مقصد حاصل نہیں کیا جاسکتا ہے۔اس لیے آیئے مشترکہ امورومسائل میں مشترک میل ملاپ کا داعیہ پیدا کریں،اپنی قائدانہ صلاحیتوں کا تعارف کرائیں، بھوک، مال نیوٹریشن،غریبی، بیماری، بے کاری، جہالت، ظلم، استحصال، صاف پانی کی فراہمی، ماحولیات کی حفاظت،صفائی ستھرائی،ڈرینج اورسیوریج یہ وہ مسائل ہیں جن کا کوئی مذہب نہیں ہے،جن کی کوئی قومیت نہیں ہے۔یہ انسانیت کے عام مسائل ہیں۔لہٰذا ان مسائل کےحل کے لیےمشترکہ جدوجہد درکار ہے۔مسلمانوں کواس معاملے میں پہل کرنی چاہیےاوران مسائل کےحل کے لیےملی فورم پربھی اورمشترکہ ملکی فورم پربھی ٹھوس منصوبہ بندی اور پروگرام کے ساتھ اپناتعاون پیش کرنا چاہیے۔غریب صرف مسلمان ہی نہیں ہیں بلکہ ہندوستان کی آدھی آبادی غریب ہے۔جہالت اور بےکاری صرف مسلمان کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ پورے ہندوستان کا مسئلہ ہے۔لہٰذا ان مسائل کےحل میں بھرپور تعاون دیناایک دینی،ملی اورانسانی فریضہ ہے،کسی بھی آفات سماوی یاارضی کے وقت ہماری طرف سے اٹھنے والا ہاتھ صرف ضرورت مندکو دیکھے،ان کا دین دھرم،قوم برادری نہ دیکھے،وہ انسان ہیں،ضرورت مند ہیں لہٰذا ہماری مدد کے مستحق ہیں، جب تک اپنی ایک روٹی کا آدھاحصہ کسی بھوکے پڑوسی اور دیگرشخص کےحوالے کرنے کا داعیہ پیدانہیں کریں گے ہماری اخلاقی عظمت متحقق نہیں ہوگی اور ہم قوموں کی بھیڑ میں سر اٹھا کرنہیں چل سکتے ہیں۔اس لیےکل کی باتیں چھوڑیئے آج اورآنے والےکل کی فکر کیجئے اورایک نئے ذہن،ایک نئے عزم اورایک نئے اخلاق کے ساتھ خودکو

متعارف کرائیے، یقین جانئے مستقبل آپ کا ہوگا۔

حق کی آواز بن کر اٹھو!

ہمیں سیکولرزم اور کمیونزم کی بے معنی بحث سے اوپر اٹھ کر انسانیت نوازی کے فلسفے کو حرز جاں بنانا چاہیے اور ہر کمزور، مظلوم اور محروم کی طرف سے کھڑا ہونا چاہیے۔ ہم ہر تعصب اور تنگ نظری سے بالاتر ہو کر انصاف کے علمبردار بنیں اور ظالم کوئی بھی ہو اس کا ہاتھ پکڑنے کا دم خم پیدا کریں۔ ہمیں معلوم ہے جب اسٹیٹ ایجنسی ظلم پر آمادہ ہو جاتی ہے تو اس کا مقابلہ کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ مگر اسی وقت ہمت کے ساتھ حق کی آواز بن کر اٹھنے کی ضرورت ہے۔ ہندوستان ایک شدید بحرانی دور سے گزر رہا ہے۔ ہندوستانی سماج میں زبردست ٹوٹ پھوٹ جاری ہے۔ فرقہ پرست، تنگ نظر، متعصب اور فاشسٹ ذہنیت کے لوگ فیصلے کے مقام پر چھاتے جا رہے ہیں، جنہوں نے انصاف پسند عوام کے لیے دائرہ کار محدود کر رکھا ہے۔ لہٰذا اس آزمائش کی گھڑی میں ایک جاندار قیادت کی ضرورت ہے۔ اس خلا کو کون پر کرے گا یہ دیکھنے کی چیز ہے۔ اکیسویں صدی کا ہندوستان ایک بار پھر معمار حرم کو تعمیر جہاں کے لیے بیدار، مستعد اور منظّم ہونے کی دعوت دے رہا ہے۔ تاکہ انسانیت عظمی کو ایک نیا حیات بخش ماحول عطا کیا جا سکے، یہ کام کیسے ہوگا، اس کی شروعات کس طرح کی جا سکتی ہے اس کی ابتداء کہاں اور کن کاموں سے کی جائے، اس کا تنظیمی ڈھانچہ کیا ہوگا، کون سے مردان کار درکار ہیں؟ یہ بڑے سوالات ہیں جن پر سر جوڑ کر بیٹھنے اور فیصلہ لینے کی ضرورت ہے۔ تو آیئے پہلے ایسی سوچ پیدا کریں پھر عمل کی راہیں خود بخود نکل آئیں گی۔

ہندوستان میں کمیونل ہارمونی کی ضرورت اور مسلمانوں کا نقطہ نظر

ہندوستان کی سماجی اور تمدنی بناوٹ:

ہندوستان کسی ایک قوم، مذہب اور زبان کا ملک نہیں ہے بلکہ ساڑھے بتیس لاکھ اسکوائر کیلومیٹر میں پھیلا ہوا ایک وسیع وعریض ملک ہے جہاں 1300 ملین لوگ رہتے ہیں۔ یہ مختلف مذاہب، زبانوں، کلچروں، رنگوں اور نسلوں کا ملک ہے۔ ہندوستان میں جتنے مذہبوں، رنگوں، نسلوں اور زبانوں کے لوگ پائے جاتے ہیں وہ سب یہاں کے اصلی اور پیدائشی شہری ہیں۔ دنیا میں شاید ہی کسی ملک اور خطہ میں ایسی رنگارنگی ملے گی۔ اور یہ سب اس طرح سے گھلے ملے ہیں کہ انہیں کسی طرح ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا ہے۔ اس لیے ہندوستانی کلچر کو بجا طور پر Mosiac Culture کا نام دیا گیا ہے۔ ایک ایسے ملک میں فرقہ وارانہ میل ملاپ (Communal Harmony) وقت کی ایک اہم ضرورت ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر ملک کا استحکام (Solidarity) سالمیت (Integrity) اتحاد (Unity) اور ترقی (Development) سب خطرے میں پڑ جائیں گی۔ بلکہ آج جو صورتحال پیدا ہوگئی ہے اس نے دیش کی ایکتا، اکھنڈتا اور وکاس کے سامنے ایک بڑا سوالیہ نشان (Question Mark) کھڑا کر دیا ہے۔ اگر آپ بھارت کی جغرافیائی بناوٹ اور اس میں مختلف بھاشا، دھرم، سنسکرتی کے پھیلاؤ کو دیکھیں تو آپ کو پہلی نظر میں یہ واضح ہو جائے گا کہ ہماری سرحدی ریاستوں میں

ان لوگوں کی اکثریت ہے جو پورے ملک کے تناسب سے اقلیت (Minority) میں ہیں۔ مثال کے طور پر کشمیر میں مسلمان اکثریت میں ہیں۔ پنجاب میں سکھ اکثریت میں ہیں، نارتھ ایسٹ میں عیسائی اکثریت میں ہیں کیرالہ، آندھرا پردیش، تامل ناڈو، پانڈیچیری، گوا وغیرہ میں عیسائیوں کی بڑی آبادی ہے۔ اس کے علاوہ ملک کے اندرونی حصوں میں بہت سے ضلع، شہر اور گاؤں ہیں جہاں مختلف اقلیتی گروہ اکثریت میں ہیں۔ مثال کے طور پر سچر کمیٹی کی رپورٹ کے مطابق ۲۰۰۱ء کی مردم شماری کی رو سے ہندوستان میں 9 اضلاع ایسے ہیں جہاں مسلمانوں کی آبادی %75 سے زیادہ ہے، اس میں لکش دیپ اور جموں کشمیر کے 8 اضلاع ہیں۔ 11 اضلاع جہاں %50 کے بیچ ہے ان میں چھ اضلاع آسام میں دو اضلاع جموں وکشمیر میں ایک ایک ضلع کیرالہ، بہار اور بنگال میں ہے۔ اس طرح بھارت میں 20 اضلاع ایسے ہیں جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں ملک میں 38 اضلاع ایسے ہیں جہاں مسلمانوں کی آبادی %25 سے زیادہ اور %50 سے کم ہے۔ ان 38 اضلاع میں مسلمانوں کی %22 آبادی رہتی ہے۔ ان میں سے 12 اضلاع اتر پردیش میں، 5 اضلاع مغربی بنگال میں 5 کیرالہ میں 4 آسام، بہار، جھارکھنڈ، میں دہلی میں ایک ایک ضلع آندھر اپردیش، ہریانہ، جموں وکشمیر، اتراکھنڈ اور پانڈیچیری میں ہیں۔ اس لیے اگر ملک میں بدامنی، انتشار اور ٹکراؤ کی فضا پیدا ہوتی ہے تو ٹھیک ہے کہ اقلیتی گروہوں کو خاص طور سے مسلمانوں کو زیادہ نقصان اٹھانا ہوگا لیکن یہ چیز بالآخر پورے ملک کو تباہ کردے گی۔ اس لیے ہر سوچنے سمجھنے والا آدمی موجودہ صورتحال سے پریشان ہے اور فرقہ وارانہ خیر سگالی کو وقت کی اہم ضرورت مانتا ہے۔

فرقہ پرستی کیا ہے؟

اس سے پہلے کہ فرقہ وارانہ میل ملاپ یا Communal Harmony کی بات کی جائے، یہ جان لینا چاہیے کہ Communalism یا فرقہ پرستی کیا ہے؟ افسوس کی بات ہے کہ باوجود بہت کوشش کے اب تک فرقہ پرستی کی کوئی ایسی جامع تعریف (Definition) متعین

نہیں کی جاسکی ہے جسے سب مانتے ہوں۔اس لیے ہر آدمی اپنی سمجھ کے مطابق بڑی آسانی سے کسی کو فرقہ پرست ٹھہرا دیتا ہے۔کسی بھی آدمی کا اپنی کمیونیٹی سے محبت رکھنا اور اس کے جائز مفادات (Legitimate interest) کی حفاظت کرنا یا اس کو حاصل کرنے کی کوشش کرنا فرقہ پرستی نہیں ہے بلکہ فطری امر (Natural Urge) ہے۔

فرقہ پرستی وہاں سے شروع ہوتی ہے جب ایک آدمی اس لکشمن ریکھا کو پار کر جاتا ہے اور اپنی کمیونٹی کی جائز اور ناجائز دونوں معاملوں میں طرف داری شروع کر دیتا ہے۔یعنی انصاف کا راستہ چھوڑ کر ظلم کا راستہ اپنا لیتا ہے اور My nation right or wrong کا نعرہ لگانے لگتا ہے۔یہ صورت حال اس وقت خطرناک ہوجاتی ہے جب کوئی اس کو روکنے ٹوکنے والا نہیں ہوتا یا روکنے والوں کی آواز اور پکڑ اتنی کمزور ہو جاتی ہے کہ سماج ایسی طاقتوں کے سامنے سرنگوں ہو جاتا ہے۔یہی وہ صورتحال ہے جس کو فرقہ پرستی،ظلم اور فاشزم کا نام دیا جاسکتا ہے۔ فاشزم انہیں بھی نگل جاتا ہے جو اس کے پوشک ہوتے ہیں۔فاشزم کھڑا تو ہوتا ہے راشٹر واد کے نام پر لیکن بالآخر وہ ملک کو توڑ کر دم لیتا ہے۔جرمنی کی مثال ہمارے سامنے ہیں۔

فرقہ پرستی کیا ہے اور کیا نہیں ہے؟ اس کو ایک مثال سے واضح کیا جاسکتا ہے۔دو لڑکے ہیں اور دونوں Equal Merit کے ہیں۔اس میں ایک لڑکا ہماری کمیونٹی کا ہے اور دوسرا کسی دوسری کمیونٹی کا ہے۔اب ہمارے سامنے سوال یہ ہے کہ ہم کس کو ترجیح (Preference) دیں تو فرقہ پرستی یا بے جا طرفداری (undue favour) نہیں ہوگی۔اس صورت میں ہم جس کسی کا بھی انتخاب کریں گے صحیح مانا جائے گا۔کیونکہ دونوں یکساں صلاحیت کے حامل ہیں لیکن اگر ہم نے کسی ایسے لڑکے کو جو Superior Merit کا تھا محض اس لیے دبا دیا کہ وہ ہماری کمیونٹی کا نہیں ہے اور اس کے مقابلے کسی ایسے لڑکے کو آگے بڑھایا جو Inferior Merit کا تھا اس لیے کہ وہ ہماری کمیونٹی کا ہے تو یہ فرقہ پرستی ہے جو انصاف اور انسانیت کے خلاف ہے۔ آگے بڑھنے سے پہلے ہم یہاں یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ اصولی طور پر ایک مسلمان کو فرقہ پرست نہیں ہونا چاہیے۔اس لیے کہ فرقہ پرستی اس کے دعویٰ کی Anti- thesis ہے۔اسلام

خدا کا دین ہے اور خدا وہ ہے جوتمام انسانوں اورتمام جہانوں کا پالنہا رہے۔ یہ دین تمام انسانوں کے لیے ہےاس لیےمسلمان A messenger of God towards the whole humanity ہے۔ اسلام کا پیغام دنیا والوں تک رواداری، پریم،سیوا اورسوہارد کے واتاورن میں ہی پہنچایا جاسکتا ہے۔نفرت اور ہنسا کے ذریعہ نہیں۔قرآن مسلمانوں کو ہر حال میں انصاف کے راستہ پرقائم رہنے کی ہدایت کرتا ہے۔قرآن سورۃ النساء آیت ۱۳۵ میں اعلان کرتا ہے۔

> ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو،انصاف کے علمبردار بنو اور خداواسطے کے گواہ بنو اگر چہ تمہارے انصاف اور تمہاری گواہی کی زدخود تمہاری اپنی ذات پر یا تمہارے والدین اور رشتہ داروں پر ہی کیوں نہ پڑتی ہو۔فریق معاملہ خواہ امیر ہو یا غریب اللہ تم سے زیادہ ان کی بھلائی چاہنے والا ہے۔ لہٰذا اپنی خواہش نفس کی پیروی میں انصاف سے نہ پھرو اور اگرتم نے لگی لپٹی بات کہی یا سخت بات سے پہلو بچایا تو جان رکھو کہ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ کو اس کی خبر ہے۔''
>
> (النساء۴: ۱۳۵)

مجھے یہ بات کہنے میں کوئی جھجھک نہیں ہے کہ مسلمان اپنی مانوسند یشٹا یعنی داعی امت ہونے کا احساس بھول چکے ہیں اور وہ بھی ایک نسلی اور وطنی قومیت بن گئے ہیں جس کی وجہ سے تمام نسلی اور وطنی قوموں کے طرح ان کے اندر بھی فرقہ پرستی کا زہر سرایت کرتا جارہا ہے۔ بھارت کی جدو جہد آزادی کے دوران ہم اس کی بھیانک اور مکروہ شکل دیکھ چکے ہیں۔ دوقومی نظریہ کے تحت ہندوؤں اور مسلمانوں میں جوفرقہ پرستی ابھری وہ ملک کی تقسیم پر منتج ہوا۔ دوقوم سے دو اور پھر بعد میں تین ملک بن گئے،جس نے اس وقت پورے ساؤتھ ایسٹ ایشیا کو جنگ اور بدامنی سے دوچار کردیا ہے۔ میں پوری قوت سے اعلان کرنا چاہتا ہوں کہ نہ تو یہ اسلام ہے اور نہ ہی یہ مسلمانوں کے مفاد میں ہے۔

Communalism کا جواب Communalism نہیں ہے بلکہ Communalism کا جواب Bold, Assertive & derterministic humanism, ہے۔قرآن کہتا ہے کہ اگر سخت

آزمائشی حالات میں لوگوں کے ساتھ حسن سلوک اور انصاف کی روش قائم رکھی جائے اور حالات کا صبر اور حکمت سے مقابلہ کیا جائے تو وہ لوگ جو آج تمہارے شدید دشمن ہیں جلد تمہارے قریبی دوست بن جائیں گے۔ قرآن اعلان کرتا ہے۔ بلاشبہ نیکیاں برائیوں کو ختم کر دیتی ہیں۔ اسلامی تاریخ اور دنیا کی تاریخ اس حقیقت پر گواہ ہے۔ اس وقت ملک کے حالات ہمارے لیے پریشان کن ضرور ہیں لیکن مایوس کن ہرگز نہیں۔ اگر ہمارے اندر اس ملک کو دینے کے لیے کچھ ہے اور ہم Firm Determination کے ساتھ حالات کا مقابلہ کرنے کو تیار ہیں تو ظلم، نفرت اور ہنسا کے بادل جو اس وقت چاروں طرف چھائے ہوئے ہیں ہوا کے ایک جھونکے میں چھٹ جائیں گے۔ اس لیے ہمیں حالات سے مایوس نہیں ہونا چاہیے اور پوری دلجمعی کے ساتھ ملک اور انسانیت کی خدمت میں جٹ جانا چاہیے۔

بھارت میں مسلمان:

ہمارے بہت سے بھائیوں کو یہ دکھ ستا رہا ہے کہ چونکہ ہم گنتی میں کم ہیں اس لیے یہاں کی اکثریت ہمیں پس کر رکھ دے گی، کبھی کبھی بھارت کو اسپین، فلسطین اور بوسینیا بنانے کی دھمکی بھی سننے کو ملتی ہے۔ مجھے یہ بات صاف صاف کہنے میں کوئی جھجھک محسوس نہیں ہو رہی ہے کہ انشاء اللہ فرقہ پرستوں کا یہ سپنا کبھی پورا نہیں ہوگا۔ بھارت میں مسلمان اقلیت میں ضرور ہیں لیکن یہ ملک کی بڑی اکثریت ہیں اگر ان کو ایک آزاد ملک بنا دیا جائے تو آبادی کے لحاظ سے دنیا کا چھٹا سب سے بڑا ملک ہوں گے اس وقت انگلینڈ اور فرانس یورپ کے دونوں ملکوں کو ملا کر جتنی آبادی ہے ہندوستانی مسلمانوں کی آبادی اس سے زیادہ ہے۔ اتنی بڑی آبادی کو ہلاک کر دینا یا نظر انداز کر دینا ناممکن ہے۔ اس لیے اس طرح کے اندیشے دل میں پالنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ دراصل اقلیت اور اکثریت کوئی چیز نہیں ہوتی ہے بلکہ جو چیز اہم ہوتی ہے وہ Wisdom اور Determination ہے۔ حکمت اور استقلال سے ایک چھوٹی سی اقلیت بڑی سے بڑی آبادی پر غالب آ جاتی ہے۔ دنیا کی تاریخ، اسلام کی تاریخ، خود ہندو دھرم کی تاریخ اس

بات پر گواہ ہے۔ ہمارے سنگھ پریوار کے بہت سے بھائیوں کو مسلمانوں سے یہ شکایت ہے کہ وہ رام جی اور کرشن جی کی عزت نہیں کرتے۔ میں ان بھائیوں کو بتانا چاہتا ہوں کہ بھارتی مسلمان اس وقت جن حالات سے دوچار ہیں ان میں رام اور کرشن کا کردار ہمارے لیے امید کی کرن ہے۔ جب رام کو بن باس ہوگیا اور وہ اپنی بیوی اور بھائی کے ساتھ جنگل میں چلے آئے وہاں جب کہ وہ مسافرت میں تھے، غربت میں تھے، صرف تین تھے، تب ایک راجہ نے جو بلوان تھا جس کے پاس ہندو روایات کے مطاق روحانی قوت (Spiritual power) بھی تھی، چھل سے سیتا کا اغوا کرلیا۔ آپ سوچ سکتے ہیں کہ رام کے دل پر، ان کے ذہن ودماغ پر اس ہتک آمیز واقعے کا کیا اثر ہوا ہوگا؟ لیکن آپ پوری رامائن پڑھ جایئے آپ کو کہیں نہیں ملے گا کہ رام نے ایک پل کے لیے بھی یہ سوچا ہو کہ چلو ایودھیا واپس چلتے ہیں اور وہاں سے لاؤلشکر لے کر راون کو مزا چکھاتے ہیں۔ رام نے پورے یقین کے ساتھ یہ فیصلہ لیا کہ ہم اس وقت جن حالات میں ہیں اسی میں رہ کر سیتا کو واپس لانا ہے۔ انہوں نے چرند پرند (پشو پکشی) کی مدد سے اپنا مقصد حاصل کیا اور عزت کے ساتھ ایودھیا واپس آئے۔ رام کا یہ Determination ہم کمزوروں اور کم تعداد والوں کے لیے بڑی پونجی ہے اس لیے ہم کہتے ہیں کہ رام کا آدرش آج ہمارے ساتھ ہے۔ پانڈو صرف پانچ تھے اور کوروں کے ساتھ ٹڈی دل فوج تھی یہاں تک کہ کرشن نے اپنی فوج بھی انہیں دے دی تھی اور خود تنہا حق اور انصاف کا ساتھ دینے کے لیے پانڈو کے ساتھ ہوگئے تھے۔ کیا انجام ہوا مہابھارت کی جنگ کا؟ آج جو مہابھارت چھڑی ہے اس کا فیصلہ بھی ہمارے حق میں ہوگا۔ کیونکہ ہم انصاف کے راستے پر ہیں۔ اس لیے ہمیں اقلیت اور اکثریت کے چکر سے باہر آنا چاہیے اور Positive Way میں یہ سوچنا چاہیے کہ ہم اس ملک اور اس سماج کو کیا دے سکتے ہیں؟ اگر کچھ دے سکتے ہیں تو ہمارا مقام اور ہماری عزت محفوظ (استھان اور سمان سر کچھت) ہے اور نہیں دے سکتے ہیں تو پھر کسی چیز کی کوئی گارنٹی نہیں ہے۔ جب خدا نے دو ہاتھ دو پاؤں اور ایک سالم دماغ عطا کیا ہے تو پھر بیساکھی کے سہارے چلنا زندگی اور احترام (جیون اور سمان) کے منافی ہے۔ مسلمانوں کو یہ بات اچھی طرح سمجھنی ہوگی

ہم دوسروں کے بجائے خود پر بھروسہ کرنا سیکھیں۔صبر وحکمت سے سارے بند دروازے کھل جاتے ہیں۔علامہ اقبال نے کیا خوب کہا ہے ؎

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

ملک میں فرقہ واریت پھیلانا ملک سے غداری ہے:

اب میں لوٹ کر پھر اپنی اصلی بات کی طرف آتا ہوں۔اس وقت فرقہ واریت ایک متعدی مرض کی طرح پھیل گیا ہے اور پھیلتا جارہا ہے۔اس communal virus کا High Concentration Area Urban elite ہیں۔شہروں کے خوش پوش اور اونچی سوسائٹی کے لوگ اس وائرس کے شکار ہیں۔یہ Virus سب سے زیادہ ہمارے سیاستدانوں میں پایا جاتا ہے۔پھر بیوروکریٹس، اساتذہ،ٹیکنوکریٹس، پولیس، وکلاء،تجار اور صحافی حضرات،غرض جو بھی سماج کا اونچا طبقہ ہے ان میں کچھ لوگوں کو چھوڑ کر زیادہ تر لوگ آج فرقہ پرستی کے مرض میں مبتلا ہیں۔

> In India, which has always been, despite its constitutional secularism , a Hindu majoritarian state in practice -- innumerable studies have documented anti-minority biases in the bureaucracy, the judiciary, the police, the media and other institutions, the central contradiction was and remians, caste rather than class antagonism.
>
> (G.Sampath:The Missing Conservative intellectuals, The Hindu, Saturday July 25, 2015)

اس لیے صورت حال اتنی دھماکہ خیز بن گئی ہے۔اس وقت ملک کا سیکولر ایلیمنٹ اور Humanist Group پوری طرح Marginalised ہوگیا ہے۔اور فرقہ پرستوں کو کھل کھیلنے کا موقع مل رہا ہے۔اور وہ بڑی تیزی اور ہوشیاری سے اس جراثیم کو نئی نسل یعنی طلباء اور نوجوان

(ودیارتھیوں) میں بھی پھیلا رہے ہیں۔ یہاں تک کہ عورتوں اور بچوں میں بھی یہ وائرس پھیلایا جارہا ہے۔ لہٰذا بھارت اس وقت زبردست Psychological & Emotional Communal Divide کے دہانے پر پہنچ گیا ہے۔ ابھی تک گاوں کے سیدھے سادے لوگ اور بھولی بھالی عوام اس مرض سے بڑی حد تک اچھوتے تھے مگر ان کے ذہنوں کو بھی مسموم کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔

اس وقت جو پڑھے لکھے لوگ ہیں Highly placed اور Civilised لوگ ہیں ان کو Self Introspection کی ضرورت ہے۔ ملک اگر انتشار، بدامنی اور بکھراؤ سے دوچار ہوتا ہے تو یہ صورت حال کسی کے لیے فائدہ مند نہیں ہیں۔ اس لیے جو لوگ نفرت کا تھوک بیوپار کر رہے ہیں اور ہنسا کی فصل اگانا چاہتے ہیں انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ملک کے ساتھ اس سے بڑی غداری نہیں ہوسکتی ہے۔ اس دیش کا بھلا آپس میں مل جل کر رہنے میں ہے۔ ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہے جو بات چیت کے ذریعہ اور انصاف اور امن کے ماحول میں حل نہیں کیا جاسکتا ہے۔ آیئے ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچ سمجھ کر کام کریں۔ سارا مسئلہ آسانی سے حل ہوجائے گا۔ رہا دیش کی گدی حاصل کرنے کی تمنا تو یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ اس کے لیے ملک کی سالمیت کو داؤ پر لگا دیا جائے۔ اور پورے دیش میں قتل و خون کا بازار گرم کردیا جائے۔ اگر اس وقت آپ کو گدی مل بھی جاتی ہے تو مستقبل کا مورخ آپ کو غدار وطن ہی لکھے گا۔ اس لیے کہ دیش کو توڑنا اور کمزور کرنا غداری نہیں تو اور کیا ہے؟ اس وقت ملک کے فرقہ وارانہ ماحول کو خراب کرنے کے لیے طرح طرح کا پروپیگنڈہ کیا جارہا ہے۔ جس سے ملک کی شانتی بھنگ ہورہی ہے اور جگہ جگہ فرقہ وارانہ فسادات ہورہے ہیں۔ سب سے تعجب خیز بات یہ ہے کہ یہ سب کچھ دیش بھکتی کے نام پر ہورہا ہے۔ آگے پروپیگنڈہ مل کے کچھ خطرناک مصنوعات کا معروضی انداز سے جائزہ لے کر دیکھیں گے کہ واقعی اس کی حقیقت کیا ہے تاکہ عوام کو ان مکروہ رجحانات سے باخبر کیا جاسکے۔

پروپگینڈا مِل کے کچھ پروڈکٹ

ماضی میں مسلم حملہ آوروں اور حکمرانوں کے ذریعہ بہت سے مندروں اور عبادت گاہوں کی بے حرمتی اور انہدام کا پروپیگنڈہ کرکے ماحول کو خراب کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔

(۱) مندروں کی پامالی کا بیانیہ:

کہا جارہا ہے کہ کشمیر میں پچاس ساٹھ مندروں کو ڈھادیا گیا ہے۔ یہ بات اتنے بڑے پیمانے پر اور ایسے بڑے لوگوں کے ذریعہ پھیلائی گئی ہے کہ ایک عام آدمی کو اس پر یقین کرنے کے سوا چارہ نہیں تھا لیکن ۱۹۹۳ء کے ایک شمارے میں انڈیا ٹوڈے نے اس جھوٹ کا بھانڈہ پھوڑ دیا اور بتایا کہ یہ بات سراسر غلط ہے۔ دراصل کشمیر میں بابری مسجد کے ڈھائے جانے کے بعد ایک بھی مندر کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا گیا۔ ۱۹۹۰ء سے لے کر اب تک دو یا تین ایسے مندروں کو نقصان پہنچا جہاں سیکورٹی فورسیز تعینات تھیں اور جو دہشت گردوں کے حملے میں تباہ ہوئی تھیں لیکن فوراً مقامی مسلمانوں اور وہاں کی انتظامیہ نے اس کی مرمت کردی۔ یہ پروپگنڈہ دراصل بابری مسجد کے انہدام کے واقعے کو ہلکا کرنے اور ہندوؤں کے جذبات کو گرمانے کی غرض سے کیا جارہا تھا۔

(۲) منھ بھرائی کا الزام:

کہا جاتا ہے کہ ایک جھوٹ کو اتنی بار بولو کہ لوگ اسے سچ مان لیں۔ یہ افواہ بڑے زور شور سے پھیلائی جارہی ہے کہ ہر سطح پر مسلمانوں کی منھ بھرائی کی جاتی ہے۔ یہ ایک طویل موضوع ہے جس کا کھل کر جائزہ لینے کی ضرورت ہے اس پر پوری بحث ہونی چاہیے۔ ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ ہندوستان کی آزادی کے بعد کی تاریخ مسلمانوں کو ہر سطح پر اور ہر کسی کے ذریعہ الو بنانے کی تاریخ ہے۔ مسلمان اس ملک میں زندہ ہیں اور موجود ہیں، انہیں شہری حقوق حاصل ہیں اور ان کو کچھ دستوری تحفظات ملے ہوئے ہیں اگر یہ منھ بھرائی ہے تو واقعی اس کو مانا جاسکتا

ہے۔لیکن پچھلے 70 سالوں میں ہرروز ایک کی شرح سے جوفسادات ہوئے ہیں ان میں ہزاروں مسلمان مارے گئے ان کی عورتوں کی عزت لوٹی گئی،ان کااربوں کا مال خاکستر کیا گیا کیا یہی منھ بھرائی ہے۔مسلمان40%ان پڑھ ہیں،30% لوگ جوغریبی کی سطح سے نیچے ہیں ان میں 70% مسلمان غریب ہیں۔مسلمان ایڈمنسٹریٹیو سرویز(IAS) Indian Administretive Service میں صرف 3% ہیں۔دسواں کلاس پاس مسلمان صرف4% ہیں۔مسلمانوں میں1% Elite ہیں۔R.B.I کے مارچ 1992 کی رپورٹ کے مطابق بینکوں سے مسلمانوں کو 5.6% قرض ملا،Industrial Loan کا تناسب2% ہے۔ دیگر لون کا تناسب صرف3.7% ہے۔کیا یہ سب منھ بھرائی کی پالیسی کےتحت ہورہا ہے؟ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ ایک چیف منسٹر مسلمانوں کے ڈیلی گیشن سے صاف صاف کہتا ہے کہ تمہاری جان بچ گئی اب تمہیں کیا چاہیے؟Law & Order کوٹھیک رکھنا اورفسادات کی روک تھام کرنا جوکسی بھی مہذب اورذمہ دارسرکارکا بنیادی کام ہے،اس پربھی مسلمانوں پراحسان لادا جارہاہے۔ اگر یہ سب مسلمانوں کی منھ بھرائی ہے تو ہم مانتے ہیں کہ واقعی ہمارے ساتھ بڑ احسان کیا جارہاہے۔

(۳) چار بیویاں چالیس بچے:

پروپگنڈہ کیا جارہاہے کہ مسلمان چارشادیاں کرتے ہیں، فیملی پلاننگ نہیں کراتے اورخوب بچہ پیدا کرتے ہیں اگر یہی رفتار رہی تو عنقریب ہندواقلیت میں اوررمسلمان اکثریت میں ہوجائیں گے۔ابھی کچھ دنوں پہلے Mainstream میگزین نے اس پر Special Issue نکالا ہے۔ جہاں تک تعدد ازدواج کا سوال ہے تومسلمانوں کوقانوناًایک سے زیادہ بیوی رکھنے کی اجازت ہےاور ہندوؤں کونہیں ہے۔لیکن اس کے باوجود ایک سروے کے مطابق ہندوؤں میں تعدد ازدواج 5.06% ہےاورمسلمانوں میں4.31% ہے۔دور کیوں جایئے آپ اس شہر مظفرپورکو لے لیجئے بہار یونیورسٹی میں ایک بھی مسلمان ٹیچر ایسانہیں ہے جس کی ایک سے زیادہ

بیوی ہے جب کہ ایسے دسیوں ہندو ٹیچر ہیں جن کی ایک سے زیادہ بیویاں ہیں۔اس طرح آپ وکیل اورڈاکٹر کو لے لیجئے وہاں بھی آپ کو یہی صورتحال ملے گی۔تعدد ازدواج قانونی طور پر ایک سے زائد شادی کرنے کو کہتے ہیں لیکن جولوگ رکھیل رکھتے ہیں،چوری چھپے جنسی تعلق اختیار کرتے ہیں ان کی کوئی گنتی نہیں ہے۔ساری دنیا میں ایڈس کا مرض وبائی شکل اختیار کرگیا ہے جوثابت کرتا ہے کہ لوگ چاہے شادی ایک سے کرتے ہوں لیکن تعلق بہت سوں سے رکھتے ہیں۔اس لیے مسلمانوں کوذمہ دارانہ جنسی زندگی گزارنے پرمطعون کرنا دم کٹی لومڑی کا دم دار لومڑیوں کا مذاق اڑانے جیسا ہے۔جہاں تک آبادی کے بڑھنے کا سوال ہے 1971 سے 1981 کے درمیان ہندوؤں کے Birth rate میں 5.45% کا اضافہ ہوا جبکہ مسلمانوں کے Birth Rate میں 5.46% کی کمی ہوئی۔ 1980-89 کے درمیان مسلمانوں میں فیملی پلاننگ کے Permanent Method کا استعمال 11.5% بڑھا جب کہ ہندوؤں میں 10% بڑھا، Non Permanent method ہندوؤں میں 10% بڑھے اور مسلمانوں میں 5% سے 10% بڑھے۔یہ سارے Data سرکاری ہیں اور Census report سے لیے گئے ہیں اس لیے کوئی یہ نہیں کہہ سکتا ہے کہ مسلمانوں نے اپنا کیس مضبوط کرنے کے لیے ازخود گڑھ لیے ہیں۔ یہ 2001 کی Census report سے ماخوذ ہیں۔حال ہی میں آر۔ایس۔ایس کے جوائنٹ سکریٹری دتارے ہوسابلے نے ہندوؤں کوزیادہ بچہ پیدا کرنے کی تلقین کی ہے کیوں کہ ان کے خیال میں مسلمانوں کی آبادی جس تیزی سے بڑھ رہی ہے 2035 تک مسلمان اس ملک میں اکثریت میں ہوجائیں گے۔ہندوستان کے مشہور معاشی اخبار اکنامک ٹائمز نے (6 نومبر 2013) اسے حسابی ناممکنات (Mathematical impossiblity) قرار دیا ہے۔پچھلی پانچ دہائیوں میں مسلمانوں کی آبادی میں 2.7% کا اضافہ ہوا ہے جب کہ ہندوؤں کی آبادی میں 2% کا،جس کے نتیجے میں مسلمانوں کی آبادی میں 2.7% کا اضافہ ہوا ہے جبکہ ہندوؤں کی آبادی میں 2.9% کی کمی آئی ہے۔اگر یہ مان لیا جائے کہ آبادی میں بڑھنے گھٹنے کی شرح اسی طرح رہی تو مسلمانوں کو ہندؤں کے برابر آنے میں 250 سال لگیں گے۔لہٰذا یہ پوری

طرح ایک واہمہ ہے۔ مسلمانوں میں بڑھتی ہوئی آبادی کی بڑی وجہ ان کی غربت اور جہالت ہے۔ جن طبقات میں تعلیم اور معاش میں ترقی آئی ہے ان کی شرح پیدائش گھٹی ہے۔ اس لیے مسلمانوں کی شرح پیدائش کم کرنے کا سب سے موثر طریقہ ان کی تعلیمی اور معاشی ترقی ہے۔ سچر کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں افزائش آبادی پر خاص توجہ دی ہے۔ اس رپورٹ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ 1961 سے 2001 تک یعنی چالیس برسوں کے درمیان ملک کی آبادی میں 134% اضافہ ہوا ہے جبکہ مسلمانوں کی آبادی میں 194% کا اضافہ ہوا ہے جو یقیناً قومی اوسط سے بہت زیادہ ہے۔ مگر حال کے برسوں میں شرح آبادی میں گراوٹ دیکھی گئی ہے اور یہ گراوٹ مسلمانوں میں سب سے زیادہ ہے۔ مسلمان اور سبھی سماجی اور مذہبی اکائیوں میں آبادی کے معاملے میں عبوری دور کا آغاز ہو چکا ہے اور سبھی فرقوں میں ایک جنسی شرح پیدائش کا دور آیا چاہتا ہے۔ مسلمان اس معاملہ میں ہم عصر فرقوں سے دس پندرہ سال پیچھے ہیں۔

آبادی کے باب میں مسلمانوں کی ہر دو طرح کے الزام لگائے جاتے ہیں۔ پہلا مسلمانوں میں افزائش آبادی کی شرح سب سے زیادہ ہے جس کے سبب وہ کچھ دنوں میں ملک کی سب سے بڑی آبادی بن جائیں گے۔ دوسرا وہ ملک میں سیاسی قوت حاصل کرنے کے لیے اپنی آبادی بڑھا رہے ہیں۔ یہ دونوں باتیں غلط ہیں جس کا ثبوت اوپر پیش کیا گیا ہے۔ ماہرین کے اندازے کے مطابق بائیسویں صدی کی ابتدا تک آبادی میں اضافہ کی شرح رک جائے گی۔ اس وقت ملک کی کل آبادی 8-1.7 ارب ہوگی اور مسلمانوں کی آبادی 32 سے 34 کروڑ کے درمیان رہے گی۔ اس وقت ملک کی آبادی میں مسلمانوں کا تناسب 7.7% ہوگا۔ لہٰذا مسلمانوں کی آبادی کبھی بھی سب سے بڑی آبادی نہیں بن سکتی جو چیزیں پچھلی بارہ صدیوں میں نہیں ہوئیں وہ اب کیسے ممکن ہیں۔ لہٰذا یہ شوشہ محض ایک شرارت ہے۔

(۴) پرسنل لاء کا سوال:

کہا جاتا ہے کہ مسلمانوں کو پرسنل لاء جیسے خصوصی قانون حاصل ہیں جو ہندوؤں کو

حاصل نہیں ہیں۔ حالانکہ ہندوستان میں بسنے والی ہر مذہبی اکائی کا پرسنل لاء ہے جیسے سریائی عیسائیوں اور پارسیوں کا پرسنل لا ہے۔ یہاں تک کہ ہندوؤں کے لیے بھی ایک پرسنل لاء ہے جیسے ہندوؤں کے لیے ہندو وِواہ قانون، دتنک پتر قانون، وراثت کا قانون اور Undivided Hindu Faimly قانون، یہ قانون تو ایسے ہیں جن کی وجہ سے ٹیکسوں میں بھاری چھوٹ ملتی ہے۔ جب کہ مسلمان مشترک خاندان والوں کو یہ چھوٹ حاصل نہیں ہے۔ پھر امتیازی سلوک کس کے ساتھ ہورہا ہے۔ ساری دنیا اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی ہے۔

(۵) دفعہ ۳۷۰:

ایک سوال یہ اٹھایا جاتا ہے کہ کشمیر میں دفعہ ۳۷۰ کے ذریعہ وہاں کے مسلمانوں کو خصوصی مراعات حاصل ہیں کشمیر میں دفعہ ۳۷۰ کا مسئلہ ایک اہم نوعیت کا اور نازک مسئلہ ہے اس کو ہندو مسلمان کے نقطۂ نظر سے دیکھنا ایک احمقانہ عمل ہوگا۔ خاص طور سے وہاں کوئی باہری شخص زمین نہیں خرید سکتا ہے۔ کشمیر میں دفعہ ۳۷۰ سے بھارت کے اور حصوں کے مسلمانوں کا کوئی لینا دینا نہیں ہے۔ اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ ۳۷۰ ہٹا دینے سے وہاں کا مسئلہ حل کیا جا سکتا ہے تو ضرور کرے یہ کشمیر اور بھارت کے عمومی مفاد کا مسئلہ ہے یہ کشمیر اور بھارتی مسلمانوں کے مفاد کا مسئلہ نہیں ہے۔[1] جہاں تک سوال ہندوؤں کے زمین خریدنے کا ہے تو کوئی بھی غیر کشمیری خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان وہاں زمین نہیں خرید سکتا ہے اور یہ بات صرف کشمیر تک محدود نہیں ہے بلکہ ہماچل، میگھالیہ، ناگالینڈ میزورم اور دیگر قبائلی علاقوں میں اسی طرح کی پابندی لگی ہوئی ہے۔ اس لیے عوام کی کم واقفیت کی وجہ سے لوگوں کو گمراہ کرنا اور ان کے اندر بدگمانی پھیلانا اچھی بات نہیں ہے۔

(۶) شاہ بانو معاملہ:

---

(۱) 15 اگست 2019 کو مودی سرکار نے دوبارہ برسر اقتدار آنے کے بعد کشمیر سے نہ صرف دفعہ 370 ہٹا دیا بلکہ ریاست کو لداخ اور جموں کشمیر دو حصے میں تقسیم کر کے اس کو علاقہ زیر مرکز بنا دیا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ یہ قدم آگے چل کے اس مسئلہ کو حل کرتا ہے یا مزید الجھن بڑھتی ہے۔

اکثر لوگ شاہ بانو کیس کا معاملہ اٹھاتے ہیں اور اس میں مسلمانوں کی منھ بھرائی کی بات کرتے ہیں۔افسوس کی بات یہ ہے کہ خود سیکولر لوگ بھی مسلمانوں کے View Point کو ٹھیک سے نہیں سمجھتے ہیں اور اس کو Appreciate نہیں کرتے ہیں۔ضرورت اس مسئلہ پر بھی کھل کر بات کرنے کی ہے۔ یہاں اس موضوع پر تفصیل سے گفتگو کرنے کا موقع نہیں ہے۔ہم صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ کیا شاہ بانو معاملہ کوئی ہندو مسلم مسئلہ ہے یا مسلمانوں کا اندرونی معاملہ ہے؟ آپ انصاف اور عورت کے حق کی حفاظت کے نام پر تو اس مسئلے پر بات کر سکتے ہیں لیکن اسے Communal Problem ہرگز قرار نہیں دیا جا سکتا ہے۔ اس سے ہندو کمیونیٹی یا ہندو عورت کے مفاد پر کوئی ضرب نہیں پڑتی ہے ۔دوسری بات یہ ہے کہ مسلمانوں کو اعتراض اس فیصلے پر کم اور اس کے انداز پر زیادہ ہے۔ پرسنل لاء IPC کو Supercede نہیں کرتا بلکہ اس کے نفاذ کو محدود کرتا ہے۔ اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ یہ فیصلہ عورت کے مسئلہ کا حل نہیں ہے۔اسلام نے نفقہ کا جو سسٹم طے کیا ہے اس کا قریب سے جائزہ لیا جانا چاہیے اور اس کو نافذ کرنا چاہیے۔اس لیے ہمارے خیال میں شاہ بانو معاملہ میں سپریم کورٹ کا فیصلہ نہ تو Appropriate ہے اور نہ Adequate ہے۔ دراصل مطلقہ مسلم خاتون کو عملاً Single Woman Treat کرنا چاہیے اور Broad Social Security کے تحت لانا چاہیے۔سب سے زیادہ ہنسی تو اس وقت آتی ہے جب سنگھ پریوار کے لوگ مسلمان عورتوں کے حمائتی بن کر مگر مچھ کے آنسو بہاتے نظر آتے ہیں۔اگر انہیں مطلقہ مسلمان عورتوں کی حالت زار پر اتنی ہی ہمدردی ہے جس کے لیے وہ مسلم پرسنل لاء میں تبدیلی کرنا چاہتے ہیں تو انہیں فسادات میں اپنے رول پر ضرور دھیان دینا چاہیے ۔کبھی انہوں نے اپنے ذریعہ پھیلائی گئی نفرت کی آگ میں بیوہ ہونے والی عورتوں اور یتیم بچوں کے تئیں کوئی ہم دردی نہیں دکھائی۔اور نہ انہوں نے دسمبر کے فسادات میں سورت میں مسلمان عورتوں کی عصمت دری اور انہیں سڑکوں پر ننگا کر کے دوڑا کر ان کی فلم بنانے پر کوئی چنتا ظاہر کی بلکہ اس طرح کے پرچے پٹنہ اور مظفر پور میں بنٹتے ہوئے پائے گئے جس میں سورت کے واقعات کی ہر جگہ پُر ناوِرتی کرنے کی ایک مخصوص فکر کے

لوگوں کو ہدایت دی گئی تھی۔ اب آپ سوچ سکتے ہیں کہ مسلم پرسنل لاء میں تبدیلی کے پیچھے مسلمان عورت کی ہمدردی ہے یا اس کی کچھ اور وجوہات ہیں۔ گجرات دنگے (۲۰۰۲ء) میں ظلم و تشدد کا جو ننگا ناچ کیا گیا وہ ان کے ناپاک عزائم کی منہ بولتی تصویر ہے۔

(۷) آستھا کا سوال:

ایک اور سوال آستھا کا ہے۔ صحیح ہے آستھا کا فیصلہ عدالت کے ذریعہ نہیں ہوگا۔ لیکن سب سے اہم سوال یہ ہے کہ اس آستھا کی بنیاد کیا ہے؟ اگر ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ ہمارے ایمان کا مسئلہ ہے تو اس کے لیے قرآن اور حدیث سے ہم دلیل دیتے ہیں پھر ایمان کی بنیاد روز بدلنے اور بڑھنے والی چیز نہیں ہے بلکہ ایک بار جو بتا دیا گیا بس وہی ایمان کہلاتا ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ جس جگہ بابری مسجد تھی وہی جگہ رام کا جنم استھان ہے۔ اور یہ ہماری آستھا کا سوال ہے۔ چلیے مانا، آپ یہ بتائیے کہ کیا رامائن میں، اتر رامائن میں، مہابھارت میں، پوران میں، گیتا میں، وید میں کسی بھی جگہ اس جگہ کا ذکر ہے۔ پھر آپ کے پاس کیا تاریخی ثبوت ہے کہ وہاں کوئی مندر تھا جس کو توڑ کر مسجد بنائی گئی تھی؟ اگر آپ کسی دھرم گرنتھ اور تاریخ سے اس بات کو ثابت نہیں کر سکتے ہیں تو پھر یہ آستھا کا سوال کیسے ہوا؟ اور اگر آپ یہ ثابت کر دیتے تو آپ کو مسجد کو توڑنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ مسلمان لیڈر شپ نے لکھ کر دیدیا تھا کہ اگر یہ بات ثابت ہوگئی تو وہ خود اپنا دعویٰ واپس لے لیں گے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ ضد اور ہٹ دھرمی کو آستھا کا نام دے دیا گیا ہے تاکہ بحث کا رخ پھیر دیا جائے اور جس کی لاٹھی اس کی بھینس کے سہارے کچھ بھی کیا اور کہا جا سکتا ہے۔

(۸) اکثریت کے جذبات کا مسئلہ:

ایک سوال ہندوؤں کے جذبات کا اٹھایا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مسلمانوں نے دھرم کے معاملہ میں سپریم کورٹ کا فیصلہ نہیں مانا۔ یہ بات پوری طرح صحیح نہیں ہے۔ مسلمانوں نے اس عدالتی کارروائی سے کبھی انکار نہیں کیا اور کورٹ کو کبھی چیلنج نہیں کیا بلکہ سپریم کورٹ نے

جو فیصلہ دیا اس کے Redressal کے لیے جمہوری طریقے پر پورے ملک میں زوردار پرامن تحریک چلائی اور پارلیمنٹ سے جو ملک کا سب سے بڑا جمہوری ادارہ ہے اس سے Redressal چاہا۔ آپ تو جذبات کے نام پر اس عدالتی کارروائی سے انکار کررہے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ بھارت کی تاریخ میں یہ کوئی انوکھا واقعہ نہیں ہے۔ ایسا بارہا ہوا ہے کہ سپریم کورٹ کے فیصلے کے خلاف پارلیامنٹ نے قانون بنایا ہے۔ پری وی پرس اور بینکوں کے نیشنلائزیشن کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ ایک معاملہ ایک کمیونٹی کے جذبات کا ہے تو یہ ایک دوسرا ایشو ہے۔ جہاں دو کمیونٹی کے جذبات کا معاملہ ہو وہاں کیا کیا جائے؟ جب ایک کمیونٹی کہتی ہے کہ آؤ مل بیٹھ کر اس معاملہ کو حل کرلیں۔ لیکن اگر بات چیت کے ذریعہ یہ مسئلہ حل نہیں ہوتا تو کورٹ کا فیصلہ مان لیں وہ اپنے Sentiment کو چھوڑ کر اعلان کرتی ہے کہ ہم یہ فیصلہ مانیں گے چاہے وہ ہمارے خلاف ہی کیوں نہ ہو اور یہ بات وہ اس وقت کہہ رہی ہے جب کہ کورٹ نے اب تک سارا فیصلہ اس کے خلاف دیا ہے۔ اس کے بعد بھی لوگوں کو گمراہ کرنے کی ناپاک کوشش کرنا کیا ملک اور انسانیت سے دوستی کہی جاسکتی ہے؟

اس وقت ملک جس خوفناک صورتحال سے دوچار ہے، اس کو دو اور چیزیں خوفناک بنارہی ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس وقت ملک کی سب سے بڑی ٹریجڈی یہ ہے کہ اقتدار کی اونچی اونچی کرسیوں پر بہت چھوٹے چھوٹے لوگ براجمان ہیں جن کا نہ تو کوئی کردار ہے اور نہ کوئی Commitment۔ وہ اپنی ذات کے سوا کسی اور چیز کے وفادار نہیں ہیں اور ان کا سب سے بڑا اخلاق کسی طرح گدی حاصل کرنا اور اس پر بنے رہنا ہے۔ آج بھارت میں گاندھی، نہرو، مولانا آزاد، جے پرکاش نارائن اور لوہیا کے قد کا کوئی لیڈر نہیں ہے جس کی National & International image ہو اور جو اپنی ذات سے اوپر اٹھ کر سوچتا ہو۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہمارے جو Secularist ہیں وہ اتنے Demoralise Subdude & Disorganised ہیں کہ وہ اس صورتحال کا مقابلہ کرنے کے لیے ابھی تک عملی طور پر تیار نہیں ہوسکے ہیں۔ پروفیسر آر۔ اس۔ شرما کے بقول جب کارسیوک ایودھیا لائے جارہے تھے تب کسی بھی سیکولرسٹ نے

ان کو سمجھانے، روکنے اور اس کی خاطر دو چار ہاتھ کھانے کی ایک مثال بھی پیش نہیں کی۔ کیسے مان لیا جائے اس دیش میں سیکولر طاقتیں موجود ہیں اور مضبوط ہیں۔ جس وقت بی جے پی اور کانگریس اپنا کھیل کھیل رہی تھیں اور بابری مسجد ڈھادی گئی تمام سیاسی پارٹیاں صرف زبانی طور پر ہنگامہ کرتی رہیں نہ تو کسی سیاسی پارٹی نے اور نہ کسی Humanist Group نے یہ ہمت جٹائی کے جہاں دولاکھ لوگ ایک مسجد توڑنے کے لیے جاسکتے ہیں کیا بھارت جیسے ملک میں دولاکھ ایک مسجد بچانے کے لیے نہیں جاسکتے تھے۔ ملک کی سیکولر طاقتوں کو اپنی تصویر ایک بار آئینے میں ضرور دیکھنی چاہیے۔ شاید لوگوں نے یہ سمجھا کہ مسلمانوں کے لیے اتنا کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ دو چار بیان دے دینا کافی ہے لیکن اس سے سیکولر طاقتوں کے Genuine view اور Secular Crendential پر ایک سوالیہ نشان ضرور لگتا ہے۔ ہمارے سامنے اس وقت سب سے بڑا مسئلہ یہی ہے۔ جب کہ ایک طرف Communal forces دونوں ہاتھ سے ملک میں پورے جتھے کے ساتھ تندہی سے آگ لگا رہے ہیں ہمارے یہ نام نہاد سیکولر کہے جانے والے لوگ بقول دنکر سانسوں سے آگ بجھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ صورت حال کی نزاکت آپ کے سامنے ہے۔ اب آپ سوچئے کہ اس صورتحال میں Communal Harmony کیسے حاصل کی جاسکتی ہے؟

کمیونل ہارمونی کے لیے قرآن پاک کے سات سنہرے اصول:

ابھی وقت نہیں گیا ہے، ہم اگر مل جل کر ہمت کے ساتھ اٹھیں تو حالات کو بدلا جاسکتا ہے اس سلسلے میں Communal Harmony کے لیے قرآن جو اصول پیش کرتا ہے ہم آپ کے سامنے رکھتے ہیں۔ مجھے خوشی ہوگی اگر دوسرے مذاہب کی کتابیں اور Thinkers اس رائے کی تائید کریں گے۔ اس لیے کہ اس صورت میں ہماری منزل اور ہمارا ٹارگٹ ایک ہوگا اور ہم مل جل کر صورتحال کا مقابلہ کریں گے۔

پہلا اصول انصاف کی علمبرداری ہے:

اس سلسلے میں سب سے پہلا اصول قوانین بالقسط کا ہے۔ یعنی ہر حال میں Justice

Fair Play & کے راستے پر قائم رہنا اور اس میں اپنے اور پرائے میں کوئی تمیز نہیں کرنا۔ قرآن کا ارشاد ہے:

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! انصاف کے علم بردار بنو اور صرف خدا واسطے کے گواہ بنو چاہے یہ گواہی تمہیں اپنی ذات، یا اپنے والدین اور رشتہ داروں کے خلاف دینی پڑے۔ چاہے وہ غریب ہو یا امیر اللہ ان کی خبر گیری کے لیے کافی ہے۔ اپنی خواہش نفس کی پیروی میں انصاف سے روگردانی نہ کرو، اگر تم نے اس میں تبدیلی کی یا منھ پھیرا تو اللہ کو اس کی خبر ہے کہ جو تم کرتے ہو۔''

(۴:۱۳۵)

دوسری جگہ ارشاد ہے:

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! خدا واسطے کے گواہ بنو اور انصاف پر قائم رہو۔ کسی قوم کی دشمنی تم کو انصاف سے نہ روکے، ہر حال میں انصاف کرو یہ تقویٰ سے قریب تر ہے۔ اللہ سے ڈرو، اللہ جانتا ہے جو تم کرتے ہو۔'' (۵:۸)

دوسرا اصول تمام مذہبی شخصیتوں کا احترام ہے:

یعنی دوسرے مذاہب اور ان کے دھرم گروؤں کی بے حرمتی سے پرہیز کرنا ہے۔ قرآن کہتا ہے:

''یہ لوگ اللہ کے سوا جن کو پکارتے ہیں تم انہیں برا بھلا نہ کہو کہ وہ حد سے آگے بڑھ کر جہالت کی بنا پر اللہ تعالیٰ کو برا بھلا کہنے لگیں۔ اس طرح ہم نے ہر گروہ کو اس کا عمل خوشنما بنا دیا ہے۔ پھر انہیں اپنے رب کے پاس لوٹنا ہے، وہ انہیں بتائے گا کہ وہ کیا کرتے رہے تھے۔'' (انعام:۱۰۸)

تیسرا اصول تمام مذہبی مقامات کی حفاظت ہے:

یعنی سبھی مذاہب کی عبادت گاہوں کی حفاظت اور احترام۔ اسلامی جہاد کا ایک مقصد

قرآن نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ گرجوں،صومعوں،مندروں اور دیگر عبادت گاہوں کی حفاظت بھی کرنی چاہیے۔ارشاد باری ہے۔

''اگراللہ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعہ دفع نہ کرتا تو صومع اور گرجے اورمعبد اور مسجدیں جن میں اللہ کا ذکر کثرت سے کیا جاتا ہے،مسمار کردیئے جاتے۔'' (الحج:۴۰)

چوتھا اصول مذہب کے معاملے میں زبردستی سے پرہیز ہے:

یعنی مذہب کے معاملہ میں کوئی زور زبردستی نہیں ہونی چاہیے۔قرآن میں ہے لااکراہ فی الدین یعنی دین کے معاملے میں کوئی زبردستی نہیں ہے۔(سورہ البقرہ)

پانچواں اصول مذہبی معاملات میں مداخلت سے گریز:

یعنی کسی بھی دھرم میں کوئی مداخلت نہیں ہونا چاہیے۔تمہارا دھرم تمہارے لیے اور ہمارا دھرم ہمارے لیے۔لکم دینکم ولی دین تمہارا دین تمہارے لیے اور ہمارا دین ہمارے لیے۔(الکافرون)

چھٹا اصول سب کے ساتھ برابری کا سلوک ہے:

یعنی سبھی انسانوں کو ایک خدا کا بندہ،ایک ماں باپ کی اولاد ماننا اور سب کو ایک برابر تسلیم کرنا اور سبھی کی خدمت عزت کا راستہ اپنانا۔قرآن کا ارشاد ہے۔

''اے انسانوں !اللہ سے ڈرو جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اسی جان سے اس کا جوڑا بنایا اور اسی سے بے شمار مرد عورت پیدا کئے۔اللہ سے ڈرو جس کا نام لے کر تم ایک دوسرے سے اپنا حق طلب کرتے ہو۔اپنے رشتہ داروں کا خیال رکھو،اللہ سب چیزوں پر نگراں ہے۔'' (النساء:۱)

ساتواں اصول ظلم کے خلاف متحدہ محاذ بنانا:

یعنی ظلم میں کسی کی مدد نہیں کرنا، ظالم کا ہاتھ پکڑنا اور مظلوموں کی حمایت کرنا۔

مظلوموں کے ساتھ مل کر ظالم سے اس وقت تک لڑنا جب تک وہ ظلم کو چھوڑ کر انصاف کا راستہ نہ اپنالے۔قرآن کہتا ہے،

> ''تمھیں کیا ہو گیا ہے کہ اللہ کی راہ مین ان کمزوروں، مردوں، عورتوں اور بچوں کی خاطر نہیں لڑتے جو کہتے ہیں اے خدا ہمیں اس بستی سے نکال جہاں کے لوگ بڑے ظالم و جفا کار ہیں اور ہمیں اپنی طرف سے ایک محافظ اور مددگار مقرر فرما۔'' (النساء:۷۵)

یہ وہ سات سنہری اصول ہیں جن کو اپنا کر ہی ملک میں شانتی اور انصاف قائم کیا جاسکتا ہے اور اسی وقت Communal Harmony بامعنی ہوسکتی ہے۔ میں ملک کے تمام ہندوؤں اور مسلمانوں بالخصوص مسلمانوں کو ان سات سنہری اصولوں پر عمل کرنے کی دعوت دیتا ہوں اور اس کو لے کر اپنی غیر مسلم آبادی میں جانے کی درخواست کرتا ہوں۔ہم پر اس ملک اور یہاں کی آبادی کا جو حق عائد ہوتا ہے اس کو بغیر کسی اجر اور امید کے محض اللہ کی رضا کے لیے ادا کریں۔انشاء اللہ اس سے خیر کے ایسے چشمے پھوٹیں گے جو امن وانصاف سے پورے ملک کو سیراب کر دیں گے اور ہمارا وطن محبت اور خیر سگالی کی فصل سے لہلہا اٹھے گا۔آیئے ہم اپنے حصے کی ذمہ داری پوری کریں اور اللہ سے دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ہمارے ملک کو محفوظ و مامون رکھے۔آمین۔

علم کی بنیاد پر قومی یکجہتی: وقت کی ضرورت

موجودہ عہد ایک مجموعہ اضداد ہے۔ ایک طرف ناقابل یقین ترقی کے امکانات موجود ہیں تو دوسری طرف مکمل تباہی کی تیاری بھی ہے۔ اس صورتحال میں دنیا کو امن وترقی سے ہم کنار کرنے کے لیے ایک ایسے نظریۂ حیات اور ایک ایسی کتاب کی ضرورت ہے جو یقینی علم کی بنیاد پر تعمیر حیات کا درس دیتی ہے۔

فرد سے سماج بنتا ہے اور سماج سے ملک اور ملکوں کے اشتراک سے عالمی برادری وجود میں آتی ہے۔ انسان اگرچہ ایک خدا کی مخلوق اور ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہے، لیکن اس کے درمیان رنگ، زبان، نسل، قومیت اور مذہب کا فرق پایا جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے لوگ انسانوں کو الگ الگ خانوں میں بانٹ کر دیکھتے ہیں۔ لیکن ضرورت اور احساس کی سطح پر سارے انسان ایک جیسے ہیں۔ انسان کی طبیعت میں اختلاف سے فطرت میں اختلاف لازم نہیں آتا جو اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ ظاہری اختلاف کے باوجود اندر سے انسان ایک ہے جس کی خوشی اور غم، چاہت اور محرومی ایک جیسی ہے۔ اس لیے انسان صرف جسمانی بناوٹ کے لحاظ سے ہی نہیں طبیعت اور نفسیات کے لحاظ سے بھی ایک ہے۔ اس لیے دین وہ ہونا چاہیے جو سب کے لیے ہو اور جو سب کو اپیل کرے۔ ہم نے اپنے آپ کو اتنے خانوں میں بانٹ لیا ہے کہ ہم کل کے طرز پر سوچنا بھول گئے ہیں اور شاید انسانی سوسائٹی میں تفاوت اور تصادم کی

یہی وجہ ہے۔ دراصل وقت کی سوئی الٹی (Anti Clockwise) چل رہی ہے۔ اسے صحیح سمت میں لے چلنا اس زمین پر حیات انسانی کے وجود و بقا اور استحکام کے لیے ضروری ہے۔

کتابیں بہت سی ہیں، دعوے بھی بہت ہیں۔ مجھے ان دعوں اور کتابوں کی تردید میں کچھ نہیں کہنا ہے۔ میں مثبت طور پر قرآن پیش کرتا ہوں۔ قرآن کوئی نرالی کتاب نہیں ہے۔ یہ اپنی اصل (Origin) میں آسمانی اور اپنی تعلیم میں زمینی ہے جو زمین کے باسیوں کو سیدھی راہ دکھانے کا دعویٰ کرتی ہے۔ کسی چیز کو یہ کہہ کر رد نہیں کرنا چاہیے کہ یہ کسی دوسری قوم یا ملک سے آئی ہے بلکہ یہ دیکھنا چاہیے کہ یہ مفید ہے یا مضر۔ اگر مفید ہے تو اسے قبول کرنا چاہیے اور مضر ہے تو رد کر دینا چاہیے۔ لیکن لوگ چیزوں کو مخصوص عینک لگا کر دیکھتے ہیں اور عینک کے رنگ سے ہم رنگ دیکھ کر فتویٰ صادر کر دیتے ہیں کہ فلاں چیز کا رنگ ایسا ہے جبکہ حقیقت اس کے برخلاف ہوتی ہے۔ کچھ یہی معاملہ قرآن اور اسلام کے ساتھ ہے۔

مغرب اور مشرق میں عالموں، دانشوروں اور فلاسفہ کے مختلف گروپ ہیں جو اپنے اپنے نظریہ اور تہذیب کو غالب کرنے کے لیے دوسرے نظریہ حیات اور تہذیبوں کی صورت بگاڑ کر اس انداز میں پیش کرتے ہیں کہ لوگ غلط فہمیوں کا شکار ہو کر ان کی فکر میں ڈھل جاتے ہیں۔ یہ نوآبادیاتی طرز فکر آج بھی جاری ہے۔ سامراجیت کا وجود مٹ چکا ہے لیکن اس کی روح زندہ ہے جو نت نئے قالبوں میں اجاگر ہو کر عالمی وسائل و ذرائع پر قابض ہونے کی غرض سے سحر سامری کی طرح نت نئے رنگ میں رچ کر انسانی آبادیوں کو گمراہ کر رہی ہے۔ اس لیے رسل و رسائل کے ذرائع میں بیش بہا ترقی کے باوجود غلط فہمیوں اور تعصّبات کی دبیز چادر سے پورا عالمی معاشرہ ڈھکا ہوا ہے۔ پروپیگنڈہ کی تیز آندھی نے اتنی گرد اڑائی ہے کہ دوپہر کی دھوپ بھی ماند پڑ گئی ہے۔ لہٰذا موجودہ صورت حال میں کسی سچی بات کا ادراک ناممکن نہیں تو مشکل الحصول ضرور ہے۔ تاہم گھپ اندھیرے میں بھی چراغ اس لیے جلانا چاہیے کہ ایک طرف یہ آپ کے وجود کی علامت ہے تو دوسری طرف کسی بھٹکے ہوئے راہی کے لیے شمع امید۔

بھارت میں علم کی بنیاد پر قومی یکجہتی

کوئی قوم ناواقفیت اور غلط فہمیوں کے ساتھ آگے نہیں بڑھ سکتی ہے ۔ یہ چیز اس کی آزادی ،عزت ،امن اورترقی سب کے لیے خطرہ ہے ۔اس لیے صحیح بات جاننا اور سہی بات لوگوں تک پہنچانا یہ ملک و ملت کی ایسی خدمت ہے جس سے کوئی ہوش مند آدمی انکار نہیں کرسکتا۔ بھارت جیسے دیش میں اس کی ضرورت واہمیت کسی اور ملک سے کہیں زیادہ ہے۔

بھارت اگرچہ ایک ملک ہے لیکن یہ اپنے آپ میں ایک برعظیم ہے۔ جہاں ایک ساتھ سیکڑوں زبانیں بولی جاتی ہیں ۔دسیوں مذاہب کے لوگ اس ملک کے پیدائشی شہری ہیں۔تہذیب وثقافت کی رنگارنگی نے اسے عالمی تہذیب کا گہوارا بنادیا ہے ۔ایک عالم بوقلموں پوری توانائی کے ساتھ رواں دواں ہے۔ایک ایسے ملک میں جہاں اختلافات اتنے بڑے پیمانے پرموجود ہیں وہاں اگر ناواقفیت اور غلط فہمی کے بادل چھائے رہیں تو اندیشہ ہے کہ نفرت کی تیز بارش پورے ملک کوایک ایسے سیلاب بلا میں ڈبودے جہاں سب کچھ تہس نہس ہوجائے ۔اس طرح کا اندیشہ محض واہمہ نہیں ہے بلکہ ہم اپنی حالیہ تاریخ میں ایک ایسے تباہ کن مرحلے سے گذر چکے ہیں جس کا زخم ابھی پوری طرح مندمل نہیں ہوا ہے اور ہم کسی طرح دوسرا زخم کھانے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔ اس لیے بھارت جیسے ملک میں جو اپنی بوقلمونی (Hetrogeniety) کے لیے مشہور ہے بین الملل ترسیل (Inter Community Communication) کی جتنی ضرورت ہے شاید ہی دوسرے کسی ملک میں اتنی ضروری ہو۔

اس وقت ملک میں قومی یکجہتی (National Integration) کی بات بڑے زوردار طریقہ سے چل رہی ہے لیکن ناواقفیت کی بنیاد پر پیدا شدہ کوئی بھی مصنوعی یک جہتی زیادہ نقصاندہ ثابت ہوسکتی ہے۔ اس لیے وہی یک جہتی ٹھوس اور پائدار ہوگی جو پوری واقفیت کی بنیاد پر استوار ہو اور پوری واقفیت کے لیے مختلف اقوام کے عقائد ،تاریخ اور مذہبی صحیفوں کا معروضی انداز میں مطالعہ کرنا ضروری ہوگا۔ افسوس ہے کہ ہندوستان میں آج تک یہ فضا نہیں

بن سکی ہے اور مختلف اقوام نے ایک دوسرے کو جاننے کی سنجیدہ اور ایماندارانہ کوشش نہیں کی ہے۔

حال کے برسوں میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں جس قسم کے اختلافات رہے ہیں اس نے دونوں کے ذہنوں کو پوری طرح مسموم کر رکھا ہے اور ہر دو جانب ایک دوسرے کو جاننے اور سمجھنے کی ایماندارانہ کوشش کا فقدان پایا جاتا ہے۔ بلکہ اس کی جگہ پر ایک دوسرے کی کمزوریوں اور غلطیوں کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا جاتا ہے تا کہ دونوں قوموں کی دشمنی پروان چڑھے۔ گروہی نقطہ نظر سے یہ کوشش چاہے کتنی ہی مفید ہو لیکن ملک کے لیے نقصان دہ ہے اور محبّ وطن شہریوں کو اس پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے اور اس کو بدلنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس کا پہلا قدم یہ ہے کہ بغیر تعصب و تنگ نظری اور پہلے سے قائم شدہ کسی نظریہ (Pre-concieved View) کے بغیر چیزوں کو ان کی اصلی صورت میں دیکھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ان کے صحیفہ (Scripture) کا مطالعہ جیسا کہ وہ ہیں اس انداز سے بغیر کسی حاشیہ آرائی کے کرنا چاہیے۔ اس معروضی اور سائنسی انداز مطالعہ کے بغیر ہم حقائق تک نہیں پہنچ سکتے ہیں۔

لیکن اس میں ہماری کئی مجبوریاں ہیں۔ ایک طرف تو تنگ نظری اور تعصب کا ماحول ہے۔ دوسری طرف ہماری آدھی سے زیادہ آبادی ابھی بھی جہالت کی اندھی کھائی میں جی رہی ہے۔ جس نے مسئلہ کو پیچیدہ اور مشکل بنا دیا ہے۔ یہ بات کتنے شرم کی ہے کہ ایک طرف دنیا میں جب کہ علمی انقلاب آ چکا ہے ہم اپنے پڑوسیوں کو بھی، جو برسوں نہیں صدیوں سے ایک ساتھ رہتے آ رہے ہیں، ٹھیک سے نہیں جانتے۔ یہی وہ کمی تھی جس سے انگریزوں نے فائدہ اٹھایا تھا اور اپنی تقسیم کرو اور حکومت کرو (Divide & Rule) کی ناپاک پالیسی کے سہارے ہمیں غلام بنانے میں کامیاب ہو گئے تھے اور آج یہ پالیسی ملک میں نفرت کے سوداگروں اور سیاسی شعبدہ بازوں نے بھی اختیار کر رکھی ہے۔ جس کے نتیجے میں فسادات اور اس میں انسانی جان و املاک کی تباہی ہمارا مقدر بن گئی ہے۔ فسادات صرف امن و قانون کا مسئلہ نہیں ہیں بلکہ یہ جہالت اور نفرت کے پرچار کا نتیجہ بھی ہیں اور ان دونوں پر قابو پانے کے لیے صحیح جانکاری پہنچانا ایک بڑی

قومی خدمت ہے۔

اندھیرے کو دور کرنے کے لیے اندھیرے کو کوسنے سے بہتر ایک چراغ روشن کرنا ہے۔ چراغ کی روشنی خاموشی سے اپنے وجود کے دائرے میں تاریکی کو مٹادے گی، اور لوگوں کو صحیح چیز پوری روشنی میں دیکھنے کا موقع دے گی۔ اس لیے جہالت کا بدل علم ہی ہوسکتا ہے۔ غلط فہمی اور ناواقفیت اسی سے دور ہوگی۔ یہی چیز تعصب اور تنگ نظری کو بھی کم کرے گی اور بہتر افہام و تفہیم کا ماحول بنانے میں مدد بھی کرے گی۔ اس لیے وقت کی اس ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے ہمیں آگے آنا چاہیے اور اپنی طرف سے لوگوں کو صحیح باتوں سے روشناس کرنے کی کوشش شروع کرنی چاہیے۔

بھارت میں اسلام پہلی صدی ہجری کے اوائل میں ہی آگیا تھا۔ اس کی جڑیں اس ملک میں اتنی گہری اور اس کی شاخیں اتنی پھیلی ہوئی ہیں کہ ہندوستان اور اسلام ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ اسلام کے بغیر بھارت کا کوئی تعارف نامکمل ہوگا۔ بلکہ اگر کوئی شخص آج بھارت کو سمجھنا چاہے تو وہ اس کو سمجھ نہیں سکتا جب تک کہ وہ بھارت میں اسلام کے رول اور اس کے تعاون (Contribution) کو نہ سمجھے۔ بھارت میں اسلام کی ایک سماجی اور تمدنی تاریخ ہے اور دوسری سیاسی تاریخ ہے۔ ان دونوں میں تھوڑا فرق ہے جس کو نظر انداز نہیں کیا جانا چاہیے۔ اس ملک میں اسلام کی قربت اور قدامت کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ نہ تو مسلمانوں نے اس ملک میں اسلام کے تعارف کی کوئی ٹھوس اور سنجیدہ کوشش کی اور نہ ہی ہندوؤں نے اس کی طرف کوئی خاص التفات کیا بلکہ ہمیشہ سے ان کا ردعمل ایک متحارب نظریہ کا رہا ہے۔ مسلمان اپنے اقتدار کے نشہ میں یہ بھول گئے کہ وہ ایک داعی امت ہیں اور ان کو اس ملک میں اسلام کی دعوت دینی چاہیے۔ مسلمانوں کے طویل دور اقتدار میں ایک بھی بادشاہ ایسا نہیں ملتا جس نے سرکاری طور پر اسلام کی اشاعت و تبلیغ کی کوشش کی ہو۔ تاریخ میں شمس الدین التمش، تغلق اور اورنگزیب دیندار حکمران مانے جاتے ہیں۔ لیکن ان میں سے کسی نے بھی اشاعت اسلام کی کوئی کوشش کی ہے اس کی کوئی مثال نہیں ملتی ہے۔ بھارت میں اسلام کی اشاعت

میں یقیناً مسلم اقتدار سے مدد ملی ہے تاہم یہ کام زیادہ تر علماء،صوفیا،تجار اور عام مسلمانوں نے انجام دیا ہے۔کسی مرکزی نظام تربیت کے فقدان کی وجہ سے لوگوں کی صحیح اسلامی تربیت نہیں ہوسکی اور کفر واسلام کا ایک ایسا ملغوبہ تیار ہوگیا کہ بسااوقات مسلمان سماج میں رائج رسومات و عادات اسلامی تعلیمات کے بالکل برعکس نظر آتے ہیں۔

ہندوؤں کے عام طبقہ میں مسلمانوں سے نفرت اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ وہ انہیں ملیچھ سمجھتے تھے اور ان کے قریب آنا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔مسلمانوں کی وہ باتیں جن کو وہ اپنے خیال میں غلط سمجھتے تھے اس کی بنیاد پرنفرت و دوری پیدا کرتے تھے۔ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے سماجی روابط کو کبھی پسندیدہ نظروں سے نہیں دیکھتے تھے۔ دوسری طرف مسلمانوں میں بھی ہندوعقائد ونفسیات کے مطالعہ کی کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی گئی اور ان کا رجحان بھی ہندوسماج کی کمیوں اور خامیوں کو اجاگر کرکے ان کا مذاق اڑانا رہ گیا تھا۔ البیرونی نے ہندوسماج،ان کے عقائد،فکر وفلسفہ،تہذیب وثقافت کوسمجھنے کی ایک عالمانہ کوشش کی اور''کتاب الہند'' کے نام سے ایک جامع اور مستند کتاب لکھی مگر اس روایت کوآگے نہیں بڑھایا جاسکا اور بعد میں چل کر دوریاں بڑھتی گئیں۔

اکبر نے اپنے دور اقتدار میں اس جانب تھوڑی توجہ دی۔لیکن اس دوری کو پاٹنے کے بجائے اس نے دین الٰہی کے نام سے ایک نیا دین گڑھ لیا جس کو نہ تو ہندوؤں نے قبول کیا اور نہ مسلمانوں نے۔ داراشکوہ نے ہندومذہبی کتابوں کے مطالعہ کی ایک سنجیدہ کوشش کی تھی۔ لیکن اس نے کوئی معروضی نقطہ نظر اختیار کرنے کے بجائے ایک دوسرا ملغوبہ بنانا چاہا۔ اسلام کے سلسلے میں اس کا مطالعہ بھی ناقص تھا۔ اس لیے مسلم علماء اوردانشوروں نے داراشکوہ کی اس کوشش کو بہ نظر تحسین نہیں دیکھا۔

ان تاریخی اور سماجی عوامل کی وجہ سے دونوں قوموں کی نظریاتی دوری وقت کے ساتھ بڑھتی چلی گئی ۔ یہاں تک کہ ایک دوسرے کی کمزوریوں کو اچھالنا اور نفرت پیدا کرنا ان کا محبوب مشغلہ بن گیا۔ایک دوسرے کے پڑوس میں رہنے کے باوجود یہ ایک دوسرے کے معتقدات،

عبادات،تمدنی ضوابط، رسوم و قوانین سے بالکل ناواقف رہے، بلکہ ایک احساس ہتک (Sense of Contempt) دونوں قوموں میں موجود رہا۔ چنانچہ جب انگریز اس ملک میں آئے توانہوں نے اس صورت حال کواپنے حق میں بہت مفید پایا اورانہوں نے Divide & Rule کی ناپاک پالیسی اپنا کر دونوں قوموں میں ایسی نفرت و عداوت بھر دی کہ دونوں ندی کے دو پاٹ بن گئے جس پر کوئی پل نہیں تھا۔ کچھ لوگوں نے ملی اور ملکی مفاد میں ایک پل بنانے کی کوشش بھی کی لیکن نفرت کی آندھی اتنی تیز تھی کہ وہ اس میں کامیاب نہیں ہو سکے۔

اس صورت حال نے قومی افہام وتفہیم کی فضا کو اور خراب کر دیا۔ فرقہ واریت اور نفرت وتشدد کا رجحان اتنا بڑھا کہ بالآخر ملک تقسیم ہو گیا۔ تقسیم ملک اور آزادی کی سات دہائی کے بعد بھی نفرت کے سوداگر اپنی گھناؤنی تجارت سے باز نہیں آئے ہیں بلکہ پوری قوت سے اور بڑے پیمانے پر اپنی تجارت کو پھیلا رہے ہیں۔ لیکن یہ بات ملک کے مفاد میں نہیں ہے۔ ہم سب ایک ہی ملک کے شہری، ایک ہی کشتی کے مسافر ہیں۔ اگر کشتی کنارے لگتی ہے تو سب بخیر و عافیت کنارے پہنچ جائیں گے اور اگر ڈوبتی ہے تو سب ڈوب جائیں گے۔ ہمیں سمجھنا چاہیے کہ ہمارا فائدہ اور نقصان، خوشی اور غم ایک ہے۔ ہم ایک دوسرے سے نہ تو الگ رہ سکتے ہیں اور نہ ہر وقت لڑنا بھڑنا ہمارے مفاد میں ہے۔ لہٰذا ہمیں ایک دوسرے کو جاننا چاہیے اور پر امن بقائے باہم کی فضا بنانی چاہیے۔ تاریخی اور سماجی وجوہ سے دور رہنا یا دوری پیدا کرنا کسی کے حق میں نہیں ہے۔ اس لیے یہ اس ملک کے تمام شہریوں بالخصوص مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ پہل کریں۔ اپنی جانب سے قربت پیدا کریں اور اپنے ابنائے قوم کو صحیح دین سے واقف کرائیں اور اپنی خدمت کے ذریعہ اکثریت کا دل جیتنے کا اہتمام کریں۔

آزادی کی سات دہائیاں مکمل ہو چکی ہیں۔ ایک بچہ جو ۱۵؍اگست ۱۹۴۷ء کو پیدا ہوا تھا آج اس کی دوسری نسل اور تیسری اس کی گود میں کھیل رہی ہے یعنی وہ ناتی پوتوں والا ہو چکا ہے۔ اس درمیان نہ معلوم ہندوستان کی ندیوں میں کتنا پانی بہہ چکا ہے۔ مگر ایسا لگتا ہے کہ ہندوستانی سماج ایک مقام پر آ کر ٹھہر گیا ہے اور وہ مقام ہے تجاہل عارفانہ (Wilful ignorance) کا۔

ہم نہ تو خود کچھ سمجھنا چاہتے ہیں اور نہ ہی دوسروں کو کچھ سمجھانا چاہتے ہیں۔قوموں اور برادریوں کے درمیان ایک ایسی غیر مرئی دیوار کھڑی ہے جس کو توڑنے ،جس میں در بنانے ،یا جس کو پھلانگنے کے لیے کوئی تیار نہیں ہے۔

اگر ہمارے سیاست داں، صحافی،اساتذہ کرام، جج صاحبان، اعلیٰ انتظامیہ کے اراکین اعلیٰ پولس افسران اور سماج کے دیگر اعلی طبقے کے لوگ ناواقفیت اور تعصب کے دلدل میں گلے گلے تک ڈوبے ہوئے ہوں گے تو عام لوگوں کے بارے میں کیا کہا جاسکتا ہے۔مسئلہ یہ نہیں ہے کہ لوگ واقف نہیں ہیں بلکہ مسئلہ یہ ہے کہ لوگوں کے اندر صحیح واقفیت حاصل کرنے کی کوئی خواہش بھی نہیں ہے۔ وہ اس کی ضرورت واہمیت سے ناواقف ہیں۔دونوں قوموں کے درمیان اتنی ذہنی دوری ہے کہ صحیح بات جاننے،صحیح بات ماننے اور صحیح بات بتانے اور صحیح بات پہنچانے کے لیے کوئی تیار نہیں ہے۔اس صورت میں جب قومی یکجہتی کی بات کی جاتی ہے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیسے ہوگا؟ کیا ہم جہالت کی بنیاد پر قومی یکجہتی قائم کر سکتے ہیں؟ ایسا لگتا ہے کہ لوگ سیاسی ضرورتوں کے لیے محض یہ لفظ بولتے ہیں ورنہ دل سے اس کی ضرورت کے قائل نہیں ہیں۔اگر دل سے اس کی ضرورت کے قائل ہوتے تو ان کا رویہ اتنا غیر ذمہ دارانہ نہیں ہوتا۔

بہر حال مسئلہ یہ نہیں ہے کہ ہندوستان میں بسنے والی دیگر قومیں بالخصوص یہاں کی اکثریت اس معاملےمں غیر سنجیدہ ہے بلکہ وہ اس کی کوئی خاص ضرورت محسوس نہیں کرتی ہے۔ مگر ہم مسلمان اس معاملے میں اتنے غیر سنجیدہ اور غیر ذمہ دار نہیں ہوسکتے ہیں۔ اس کی تین وجہیں ہیں۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ ہم اللہ کی طرف سے منصب شہادت پر فائز ہیں یعنی ہم پر عام لوگوں تک صحیح بات غلط بات سے چھانٹ کر صحیح طو پر پہنچانے کی ذمہ داری دی گئی ہے ۔کوئی مانے یا نہ مانے مگر ہمیں اس کام کو کرنا ہے۔لہٰذا یہ ہماری منصبی ذمہ داری ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ ہماری قومی ضرورت ہے۔ ملک اور ابنائے ملک کی بھلائی کا کوئی کام،ایک دوسرے کو صحیح طو پر سمجھے اور جانے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اس لیے قوموں کے درمیان صحیح ربط وتعلق کے لیے ایک دوسرے کو صحیح طور پر جاننا اور اس کی حیثیت عرفی کو سمجھنا

ضروری ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ اگر ہم سماجی امن چاہتے ہیں، نفرت ، تشدد، تعصب سے پاک انصاف کی بنیاد پر ایک ترقی یافتہ خوشحال سماج کی تشکیل چاہتے ہیں تو اس کے لیے ضروری ہے کہ غلط معلومات اور غلط فہمیوں کی بنیاد پر جو ٹکراؤ اور بکھراؤ ہے اس کا ازالہ کیا جائے اور اس کے لیے بھی ایک دوسرے کو جاننا اور سمجھنا ضروری ہے۔ اس لیے اگر ملک میں کوئی اور اس کام کو نہیں کرتا ہے یا نہیں کرنا چاہتا ہے تو اس معاملے میں مسلمانوں کو اپنی منصبی ذمہ داری سمجھتے ہوئے ملک کی بقاء و استحکام اور پرامن سماجی ماحول کی تعمیر میں اپنے حصہ کی ذمہ داری ادا کرنے کی غرض سے خود کو صحیح تناظر میں پیش کرنا اور دوسروں کو صحیح تناظر میں سمجھنا اور اس کی بنیاد پر ایک مشترکہ لائحہ عمل تشکیل دے کر سماج کی تعمیر اصلاح اور ترقی میں معاون بننا ایک اہم انسانی اور اسلامی فریضہ ہے۔ لہٰذا مسلمانوں کو اس کام کے لیے آگے آنا چاہیے۔ جہالت و ناواقفیت کسی بھی ملک اور قوم کو کمزور کرتی ہے۔ جب کہ علم و جانکاری اس کی قوت و طاقت میں اضافہ کرتی ہے۔ لہٰذا علم کی بنیاد پر یکجہتی کی ایک سنجیدہ ایماندارانہ کوشش وقت کی ایک اہم ضرورت ہے۔

علم کی بنیاد پر قومی یکجہتی پیدا کرنے کی مختلف صورتیں ہوسکتی ہیں۔ جن کا یہاں اختصار کے ساتھ ذکر کیا جارہا ہے۔

(ا) بہتر عوامی رابطے کی کوشش

ہندوستان میں مسلمان دال میں نمک کی طرح ہیں جن کو کسی طرح اس ملک اور قوم سے الگ نہیں کیا جاسکتا ہے۔ یہ اس ملک کے ہر خطے اور ہر ریاست بلکہ ہر قصبہ اور ہر گاؤں میں موجود ہیں۔ لہٰذا ہر موقع اور ہر معاملہ میں اور ہر جگہ ہندوستان کی اکثریت اور دیگر اقوام سے ان سے رابطہ رہتا ہے۔ اس رابطے کو بڑھانا، مضبوط کرنا اور پھیلانا وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ مسلمانوں کو اس وسیع تر آبادی سے مختلف ذرائع سے عوامی رابطے کا اہتمام کرنا چاہیے تاکہ

روزمرہ کے تعلقات کے نتیجے میں ان کے سلسلہ میں پیدا ہونے والی غلط فہمی اور دوری ختم ہو سکے۔

(۲) مخاطب سے اس کی زبان میں بات کرنا:

ہندوستان میں دسیوں زبانیں اور سیکڑوں بولیاں بولی جاتی ہیں۔ ملک کی آدھی آبادی آج بھی ان پڑھ ہے۔ لہٰذا ان سے گفتگو کرتے وقت ان کی زبان اور محاورات کو جاننا اور سمجھنا ضروری ہے تا کہ آپ بغیر کسی واسطے کے بات کر سکیں۔ عام لوگوں تک اسلام کو پہنچانے کے لیے ان کی تہذیبی اور ثقافتی پس منظر کا گہرائی سے مطالعہ کر کے ان کی زبان اور محاورات میں اپنی بات پہنچانے کا اہتمام ضروری ہے تا کہ وہ اس کو اچھی طرح پڑھ اور سن کر سمجھ سکیں اور ان کو صحیح جانکاری صاف اور ستھرے انداز میں حاصل ہو جائے۔ اس غرض کے لیے مقامی بولیوں کو جاننا، علاقائی زبانوں کو سیکھنا اس میں بولنے اور لکھنے کی صلاحیت پیدا کرنا اس میں لٹریچر چھاپنا اور مکالمہ اور گفت وشنید کا ماحول پیدا کرنا ضروری ہے۔ لوگ جاہل، گنوار، بد تہذیب، آدی باسی، دیہاتی، دہقانی، غریب اور بے وزن ہو سکتے ہیں لیکن یہ سب آدمی ہیں۔ خدا کے بندے ہیں، زمین پر اس کے خلیفہ ہیں، لہٰذا ہمارے لیے قیمتی سرمایہ ہیں۔ ان کو غیر اہم سمجھ کر نظر انداز کرنا اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنا ہے۔ ہندوستان انہیں غیر اہم اور عام لوگوں سے مل کر بنا ہے۔ اس لیے ان سے جڑنا اور ان کو جوڑنا ہمارا دینی اور انسانی فریضہ ہے۔

(۳) خدمت کے دائرے کو بڑھانا:

مسلمان اس وقت ایک ایسی قوم ہیں جو ایک خول میں بند ہو گئے ہیں۔ مسلمان قوم سے باہر ہمارا رابطہ ہماری ہم قوم برادریوں سے نہ کے برابر ہے۔ یہ ہمارے لیے دوسرے نقصانات کا سبب ہے۔ ہمیں اس خول سے باہر نکلنا ہوگا اور اپنی خدمت کے دائرے کو وسعت دینا ہوگا۔ غریب، بھوکا، مجبور، مظلوم، بے بس، بیمار اور مصیبت زدہ جو فرد بھی ہے چاہے وہ مرد ہو یا عورت یا بچہ بوڑھا جوان ہو، مسلم ہو یا غیر مسلم ہمیں سب کا ہاتھ تھامنا ہے۔ سب کی مدد کرنی

ہے۔ سب کو سہارا دینا ہے۔ جو کام کتاب سے نہیں ہوگا وہ اخلاق سے ہوگا۔ خدمت اور اخلاق وہ جوہر ہیں جو دشمن کو دوست بنا سکتے ہیں۔ اگر ہم اس دائرے کو بڑھائیں گے تو جو دور ہیں، اجنبی ہیں وہ دوست موئد، معاون، ہمدرد بن کر ہمارے قریب آئیں گے۔

ہندوستان میں علم کے ساتھ قومی یکجہتی کے قیام میں یہ طریقہ کار دور رس نتائج کے حامل ہوں گے۔

بین الملل تعلقات اور اسلام

عالمی برادری میں مسلمانوں کو بدنام کرنے کی سازش

ہم اس وقت جس دور اور جن حالات سے گزر رہے ہیں اسے بجا طور پر عرصۂ محشر سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ بقول اقبالؔ

یہ گھڑی محشر کی ہے، تو عرصۂ محشر میں ہے
پیش کر غافل اگر کوئی عمل دفتر میں ہے

چنانچہ ہمیں قدم قدم پر ملک کے اندر اور بین الاقوامی سطح پر طرح طرح کے سوالات سے دوچار ہونا پڑتا ہے اور مسلمان آبادیوں، ملکوں بالخصوص ان کے دینی حلقوں کو طرح طرح سے بدنام کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ آج کل بین الاقوامی ایجنسیاں اور دیگر ذرائع ابلاغ، ریڈیو، ٹی وی۔ اخبارات ورسائل، انٹرنیٹ، سینما، مغربی اور مشرقی ممالک کے بڑے بڑے رہنما اور دانشوران مسلمانوں کی جو تصویر پیش کرتے ہیں اس سے مسلمانوں کے متعلق عام لوگوں کے دلوں میں بے شمار بدگمانیاں پیدا ہو رہی ہیں جن کا ازالہ نہایت مشکل بلکہ بسا اوقات ناممکن نظر آتا ہے۔ مسلمانوں کی مساجد، مدارس اور آبادیوں کو اتنا خوفناک اور بھیانک بنا کر پیش کیا جاتا ہے گویا یہ انسان نہیں بلکہ خونخوار درندوں کی آماج گاہ ہیں، کسی آبادی، ملک اور سماج کے لیے لازمی خطرہ ہیں۔ چنانچہ ان درندہ صفت لوگوں سے انسانی آبادی کو محفوظ رکھنا مہذب

سماج (Civilized Society) کی بقا کے لیے ضروری سمجھتے ہیں۔ان کے خیال میں مسلمانوں میں یہ وحشت ودرندگی براہ راست اسلامی تعلیمات کا نتیجہ ہے کیونکہ بقول ان کے اسلام میں دوسروں کو برداشت کرنے کا مادہ نہیں ہے۔اس میں عدم برداشت (Intolerance) بہت ہے اوروہ پرامن بقائے باہم (Peaceful Co-existence) کا قائل نہیں ہے۔اس کے ماننے والے دہشت گرد (Terrorist) اورلڑاکو (War Monger) ہوتے ہیں۔ یہ جہاں ہوں گے وہاں مہذب سماج کو ان سے خطرہ بنا رہے گا۔غرض مسلمانوں کی کچھ ایسی شبیہ (Image) بنائی جارہی ہے کہ ہرداڑھی ٹوپی والا،نماز پڑھنے والا، مدرسہ میں تعلیم پانے والا، یہاں تک کہ دبلا پتلا نحیف ونزار مسلمان بھی لوگوں کو آتنک وادی نظر آتا ہے اورلوگ اس کو شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

مسلمانوں کی یہ تصویر نہ صرف امریکہ اوردیگر مغربی ملکوں میں بنائی جارہی ہے بلکہ خود ہندوستان میں ایسے دسیوں ادارے اور تنظیمیں ہیں جو مسلمانوں کو پوری فنی مہارت کے ساتھ دن رات اسی رنگ میں پیش کرنے میں لگے ہیں اوران کی پوری تاریخ وتہذیب کو مسخ کرکے دہشت گرد کے روپ میں پیش کرنے کی کوشش کررہے ہیں۔ یہ دراصل نفرت کے تھوک بیوپاری ہیں جو اپنا مال تجارت تھوک بھاؤ میں نئی نسل کو منتقل کرنا چاہتے ہیں تا کہ ان کے فاشسٹ عزائم کی تکمیل ہوسکے۔

ان کے اس پروپیگنڈہ بازی اورمہم جوئی کے ہندواورمسلمان نوجوانوں کے ذہنوں پر الگ الگ اثرات مرتب ہورہے ہیں۔ جہاں ہندونئی نسل میں مسلمانوں کے تئیں نفرت اورتشدد کے جذبات ابھر رہے ہیں، وہیں مسلمان نوجوانوں میں غیرمحسوس طور پراحساس کمتری (Demoralisation) پیدا ہورہی ہے۔پروپیگنڈے کا زور ایسا ہے کہ مسلمانوں کے ایک طبقہ میں اپنے دین اورروایات کے سلسلے میں بدگمانی پیدا ہورہی ہے اوروہ ان الزامات کا صحیح جواب نہ جاننے کی وجہ سے اندر ہی اندر ٹوٹتے جارہے ہیں، بلکہ بعض لوگ سمجھنے لگے ہیں کہ شاید مسلمان یا اسلامی سوسائٹی ایسی ہی ہے۔لیکن جب ان سے پوچھا جاتا ہے کہ وہ بھی تو مسلمان

ہیں کیا وہ خود کو دہشت گرد سمجھتے ہیں؟ تو ان کا جواب ہوتا ہے نہیں!۔ان کو یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر یہ سوالات اتنے اصرار اور تکرار کے ساتھ کیوں اٹھائے جاتے ہیں؟ انہیں یہ معلوم نہیں کہ ہمارے مغربی اور مشرقی آقا مکاویلی اور گوبلس کے چیلے ہیں جنہوں نے جھوٹ کو فنی مکاری کے ساتھ عام کرنے کی تعلیم دیتے ہوئے بتایا کہ ایک جھوٹ اگر تسلسل کے ساتھ بولا جائے تو لوگ اس کو سچ ماننے لگتے ہیں۔

عالمی ذرائع ابلاغ کے سامنے ہماری بے بسی

نوجوانوں کے تعلق سے ہمارا مسئلہ صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ ہماری نوجوان نسل ان چیرہ دستوں کے سامنے پوری طرح بے بس ہے۔ ذرائع ابلاغ کا زور کچھ ایسا ہے کہ ہم خود کو اور اپنی نئی نسل کو اس کے حملے سے بچا نہیں سکتے ہیں۔ کہنے کو تو دنیا میں فکر و خیال کی آزادی ہے مگر حقیقت واقعہ یہ ہے کہ چند ایجنسیاں ہیں جنہوں نے ذرائع ابلاغ پر اجارہ داری قائم کر رکھی ہے۔ وہ دنیا میں جو چیز پھیلانا چاہتے ہیں اور دنیا کو جو چیز دکھانا چاہتے ہیں دنیا وہی سنتی اور دیکھتی ہے اور اسی انداز سے سوچتی اور بولتی ہے۔ کہنے کو دنیا میں اس وقت دوسو بہتر ۲۷۲ آزاد خود مختار مما لک ہیں۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں چند بڑی طاقتیں ہی آزاد خود مختار ہیں۔ دنیا بھر کے ذرائع ابلاغ انہی چند مما لک کے دست نگر ہیں اور ان کے زیر سایہ قائم ایجنسیوں اور اداروں کی باج گزار ہیں اور دیگر مما لک کے حکمراں اور حزب اختلاف ان بڑی قوتوں کے ترجمان ہیں۔ اب اس حقیقت پر سے پردہ اٹھتا جا رہا ہے بلکہ دنیا کے زیادہ تر حکمراں اور (Potential) رکھنے والے لوگ عالمی اداروں، ایجنسیوں اور حکومتوں کے باضابطہ Payroll پر ہیں گویا وہ ان کے تنخواہ دار ملازم ہیں جو اپنے اپنے ملکوں میں ان بڑی طاقتوں کے مفاد کے لیے کام کر رہے ہیں۔ ایسی صورت میں آزادئ خیال کا نعرہ اور ذرائع ابلاغ کی آزادی محض ایک واہمہ ہے۔ دنیا ایک قطبی نہیں بلکہ یک رخی ہو گئی ہے اور اس نے انسانی آبادی کو گمراہ کرنے کے لیے موثر ہتھیار ایجاد کر لیے ہیں۔

معاملہ صرف ذرائع ابلاغ کا ہی نہیں ہے بلکہ نظام تعلیم (System of Education) اور نصاب تعلیم (Course & curriculum) کا بھی یہی حال ہے۔ اس وقت ہمارے ملک میں جس طرح کا نظام تعلیم اور نصاب تعلیم رائج ہے یا جس کو رائج کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے اور جو تاریخ پڑھائی جا رہی ہے نیز ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کے ذریعہ جس طرح نوجوانوں کے ذہنوں کو مسموم کیا جا رہا ہے وہ سماج کے پرامن بقائے باہم کے لیے ایک خطرہ ہے۔ کسی سماج کا امن، اس کی بقا اور ترقی صحیح اور واضح سوچ پر منحصر کرتی ہے۔ اس لیے کسی مسئلہ پر معتدل اور معروضی انداز سے غور و مطالعہ کرنا چاہیے تاکہ چیزوں کو صحیح طور پر جان کر صحیح نتائج اخذ کیا جا سکے۔

ہم اس وقت اکیسویں صدی میں سانس لے رہے ہیں۔ پچھلی دو صدیوں میں سائنسی اور صنعتی ترقی کے سبب پیداوار کے ذرائع وسائل اور مقدار و معیار میں بے پناہ اضافہ ہوا ہے۔ ترسیل وابلاغ اور رسل و رسائل کے بے پناہ امکانات پیدا ہوئے ہیں۔ ملکوں اور قوموں کے درمیان میں تعلیمی، تجارتی، ثقافتی اور سیاسی وجوہات سے نقل وحمل بڑھ رہے ہیں۔ یورپ کی مختلف قوموں نے جب ایشیا، افریقہ، جنوبی امریکہ اور آسٹریلیا وغیرہ میں اپنی نو آبادیات قائم کیں تو ان کو مختلف کاموں کے لیے بڑی تعداد میں مردان کار (Work Force) کی ضرورت پڑی جس کی وجہ سے انہوں نے دنیا کے مختلف ملکوں سے بہت سی قوموں کے افراد کو ایک جگہ سے دوسری جگہ بسایا، جہاں آج ان کی مستقل آبادیاں ہیں۔ پچھلی صدیوں میں قوموں، ملکوں، علاقوں اور آبادیوں کے درمیان جو دوری اور تفاوت تھی وہ دھیرے دھیرے بین الاقوامیت میں ضم ہوگئی ہے۔ انسانی آبادی کا اختلاط و تعلق اتنا بڑھا ہے کہ ملکوں اور سرحدوں کے اختلافات اب علامتی ہوگئے ہیں۔ لوگ دریاؤں، سمندروں، پہاڑوں، جنگلات اور ریگستانوں کو عبور کر کے ایک علاقے سے دوسرے علاقے میں جا بسے ہیں۔ جہاں وہ باضابطہ شہری ہیں۔ زبان، مذہب رنگ اور نسل کے اختلافات کے باوجود ایک جگہ رہتے ہیں اور مشترکہ امور و مسائل میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون و اشتراک بھی کرتے ہیں۔ اس لیے

آج دنیا کا شاید ہی کوئی سماج ایسا ہے جو وحدانی سماج کہا جا سکے۔ بلکہ اس وقت ساری دنیا میں تکثیری سماج (Plural Society) پایا جاتا ہے۔ جہاں ایک دوسرے کے ساتھ پرامن طور پر رہنا اور صحت مند خطوط پر ترقی کرنا ایک عالمی انسانی ضرورت ہے۔ اس وسیع تناظر میں بین الملل تعلقات کے باب میں اسلامی تعلیمات کا جائزہ لینا بہت اہم ہے تا کہ ہم اپنوں کی غلط فہمی اور غیروں کی بدگمانی کو دور کرنے کے ساتھ ساتھ اس غلط پروپگنڈے کا زور بھی توڑ سکیں جو جان بوجھ کر اسلام اور مسلمانوں کو بدنام کرنے لے لیے ملک اور بیرون میں پھیلا رہے ہیں۔

مسلمان سماج کی مظلومی

اس وقت مسلم سوسائٹی (Receiving End) پر ہے۔ وہ خود کوئی پہل کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔ بعض عمل کے نتیجے میں اس سے کبھی جان بوجھ کر اور کبھی انجانے میں کوئی ردعمل سرزد ہو جاتا ہے جس کا بہانہ بنا کر ایک عمل درعمل یعنی (Chain reaction) کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور کسی کی سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیوں ہو رہا ہے اور کیسے ہو رہا ہے؟

ایک طرف دنیا بھر میں آزادی اور خودمختاری کی تیز ہوا چل رہی ہے تو دوسری طرف دنیا کی بڑی طاقتیں مسلمان ملکوں، آبادیوں اور ان کے قدرتی وسائل پر ناجائز قبضہ کر رہی ہیں۔ ایسے حالات پیدا کئے جا رہے ہیں جس کی وجہ سے لوگ اپنے اپنے ملکوں اور گھروں سے ہجرت کر کے رفیوجی کیمپوں میں زندگی گذارنے پر مجبور ہیں۔ اس وقت دنیا کی ستر فیصد رفیوجی آبادی مسلمان ہے۔ ظاہر سی بات ہے کوئی آدمی اپنی خوشی سے اپنا ملک یا گھر بار چھوڑ کر رفیوجی کیمپ میں رہنا پسند نہیں کرتا ہے۔ ایسی صورت میں جب انہیں کہیں سے کوئی انصاف نہیں ملتا اور ان کو لگتا ہے کہ ان کی نسلوں کا کوئی مستقبل نہیں ہے بلکہ ان کی جان مال عزت و آبرو کچھ بھی محفوظ نہیں ہے تو وہ مرنے مارنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ اس وقت انہیں دہشت گرد بلکہ اسلامی دہشت گرد قرار دے کر ساری دنیا میں بدنام کیا جاتا ہے اور اسی طرح ساری دنیا مین ان کے

خون کومباح کرنے کی اسکیم رچی جاتی ہے۔کوئی بھی اس ظلم کے ازالہ کی کوشش نہیں کرتا بلکہ مظلوم کی بیخ کنی کے لیے عالمی سطح پر معاہدات کئے جاتے ہیں تا کہ اس ردعمل کو روکا جا سکے۔ اس کی سب سے واضح مثال فلسطینیوں کی طرف سے جاری حماس کا انتفادہ ہے جس کو دہشت گردی سے تعبیر کیا جاتا ہے جب کہ ہر شخص خود اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے کہ دہشت گرد کون ہے؟ ایک طرف چھوٹے چھوٹے بچے ہیں جو ہاتھ میں پتھر لیے پولس کی گاڑی پر پتھراؤ کرتے نظر آتے ہیں اور دوسری طرف مسلح فوج ہے جو ٹینک، بکتر بند گاڑیوں ، ہیلی کوپٹر اور جنگی جہازوں کے ذریعہ ان کے گھروں، آبادیوں ،شہروں یہاں تک کہ صدارتی دفاتر، اسکول اور اسپتالوں پر گولی اور بم کی بارش کرتی نظر آتی ہے اور ایک کا دس کے حساب سے بدلہ لیتی ہے۔ دنیا میں کوئی یہ کہنے والا نہیں ہے کہ تمہارا وجود ہی ظلم کی کوکھ سے ہوا ہے لہٰذا تم مزید ظلم سے باز آؤ۔نہیں بلکہ اس ظالم قوت کو ساری دنیا کی طاقت ور اقوام اور حکومتوں کی حمایت اور پشت پناہی حاصل ہے۔ دنیا اگر اتنی اندھی اور متعصب ہو جائے گی تو انصاف و دیانت کا کیا ہوگا؟ لہٰذا دنیا میں اگر کہیں کبھی کوئی دہشت گردانہ کاروائی ہوتی ہے تو اس کی مذمت کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ اس کے اسباب و محرکات کیا ہیں؟ جب تک ہم انصاف اور اعتدال کا رویہ اختیار نہیں کریں گے یک طرفہ فیصلہ سنانے سے مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ جن کے بچے مارے گئے ہیں جن بہنوں کی بھائیوں کی آنکھوں کے سامنے عصمت دری کی گئی ہے، جن کے بے گناہ والدین کو گھروں سے باہر کھینچ کر گولی ماردی گئی ہے، جن کے جگر گوشوں کو آگ میں زندہ جھونک دیا گیا ہے ان سے اگر آپ یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ اپنے جذبات پر قابو رکھیں گے تو یہ ایک زیادتی ہوگی۔ آپ ان مسائل کا قابل قبول حل ڈھونڈیں تو ردعمل کا یہ سلسلہ خود بخود بند ہو جائے گا۔ میں دہشت گردی کی تائید نہیں کر رہا ہوں اور نہ اس عمل کو صحیح ٹھہرا رہا ہوں۔ عام لوگوں اور معصوموں کی جان لینا کسی طرح جائز نہیں ہے لیکن جب تک آپ نفس مسئلہ سے براہ راست مخاطب نہیں ہوں گے محض اس کی مذمت کر کے یا اس کے خلاف تادیبی طریقہ اختیار کر کے اس مسئلہ کو حل نہیں کر سکتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ دہشت گردی کسی مسئلہ کا حل نہیں ہوسکتی ہے۔ لیکن

دہشت گردی کے خاتمہ کے لیے ہر دو جانب انصاف اور دیانت کے ساتھ معاملہ کے حل کی کوشش ضروری ہے۔ بالخصوص کسی مشترک سماج میں کیوں کہ اس سماج کی حیات، بقا، ترقی اور استحکام اس کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

یہاں میں ایک اور اہم بات واضح کرنا چاہتا ہوں کہ اس وقت دنیا میں جو مسلم سوسائٹی پائی جاتی ہے وہ بالعموم اسلامی سوسائٹی نہیں ہے۔ اس لیے ان کے سبھی کاموں اور رویوں کو اسلامی ماننا صحیح نہیں ہے۔ وہ کچھ کام اسلام کے مطابق کرتے ہیں تو بہت سے کام اس کے خلاف بھی کرتے ہیں۔ اسلام سے ان کی نظریاتی وابستگی بہت کمزور ہے۔ تاہم مسلم ثقافت چونکہ ان کے قومی نفسیات میں اس طرح رچی بسی ہے کہ وہ اگر اپنی قومی مزاحمت کے اظہار کے لیے کوئی ادارہ یا تنظیم قائم کرتے ہیں تو اس کا نام اس ثقافت سے مستعار ہوتا ہے جس سے بسا اوقات غلط فہمی پیدا ہوتی ہے۔ لوگ اس طرح کے اداروں کا اسلامی نام اس وجہ سے بھی رکھتے ہیں تا کہ اس سے ان کی قومی اور جذباتی وابستگی کا اظہار ہو سکے اور لوگوں کی ہمدردی اور حمایت حاصل کرنے میں بھی آسانی ہو۔ دنیا کے تمام ملکوں اور قوموں میں یہی انداز فکر پایا جاتا ہے۔ موجودہ مسلمان سماج اور اس کے ادارے اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ لیکن وہ اسلامی ہیں یا نہیں یہ محض علامتی ناموں سے متعین نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اسلامی ہونے کے لیے ضروری ہے کہ قرآن وسنت میں اس کی دلیل موجود ہو۔ اگر قرآن وسنت کی سند اس کو حاصل ہے تو وہ اسلامی ہے ورنہ اس عمل کو اسلامی نہیں کہا جا سکتا۔ خواہ اس کا انجام دینے والا کوئی مسلمان فرد ہو یا کوئی جماعت ہو۔ اسلام جہد وعمل، تنظیم وتحریک، جہاد وانقلاب کا حامی ہے اور ضرورت کے مطابق جنگ کرنے کی ہدایت بھی دیتا ہے لیکن اس کے کچھ شرائط اور حدود ہیں۔ اگر ان شرائط اور حدود کو چھوڑ دیا جائے تو پھر وہ چیز اسلامی نہیں رہتی بلکہ غلط اور غیر اسلامی ہو جاتی ہے۔ اسلام جہاد کا قائل ضرور ہے لیکن وہ فتنہ، فساد، ظلم ودہشت گردی کی مطلق اجازت نہیں دیتا۔ لہٰذا عرف عام میں اس وقت جس چیز کو دہشت گردی کہا جاتا ہے اسلام اس کا حمایتی نہیں ہے۔ چاہے یہ کام مسلمانوں کی جانب سے ہو یا غیر مسلموں کی جانب سے۔ اس لیے مسلم ملکوں اور

علاقوں میں قومی مزاحمت کے تحت جو دہشت گردانہ کاروائیاں ہورہی ہیں وہ قومی مزاحمت یا دہشت گردی تو کہی جاسکتی ہیں لیکن اس کو اسلامی دہشت گردی قرار دینا ایک ظلم ہے۔ ایسی کوشش محض لوگوں کو گمراہ کرنے اور ایک نئے قسم کی مذہبی کش مکش شروع کرنے کی غرض سے جان بوجھ کر کی جاتی ہے تا کہ تمام غیر اسلامی قوتوں کو اسلام کے خلاف جمع کر کے ایک ساتھ ان کی آبادیوں پر ہلہ بول دیا جائے۔ اسلامی دہشت گردی کی اصطلاح ان کی مذموم سازشی ذہن کی آئینہ دار ہے۔ مسلمان ملکوں میں کوئی بم بنائے تو وہ اسلامی بم کہا جائے اور وہاں کوئی تحریک برپا ہوتو اسے اسلامی دہشت گرد تحریک کا نام دیا جائے اور باقی دنیا میں اگر اسی قسم کی کوئی چیز ہوتی ہے تو اسے اس کے مخصوص نام یا قوم اور علاقے سے منسوب کیا جائے۔ امریکی اور یورپی دہشت گرد کو مسیحی دہشت گرد سری لنکائی اور برمی دہشت گردوں کو بودھسٹ دہشت گرد سکھوں کو خالصہ دہشت گرد اور ہندوؤں کو ہندو دہشت گرد اسرائیلیوں کو یہودی دہشت گرد کیوں نہیں کہا جاتا ہے؟ اگر دیگر مذاہب کے لوگوں کو ان کے مذہب کی بنیاد پر اس طرح منسوب نہیں کیا جاتا ہے تو پھر مسلمانوں کو محض اسلام سے وابستہ ہونے پر اسلامی دہشت گرد کیوں پکارا جاتا ہے؟ مان لیجئے کوئی مسلمان چور، زانی، ڈاکو اور شرابی ہے تو اسے اسلامی چور، اسلامی ڈاکو، اسلامی زانی اور اسلامی شرابی کہا جائے گا جبکہ اسلام میں یہ تمام چیزیں حرام ہیں؟ دراصل لوگ اس فرد، پارٹی اور گروہ کی مذمت کے ساتھ ساتھ اسلامی نام دے کر درپردہ اسلام کی مذمت کرتے ہیں۔ اور بھولے بھالے عوام کو یہ کہہ کر گمراہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ان کا یہ عمل عین تقاضہ اسلام ہے کیونکہ یہ اسلام ہی ہے جو انہیں اس طرح کی مذموم حرکات کی تعلیم دیتا ہے اور اس کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ لہٰذا مسلمان اپنے عقائد کی وجہ سے ہی مہذب سماج کے لیے خطرہ ہیں ۔ اس طرح کے پروپیگنڈے جہاں ایک طرف مسلمانوں کے اس طبقے کو جن کی دینی معلومات کم ہے یا مسلم سوسائیٹی سے جن کی وابستگی کمزور ہے، ان کو اسلام سے بدگمان اور مسلم سوسائٹی سے بدظن کرنے کی غرض سے کئے جاتے ہیں وہیں دوسری طرف مسلمان مخالف قوموں کے اندر مخالفانہ جذبات پیدا کر کے لوگوں کو

اپنے ارد گرد جمع کرنے کے لیے کئے جاتے ہیں۔ اس طرح ایک جذباتی ابال پیدا کر کے لوگوں کو اپنے ارد گرد جمع کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

ہندوستانی سماج کی بناوٹ

جیسا اوپر عرض کیا گیا آج دنیا کے تمام ممالک میں تکثیری معاشرہ ہے۔ لہٰذا ان کی بقا اور ترقی کا دارو مدار اس بات پر منحصر ہے کہ وہ اپنے سماج کے مختلف طبقات اور گروہوں کے ساتھ کس قسم کا رشتہ رکھتے ہیں؟ جس سماج میں تمام طبقات کو امن و آزادی کے ساتھ اپنے مذہبی عقائد، تہذیبی روایات، امنگوں اور ضرورتوں کے مطابق آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کے مواقع میسر ہیں وہ سماج زیادہ پرامن، متحد، مضبوط اور ترقی یافتہ ہوگا۔ جہاں ان چیزوں کا فقدان ہے اس کے اندر کشمکش ہوگی جو سماج کو کھوکھلا اور کمزور بنادے گی اور باہری قوتوں کو بھی دراندازی کا موقع ملے گا۔

لہٰذا کسی بھی محبِّ وطن اور انسانیت دوست فرد اور جماعت کے لیے صحیح فکر و عمل یہ ہے کہ سماج میں ناانصافی کو ختم کر کے لوگوں کو عزت، آزادی اور برابری کے مواقع فراہم کرے تاکہ سماج کا ہر طبقہ پوری یکسوئی کے ساتھ اپنی بھرپور صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے قومی ترقی میں معاون ہو۔ بھارت کے تناظر میں یہ نقطۂ نظر اور بھی ضروری ہے۔

بھارت کی یہ خصوصیت ہے کہ یہ کم و بیش چھ مذاہب کا گھر ہے۔ چار تو اسی ملک اور مٹی سے اٹھے ہیں۔ ایک ہندو دھرم ہے جس کے ماننے والوں کی اکثریت ہے اس کے تمام گروہوں اور طبقات کی تعداد ملک کی مجموعی تعداد کی 82% ہے۔ دوسرا بودھ دھرم ہے جس کے ماننے والے کی تعداد 0.8% ہے۔ تیسرا جین دھرم ہے جن کی مجموعی آبادی کا تناسب 0.4% ہے۔ چوتھا سکھ دھرم ہے جس کا مجموعی تناسب 1.9% ہے۔

اسلام اور عیسائیت اگرچہ یہاں کے پیدائشی مذاہب نہیں ہیں۔ لیکن ہندوستان میں ان کی جڑیں بہت گہری ہیں۔ ملک میں عیسائیوں کی آبادی کل آبادی کا 2.3% ہے۔ ہندوستان

میں عیسائیت انگریزوں کے ساتھ نہیں آئی بلکہ یہ یورپ میں آنے سے بہت پہلے، پہلی دوسری صدی میں ہی ہندوستان کے بعض علاقوں میں آ گئی تھی۔ ہندوستان اورعرب کا تعلق باضابطہ مسلم عہد شروع ہونے سے بہت پہلے قائم ہو چکا تھا۔جب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی دعوت دینی شروع کی اور ہجرت کے بعد آپؐ مکہ سے مدینہ تشریف لے گئے اسی وقت سے ہندوستان سے اسلام کا تعلق شروع ہوجاتا ہے۔کہا جاتا ہے کہ حضور کے صحابیوں میں ایک ہندوستانی صحابی بھی تھے۔مسلمانوں نے اس ملک میں عروج وزوال دونوں دیکھا ہےاور تاریخ کے لمبے دور میں انہوں نے یہاں کے لوگوں کے ساتھ مل کر فتح بھی حاصل کی ہے اورزخم بھی کھائے ہیں۔اس لیے یہ صرف اچھے دنوں کے ساتھی نہیں ہیں بلکہ برے اورآزمائشی ادوار میں بھی سکھ دکھ ایک ساتھ جھیلنے والے ہیں۔اس وقت مسلمان ملک کی مجموعی آبادی کا14.2% ہیں۔انڈونیشیا کو چھوڑ کر دنیا میں کسی بھی ملک کے مقابلے سب سے زیادہ آبادی مسلمانوں کی ہندوستان میں ہے۔لہذا ہندوستان دنیا میں مسلمانوں کا سب سے بڑا گھر ہے۔2011 کی مردم شماری کے مطابق ملک کی سوا سو کروڑ سے زائد آبادی میں مسلمانوں کی تعداد 17 کروڑ سے اوپر ہے جوملک کے کم وبیش تمام خطوں اورعلاقوں میں پائے جاتے ہیں چاہے وہ شمال مشرق کا دور دراز کا علاقہ ہو یا جنوبی ہندوستان کے سواحل یا مغربی مشرقی اور وسطی ہندوستان۔اس کے علاوہ ہندوستان میں پارسی، بہائی، یہودی اور دیگر مذاہب کے لوگ بھی پائے جاتے ہیں۔

اسی طرح ہندوستان میں سینکڑوں بولیاں اورزبانیں بولی جاتی ہیں اورملک کے مختلف خطوں میں الگ الگ رنگ، کلچر اورنسل کے لوگ رہتے ہیں۔ہندوستان میں جن کو اقلیت شمار کیا جاتا ہے ان میں اینگلوانڈین، پارسی، میدانی اور پہاڑی علاقوں میں رہنے والے قبائل، ہندوستانی عیسائی، سکھ، مسلمان اورشیڈیول کاسٹ خاص ہیں۔لنگوسٹک سروے آف انڈیا کے مطابق 179 زبانیں اور 544 بولیاں ہیں۔دستور کے آٹھویں شیڈویول میں 22 زبانوں کو شامل کیا گیا ہے جب کہ اور زبانوں کو بھی اس میں شامل کرنے کا مطالبہ زوروں پر ہے اور یہ فہرست بڑھتی جارہی ہے۔بہت سی مقامی بولیوں کو باضابطہ زبان کا درجہ دیا جارہا ہے۔

ہندوستان رقبہ کے اعتبار سے اتنا بڑا ہے اور اس کی آبادی اتنی بڑی ہے کہ ہر تھوڑی دور پر لوگوں کی زبان اور کلچر نیز مذہبی عقائد میں فرق دیکھنے کو ملتا ہے۔ لہٰذا ہر مذہبی، تمدنی، لسانی اور نسلی گروہ کے اندر سینکڑوں فرقے اور طبقے (Sects & Sub-Sects) پائے جاتے ہیں۔ جس کی وجہ سے کبھی کبھی خود اس کمیونٹی کے اندر ٹکراؤ پیدا ہوجاتا ہے۔ جیسے سکھوں میں خالصہ اور نرنکاریوں کے درمیان تصادم، ہندوؤں میں بیک وارڈ، فورورڈ، دلت برہمن، اگڑے پچھڑے، چھوت اچھوت کے درمیان کش مکش، عیسائیوں میں کیتھولیک اور پروٹسٹینٹ کے درمیان لڑائی۔ مسلمانوں میں شیعہ، سنی، دیوبندی، بریلوی کے درمیان نزاع یا پھر ہندی اور تامل اور دیگر غیر ہندی زبانوں جیسے اردو اور ہندی کے درمیان لسانی جھگڑے وغیرہ۔ جب ایک مذہب نسل اور ذات کے لوگ بعض اوقات باہم دست وگریباں رہتے ہیں تو دوسرے مذاہب اور تمدنی اکائیوں کے بیچ جھگڑا، تصادم، کش مکش اور نزاع پیدا ہوجانا عین ممکن ہے۔ بلکہ ہندوستان پر انگریزوں کی آمد کے بعد جو لعنتیں مسلط ہوگئی ہیں ان میں فرقہ وارانہ تصادم اور کشمکش سب سے اہم اور پیچیدہ مسئلہ ہے۔ ہمیں اس ناپاک وراثت کو ترک کرکے ایک نئے عہد اور ایک بہتر انسانی رشتہ کی تلاش کرنی ہے تاکہ ہمارا سماج ٹکراؤ اور بکھراؤ کے موجودہ ماحول اور منطق سے باہر نکل کر اتحاد، تعمیر اور ترقی کے نئے دور میں داخل ہوسکے۔ اس لیے اس پورے پس منظر میں ہم کو اپنے متعین کردار کے ساتھ آگے بڑھنا ہوگا تاکہ ایک بہتر ترقی یافتہ سماج کی تعمیر میں ہم اپنی خدمات پیش کرسکیں۔

آیئے ہم تمام تعصب اور غلط فہمیوں کو بالائے طاق رکھ کر معروضی انداز سے یہ دیکھنے کی کوشش کریں کہ بین الملل تعلقات (Inter - community Relations) کے باب میں اسلام ہماری کیا رہنمائی کرتا ہے؟۔ بین الملل تعلقات پر اسلامی موقف کی جانکاری سے پہلے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ انسانی نسل اور سماج (Human race & Society) کے باب میں اسلام کا نقطۂ نظر کیا ہے اور وہ کن اصولوں کی آبیاری کرتا ہے؟

اسلام کا عالمی نظریہ:

کسی بھی مسئلہ پر غور کرنے سے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ اسلام کا عالمی نظریہ (World View) کیا ہے؟ اس سلسلے میں اسلام جن بنیادی اصولوں کی تعلیم دیتا ہے وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) وحدت تخلیق:

اس سلسلہ میں سب سے پہلا اصول نظریۂ وحدتِ تخلیق (principle of Unity of Creation) ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ زمین آسمان، سورج چاند، ستارے، ہوا، پانی، دریا، پہاڑ، جن اور انسان گویا کائنات کی ساری چیزیں اللہ وحدہ لاشریک کی تخلیق کردہ ہیں۔ لہٰذا اس کے خلق اور ملک میں کوئی دوسرا اس کا شریک نہیں ہے۔ اس لیے تخلیق کی بنیاد پر سارے انسان برابر ہیں۔ لہٰذا رنگ، نسل زبان اور علاقے کی بنیاد پر کسی کو کسی پر کوئی فضیلت نہیں ہے نہ کالے کو گورے پر نہ گورے کو کالے پر، نہ امیر کو غریب پر اور نہ غریب کو امیر پر، نہ عربی کو عجمی پر اور نہ عجمی کو عربی پر۔ اس لیے کہ ملک، علاقیت، سرد گرم ماحول سب اللہ کے بنائے ہوئے ہیں۔ لہٰذا اس بنیاد پر کسی کو کسی پر کوئی برتری حاصل نہیں ہے۔ اس طرح وحدت تخلیق کے اصول کے تحت سب برابر ہیں۔

(۲) وحدت ابتداء:

اس سلسلے میں دوسرا اصول وہ ہے جس کو نظریۂ وحدت ابتداء یعنی Principle of Unity of Origin کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں سورۃ النساء آیت نمبر ایک میں اس نظریہ کی وضاحت اس طرح کی گئی ہے۔

> ''لوگو! اللہ سے ڈرو جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اسی جان سے جوڑا بنایا اور ان دونوں سے بہت مرد وعورت دنیا میں پھیلا دیئے۔ اس خدا سے ڈرو جس کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے اپنا حق مانگتے ہو اور رشتہ وقرابت کے تعلقات کو بگاڑنے سے پرہیز کرو۔ یقین جانو اللہ تم پر نگرانی کر رہا

ہے۔‘‘(النساء:۱)

یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ انسان کو ایک جان سے پیدا کیا گیا ہے اسی سے اس کا جوڑا بنایا گیا ہے اور پھر اس سے بہت سے مرد وعورت دنیا میں پھیلا دئے گئے ۔ لہٰذا تمام انسان اپنی اصل کے اعتبار سے برابر ہیں۔

(۳) کثرت میں وحدت:

اس سلسلے میں تیسرا اصول وہ ہے جس کو نظریہ کثرت میں وحدت Principle of Unity in Divesity کا نام دیا جاتا ہے۔ قرآن اس نظریہ کی وضاحت اس طرح کرتا ہے۔

’’لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمہاری قومیں
اور برادریاں بنادیں تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔‘‘(سورہ الحجرات۔۱۳)

اس آیت میں قوموں اور برادریوں میں انسانوں کی تقسیم کسی برتری کی غرض سے نہیں ہے بلکہ ایک دوسرے کی پہچان کی غرض سے ہے ۔ جیسے مختلف انسانوں کا الگ الگ نام ہوتا ہے۔ محض نام کی وجہ سے نہ کوئی ذلیل سمجھا جاتا ہے اور نہ کوئی محترم۔

مذہب نئی چیز نہیں ہے:

ان آیات کے استحضار سے ایک چیز واضح ہوجاتی ہے کہ تمام انسان خواہ وہ کسی قوم اور برادری کا حصہ ہوں ایک ماں باپ کی اولاد ہیں۔ لہٰذا ان کے درمیان برابری اور بھائی چارہ کا رشتہ ہے۔ ان کے بنیادی انسانی حقوق یکساں اور لائق احترام ہیں۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ اسلام مختلف مذاہب اور ان کے ماننے والے کے درمیان کیسے تعلقات کا حامی ہے یا اس باب میں اس کی تعلیمات کیا ہیں؟ اس بات پر غور کرنے سے پہلے خود مذاہب کے بارے میں اسلام کی رائے کیا ہے یہ جان لینا چاہیے۔

اسلام کی رو سے ساری کائنات کا دین اسلام ہے اور کائنات کی تمام چیزیں چارو

ناچار اللہ کی بندگی بجالانے پر مجبور ہیں۔اس کائنات میں چاہے وہ زمین وآسمان ہو، چاند اور سورج ہو، ہوااور پانی ہو، دریا و پہاڑ ہو غرض چھوٹی بڑی کوئی بھی چیز ہو وہ سب اللہ کے حکم سے اور اس کے متعین کردہ ضابطہ کے مطابق کام کررہے ہیں۔وہ اپنی مرضی سے سرِ مو انحراف نہیں کرسکتے ہیں اس پوری کائنات میں صرف انسان ہے جسے عقل وشعور اور علم وآگہی بخشی گئی ہے۔لہٰذا اسے اختیار وعمل کی آزادی دی گئی ہے۔

یہی وہ خوبی اور خصوصیت ہے جس کی وجہ سے اسے تمام مخلوقات میں اشرف قرار دیا گیا ہے۔مذہب کا تعلق انسان کے عقائد، عبادات، اخلاق ومعاملات سے ہے۔ان میں سے بعض چیزیں وہ ہیں جو انسان کی نگاہوں سے اوجھل ہیں اور بعض معاملات ایسے ہیں جن کا فہم و ادراک انسان کو ازخود حاصل نہیں ہوسکتا ہے۔لہٰذا انسان کو ان مخفی حقائق سے آگاہ کرنے اور حیات وکائنات کا فہم وادراک بہم پہنچانے کے لیے خدا نے نبی اور رسول بھیجے۔نبی اور رسول کو فلسفی اور سائنس دان کی شکل میں نہیں دیکھنا چاہیے کیونکہ فلسفی اور سائنسداں نبی اور رسول کا بدل نہیں ہوسکتے ہیں۔ایک شخص فلسفہ اور سائنس کا علم حاصل کرنے کے بعد بھی دینِ حق سے ناآشنا بلکہ گمراہ ہوسکتا ہے۔بعض لوگ دینی حقائق سے سائنسی حقائق کو باہم متصادم کرکے خود بھی گمراہ ہوتے ہیں اور دوسرے کو بھی گمراہ کرتے ہیں۔انسان کا دائرہ تحقیق مادی کائنات ہے نہ کہ ماورائے کائنات۔اس علم کا جتنا حصہ اللہ نے ضروری سمجھا ہے وہ اپنے رسولوں کے ذریعہ بطور ہدایت انسانوں کو عطا کردیا ہے۔جو لوگ وجود باری تعالیٰ اور اس کی مخفی سلطنت کی سیر کرنا چاہتے ہیں ان کے حصے میں سوائے گمرہی کے کچھ حاصل نہیں ہوگا بقول اکبرالٰہ آبادی ؎

معرفت خالق کی دنیا میں بہت دشوار ہے
جب کہ شہر تن میں خود اپنا پتہ ملتا نہیں

بہرحال قرآن کے اس دعویٰ کے باوجود کے ساری کائنات کا دین اسلام ہے اور اللہ کے نزدیک واحد دین اسلام ہی ہے اس کے علاوہ جو کوئی اور دین پسند کرے گا وہ خدا کے حضور قابل قبول نہیں ہوگا اللہ نے انسان پر جبراً یہ دین نہیں تھوپا۔قرآن کے بقول اگر اللہ چاہتا تو

سارے انسانوں کا دین ایک ہی ہوتا۔لیکن اس نے اپنی بعض مصلحتوں کے سبب اس معاملہ میں انسان کو ردو قبول کی آزادی دی ہے اور اپنے رسولوں پر یہ واضح کر دیا ہے کہ ہدایت آپ نہیں ہم دیتے ہیں۔لہٰذا آپ لوگوں پر داروغہ بنا کر نہیں بھیجے گئے ہیں بلکہ آپ کا کام لوگوں تک اللہ کے دین کو اپنے بہترین قول وعمل کے ذریعہ پہنچا دینا ہے۔جس کا جی چاہے اسے قبول کرے اور جس کا جی چاہے رد کر دے۔ہاں اس نے رد کرنے کے انجام سے باخبر کر دیا ہے کہ یہ بڑے گھاٹے کا سودا ہے جس کی وجہ سے انسان دنیا میں گمرہی اور آخرت میں خدا کے غضب اور عذاب الیم کا مستحق ہوگا۔ اس کے بعد بھی اگر کوئی اس دین کو تسلیم نہ کرے تو اس پر جبر نہیں کیا جائے گا۔قرآن کا صاف اعلان ہے۔ لَااِکْـرَاہَ فِـیْ الدِّیْنِ. یعنی دین کے معاملے میں کوئی زبردستی نہیں ہے۔

یہ زبردستی نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کو غیر مسلموں پر نہیں کرنی چاہیے بلکہ اگر غیر مسلم زور واقتدار رکھتے ہوں تو انہیں بھی اس سنہرے اصول کا پابند ہونا چاہیے۔اس صورت میں سب سے بہترین طریقہ لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْنِ یعنی تمہارا دین تمہارے لیے اور ہمارا دین ہمارے لیے ہے۔

انسانی سماج میں نزاع اور تصادم بسا اوقات اسی صورت میں پیدا ہوتا ہے جبکہ ایک گروہ دوسرے گروہ کی حق تلفی کرتا ہے یا جبراً اس پر اپنا اصول وضابطہ تھوپنے کی کوشش کرتا ہے جب تک معاملہ افہام وتفہیم، بحث ومباحثہ،مناظرہ مجادلہ اور آج کی اصطلاح میں پرامن گفت و شنید Debate & Discussion یا پھر پروپگنڈے اور Cold War کا رہتا ہے اس وقت تک کوئی زیادہ مسئلہ نہیں ہوتا لیکن جیسے ہی فتنہ فساد اور جنگ وجدال کے مرحلے میں داخل ہو جاتا ہے یعنی Hot War میں تبدیل ہو جاتا ہے۔معاملہ سنگین ہو جاتا ہے اور اس کی وجہ سے بہت سے مسائل اور بے اعتدالیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔

جنگیں انسانی معاشرے میں ہمیشہ ہوئی ہیں اور آج بھی ہو رہی ہیں یہ جنگیں مذہب کے نام پر بھی ہوئی ہیں اور دیگر وجوہات اور ناموں پر بھی ہوئی ہیں۔ جنگ کے چاہے جو

اسباب ہوں یہ ایک وقتی اور ہنگامی صورتحال ہے۔ کوئی سماج ہر وقت جنگ اور حالت جنگ میں نہیں رہ سکتا ہے۔ اسے لامحالہ پر امن دور میں واپس آنا ہوتا ہے۔ اس لیے دیکھنا یہ ہے کہ مخصوص جنگی حالات کے علاوہ وہ عام دنوں میں یعنی پرامن دور میں اپنے ماننے والوں کو کیا ہدایت دیتا ہے؟

ہمارے ملک اور سماج میں ایک سے زیادہ مذاہب کے ماننے والے لوگ ہیں جن کے عقائد و اعمال ایک دوسرے سے الگ ہیں۔ مثلاً اگر ایک، خدا کے ایک ہونے کا قائل ہے تو دوسرا بہت سے خداؤں کو مانتا ہے۔ ایک، انسان کی برابری کا دعویدار ہے تو دوسرا انسانوں کو پیدائشی طور پر چھوٹا یا بڑا، عزت دار اور ذلیل سمجھتا ہے۔ کسی کے یہاں کسی چیز کا کھانا پینا حلال ہے تو دوسرے کے یہاں حرام۔ اس صورت میں اگر لوگ لڑنا چاہیں تو انہیں بڑی آسانی سے لڑایا جاسکتا ہے۔

اسلام کے رہنما اصول

اسلام اس سلسلے میں چند رہنما اصول (Guiding Principles) فراہم کرتا ہے جس پر دیگر تمام باتوں کو قیاس کیا جاسکتا ہے۔ قرآن پاک کی سورہ الممتحنہ آیت ۸۔۹ میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔

> ''اللہ تمہیں ان لوگوں کے ساتھ نیکی اور انصاف سے نہیں روکتا جنہوں نے دین کے معاملے میں تم سے جنگ نہیں کی اور تمہیں تمہارے گھروں سے نہیں نکالا۔ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے اور تمہیں جس بات سے روکتا ہے وہ یہ ہے کہ تم ان لوگوں سے دوستی کرو جنہوں نے دین کے معاملے میں جنگ کی اور تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا اور تمہارے اخراج میں ایک دوسرے کی مدد کی ایسے لوگوں سے جو دوستی کریں گے وہی ظالم ہیں۔''
>
> (الممتحنہ ۸۔۹)

اس آیت میں اللہ نے غیر مسلموں کے ساتھ انصاف اور دوستی سے منع نہیں کیا ہے

سوائے ان لوگوں کے جنھوں نے دین کے معاملے میں جنگ کی ،مسلمانوں کو ان کے گھروں سے نکالا اوران کے اخراج میں ایک دوسرے کی مدد کی۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ غیر مسلم معاشرہ میں دوطرح کے افراد ہوں گے ایک وہ جو مسلمانوں سے محض ان کے دین کی وجہ سے ان سے لڑتے ہیں اوران کو ان کے ملکوں اور گھر بار سے نکالنے کے درپے ہیں دوسرے وہ لوگ ہیں جو مسلمانوں سے لڑتے نہیں ہیں اور نہ اس طرح کے کسی ظلم وزیادتی میں کسی کا ساتھ دیتے ہیں۔ جولوگ مسلمانوں سے لڑتے ہیں ،قرآن پوری قوت کے ساتھ ان سے لڑنے کی تلقین کرتا ہے تا کہ اس فتنہ کا پوری طرح قلع قمع ہوجائے لیکن جو لوگ نہیں لڑتے ہیں ان پر نہ صرف یہ کہ کسی طرح کی دست درازی سے روکتا ہے بلکہ ان کے ساتھ نیکی ،انصاف اور دوستی کا رویہ رکھنے کی تلقین کرتا ہے۔

نیکی اور بھلائی کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کرو اور ظلم کے کاموں میں کسی کی مدد نہ کرو۔

قرآن پاک میں دوسری جگہ فرمایا گیا۔

''بے شک اللہ عدل واحسان کا حکم دیتا ہے اور قرابت داروں سے بہتر سلوک کی ہدایت کرتا ہے اور فحش اور منکر،ظلم وسرکشی سے منع کرتا ہے۔ اور تمہیں نصیحت کرتا ہے شاید کہ تم نصیحت حاصل کرو۔'' (النحل:۹۰)

اسلام نے انسانوں کے ساتھ حسن سلوک کے باب میں جو بھی ہدایت دی ہے اس کا خطاب عام ہے یعنی اس کا اطلاق پوری انسانی آبادی پر ہوتا ہے ۔اس میں مسلم وغیر مسلم کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔

وہ غیر مسلم جن سے خاندانی تعلقات رہے ہیں ان کے ساتھ حسن سلوک عین تقاضۂ ایمان ہے۔ ہر کسی کے ساتھ اور ہر حال میں انصاف و دیانت کا رشتہ رکھنا ،ان کی ضرورت کے وقت کام آنا ،ان کی خیر خواہی اور دلجوئی کرنا نیز ان کے ساتھ فراخ دلی اور فیاضی سے پیش آنا یہاں تک کہ حالت جنگ میں بھی ظلم و شقاوت سے باز رہنا ضروری ہے۔ غیر مسلم رشتہ دار،

پڑوسی،مسافر، بیمار، بھوکا اور بیکار کی ضرورت کے وقت مدد کرنا اسی طرح لازم ہے جیسے کسی مسلمان کی مدد کرنا۔ غیر مسلم عورت، مرد بوڑھا،، بچہ آزاد، غلام کوئی بھی ہواس کی عزت نفس اور جان و مال کی حفاظت کی ذمہ داری پوری مسلم سوسائٹی پر عائد ہوتی ہے۔کسی بھی مصیبت کے وقت مدد کے لیے اٹھنے والا سب سے پہلا ہاتھ مسلمان کا ہونا چاہیے۔کوئی معاشرہ مسلم معاشرہ ہے کہ نہیں اور کوئی ملک صحیح معنوں میں اسلامی ملک ہے یا نہیں اس کی ایک بڑی علامت یہ ہے کہ وہاں بسنے والی غیر مسلم اقوام محفوظ مامون ہیں یا نہیں اور وہ عزت و آزادی کے ساتھ اپنے عقائد کے مطابق زندگی گذارتی ہیں اور اپنی نسلوں کی حفاظت کرتی ہیں یا نہیں اگر ایسا ہے تو اسے ایک مہذب مسلم معاشرہ اور صحیح معنوں میں ایک مہذب اسلامی ملک کہا جا سکتا ہے۔اور اگر ایسا نہیں ہے تو وہ چاہے جتنا دعویٰ کرے اسے مسلم ملک یا معاشرہ نہیں قرار دیا جا سکتا ہے کیونکہ اس کا یہ رویہ قطعاً غیر اسلامی ہے۔

مسلمانوں کے لیے صحیح رویہ اور ان کے کرنے کا کام

مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ ہماری موجودہ مسلم سوسائٹی اس آئیڈیل سے کوسوں دور ہے۔شاید یہی وجہ ہے کہ ہم ملک میں موجودہ فرقہ وارانہ کش مکش پر قابو پانے میں ناکام ہیں۔ہم نے اس کام کو حکومت اور اکثریت پر چھوڑ دیا ہے اور خود کسی کونے میں جا بیٹھے ہیں۔ جب کہ ہم کو اپنے نبی کے اسوہ کے مطابق اپنا رویہ بدلنا چاہیے۔ہمارے سماج میں دو طرح کے لوگ ہیں ایک وہ لوگ ہیں جو ہم سے بدگمان ہیں اور ہر جا و بیجا بات پر لڑنے پر آمادہ رہتے ہیں۔ دوسرے وہ لوگ ہیں جو اس صورت حال سے کڑھتے ہیں اور ناراض ہیں اور اس کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں۔ اس ملک کی 99% آبادی پر امن شہریوں کی ہے جو آج بھی مسلمانوں سے ہمدردی اور محبت رکھتی ہے۔لہٰذا اس آبادی کا ہم پر یہ حق ہے کہ ہم ان کی بھلائی کے لیے کام کریں اور ان کے مسائل اور مشکلات میں ان کا ہاتھ بٹائیں۔ جو لوگ ہم سے لڑ رہے ہیں ان میں بڑی تعداد ان لوگوں کی ہے جن کو ہمارے خلاف بدگمان کر دیا گیا ہے۔ان

کے ذہنوں میں نفرت اور غلط فہمی کے بیج بو دیئے گئے ہیں۔ جن کو ہم محض زبانی باتوں اور دعوؤں سے دور نہیں کر سکتے ہیں۔ اور نہ بحث وتکرار سے ختم کر سکتے ہیں۔ اس کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ ہے نفرت کا جواب محبت، دشمنی کا جواب خدمت، گالی کا جواب دعا، بدعہدی کا جواب ایفائے عہد اور حیوانیت کا جواب انسانیت سے دینا جنہوں نے حضورؐ کے سر پر اوجھ ڈالی، آپ کے راستے میں کانٹے بچھائے، آپ پر کوڑے ڈالے، آپ کو گالیاں دیں اور جو دن رات آپ کے خلاف سازشیں کرتے رہے کیا آپ نے ان کے سر پر اوجھ ڈالی اور ان کے راستے میں کانٹے بچھائے، ان کے سروں پر کوڑے ڈالے، ان کو گالیاں دیں یا ان کے خلاف سازش کی؟ آپؐ سب کو خیر وسلامتی کی دعا دیتے رہے اور خیر کے ساتھ دین کی دعوت دیتے رہے۔ یہاں تک کہ آپ نے طائف والوں کے حق میں بھی بددعا نہیں کی۔ پھر ہمارے لیے اس کے علاوہ کیا کوئی دوسری راہ ہوسکتی ہے؟ یا ہم بقید ہوش وایمان کوئی دوسری راہ بھی اختیار کر سکتے ہیں؟ تو پھر کیوں نہ ہم اپنے نبی کے اسی اسوے پر عمل کریں یہی وہ طریقہ ہے جس سے اپنوں کی غلط فہمیاں اور غیروں کی بدگمانیاں دور ہوسکتی ہیں۔

تو آیئے ہم بھوکوں کو کھانا کھلائیں، بیماروں کی تیمار داری کریں، غریبوں اور محتاجوں کے کام آئیں۔ یتیموں کے سر پر دست شفقت پھیریں، عورتوں اور بچوں کی مدد کریں اور سماج کے مجبور اور کمزور طبقات کی تقویت کا سامان بہم پہنچائیں۔ یعنی اپنے سماج کو اپنے سایہ عاطفت میں لے لیں۔ ذرا اپنا دل، دماغ، دست وبازو بڑا کر دیں جس میں ساری انسانیت سما جائے پھر دیکھئے غیر مسلم افراد اور اقوام کے ساتھ ہمارے رشتے کیسے بہتر ہوتے ہیں اور حالات واحوال میں کیسی خوشگوار تبدیلیاں پیدا ہوتی ہے۔ اسلام میں بین الملل یعنی دوسری قوموں سے تعلقات کو اس انداز نظر سے دیکھنا چاہیے۔ اس مضمون میں میں نے جو نقطہ نظر اختیار کیا ہے، میرا احساس ہے کہ یہی تقاضائے دین وشریعت ہے۔ لہٰذا اسے ہمارے قومی اور ملی پروگرام کا حصہ ہونا چاہیے۔ میں چاہوں گا کہ دیگر اہل علم بھی اس کو تیز کرنے میں ہماری مدد کریں تا کہ ہم اپنی غیر مسلم سوسائٹی کے لیے سراپا رحمت بن جائیں۔ شاید ملی بقا کا راستہ اسی خاردار وادی سے ہو کر گزرتا ہے۔

باب سوم

- ہندوستان میں ملی تعمیر کے چار نکات
- مسلم قیادت اور رائے عامہ کے سامنے چند غور طلب پہلو
- ملک کے موجودہ حالات میں ہماری حکمت عملی
- ہندوستان میں مسلمانوں کے مسائل اور ان کا حل
- ہندوستان میں ریزرویشن کی تاریخ، عوامل، محرکات اور...
- آزادی کے بعد ہندوستان کا سیاسی منظر نامہ اور مسلمان

ہندوستان میں ملی تعمیر کے چار نکات

موجودہ حالات

پچھلے چودہ سوسال میں جب سے مسلمان ہندوستان میں رہ رہے ہیں کبھی انہیں مجموعی طور پر پورے ملک میں اس صورتحال سے دوچار نہیں ہونا پڑا جس سے وہ اس وقت دوچار ہیں۔ یقیناً ان پر تاریخ کے مختلف ادوار میں کئی چھوٹی بڑی قیامتیں گزریں ہیں جنہوں نے بعض اوقات اور بعض مقامات پر ان کو پوری طرح برباد اور تاراج کردیا تھا۔ لیکن آج پوری ملت جس دباؤ اور نفسیاتی پسپائی کے دور سے گزر رہی ہے ایسا شاید پہلے کبھی نہیں ہوا۔ حالانکہ مغلیہ سلطنت کا زوال، نادر شاہ کا حملہ، سکھوں کے مظالم، انگریزوں کا مسلمانوں سے بے رحمانہ سلوک، تقسیم ملک کے بعد کے قیامت خیز واقعات اور اس طرح کے کتنے ہی سخت مرحلے ہیں جو مسلمانوں کے سر سے قیامت بن کر گزر چکے ہیں لیکن موجودہ صورتحال اپنی سنگینی میں ان سب سے بڑھ کر ہے۔

۶/دسمبر ۱۹۹۲ء کو بابری مسجد کے انہدام کا واقعہ محض ایک مسجد کو ڈھانے کا عمل نہیں تھا بلکہ یہ ہندوستان میں مسلمانوں کے مسلمہ اقلیتی وجود کے انہدام کی علامت ہے۔ کل تک جو چیزیں خطرے کی حد تک محسوس کی جارہی تھیں اب وہ ایک ڈراونی حقیقت بن کر ہمارے سامنے ہیں۔ اس ملک میں آزادی کے بعد سے ہی مسلمانوں کی جان ومال، عزت وآبرو، سماجی

اور معاشی حیثیت، سیاسی استحکام، تعلیمی ادارے، مساجد، مقابر، اوقاف، پرسنل لاء غرض ہر چیز پر خطرہ منڈلا تارہا ہے۔ فرقہ وارانہ فساد تو روزمرہ کا معمول ہے گویا اس ملک میں مسلمانوں کی حیثیت گاجر مولی سے زیادہ نہیں۔ تبھی تو بھا گلپور فساد کے وقت لوگائی گاؤں میں مسلمانوں کو قتل کر کے کھیت میں دفنا دیا گیا اور اس پر ہل چلا کر گوبھی بودی گئی۔ سورت میں مسلمان عورتوں کو ننگا کر کے دوڑایا گیا، ان کی اجتماعی آبروریزی کی گئی اور اس کی ویڈیو فلم بنائی گئی پھر ان کو تیل چھڑک کر زندہ جلا دیا گیا۔ یہ سب کچھ قابل برداشت اس صورت میں تھا جب کہ لوگوں کو اعتماد تھا کہ یہ سب چند شر پسند عناصر کا کھیل ہے۔ یہاں کی اکثریت، حکومت، عدالت، انتظامیہ، پریس اور سیاسی رائے عامہ ان چیزوں کی مخالف ہے۔ لہٰذا اس صورتحال پر روک لگے گی۔ لیکن بابری مسجد کے انہدام نے اس صورتحال کو پوری طرح بدل کر رکھ دیا۔ اب نہ حکومت کی کوئی گارنٹی ہے، نہ عدالت کا کوئی بھرم اور نہ کسی اجتماعی ادارے کا احترام۔ فسطائی اور شر پسند عناصر جو چاہتے ہیں، جیسے چاہتے ہیں ڈنکے کی چوٹ پر کہتے اور کرتے ہیں۔ کوئی ہاتھ ان کو پکڑنے والا نہیں، وہ دن دور نہیں جب یہ عناصر ملک پر حکمراں ہو جائیں، اس وقت یہ کیا کچھ نہ کر گزریں گے اس کا صرف تصور ہی کیا جا سکتا ہے۔ نریندر مودی کی حکومت میں گجرات کا فساد اس کا مظہر ہے۔ ہندوستان میں پوٹا کا قانون شاید مسلمانوں پر ہی ظلم ڈھانے کے لیے بنایا گیا ہے۔ گجرات میں تقریباً دو ہزار مسلمانوں کا قتل عام ہوا۔ ڈیڑھ لاکھ لوگ بے گھر بار ہوئے۔ اجتماعی عصمت دری کے دل دوز واقعات ہوئے اور 287 لوگوں کو پوٹا کے تحت گرفتار کیا گیا جس میں 286 مسلمان اور ایک سکھ ہے۔ یہ ایک ٹریلر ہے جو سامنے آیا ہے۔ ان کے آئندہ کے عزائم اور بھی خطرناک ہیں۔

میرے نزدیک مسلمانان ہند کی موجودہ حالت کا موازنہ 1857ء کے حالات سے کیا جا سکتا ہے۔ 1857ء کے غدر کی ناکامی نے اس ملک پر انگریزوں کو پوری طرح مسلط کر دیا تھا۔ انگریزوں نے یہ دیکھتے ہوئے کہ غدر کے اصل روح رواں مسلمان تھے ان پر قہر ناگہانی بن کر ٹوٹ پڑے اور ان کو پوری طرح تاراج کرنے کی ٹھانی جو اس دور کی تاریخ سے واضح ہے۔ جو

سلوک انگریزوں نے غدر کے بعد مسلمانوں کے ساتھ کیا تھا اس سے بدتر سلوک یہ فسطائی عناصر مسلمانوں کے ساتھ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ انگریز اپنی تمام تر ظالمانہ حرکتوں کے باوجود موجودہ فسطائی عناصر کے مقابلے زیادہ مہذب تھے اور ان کے اندر کچھ نہ کچھ اعلیٰ انسانی اوراخلاقی قدروں کا پاس ولحاظ تھا لیکن یہ لوگ تو فرعون وقت بن کر مسلمانوں کو ہر طرح سے برباد کردینے پر تلے ہوئے ہیں۔

اس صورت حال میں ملت کے تحفظ،اصلاح اور استحکام کے باب میں سنجیدہ غور وفکر کی ضرورت ہے تا کہ موجودہ صورتحال کا سد باب کیا جا سکے۔ہم لوگوں نے پہلے ہی اپنے انتشار اور ناعاقبت اندیشی کی وجہ سے بہت سا وقت ضائع کر دیا ہے۔تاہم اب بھی وقت نہیں گیا ہے۔ اگر ہم سنجیدگی اوراخلاص کے ساتھ سوچ سمجھ کر کوئی فیصلہ کریں اور مل جل کر اقدام کرنے کے لیے تیار ہو جائیں تو حالات کے رخ کو بدلا جا سکتا ہے۔ورنہ اب ایک لمحے کی غفلت ہمارے لیے سم قاتل ثابت ہو سکتی ہے۔

ایک بات اچھی طرح ذہن نشیں رہنی چاہیے کہ زمانے اور حالات کی کنجی اللہ رب العزت کے ہاتھ میں ہے،وہ جیسا چاہتا ہے لوگوں کے درمیان حالات کو الٹتا پلٹتا رہتا ہے۔ اس میں جو چیز فیصلہ کن حیثیت رکھتی ہے وہ لوگوں کے اعمال ہیں۔ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ

> ''اللہ تعالیٰ کسی قوم کی حالت اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک کہ وہ خود اپنی حالت بدلنے کے لیے تیار نہیں ہوتی۔''

گویا حالات کی تبدیلی کا دارومدار بہت کچھ قوم کے اپنے رویہ پر منحصر ہے۔اللہ کی تائید ونصرت اس کے عمل کے ساتھ مشروط ہے۔ایک دوسری جگہ اور واضح الفاظ میں یہ اعلان کیا گیا کہ انسان کو وہی کچھ ملتا ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے۔''اور جو لوگ ہمارے راستے میں کوشش کریں گے انہیں ہم ضرور اپنی ہدایت کا راستہ دکھائیں گے۔'' مطلب یہ کہ تبدیلیٔ حالات کے لیے کوشش شرط ہے۔آسمان سے مافوق الفطری طور پر کچھ نہیں ہوگا۔مسلمانوں نے ذلت ونکبت کے طویل دور دیکھیں ہیں۔مسلمانوں سے اللہ کی کوئی رشتہ داری نہیں ہے اور اللہ

کی سنت کبھی بدلتی نہیں ہے۔اس لیے مسلمانوں کو ایک بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ انہیں اپنی تقدیر بدلنے کے لیے اپنے آپ کو آمادہ کرنا ہوگا تبھی اللہ کی تائید ونصرت ان کے شامل حال ہوگی۔اس لیے کہ اللہ نے نیکی اور بھلائی کے کاموں میں اپنی نصرت کا وعدہ فرمایا ہے۔اللہ کی شریعت میں مایوسی کفر ہے۔اس لیے موجودہ حالات سخت اور پریشان کن ضرور ہیں۔مایوس کن ہرگز نہیں۔حالات سے مایوس ہوکر سپر ڈال دینے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ ہمیں ہمت وحوصلے کے ساتھ حالات کا رخ بدلنے کی ٹھوس،سنجیدہ طویل المیعاد اورمبنی بر اخلاص اجتماعی جدو جہد کرنے کی ضرورت ہے۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مسلمان موجودہ حالات کو بدلنے کے لیے کیا کریں اور کیسے کریں؟ یہ وقت کا سب سے اہم سوال ہے۔اس سلسلے میں مختلف لوگوں کے نزدیک مختلف کام ہوسکتے ہیں۔ان کی ترجیحات میں بھی اختلاف ہوسکتا ہے۔تاہم میرے نزدیک مندرجہ ذیل چند ضروری امور ہیں جن پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔میں یہاں نہ صرف یہ کہ ان کاموں کی نشاندہی کروں گا بلکہ ان کو کیسے بروئے کار لایا جائے اس سمت میں بھی کچھ رہنما خطوط غور وعمل کے لیے پیش کرنے کی کوشش کروں گا۔یہ ایک مشاورتی خاکہ ہے کوئی فیصلہ کن منصوبہ نہیں ہے۔ہم چاہیں گے کہ اس پر کھلے دل سے غور وتبصرہ ہو اور پھر اس کی روشنی میں مقامی حالات اور وسائل کے پیش نظر ایک عملی منصوبہ تشکیل دیا جائے تاکہ حالات کو بدلنے کا عمل شروع کیا جاسکے۔

میری نظر میں مسلمانوں کو ترجیحی طور پر مندرجہ ذیل امور پر توجہ دینی چاہیے۔

(۱) دینی بے داری:

مسلمان بنیادی طور پر ایک دینی ملت ہیں۔یعنی دوسری قوموں کی طرح یہ کوئی وطنی یا نسلی قوم نہیں ہیں۔مسلمان کی پہچان اور اس کی شناخت اس کا دین ہے۔اگر دین سے مسلمانوں کو الگ کردیا جائے تو پھر اس کا وجود اور عدم وجود برابر ہے۔اس وقت ہندوستان

میں مسلمانوں کی جان سے زیادہ ان کے ایمان کو خطرہ ہے۔لوگ جان کے خطرے کو تو اہمیت دیتے ہیں لیکن ایمان کے خطرے کے بارے میں اتنے حساس نہیں ہیں۔ حالانکہ اگر آپ فسطائی عناصر کے عزائم کو دیکھیں تو صاف معلوم ہوگا کہ ان کو آپ کی ایمانی شناخت سب سے زیادہ کھٹکتی ہے۔ چنانچہ وہ بار بار اس بات کا اظہار کرتے نظر آتے ہیں کہ ہندوستان میں مسلمان اگر اپنے عقائد اور مخصوص تہذیبی علامات کو ترک کر دیں اور ہندوستانی عقائد اور کلچر کو اختیار کر لیں بالفاظ دیگر اکثریتی قومی دھارے میں شامل ہونے کو تیار ہو جائیں تو پھر سارا جھگڑا ختم ہو جاتا ہے۔ دراصل یہ ہندوستانی سیاست کا مشترکہ مقصد ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ کچھ لوگ اسے سمجھا بجھا کر تعلیم وتربیت کے ذریعہ، ذرائع ابلاغ کی مدد سے جمہوری طور پر کرنا چاہتے ہیں۔ جبکہ فسطائی عناصر اتنا صبر نہیں رکھتے اور وہ یہ کام جلد سے جلد زور زبردستی سے کرنا چاہتے ہیں۔ لہٰذا میری نظر میں یہ سب سے اہم مسئلہ ہے۔ اس لیے اجتماعی اصلاح واستحکام کی کسی بھی اسکیم میں دینی بیداری کو اولیت دینی چاہیے۔

دینی بیداری کا مفہوم:

سوال یہ ہے کہ دینی بے داری سے کیا مراد ہے؟ اس کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں اور اس کے حصول کا ذریعہ کیا ہے؟ دینی بے داری سے مراد یہ ہے کہ مسلمان اپنے دین کی صحیح حیثیت سے واقف ہوں، اس کے عقائد سے آگاہ ہوں، اوامر ونواہی کا ان کو صحیح علم ہو۔ اسلامی عبادات کی ان کو جانکاری ہو اور اس کے التزام کو وہ جانتے اور سمجھتے ہوں اسلامی اخلاقیات سے آگاہ ہوں اور معاملات ومسائل کے ضمن میں اسلامی احکامات سے واقف ہوں۔ بالفاظ دیگر مجموعی طور ان کو پورے دین کی جانکاری ہو اور ہمارا ہر عامی بھی دین کی بنیادی باتوں سے اس حد تک آگاہ ہو کہ اسلام اور غیر اسلام کے فرق کو اچھی طرح سمجھتا ہو۔

مسلمانوں کو دراصل بڑے پیانے پر پُر زور طریقے سے ہر محفل اور مجلس میں انفرادی اور اجتماعی طور پر یہ سمجھانے کی ضرورت ہے کہ اسلام کی رو سے دین ودنیا کی تفریق غلط ہے۔

دین دراصل اللہ کی طرف سے دنیا گزارنے کا وہ طریقہ ہے جس کو اللہ نے اپنے رسولوں کے ذریعہ بتلایا ہے اور رسول نے اپنی زندگی اور عمل سے اس کو برت کر دکھایا ہے۔ دین دنیا سے الگ کوئی چیز نہیں ہے دنیا اللہ کے نزدیک اس وقت ناپسندیدہ ہے جب دین سے ہٹ کر اختیار کی جائے۔ دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔ دنیا عمل کی جگہ ہے اور آخرت انجام کا گھر۔ اس لیے حسن آخرت اس وقت تک حاصل نہیں ہوسکتا جب تک حسن دنیا حاصل نہیں ہوتا ہے۔ یعنی ہماری زندگی اللہ اور اس کے رسول کے بتائے ہوئے طریقہ کے مطابق گزرے یہی دین اسلام ہے اور یہی اس کی ضرورت ہے۔

اللہ نے اول دن سے ہی جہاں انسان کی زندگی کے لیے وہ ساری ضروری چیزیں اس روئے زمین پر مہیا کردی ہیں تاکہ انسان زندہ رہ سکے وہیں اسے صحیح اور غلط کی تمیز بھی عطا کی ہے۔ انسان اول حضرت آدم کو اللہ نے نہ صرف انسان بلکہ نبی بھی بنایا اور ان کے ذریعہ نسل آدم کی تعلیم کا انتظام کیا۔ تاریخ کے مختلف ادوار میں اللہ نے انسانوں کی ہدایت کے لیے ان کی تمدنی ضرورتوں کا لحاظ کرتے ہوئے مختلف انبیاء ورسل کے ذریعہ اپنا دین بھیجنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ اس لحاظ سے تمام انبیاء ایک ہی دین لے کر آئے۔ سب سے آخر میں حضور سیدنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی ورسول بنا کر بھیجا۔ آپ پر سلسلہ نبوت ختم ہوگیا۔ آپ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ اب قیامت تک یہی دین اور یہی شریعت تمام انسانوں کے لیے واحد مقبول اور مستند طریقۂ زندگی ہے۔ مسلمان جو اس دین کے امین ہیں۔ رسول کے بعد یہ ان کی ذمہ داری ہے کہ اس دین کو اپنی زندگی میں جاری وساری کریں اپنے قول اور عمل سے دنیا والوں کے سامنے حکمت اور اچھی نصیحت، نصح و خیر خواہی، دلسوزی، محبت اور خدمت کے ذریعہ بغیر کسی امتیاز و تخصیص کے اس دین کو دوسروں تک پہنچائیں۔ امیر غریب، جاہل عالم، بھنگی شودر، برہمن، چھوٹے بڑے، مالک مزدور، کسان، وکیل، ڈاکٹر، انجینئر، کالے گورے، شہری دیہاتی، اپنے پرائے، کسی رنگ، کسی نسل، کسی زبان، کسی ملک کا رہنے والا انسان ہو، عورت ہو یا مرد، بچہ ہو یا بوڑھا، جوان ہو یا ادھیر، بیمار ہو یا صحت مند، اپاہج ہو یا صحیح سالم غرض کوئی بھی ہو کہیں بھی

ہو، کیسا بھی ہو سب اس دین اور اس دعوت کے مخاطب ہیں۔ اس لیے اس دین کو عام انسانوں تک ان کے جرم، ظلم، استہزا، بغاوت، مخالفت، دھمکی، آزمائش، ایذارسانی اور ہر طرح کے خوف، زیاں وزبوں کے باوجود پہنچانا ہے۔ اس معاملے میں نہ اقلیت اور اکثریت کا خیال آنا چاہیے اور نہ حکومت کے زور و دباؤ کے آگے سپر ڈالنا چاہیے۔

مسلمان کی زندگی کا مقصد صرف شہادت، شہادت اور شہادت ہے۔ اس فکر، اس احساس، اس علم، اس عمل، اس نقل وحرکت سے مسلمانوں کے نوجوانوں، بوڑھوں، بچوں، عورتوں، تاجروں، طالب علموں، کسانوں، چھوٹوں، بڑوں غرض سب کو آگاہ کرنا باخبر رکھنا اور تیار کرنا ہے یہ ہے دینی بے داری۔

مسلمانوں میں یہ شعور اجاگر کرنے کی ضرورت ہے کہ اسلام اللہ کی طرف سے واحد مکمل، پسندیدہ اور مستند دین ہے۔ اس دین کو چھوڑ کر اگر کوئی شخص کوئی دوسرا طریقہ اختیار کرے گا تو وہ اللہ کے یہاں ہرگز مقبول نہیں ہوگا۔ بلکہ آخرت میں وہ عظیم خسران اور عذاب کا باعث ہوگا۔ اس لیے اپنے دین کو جاننا اور سمجھنا ضروری ہے۔

مسلمانوں کو دوسری بات یہ بتانی ہے کہ ہندوستان میں اور دنیا کے اور ملکوں میں بھی چونکہ نظام کفر کی حکمرانی ہے اس لیے پورے دین پر عمل کرنا عملاً اس وقت تک ناممکن ہے جب تک اللہ کا دین اللہ کی زمین پر پوری طرح قائم نہیں ہوتا۔ اللہ کا دین پوری طرح قائم ہونے کی دو شرطیں ہیں۔

(۱) دین کے جتنے حصے پر اس وقت عمل کرنا ممکن ہے مسلمان اخلاص اور دلجمعی کے ساتھ رضا کارانہ طور پر اس پر پوری طرح عمل کریں۔

(۲) دین پر ان کا یہ عمل آگے دین کو قائم کرنے کی راہ ہموار کردے گا۔

بغیر پہلی صورتحال پیدا کئے ہوئے دوسری صورتحال کا پیدا ہونا ممکن نہیں ہے۔ اس لیے فی الوقت دین کے اس حصہ پر عمل شروع ہوجانا چاہیے جس پر کوئی باہری رکاوٹ نہیں ہے۔ قانون، حکومت اور اکثریت اس میں مانع نہیں ہیں۔

دوسرے حصہ پر عمل کے لیے لوگوں کی تعلیم کا نظم کیا جانا چاہیے۔ اور ایک اجتماعی تحریک برپا کرنا چاہیے جو اس کے لیے فکری اور عملی ماحول بندی کرے۔ اس سلسلے میں ہمار اخلاص، ہمارا عمل، ہمارا علم اور ہماری لگن راہ کی رکاوٹوں کو دور کرنے میں معاون ہوگی۔ یہ کام بغیر اللہ کی مدد کے ممکن نہیں ہے۔ اس لیے دعا و استعانت اس راہ کی لازمی زادراہ ہیں۔

اس فکر کے فروغ کے لیے جہاں ایک طرف دین کے اجتماعی فکر کو واضح کرنے کی ضرورت ہے وہیں مسلمانوں کے عقائد و اعمال کی اصلاح کے لیے بھرپور مہم چلانے کی ضرورت ہے۔ عقائد کے باب میں توحید، رسالت اور آخرت کا صحیح ادراک کرانا ضروری ہے۔

توحید:

ادیان عالم میں توحید الٰہی کا اسلامی تصور اپنی امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ دنیا کے دوسرے مذاہب میں بھی ایک خدا کا تصور پایا جاتا ہے لیکن وہ محض ایک تصور ہے جو شرک کی بھول بھلیوں میں گم ہے۔ وہاں توحید نہ خالص ہے اور نہ عملی بلکہ سب کچھ خیالی اور تصوراتی ہے۔ اس لیے اسلام نے توحید کے اثبات سے پہلے شرک کا استیصال ضروری سمجھا تا کہ خالص توحید کا تصور اپنے تمام صفات وخصوصیات کے ساتھ نمایاں ہو کر سامنے آئے۔

توحید صرف یہی نہیں ہے کہ خدا کو ایک مانا جائے بلکہ اس کی صفات و اختیارات میں کسی کو شریک نہ مانا جائے۔ وہ اپنی ذات میں یکتا اور بے مثل ہے اس جیسا کوئی دوسرا نہیں! یہ کائنات تخلیق کمالات الٰہی کا مظہر ہے اور اس کی صفات یہاں کے ذرّے ذرّے سے عیاں ہے۔ کسی چیز میں صفات الٰہی کا کچھ عنصر اور عکس ہوسکتا ہے لیکن وہ اپنی جامعیت اور وسعت میں بہت محدود ہے۔ مثلاً رحم اللہ کی صفت ہے، یہ رحم کا مادہ ماں میں بھی ہوتا ہے اور کسی اور شخص اور چیز میں بھی ہوسکتا ہے۔ یہ خدائی صفت کا پرتو ہے، ہم پلہ اور شریک نہیں۔ لہٰذا اپنے دل و دماغ، عقیدے اور عمل کو شرک کے ہر شائبے سے پاک کرنا چاہیے اور اس میں کمی بیشی سے گریز کرنا چاہیے۔

اللہ ہمارا معبود و مسجود ہے اور وہی ہمارا حاکم وفرماں روا ہے۔ خلق اس کی ہے اور حکم اس کا ہی چلنا چاہئے۔

انسانی دنیا کا امن نظام کائنات سے ہم آہنگ ہونے میں مضمر ہے۔ یعنی اللہ کی اطاعت جس طرح آسمان میں ہوتی ہے اسی طرح زمین میں ہونی چاہیے۔

نفع ونقصان، زندگی وموت، عروج وزوال، تنگ دستی وفراغت، اقبال وادبار سب اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اس لیے مدد واستعانت، خوف وتقوی، امید ورجاء، اطاعت وعبادت صرف اور صرف اللہ کی ہونی چاہیے۔ اس میں کسی زندہ یا مردہ انسان یا مظاہر کائنات کی کوئی چھوٹی یا بڑی چیز یا مادی قوت کے اعتبار سے عظیم اور وقتی طور پر اعلیٰ حکمرانی کے منصب پر فائز، کسی کو شریک نہیں کرنا چاہیے۔

ہمیشہ اور ہر حال میں خیال رہے کہ خدا کے دیئے ہی کچھ ملے گا، ذریعہ کوئی بھی ہو۔ اس لیے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ذریعہ کو ناپاک کرنا ضروری نہیں ہے۔ جب وہ چیز خدا کے چاہے ملے گی تو جائز ذرائع سے بھی ملے گی۔ ہاں نظام باطل کے غلبہ اور آزمائش کے طور پر دیر سے مل سکتی ہے۔ اس لیے مومن کو مایوس ہوکر فوراً اپنے عقیدے میں ضعف پیدا کر کے کسی کو خدا کا متبادل سمجھ کر اس طرح نہیں مانگنا چاہیے کہ گویا وہ خدائی اختیار میں شریک ہے یا خدا اس کی مرضی اور اجازت کے بغیر تصرف نہیں کرسکتا (نعوذ باللہ)۔ توحید خالص پر مسلمان جتنا جمیں گے اور جس قدر خدا کا تقویٰ اختیار کریں گے ان کے عقیدے اور کردار میں اتنی ہی مضبوطی آئے گی اور وہ دنیا کی قوموں میں اپنی امتیازی شان پیدا کرسکیں گے۔

رسالت:

توحید کے بعد رسالت کا عقیدہ ہے جس کا صحیح ادراک کرنے کی ضرورت ہے۔ رسول دیوتا اور اوتار نہیں ہوتا۔ وہ فرستادۂ الٰہی ہوتا ہے۔ وہ انسان ہوتا ہے۔ وہ اللہ کا ایک ایسا بندہ ہوتا ہے جس کے جیسا کوئی دوسرا نہیں ہوتا۔ وہ وحی والہام کی روشنی میں ہدایت پاتا ہے

اور یہی ہدایت اپنی ذات سے،تعلیمات سے اور عمل سے لوگوں تک پہنچا تا ہے۔ یہ رسول ہر زمانے اور ہر قوم میں آئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سلسلۂ نبوت کی آخری کڑی ہیں۔ آپ پر اللہ نے اپنا دین مکمل کر دیا۔ آپ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ اب قیامت تک یہی شریعت اور سنت خدا پرستی کی واحد راہ ہے جس کو قران نے صراط مستقیم کہا ہے۔

اس وقت مسلمانوں پر جس قسم کے حملے ہو رہے ہیں ان میں ایک حملہ حضورؐ کی ذات پر بھی ہوتا ہے تا کہ مسلمانوں کے دلوں میں آپؐ سے جو والہانہ لگاؤ اور محبت کے جو جذبات موجزن ہیں ان کو ختم کر دیا جائے۔ جس دن مسلمانوں کے دلوں سے حضور کی محبت ختم ہو جائے گی اس دن توحید خالص، اللہ کی اطاعت وعبادت اور اسلام کا چلن ختم ہو جائے گا۔ اس لیے مسلمانوں کو اس بات پر پورے زور کے ساتھ آمادہ کرنا ہے کہ وہ حضورؐ کا دامن مضبوطی سے پکڑے رہیں اور اس میں ایک لمحے کے لیے بھی ڈھیل پیدا نہ ہونے دیں۔ حضورؐ احکام الٰہی کی تجسیم ہیں۔ اللہ ہم سے کیا چاہتا ہے، کیسے چاہتا ہے۔، اس ہدایت کے لیے حضورؐ ہی سراج منیر اور روشن مینار ہیں۔ اس لیے قرآن نے صاف صاف کہا کہ رسول کی زندگی میں تمہارے لیے بہترین نمونۂ عمل ہے۔ لہٰذا رسولؐ جو دیں اس کو لے لو اور جس چیز سے منع کریں اس کو چھوڑ دو، رسول کے فیصلے کے خلاف دل میں ذرہ برابر تنگی محسوس نہ کرو۔ رسول سے محبت ایمان کی علامت ہے اور رسول سے بغض وعناد نفاق کی۔ نفاق کا عملی مظہر یہ ہے کہ آدمی حضورؐ کے طریقے کو چھوڑ دے یا ناپسند کرے۔ جس طرح توحید میں شرک ہوتا ہے۔ اسی طرح رسالت میں بھی شرک ہوتا ہے۔ یعنی رسول کا جو مقام ہے اگر وہ مقام کسی اور کو دے دیا جائے تو یہ شرک فی الرسالت ہوگا جو اسلام میں اسی طرح حرام ہے جس طرح شرک فی التوحید حرام ہے۔

دنیا کے ہر شخص کے عمل میں چوں و چرا اور بحث ومباحثہ کی گنجائش ہے لیکن رسولؐ کے فرمان میں نہیں۔ رسول کبھی ہوائے نفس سے نہیں بولتا اس لیے جن باتوں کو آپؐ نے کرنے کا حکم دیا ہے یا جن باتوں سے روکا ہے اس پر عمل کرنا ایمان کی علامت ہے۔ یہی ہماری نجات اور شفاعت کا ذریعہ ہے۔ رسولؐ شفیع اول بھی ہیں اور شفیع آخر بھی۔ اس لیے جو کوئی حضورؐ کی

شفاعت کا امیدوار ہے اسے چاہیے کہ حضور پاکؐ کی خالص اطاعت کی خو پیدا کرے۔

حضورؐ سے محبت کی دو علامتیں ہیں۔ ایک آپؐ کو اپنی جان، مال، عزت، آبرو، ماں باپ، بیوی، بچوں اور دنیا بھر سے زیادہ عزیز رکھنا، دوسرے حضورؐ کی ہر حالت اور حیثیت میں اطاعت کرنا خواہ وہ بات اپنے نفس کو کتنی ہی ناگوار لگتی ہے، دنیا کے بڑے لوگوں کے چلن سے مختلف ہے یا کسی حکومت کا قانون اس کے خلاف ہے۔ یہی رسالت پر ایمان کی حقیقت ہے اور یہی اس کا تقاضہ۔ مسلمانوں کو یہ چیزیں اس طرح کھول کھول کر اور اتنی بار بتانے کی ضرورت ہے کہ وہ اس کی حقیقت سے پوری طرح واقف ہو جائیں۔ یہاں تک کہ یہ طرز فکر ان کی زندگی کا چلن بن جائے پھر تو حالات چاہے جتنے سخت ہوں مسلمانوں کے دین وایمان پر کبھی کوئی خطرہ نہیں آسکتا۔ اس لیے کہ حضورؐ کی ذات وہ قلعہ بند فصیل ہے جس کو کوئی توڑ نہیں سکتا ہے۔

آخرت:

آخرت کا تصور ہماری نظروں سے اوجھل ہے۔ ہم دنیا میں گم ہو گئے ہیں۔ حالانکہ اسلام نے دنیا سے منع نہیں کیا ہے لیکن اس نے ہر عمل کو آخرت کے نقطۂ نظر سے کرنے کا حکم دیا ہے کیوں کہ وہی دائمی انجام کا گھر ہے، جنت و دوزخ وہیں ہے۔ ہم دنیا کی زندگی میں تنگ دستی، افلاس، بیماری سے پریشان ہو کر آخرت کو بھول کر ہر قیمت پر اور ہر حال میں دنیا حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن ایک روز طبعی عمر گزار لینے کے بعد ہمیں اس دار فانی کو چھوڑنا پڑتا ہے۔ ذرا سوچیے وقتی مصیبت ہمارے پائے ثبات میں کبھی لغزش پیدا کر دیتی ہے لیکن آخرت کا گھر جہاں ہمیشہ رہنا ہے وہاں اگر ہم خدا کے غضب میں گھر گئے اور اس کے عذاب میں مبتلا کر دئے گئے تو وہاں موت بھی نہیں آتی۔ پھر ہمارے پاس کیا راہ نجات ہوگی۔

اس لیے مسلمانوں کو اس دن سے ڈرنا چاہیے اور اس گھر کی فکر کرنی چاہیے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ ہم اپنی دنیا کی زندگی خدا اور اس کے رسول کے بتائے ہوئے طریقے کے

مطابق گزاریں۔ مسلمانوں کو قیامت، جنت، دوزخ، حشر ونشر، قبر اور عذاب قبر اور وہاں کی جو کیفیت قرآن وسنت میں بیان ہوئی ہے۔ اس کو کھول کھول کر اور بار بار اس طرح پیش کرنا چاہیے کہ یہ ان کا طرز فکر بن جائے۔ اگر عقائد کی اصلاح ہو جاتی ہے تو اعمال کی اصلاح خود بخود ہو جائے گی۔ جب قلوب میں آمادگی پیدا ہوگی تو پھر اللہ کے احکام کو ماننا اور اس پر عمل کرنا آسان ہو جائے گا۔ اس لیے پہلی ضرورت عقائد کو درست کرنا اور اس کی تعلیم کا اہتمام کرنا ہے۔

مسلمانوں میں جو لوگ جس درجہ میں اس حقیقت سے واقف ہیں ان میں اتنی ہی دینداری پائی جاتی ہے۔ دین کے ہمہ گیر تصور کے فقدان کی وجہ سے چونکہ انہوں نے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے سمجھا ہے اس لیے ان کے اعمال وعبادات میں تناقض پایا جاتا ہے۔ اس لیے دین کے ہمہ جہت اور مکمل تصور کے ساتھ اگر ان کو قرآن وسنت کے ذریعہ صحیح عقائد کی تعلیم دی جائے گی تو یہ تناقض بھی رفتہ رفتہ دور ہو جائے گا۔

یہ ایک مسلسل کام ہے جو ہمیشہ ہر وقت اور ہر جگہ کرنا ہے، اس کو قرآن میں تذکیر کہا گیا ہے۔ تذکیر کا عمل چھوڑ دینے سے اعمال میں اضمحلال اور عقائد میں کمزوری پیدا ہو جاتی ہے۔ جس کے بعد شیطان کا حملہ تیز ہو جاتا ہے اور آدمی غلط سمت میں بھٹک جاتا ہے۔

عقائد کی صحیح تعلیم کے بعد دوسرا مرحلہ عبادات کی ترغیب، اسلامی اخلاقیات کی تعلیم اور معاملات اسلامی کی تفہیم ہے۔ نیز اجتماعیت وتحریک ہے۔ ہندوستان میں جتنا کچھ اسلام ہے اس کی اشاعت وتعلیم ہے۔ مثلاً مسلم پرسنل لاء سے متعلق احکام کی تفہیم، وضو طہارت کے مسائل اور دیگر شرعی احکام کی تعلیم۔ اس کام کو ایک متعین خاکہ کے تحت ترتیب دے کر علماء اور ائمہ مساجد کے تعاون سے اگر بروئے کار لایا جائے اور وقتاً فوقتاً ان کو اس کام کے سلسلے میں ضروری وسائل فراہم کئے جائیں تو کچھ دنوں میں ایک مخصوص علاقے میں جہاں یہ کام پورے زور کے ساتھ کرنا ہے ایک نمایاں تبدیلی لائی جاسکتی ہے۔

(۲) اتحاد بین المسلمین:

مسلمانوں کو ہندوستان میں اس وقت جن مسائل سے سابقہ ہے اگر ان کی تہ میں جایا جائے تو اندازہ ہوگا کہ ان میں پچاس فیصد مسائل کی وجہ صرف ہمارا آپسی اختلاف ہے۔اس نے داخلی محاذ پر ہمیں اتنا کمزور کر دیا ہے کہ ہم کسی خارجی محاذ پر اپنی اجتماعی قوت کا موثر اظہار کرنے سے قاصر ہیں۔ یہ بات ڈھکی چھپی نہیں ہے۔ ہمارے دشمنوں کو اس کا پورا پورا علم ہے۔ چنانچہ وہ بھی نت نئی چالیں چلتے رہتے ہیں۔تا کہ ہمارا یہ انتشار اور بھی نمایاں ہو کر ابھرے اور انہیں ہماری کمزوریوں سے بھر پور فائدہ اٹھانے کا موقع ملے ۔مسلمانوں کے تمام طبقات میں اتحاد و اتفاق کی خواہش پائی جاتی ہے ۔اورعوام تو گویا اسی انتظار میں بیٹھے ہیں۔لیکن اس کے باوجود اتحاد سراب کی مانند دور ہی دور ہوتا چلا جاتا ہے۔ بلکہ بسااوقات اتحاد کی کوشش مزید انتشار کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ کام میں دوہرا اور تہراپن پیدا ہو جاتا ہے۔ ایک مقصد کے لیے کئی کئی جماعتیں اور انجمنیں بن جاتی ہیں۔ان کا دائرہ کار اور طریق کار بھی الگ نہیں ہوتا ہے ۔اس طرح بیجا مسابقت اور مقابلہ آرائی پیدا ہوتی ہے۔ اور وسائل کا زیاں ہوتا ہے ۔حالانکہ اتحاد ایک ایسی لازمی ضرورت ہے جس کو پورا کئے بغیر ہم اس ملک میں نہ محفوظ رہ سکتے ہیں اور نہ آگے بڑھ سکتے ہیں۔اتحاد کی ضرورت کا مسلمانوں میں جس شدت سے ادراک و احساس ہوگا وہ اتحاد عمل کے لیے اتنی تیزی سے کوشش کریں گے۔

اتحاد بین المسلمین کا مفہوم:

سوال یہ ہے کہ اتحاد بین المسلمین سے ہماری مراد کیا ہے؟ اور اس کے ذرائع کیا ہوں گے؟ اتحاد کا مطلب نہ تو یکسانیت ہے اور نہ اس کا یہ مفہوم ہے کہ تمام مسلمان سارے اختلافات کو نظر انداز کر کے ایک مسلک اور ایک جماعت بن جائیں، یا پھر کسی ایک شخص کے ہاتھ پر بیعت کر لیں۔ یہ خیال ایک واہمہ ہے جس کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں پچھلے چودہ صدیوں میں ہم اتنی دور چل کر آ گئے ہیں کہ یہاں سے واپس لوٹ کر قرن اول کے معاشرے

میں جانا عملاً ناممکن ہے۔ اس لیے ہم جہاں جس ماحول اور جس ملک میں ہیں اس تناظر میں گفتگو کرنی چاہیے۔

اختلاف کیوں ہوتا ہے؟ اور کن لوگوں کے ذریعہ ہوتا ہے؟ اس کی ایک نظری وجہ قرآن کریم نے واضح کردی ہے جس پر پوری انسانی تاریخ گواہ ہے یہ انسان کی فطرت کا ایسا داعیہ ہے اور اختلاف کی ایسی وجہ ہے جس کو سر کی آنکھوں سے بڑی آسانی سے دیکھا جاسکتا ہے۔ قرآن کہتا ہے۔

''ابتدا میں سارے انسان ایک ہی طریقے پر تھے۔ پھر لوگوں نے اختلاف کیا، یہ اختلاف صاحب علم لوگوں نے کیا اور انہوں نے اس لیے یہ اختلاف کیا کیوں کہ وہ اپنے حصہ سے زیادہ لینا چاہتے تھے۔''

دنیا میں اختلافات کی تاریخ پر اگر نظر ڈالی جائے تو مبنی برحق اختلاف ۱۰رفیصد سے زیادہ نہیں ہوں گے۔ نوے فیصد اختلاف کی وجہ نفسانی اور مادی ہے چاہے اس کا مقصد اقتدار ہو یا دولت یا دیگر مادی مقاصد کا حصول، جس میں ناجائز انتفاع کا رجحان غالب رہتا ہے اس لیے کسی بھی انسانی سماج سے اختلاف اور عوامل اختلاف کو ختم کرنا ممکن نہیں ہے۔

دوسری طرف دس فیصد ہی حق اور اخلاص کی بنیاد پر اختلاف ہوتا ہے۔ اس لیے ہر اختلاف کو مردود اور غلط قرار نہیں دیا جاسکتا ہے۔ ایسا نہ ہو تو پھر صحیح اور غلط، اچھے اور برے، حق اور باطل، انصاف اور ظلم کے الفاظ ہی بے معنی ہوجائیں گے۔ اس لیے اختلاف کی مذمت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اتفاق کے نام پر ناروا اور ناجائز باتوں کو تسلیم کر لیا جائے۔ اختلاف بھی حدود کے اندر مطلوب ہے۔ ہر کسی سے ہر کسی بات پر اتفاق نہیں ہوسکتا ہے۔

ملت کی اندرونی صورتحال:

مسلمان معاشرہ اس وقت ایک چڑیا خانہ ہے جس میں بھانت بھانت کی بولی بولنے والے جانور رہتے ہیں۔ کسی کو خدا اور آخرت کے وجود ووقوع پر شک ہے۔ کوئی حضور کو خاتم

النبی نہیں مانتا،تو کوئی اہانت رسول کا مرتکب ہے۔کسی کو اسلامی عبادات سے چڑھ ہے تو کوئی شریعت میں تحریف کا مدعی ہے۔کوئی دین الٰہی کے طرز پر اسلام اور کفر کا ایک ملغوبہ بنانا چاہتا ہے،تو کوئی حصول اقتدار کی خاطر پوری ملت کو بیچنے کے درپے ہے۔ظاہرسی بات ہے جو لوگ یہ کررہے ہیں یہ کسی نادانی، جہالت یا سادہ لوحی میں نہیں کررہے ہیں۔ بلکہ وہ پورے علم و شعور کے ساتھ ایک سازش اور سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کررہے ہیں۔اس لیے ایسے افراد و عناصر کے ساتھ سمجھوتہ کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے۔جب تک کہ وہ اپنا طرز فکر اور طرز عمل بدل کر سیدھے سچے مسلمان نہیں ہوجاتے ہیں۔دراصل یہ لوگ ہدایت کے دشمن اور شر وفساد کے مدعی ہیں ممکن ہے ان کو اس کا شعور نہ ہو۔اس لیے ان کے سامنے بھی حق کھول کر پیش کیا جائے،شاید وہ راہ راست اختیار کرلیں ورنہ ان کے ساتھ دشمنوں کا سا معاملہ کیا جائے گا۔ ایسے عناصر سے دوستی گویا دن دہاڑے ڈاکوؤں کو اپنے گھر میں ڈاکہ ڈالنے کی اجازت دینا ہے۔ ہم کسی سے بھی اسلام کی بنیاد پر اتحاد کے قائل ہیں اسلام کو چھوڑ کر اور توڑ کر نہ اس کی ضرورت ہے اور نہ کوئی فائدہ ہے۔اس لیے اتحاد بین المسلمین کی حدود کو سمجھ کر ہی اتحاد کے لیے اقدام کی ضرورت ہے۔

اس وقت ہمارے سماج پر طالع آزما سیاسی لیڈروں کا غلبہ ہے جن کی انفرادی زندگیوں میں جھانک کر دیکھئے،ان کے خلوت وجلوت میں جھانکئے ،ان کے گھر اور ماحول پر نظر ڈالیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ وہ اسلام کو بے کار اور مسلمان کو بیوقوف سمجھتے ہیں اور ان کی زندگی اور معمولات میں اسلام کا دور دور تک کہیں کوئی شائبہ تک نہیں ملتا۔ ایمان وتقوی تو بہت دور کی بات ہے نماز روزہ جیسی بنیادی عبادات سے بھی انہیں چڑھ ہے۔لیکن وہ مسلمان بنے رہنا چاہتے ہیں تاکہ مسلمانوں کے نام پر ملنے والے فائدے سے مستفیض ہوسکیں۔حکومت اور اکثریت کو ایسے مسلمان بہت پسند آتے ہیں کیونکہ اس طرح کے شوپیس ان کے سیکولر شبیہ میں معاون ہوتے ہیں۔حکومت خواہ کانگریس کی ہو یا بھاجپا کی یا کسی تیسرے محاذ کی ہر جگہ اس برانڈ کے مسلمان مطلوب اور مقبول ہیں۔ظاہر ہے جو شخص اپنے دین وملت سے غداری کرسکتا

ہے وہ کسی اور سے کیا وفاداری نبھائے گا؟ اس لیے مختلف پارٹیوں کے لیڈرران ان کی اس حیثیت اور کمزوری سے واقف ہوتے ہیں۔لہٰذا ان تمام لوگوں کو ان کی اوقات میں رکھ کر معاملہ کرتے ہیں۔آج مسلمانوں میں سیاسی قیادت کا جو خلاء ہے اور اس وقت ملت میں جو سیاسی انتشار اور بے سمتی ہے وہ انہیں جڑ کٹے لیڈروں کی وجہ سے ہے۔ یہ انگریزوں کے دور میں بھی تھے اور آج بھی ہیں۔سیاست دانوں کا یہ برانڈ بھی ہمارے ملی انتشار کی ایک بڑی وجہ ہے جو نہ صرف ہمیں متحد ہونے نہیں دیتا بلکہ اتحاد کی ہر کوشش کو اپنی ذاتی اغراض کے لیے سبوتاژ کرتا رہتا ہے۔اتحاد بین المسلمین کے عمل میں ان سے مکالمہ تو ہونا چاہیے لیکن ان پر اعتماد کرنا اور ان کے ہاتھ میں قیادت کی باگ ڈور دینا خطرناک ہوسکتا ہے۔لہذ ان کے ساتھ محتاط مفاہمت اور ایشو بیسڈ تعاون ہی صحیح عملی پالیسی ہے۔

اتحاد بین المسلمین کی کوششوں کو آگے بڑھانے سے پہلے ہمیں ان اسباب وعوامل، افراد اور گروہوں کا پتہ لگانا ضروری ہے، جو اس راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ ہیں یا انتشار کے ذمہ دار ہیں۔ہمارے نزدیک ان کے موٹے موٹے مندرجہ ذیل اسباب ہیں۔

۱۔ مسلمان عوام کی جہالت وغربت بالخصوص دینی جہالت۔

۲۔ علمائے سُو جو کل بھی تھے آج بھی ہیں۔

۳۔ دنیاپرست بے دین ملت فروش سیاست باز۔

۴۔ اکثریت،حکومت اور ذرائع ابلاغ کی ریشہ دوانیاں، سازشیں اور غلط پروپگینڈے۔

۵۔ صالح عوامی قیادت کا فقدان۔

ایک بات اچھی طرح ذہن نشیں رہنی چاہیے کہ یہ عناصر اور افراد ہمیں کبھی متحد اور مضبوط ہونے کی اجازت نہیں دیں گے بلکہ وہ نت نئے حالات ومسائل پیدا کرکے ہماری صفوں میں انتشار کو بڑھانے کی ہر ممکن کوشش کریں گے۔لہٰذا ان کا زور توڑنے اور ہر طرح کی ریشہ دوانیوں اور پروپگینڈ کا جواب دینے اور لوگوں میں اتحاد کی تڑپ پیدا کرنے کے لیے مضبوط اجتماعی شعور پیدا کرنا ضروری ہے۔مسلمانوں میں انتشار پیدا کرنے کی کوشش صدیوں

سے چلی آرہی ہے۔ اس لیے ان میں اتحاد کے لیے ایک طویل المدت، جاندار اور پائدار تحریک چلانے کی ضرورت ہوگی۔ یہ کام ایک بالغ نظر نوجوان قیادت زیادہ اچھی طرح کرسکتی ہے۔لہٰذا ایک صالح قیادت وقت کی سب سے اہم ضرورت ہے۔

عملاً مسلمان اب کوئی دینی ملت نہیں رہ گئے ہیں بلکہ ان کی حیثیت ایک قومی گروہ کی ہوگئی ہے۔ان کے عوام وخواص نے اپنی اس حیثیت کو نہ صرف تسلیم کرلیا ہے بلکہ وہ اس پر قانع ہیں اور اقرار بھی کرتے ہیں۔جس طرح ہندو ایک قوم ہے اسی طرح مسلمان بھی خود کو ایک قوم مانتے ہیں حالانکہ یہ نظریہ بالکل غلط ہے۔ اس کو ثابت کرنے کے لیے کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہے۔مسلمان اصلی اور اصولی ہونے کے بجائے نسلی اور نقلی ہوگئے ہیں۔چونکہ باپ کا نام محمد عثمان تھا اس لیے بیٹا محمد سلطان ہے۔چاہے اس کا عقیدہ ،طریق عمل ،اخلاق واعمال اسلام کے خلاف ہی کیوں نہ ہوں۔ یہ نظریہ اسلام کے سراسر منافی ہے۔ہمیں اس نظریہ کو بدلنا ہوگا۔ نسلی مسلمانوں کو تعلیم وتربیت کے ذریعہ اصلی مسلمان بنانا بہت ضروری ہے۔ورنہ اتحاد کی کوئی بنیاد ہی فراہم نہیں ہوگی۔ پھر اتحاد کس بات پر ہوگا اور کیسے ہوگا؟ آج فرقہ ،مسلک ، جماعت اور برادری کا جھگڑا جہالت اور عصبیت کی بنیاد پر ہے۔اسلام کی نگاہ میں یہ دونوں چیزیں مردود ہیں۔لہٰذا ان کے حدود وقیود کو سمجھانا اور متوازن راہ عمل اختیار کرنا وقت کی اہم ضرورت ہے۔

مسلمان کو مسلمان سمجھا جائے:

میں یہاں پر صرف دو باتوں پر زور دینا چاہتا ہوں۔پہلی بات یہ کہ اس وقت جو لوگ خود کو مسلمان کہتے ہیں انہوں نے اعلانیہ کفر کا اظہار نہیں کیا ہے اور وہ ضروریات دینی میں سے کسی چیز کے منکر نہیں ہیں تو چاہے اپنے اعمال وکردار کی رو سے وہ کتنے ہی غلط کیوں نہ ہوں ہم انہیں مسلمان مانیں گے اور ان کے ساتھ مسلمان جیسا سلوک کریں گے۔موجودہ صورتحال اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ مسلمان ملت اس وقت ایک وبائی مرض سے دوچار ہے۔اس لیے اس کی بستی میں اگر کوئی بھی صحت مند نہیں ہے تو اس کی وجہ وبا کا پھوٹ پڑنا ہے۔اور جب کسی بستی میں وبا پھوٹ پڑتی ہے تو اسلام کا حکم ہے کہ مریضوں کو ان کے حال پر نہ چھوڑا جائے

اور نہ ہی اس بستی کو چھوڑ کر بھا گا جائے ۔لہٰذا ہمیں اصلاح حال کے لیے ایک دردمند طبیب کی طرح ملت کے امراض کو دور کرنے کی ایماندارانہ کوشش کرنی چاہیے۔ حضرت علی کے بقول اہل قبلہ کو کافر نہ کہا جائے اور ان کے ساتھ پوری ہم دردی، محبت، عزت اور خدمت کے جذبہ سے معمور ہو کر اصلاح حال کی کوشش کی جائے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس وقت مسلک، فرقہ، جماعت اور برادری کو چاہے ہم جتنا برا بھلا کہیں اور برا مانیں یہ ایک ٹھوس زمینی حقیقت ہے جس سے انکار ممکن نہیں۔ ان کے درمیان دوری پیدا کرنے اور ان کو لڑانے بھڑانے میں اب تک ہم نے بہت پیسہ، وقت اور طاقت خرچ کیا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں اب کوئی سماجی وحدت باقی نہیں۔ ایک دوسرے کی تکفیر اور تردید میں ہم اتنی دور نکل چکے ہیں کہ شاید لوٹنا ممکن نہ ہو۔ تاہم ہم ایک کام کر سکتے ہیں کہ ان سب کو ایک مستقل اکائی تسلیم کرتے ہوئے ان کو مشترکہ امور و مسائل میں جن کا تعلق پوری ملت سے ہے اور جس معاملے میں پوری قوم یکساں احساس و خیال رکھتی ہے۔ سب کے تعاون سے ایک مشترکہ لائحۂ عمل ترتیب دیا جائے۔ اور اس طرح ایک عملی اتحاد کی کوشش کی جاسکتی ہے۔ مثلاً فسادات کی روک تھام، تعلیم کا فروغ، سیاسی اور معاشی تقویت کی کوشش، مسلم پرسنل لاء کی حفاظت، اردو زبان کی ترویج، مسلمان نوجوانوں پر ظلم اور ان کی ناجائز گرفتاریوں پر احتجاج وغیرہ، اور ان امور کو اتحاد ملت کی بنیاد بنایا جائے۔ میری رائے میں ملت کا نظری اتحاد اب ممکن نہیں ہے۔ اس لیے ان کے اندر Issue based functional unity پیدا کرنے کی کوشش ہونی چاہیے۔ اس وقت اتحاد بین المسلمین کا میرے نزدیک یہی مفہوم ہے۔ بہر حال اتحاد بین المسلمین کے بغیر ہم ملی تعمیر کا کوئی منصوبہ روبعمل نہیں لا سکتے۔ اس لیے اس باب میں ایماندارانہ کوشش وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔

(۳) تعلیم کا فروغ:

مسلمانوں کی پسماندگی کی اگر کوئی ایک طبعی اور زمینی وجہ ہے تو وہ ان کی تعلیمی

پسماندگی ہے۔ تمام مطالعات اور رپورٹوں سے یہ بات پائے تصدیق کو پہنچ چکی ہے کہ مسلمان ملک کی تمام برادریوں اور قوموں کے مقابلے تعلیمی لحاظ سے پس ماندہ ہیں۔ ان مطالعات نے یہ بھی ثابت کر دیا ہے کہ آزادی کے بعد جہاں تمام قوموں نے ترقی کی ہے مسلمانوں کا معاشی اور سماجی گراف نیچے آیا ہے جس کی بنیادی وجہ ان کا تعلیمی پچھڑا پن ہے۔ حال کے دنوں میں اس مسئلہ کی طرف لوگون کی توجہ بڑھی ہے۔ مسلمان علماء اور دانشوروں نے قومی بیداری بالخصوص تعلیمی بیداری کی نئی مہم کا آغاز کیا ہے۔ اس کے کچھ اچھے اور مثبت نتائج بھی دیکھنے کو مل رہے ہیں۔ تاہم ان کوششوں کی حیثیت محض اذان دینے جیسی ہے اقامت تعلیم کا مرحلہ ابھی باقی ہے۔

تعلیم ایک ہمہ جہت اور پیچیدہ مسئلہ ہے۔ بالخصوص ایک پسماندہ ملت کا مسئلہ تہ بہ تہ اور سنگین ہوتا ہے۔ لہٰذا جب ہم ایک مخصوص ملت کے تناظر میں اس مسئلہ پر غور کرتے ہیں تو ہمارے سامنے بہت سارے مسائل و معاملات ابھر کر آتے ہیں جن پر معروضی انداز سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔

کسی قوم کی تعلیم تو ایک مسئلہ ہے ہی لیکن کسی پسماندہ قوم کی پسماندہ آبادی کی تعلیم ایک سنگین مسئلہ ہے۔ ہمارے یہاں ابتدائی تعلیم کا مسئلہ ہے۔ ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کا مسئلہ ہے۔ جدید اور مقابلہ جاتی تعلیم کا مسئلہ ہے۔ مذہبی اور لسانی تعلیم کا مسئلہ ہے۔ تعلیم کو معاش سے جوڑنے کا مسئلہ ہے۔ فنی اور تکنیکی تعلیم کا مسئلہ ہے۔ لہٰذا یہ ایک ہمہ جہت مسئلہ ہے۔

ہمارے سامنے سب سے بڑا چیلنج ہے کہ مسلمان مرد و خواتین اور بچوں اور بچیوں کے درمیان ان پڑھ آبادی کا جو تناسب ہے اسے کس طرح کم کیا جائے۔ مسلمان بچوں اور بچیوں کی بنیادی ابتدائی تعلیم اپنے دینی لسانی اور تہذیبی ماحول میں ہونی چاہیے۔ لیکن یہ سو دو سو اور ہزار اور دس ہزار بچوں کی تعلیم کا معاملہ نہیں ہے بلکہ یہ پندرہ کروڑ آبادی والی قوم کے ۵ سے ۱۵ سال کی عمر کے اندر کے لگ بھگ پانچ سے چھ کروڑ بچوں کی تعلیم کا مسئلہ ہے۔

ملت نے اپنے وسائل سے اب تک اپنے بچوں کی تعلیم کا جو نظم کیا ہے، نہ صرف یہ

کہ اس میں بعض نقائص اور کمیاں ہیں بلکہ وہ ناکافی بھی ہیں۔ ملت کے ذریعہ چلائے جانے والے تعلیمی اداروں کے پاس کوئی واضح تعلیمی پالیسی نہیں ہے۔ اور نہ کوئی ٹھوس تعلیمی منصوبہ ہے۔ یہ کوششیں زیادہ تر مقامی وسائل کے ساتھ مقامی انداز سے کی جاتی ہیں جس کو بالعموم کسی اجتماعی نظام کی سرپرستی حاصل نہیں ہے۔ وسائل کی کمی انفراسٹرکچر کے فقدان، لائق اور باصلاحیت اساتذہ کی عدم فراہمی اور کسی اجتماعی نظام کی رہنمائی سے محرومی کے سبب ان کا تعلیمی معیار پست ہے۔ اور ان اداروں سے نکلنے والے بچوں میں کسی مسابقت میں حصہ لینے کا داعیہ کم ہی پیدا ہوتا ہے۔

جہاں ان کوششوں کو باقی اور جاری رکھنے کی ضرورت ہے وہیں ان کے مسائل کے حل کے لیے ایک اجتماعی پہل درکار ہے تاکہ ان اداروں کو ضروری رہنمائی کے ساتھ ساتھ کچھ وسائل بھی فراہم کئے جاتے رہیں جو ان کی معنویت کے اضافہ میں معاون ہوں۔ لیکن ہمیں یہ بات ماننی ہوگی کہ حکومت کے تعاون کے بغیر ہم صد فیصد تعلیم کا ہدف کبھی حاصل نہیں کر سکتے ہیں۔

اس وقت حکومت نے جو اپنا تعلیمی نظام پھیلا رکھا ہے اگر ہم اس کے Physical Dimension اور Quantitative Expansion کو دیکھیں تو ہر ریاست میں لاکھوں کی تعداد میں پرائمری اور سکنڈری اسکولوں میں اساتذہ بحال ہیں اور ہر ایک کیلومیٹر پر ایک پرائمری اسکول، دو کیلومیٹر کے اندر ایک مڈل اسکول چار کیلومیٹر کے اندر ایک ہائی اسکول اور تیس کیلومیٹر کے اندر کوئی نہ کوئی سرکاری کالج ہے۔ یہ حال بہار جیسی ریاست کا ہے جو ملک کی سب سے پچھڑی ریاست ہے۔ سرکار کی پالیسی کے مطابق ہر ٹولہ اور ہر گاؤں میں بالخصوص پسماندہ آبادی والی جگہوں پر مثلاً ہریجن ٹولہ یا مسلمان بستیوں میں پرائمری اسکول کھولنے کا منصوبہ ہے۔ مگر ان تجربات سے ایک بات واضح ہو کر ابھری ہے کہ محض اسکول کھولنے اور اساتذہ کے بحال کر دینے سے تعلیم کی ضرورت پوری نہیں ہوتی اور نہ اس کا معیار بلند ہوتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ان منصوبوں کو بنانے والے دماغ اور ان کو نافذ کرنے والے ہاتھ بے ایمان

اور کرپٹ ہیں۔ ان کی سوچ ٹیڑھی ہے اوران کی نیتوں میں فساد ہے۔اولاً تو وہ دل سے چاہتے نہیں ہیں کہ تمام لوگ زیور تعلیم سے آراستہ ہوں۔اس لیے وہ منصوبہ ہی ناقص بناتے ہیں اور جب اس کے نفاذ کا وقت آتا ہے تو ان کے سامنے ایسی عملی دقتیں کھڑی کردیتے ہیں کہ ساری اسکیم دھری کی دھری رہ جاتی ہے۔دراصل ان کے دلوں میں عوام سے سچی ہمدردی نہیں ہے بلکہ ان کو بہلا پھسلا کراور بیوقوف بنا کر اپنا الوسیدھا کرنا چاہتے ہیں۔اگر آپ کاغذ پر ان منصوبوں کو دیکھیں گے تو لگے گا کہ آسمان سے تارے توڑ لائے گئے ہیں۔اور جب زمین پر ان کا نفاذ دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ ابھی تو کچھ ہوا ہی نہیں ہے۔ جہالت کے خاتمہ کا ایک دستوری ہدف طے کیا گیا تھا کہ دستور ہند کے نفاذ کے دس سال کے اندر یعنی ۲۶ جنوری ۱۹۶۰ء تک ۵ سے۱۴ سال تک کے بچوں کی صد فیصد تعلیم کا ہدف پورا کرلیا جائے گا۔جس وقت ہندوستان کو آزادی ملی تھی اس وقت اس ملک کی آبادی 37 کروڑ تھی اور آج آزادی کے ستر سال کے بعد ملک کی کل آبادی میں جاہل آبادی کا تناسب آزادی کے وقت کی کل آبادی کی کل مقدار سے کہیں زیادہ ہی یعنی لگ بھگ 45 کروڑ ہے۔ جب اس معاملے میں اکثریت کے ساتھ انصاف نہیں ہوا تو اقلیت کے ساتھ کیا انصاف ہوگا؟

انگریزوں نے اس ملک کوایک تعلیمی نظام دیا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی بعض خامیاں بھی اجاگر ہوئیں۔چنانچہ آزادی کے بعد تعلیمی نظام میں اصلاح ،ترمیم ،تبدیلی اوراضافہ کے لیے متعدد کمیشن اور کمیٹیاں بنیں۔لیکن جزوی اصلاحات اور ظاہری تبدیلیوں کے علاوہ کچھ خاص کرنے میں ناکام رہیں۔تعلیم کے منہاج اور مزاج میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ ہمارا نظام تعلیم کمیت اور کیفیت ہر دو اعتبار سے اپنے مقصد میں ناکام ہے۔

ہندوستان کا سماج ایک تکثیری سماج ہے۔ یہاں دسیوں مذاہب ،سینکڑوں زبانیں اور بیسیوں کلچر پائے جاتے ہیں۔ایک ایسے متنوع (Diversified) سماج میں تعلیم کا کوئی ایک موڈل کامیاب نہیں ہوسکتا۔ جب تک ملک کی ہر اکائی کی مذہبی ،تہذیبی اور لسانی ضرورتوں کا لحاظ رکھتے ہوئے کوئی تعلیمی نظام وضع نہیں کیا جائے گا اس وقت تک اس کو قومی تعلیمی پالیسی

کا نام نہیں دیا جا سکتا ہے۔

اس وقت جو سب سے بڑی دقت پیش آ رہی ہے بالخصوص اقلیتوں کو جو پریشانی لاحق ہے وہ یہ ہے کہ اکثریت کے منہاج اور مزاج کو ملحوظ رکھتے ہوئے اوران کی مذہبی ،تہذیبی اورلسانی ضرورتوں کے تحت جو تعلیمی نظام وضع کیا گیا ہے اسے قومی تعلیمی نظام کا نام دیا جارہا ہے جس میں اقلیتوں بالخصوص مسلمان اقلیت کی ضرورت اور جذبات کا کوئی لحاظ نہیں رکھا گیا ہے ۔اس وجہ سے مسلمان آبادی سرکاری سہولیات سے دل کھول کر فائدہ نہیں اٹھا پا رہی ہے۔ یہ ان کی تعلیمی پسماندگی کی سب سے بڑی وجہ ہے۔

یہ صحیح ہے کہ ہندوستان میں 82% ہندو ہیں لیکن یہ ان کی قومی حیثیت ہے۔ ہندوؤں کے ہر گروہ کا عقیدہ دوسرے گروہ سے مختلف ہے۔چونکہ ان کے یہاں عقائد کی جنگ نہیں ہے اس لیے وہ مذہباً ایک سمجھے جاتے ہیں لیکن جہاں تک زبان اور کلچر کا تعلق ہے ان میں بہت اختلاف پایا جاتا ہے اوراس معاملے میں وہ بہت حساس ہیں۔زبان کا معاملہ تو اتنا سنگین ہے کہ 1956 میں ریاستوں کی لسانی بنیادوں پر تنظیم نو کرنی پڑی اوراس وقت ملک کی تمام ریاستوں کی الگ زبان ہے۔ کلچر کے نام پر بھی تضاد اور تفاوت کا ماحول پایا جاتا ہے۔ ہندی کو جب ملک میں قومی زبان کی حیثیت سے نافذ کرنے کا مسئلہ اٹھا تو غیر ہندی ریاستوں نے جم کر اس کی مخالفت کی۔ ہندی سیکھنے جیسی اسکیموں کے ذریعہ ہندی کو قبول عام بنانے کی کوشش کی گئی۔اس کے نتیجے میں غیر ہندی ریاستوں میں بالخصوص ان کے شہری علاقوں میں اب کچھ لوگ ہندی سیکھنے اور سمجھنے لگے ہیں۔

دستور کے شیڈول آٹھ میں جن 22 زبانوں کو قومی زبان کی حیثیت سے تسلیم کیا گیا ہے اس میں ایک اردو بھی ہے ۔اردو آزادی سے قبل ہندوؤں،مسلمانوں،سکھوں اور دیگر لوگوں کی مشترکہ زبان تھی اور شمال وجنوب،مشرق ومغرب پورے ملک میں بولی اور سمجھی جاتی تھی۔لیکن آزادی کے بعد دیگر تمام قوموں نے اردو کا ساتھ چھوڑ دیا اور یہ بالخصوص مسلمانوں کی زبان بن کر رہ گئی۔مسلمانوں کے خلاف فرقہ واریت کا جو نفرت آمیز سلسلہ شروع ہوا اردو

اس کی زد میں آ گئی اوراس کی ہر محاذ پر ہمت شکنی کی گئی۔

اس وقت نصابی کتابوں میں نہ صرف یہ کہ دیو مالائی تصورات بھر دیئے گئے ہیں بلکہ مسلمانوں کے عقائد وتہذیب اوران کی تاریخ کو مسخ کر کے پیش کرنے کی ایک مذموم مہم جاری ہے جس کے نتیجہ میں نہ صرف یہ کہ نئی نسلوں میں فرقہ وارانہ کشمکش میں اضافہ کا اندیشہ ہے بلکہ اس سے مسلمانوں کے اندر سرکاری اداروں میں تعلیم حاصل کرنے کے رجحان کی حوصلہ شکنی ہورہی ہے۔ کسی بہتر متبادل نظام کے نہ ہونے کے سبب جومسلمان اپنے بچوں کوان اداروں میں تعلیم دلوارہے ہیں وہ اپنی نئی نسل کے مستقبل کے بارے میں سخت خلجان میں مبتلا ہیں۔ سرکاری نظام تعلیم کی دیکھا دیکھی جو غیر سرکاری اور پرائیوٹ اسکول ہیں وہ بھی اسی طرز پر تعلیم دے رہے ہیں۔ پہلے مسلمانوں کو عیسائی مشنری اسکولوں سے شکایت تھی کہ ان کے دین و تہذیب اورزبان کو مٹانے کی سازش کررہے ہیں اوراب مشنری اسکول بھی اسی ڈگر پر چل پڑے ہیں۔ چونکہ مسلمانوں کے پاس اس کا کوئی بدل نہیں ہے اس لیے مجبوراً وہ اپنے اصلی جوہر دکھا پانے میں ناکام ہورہے ہیں۔ مسلمانوں میں مسابقت کی عدم صلاحیت کی ایک بڑی وجہ ان کی ذہنی الجھن بھی ہے۔

مسلمانوں کو اپنے سامنے ایک Clear Cut تعلیمی ہدف رکھنا چاہیے اور ہندوستان کے نظام تعلیم کے ان پہلوؤں پر، جوان کے عقائد اورشبیہہ کے منافی ہیں۔ نہ صرف گہری نظر رکھنی چاہیے بلکہ ان کو نصاب سے خارج کرانے کی خصوصی مہم چلانی چاہیے۔ لیکن یہ منفی عمل ہوگا۔ ہمیں مثبت طور پر حکومت اوراکثریت کو یہ بھی بتانا ہوگا کہ ہم کیسا تعلیمی نظام چاہتے ہیں؟ اورایک صحیح قومی تعلیمی پالیسی کے خدوخال کیا ہونے چاہئیں؟ یہ کام سب کام چھوڑ کر کیا جائے ضروری نہیں ہے۔ لڑائی اور پڑھائی ساتھ ساتھ چلنی چاہیے۔

عقائد اورزبان وتہذیب کی حفاظت تعلیم گاہوں سے زیادہ گھر سے ہوتی ہے۔ اگر گھر کا ماحول درست ہے تو باہر کا ماحول بہت اثر انداز نہیں ہوتا۔ باہر کا ماحول وہیں زیادہ اثر ڈالتا ہے جہاں گھر کا ماحول صحت مند نہیں ہے۔ اس لیے ہمیں اپنے گھروں پر توجہ دینی

چاہیے اور گھر کے اندر اسلامی عقائد، عبادات، تہذیب و اخلاق کی تعلیم و تربیت کا خصوصی نظم کرنا چاہیے۔ سیاسی شورش سے خارجی معاملات درست کئے جاسکتے ہیں دل کی دنیا رضا کارانہ عمل سے آباد ہوتی ہے۔

بہرحال تعلیم کے باب میں گونا گوں مسائل ہیں جن پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ مگر ایک بات کا خیال بھی رہے کہ جاہل رہنے سے کہیں بہتر ہے تعلیم حاصل کرنا چاہے وہ تعلیم کیسے ہی غلط ماحول اور ناقص نصاب کے ساتھ دی جا رہی ہو۔ جو چراغ جلے گا وہی اندھیرے میں روشنی دکھا سکتا ہے ورنہ بجھے ہوئے دیئے کو اندھیرے میں ڈھونڈنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا بن آنکھ کے آدمی کا رات میں سفر کرنا۔ اس لیے اگر آپ اپنے بچوں کی اچھی معیاری تعلیم کا خود کوئی انتظام نہیں کر سکتے ہیں تو جو انتظام میسر ہے اس سے استفادہ کیجئے، بہتر ہے کہ لڑکیوں کے الگ اسکول اور کالج ہوں۔ الگ اسکول کالج نہ ہوں تو ان کو جاہل بنا کر گھر میں بٹھانے سے بہتر ہے کہ ان کو مخلوط تعلیم کے اداروں میں بھیجئے۔ آپ اپنے اندر جس بگاڑ کا اندیشہ رکھتے ہیں اگر معاشرے میں بگاڑ ہوگا تو جاہل رکھ کر آپ اپنے گھروں میں بھی ان کو محفوظ نہیں رکھ سکتے ہیں۔ اس لیے کمیونیٹی کو جہاں ایک طرف اپنی تہذیب و ثقافت کی حفاظت کے لیے اچھے او رمعیاری ادارے کھولنے کے لیے آگے آنا چاہیے وہیں بالکل کھلے دل کے ساتھ موجودہ وسائل سے بھرپور استفادہ کی کوشش کرنی چاہیے اوران کے منفی اثرات سے بچنے کے لیے ایک ضمنی حفاظتی اسکیم بنانی چاہیے۔ ہم اس ملک اور ماحول سے بھاگ نہیں سکتے ہیں۔ اس لیے اہلیت پیدا کرنے کی ہر ممکن صورت اختیار کر کے اس کو اپنے مزاج کے مطابق بنانے کی کوشش ایک واحد راہ ہے۔ یہ مسئلہ بنیادی طور پر ابتدائی سے ثانوی تعلیم کا ہے۔ اعلیٰ اور فنی تعلیم میں ان تحفظات کی ضرورت نہیں ہے۔

ظاہری بات ہے کہ مسلمانوں کے تعلیمی مسائل اتنا گونا گوں ہیں کہ ان پر ایک ساتھ ایک مختصر سے مضمون میں گفتگو کرنا ممکن نہیں ہے۔ اس کے لیے ایک ورک شاپ درکار ہے جس میں تمام معاملات و تعلقات پر روشنی ڈالی جاسکے ۔اس وقت صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ تعلیم

کا فروغ ہمارے ملی تعمیر کے ایجنڈے میں سب سے اول نمبر پر ہونا چاہیے اور اس کے فروغ کے لیے تمام قسم کی علمی اور عملی کوشش کی جانی چاہیے۔

(۴) ایک صالح قیادت کی ضرورت:

ملی تعمیر میں چوتھا اور سب سے اہم نکتہ ایک صالح قیادت کی ضرورت ہے ہندوستان میں مسلمان لگ بھگ پچھلے پچاس سال سے بغیر کسی مضبوط اور صالح قیادت کے جی رہے ہیں جس کی وجہ سے ۱۵ کروڑ کی ایک مضبوط آبادی شتر بے مہار ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے انتشار، بے سمتی اور بے وزنی کی یہی سب سے بڑی وجہ ہے۔ مسلمانوں کو جب تک ایک صالح، مؤثر، بے خوف صاحب بصیرت قیادت نصیب نہیں ہوتی اس وقت تک ان کی محکومی اور محرومی دور نہیں ہوگی۔

مسلمانوں میں اس وقت دو طرح کی قیادتیں پائی جاتی ہیں۔ ایک مذہبی اور دوسری سیاسی۔ زندگی کے دیگر شعبوں مثلاً تعلیم، صحت، معاشی استحکام، تمدنی بہتری (Cultural Refinement) اور دیگر میدانوں میں کوئی قیادت نہیں ہے۔ جس کی وجہ سے ان امور و معاملات میں کوئی ٹھوس رہنمائی نہیں ملتی۔ ان میدانوں میں مسلمانوں کے پچھڑے پن کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ کوئی ان کو اس بارے میں بتانے اور سمجھانے والا نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ملت کے اندر ان امور پر توجہ نہ کے برابر ہے اور جو کوششیں کسی مقام پر ہو بھی رہی ہیں وہ اپنے معیار و اثر کے لحاظ سے ناقابل التفات ہیں۔

ہماری مذہبی قیادت:

ہمارے یہاں مذہبی قیادت تین خانوں میں بٹی ہوئی ہے۔ ایک قیادت وہ ہے جو خانقاہوں کے اندر ہے۔ دوسری قیادت وہ ہے جو مسلک کی بنیاد پر قائم ہے۔ اور تیسری دینی جماعتیں ہیں۔ خانقاہی قیادت کا دائرہ کار زیادہ تر تزکیہ نفس اور روحانی اصلاح تک محدود ہے۔ ایک زمانے میں خانقاہوں کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ ان کے دروازے ہر قوم اور ہر فرقہ

کے لوگوں کے لیے کھلے رہتے تھے اسی لیے وہ فرقہ وارانہ خیر سگالی کے مراکز بنے رہتے تھے۔

آج جب خانقاہوں سے وہ روح نکل گئی ہے اور بقول اقبالؔ اب خانقاہوں میں محض مجاور اور گورکن رہ گئے ہیں۔ اس لیے ان کے فیض عام میں بھی کمی آئی ہے۔ میں اس سے زیادہ اس ادارے پر کوئی تبصرہ کرنا نہیں چاہوں گا کہ اپنی ساخت اور نوعیت کے اعتبار سے یہ ادارہ مسلمانوں کو کوئی اجتماعی قیادت فراہم نہیں کرسکتا۔ باوجود یکہ کہ عوام وخواص میں آج بھی ان کے معتقدین کی ایک بڑی تعداد پائی جاتی ہے۔

مسلمانوں میں جو دوسری دینی قیادت ہے وہ مسلکی قیادت ہے۔ بھارت میں ویسے تو مسلمانوں میں ہر فرقہ اور مسلک کے لوگ پائے جاتے ہیں لیکن اسلام کے دو دھڑے شیعہ اور سنی میں کئی مسالک ہیں جن کی الگ الگ علاقوں میں معتد بہ تعداد پائی جاتی ہے ۔مثلاً شیعوں میں اثنائے عشریہ کی اکثریت ہے اور اس کے علاہ بوہرہ، خوجہ، اسماعیلی اور دیگر مسالک کے لوگ بھی ہیں جن کی مضبوط اجتماعی ہیئت ہے ۔سنیوں میں حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی ہر مسلک کے لوگ پائے جاتے ہیں۔ مگر ملک میں حنفیوں کی اکثریت ہے اس کے بعد شافعی جن کو عرف عام میں اہل حدیث یا وہابی کہتے ہیں وہ آتے ہیں۔ حنفی مسلمان دو دھڑوں دیوبندی اور بریلوی میں بٹے ہوئے ہیں۔ ہم مسلک ہونے کے باوجود ان دونوں گروہوں میں شدید مخالفت پائی جاتی ہے ۔ یہاں تک کہ ان کے غالی عناصر ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھنے، شادی بیاہ کرنے اور جنازے میں شریک ہونے تک کے روادار نہیں ہیں۔ فروعی معاملات میں ان کا اختلاف بڑھتے بڑھتے اصول دین میں اختلاف کا ذریعہ بن گیا ہے۔ چنانچہ ان کی مسجدیں اور مدرسے الگ ہیں۔ جہاں بے محابا ایک دوسرے کے خلاف سب وشتم کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اس اختلاف نے ملی اتحاد کو جتنا نقصان پہنچایا ہے شاید ہی کسی اور چیز نے اتنا نقصان پہنچایا ہوگا۔ مسلمانوں میں دیوبندی اور بریلوی کا اختلاف اتنا شدید ہے کہ ان میں موجود قیادت کا سارا وقت ایک دوسرے کو نیچا دکھانے میں صرف ہوجاتا ہے۔ ملی تعمیر اور اصلاح کے لیے ان کے پاس کوئی وقت ہی نہیں بچتا۔ لہٰذا مسلکی قیادت اپنی ساخت اور تربیت کے

اعتبار سے ملی قیادت کی اہل نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ ان دھڑوں میں ایسے لوگ بہت کم ہیں جن کا دونوں جانب احترام پایا جاتا ہے اور جن کی باتیں دونوں طرف یکساں مقبول ہیں۔ جو لوگ مسلمانوں کی ان کمزوریوں کو سمجھتے ہیں وہ ان دونوں قیادتوں کو اپنے مقصد کے لیے وقتاً فوقتاً استعمال کرتے رہتے ہیں اور یہ لوگ آپس میں لڑنے میں چاہے جتنے بڑے غازی ہوں غنیم کی فوج کے بڑے وفادار سپاہی ہوتے ہیں۔

مسلمانوں میں مذہبی قیادت کا تیسرا دھڑا دینی جماعتیں ہیں۔اس وقت ملی سطح پر چار جماعتیں ہیں۔جمیعۃ العلماء، جماعت اہل حدیث، جماعت اسلامی، تبلیغی جماعت اور بہار اڑیسہ اور جھارکنڈ پر مشتمل امارت شرعیہ بہار کو بھی اس صف میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ان جماعتوں میں جمیعۃ العلماء نے مسلمانوں کی دینی اور روحانی رہنمائی کے ساتھ ساتھ جنگ آزادی میں بھی زبردست حصہ لیا تھا۔ انگریزوں سے اس ملک کو آزاد کرانے میں ان کی قربانیاں سنہرے حرفوں سے لکھے جانے کے لائق ہیں۔مسلمانوں کے صف اول کے تمام تر قائدین اس جماعت سے وابستہ رہے ہیں۔شیخ الہند مولانا محمود الحسن، مولانا حسین احمد مدنی اور مولانا ابوالکلام آزاد اسی جماعت کے رکن تھے۔ آزادی کے بعد ملک میں جو صورتحال پیدا ہوئی اس وقت اسی جماعت کے قائدین نے مسلمانوں کی مؤثر رہنمائی فرمائی جس نے مسلمانوں کو ڈھارس بندھائی جس سے انہیں بقاء اور استحکام ملا۔مگر اس وقت یہ جماعت اپنا زور اور اثر کھو چکی ہے اور اپنے مقدس اسلاف کے نام پر ابھی بھی قائم اور زندہ ہے لیکن مؤثر قیادت دینے سے قاصر ہے۔ بلکہ حالیہ دنوں میں خاندانی نزاع کا شکار، انتشار وافتراق سے دوچار ہے۔

مسلمانوں میں اس وقت جو سب سے مقبول عام جماعت ہے وہ تبلیغی جماعت ہے مگر یہ جماعت سے زیادہ ایک چلت پھرت ہے جس کو کلمہ نماز کی تحریک کہا جاسکتا ہے۔اس نے اپنی کوششوں کے دائرے میں کچھ اور چیز کو شامل کیا ہی نہیں ہے اس لیے یہ مسلمانوں کو کوئی قیادت فراہم نہیں کرسکتی ہے۔

جماعت اہل حدیث یہ شافعی اور غیر مقلد لوگ ہیں جن کو عرف عام میں وہابی کہا جاتا

ہے۔اس جماعت کی موجودہ اجتماعی ہیئت تو نئی ہے تاہم اس کا سلسلہ شاہ ولی اللہ،سید اسمٰعیل شہید،سید احمد بریلوی اورفرنگی محل اورعلمائے صادق پور سے ملتا ہے۔ان لوگوں نے ہندوستان میں بدعت کے خلاف اورسنت کے اجراء کے لیے جوزوردارتحریک چلائی وہ اپنی مثال آپ ہے۔اس کے ساتھ ساتھ جنگ آزادی میں ان کی قربانیاں ہندوستان کے کسی بھی فرقہ اورگروہ کی قربانیوں سے کہیں زیادہ ہیں۔ان کی تحریک اتنی مضبوط اورمؤثر تھی کہ ان کی زورواثر کی وجہ سے نہ صرف ہندوستان میں بلکہ دیگرمسلمان ملکوں میں بھی انگریزوں کے پاؤں اکھڑتے محسوس ہوئے۔ لہٰذا انہوں نے اس تحریک کو بدنام کرنے کے لیے وہابی تحریک کہہ کرپکارنا شروع کیااورمسلمانوں کی جہالت سے فائدہ اٹھا کر مسلمانوں کے ایک مضبوط دھڑے کو ان کے خلاف لاکھڑا کیا۔جس کے نتیجے میں یہ تحریک انقلابی ہونے کے بجائے مسلکی بن کررہ گئی اور اب اہل حدیث حضرات بھی اس پرقانع ہوگئے ہیں۔ان کے اندربھی عدم رواداری اورتشدد پسندی اس درجہ آگئی ہے کہ انہوں نے خودکومسلمانوں کے سواداعظم سے الگ کرلیا ہے۔لہٰذا اس وقت اہل حدیث تحریک ایک مسلکی تحریک ہے جس کی اپیل اہل حدیث کہے جانے والے افرادتک حدود ہے۔

خلافت تحریک کی ناکامی کے بعدمسلمانوں کوشرعی رہنمائی دینے اوران کوایک شرعی امارت کےتحت زندگی گزارنے پرآمادہ کرنے کے لیے بہارمیں امارت شرعیہ کے نام سے ایک کوشش کی گئی جس نے بعدمیں ادارے اوراب ایک جماعت کی شکل اختیارکرلی ہے۔امارت نے ابتداًمسلمانوں کی سیاسی رہنمائی کابھی بیڑ ااٹھایاتھا اور اس نے عملاً یہ فریضہ انجام بھی دیالیکن صف اول کے قائدین بالخصوص مولاناسجادعلیہ الرحمہ کے اٹھ جانے کے بعدامارت میں سیاسی قیادت کی صلاحیت باقی نہیں رہی مگر بہارمیں اس کاایک بڑاحلقہ ہے اورمسلمان مختلف امور میں اس کی طرف رہنمائی کے لیے رجوع کرتے ہیں۔حال کے دنوں میں امارت نے خدمت خلق،جس میں ریلیف کے علاوہ ہاسپٹل ،تعلیم ،ٹکنیکل تعلیم کے باب میں قابل ذکرکام کیاہے اوربہار کی سطح پرملت کی رہنمائی کافریضہ انجام دے رہی ہے۔اس کی شاخیں اڑیسہ

اور جھارکھنڈ میں بھی پھیلی ہوئی ہیں۔

بریلوی حلقے نے امارت شرعیہ کے طرز پر ادارۂ شرعیہ، بہار و جھارکھنڈ و اڑیسہ قائم کیا ہے اور وہ بھی اپنے مسلک کی ترویج و اشاعت کے ساتھ ساتھ دیگر سماجی، رفاہی اور سیاسی معاملات میں دلچسپی لیتے نظر آرہے ہیں۔

اس وقت مسلمانوں میں صرف ایک جماعت ہے جس کو جماعت کہہ کر پکارا جاسکتا ہے وہ جماعت اسلامی ہند ہے۔ یہ ایک نظری اور اصولی جماعت ہے جس کے پاس واضح نصب العین، ٹھوس اجتماعیت، مضبوط کیڈر اور وسیع پالیسی پروگرام ہے۔ جماعت اسلامی کی دعوت اسلام ہے۔ یہ تنہا جماعت ہے جو مسلمانوں اور غیر مسلموں دونوں کو مخاطب کرتی ہے۔ یہ مکمل اسلام کی وکالت کرتی ہے اور اس کی اشاعت، شہادت اور اقامت کے لیے ہمیشہ کوشاں ہے۔ جماعت اسلامی تعلیم، صحت، خدمت خلق کے دیگر میدان ریلیف، فرقہ وارانہ خیر سگالی، سماجی انصاف و مساوات، ملی اتحاد و استحکام غرض ہر میدان اور ہر معاملہ میں رہنمائی کا فریضہ انجام دے رہی ہے۔ جماعت اسلامی نے سیاست کو کبھی شجر ممنوعہ نہیں سمجھا۔ تاہم اس نے ملک کے موجودہ سیاسی عمل بالخصوص الیکشنی سیاست سے خود کو الگ تھلگ رکھا ہے یہاں تک کہ اپنے ارکان پر ووٹ دینے تک کی پابندی لگا رکھی تھی۔ مگر جب اندرا گاندھی نے ایمرجنسی لگا کر ملک کی دیگر جماعتوں کی طرح جماعت اسلامی ہند پر پابندی عائد کردی اور اس کے ارکان و کارکنان کو بے قصور جیلوں میں بند کردیا تو جماعت اسلامی نے اپنی سیاسی عدم مداخلت (Political Neutrality) کی پالیسی کو ترک کرتے ہوئے سیاسی عمل میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا اور اپنے ارکان پر سے ووٹ نہ دینے کی پابندی اٹھالی تاکہ وہ جمہوریت اور شہری آزادی اور بنیادی حقوق کی دفاع میں اپنا وزن ڈال سکیں۔

ہندوستان اس وقت نازک ترین دور سے گزر رہا ہے اور ملک پر فسطائیت کا خطرہ منڈلا رہا ہے۔ جماعت اسلامی سیکولرزم کی نظری اور تاریخی حیثیت کی ہمیشہ مخالف رہی ہے۔ یعنی لادینی، غیر روحانی، مذہب مخالف اور دنیا پرستانہ سیکولرزم کی وہ شدت سے منکر اور مخالف

ہے یورپ میں سیکولرزم جس خاص تناظر میں ابھرا اور پروان چڑھا اور وہاں اس نے جو اثرات قائم کیئے وہ اس کو بھی رد کرتی ہے۔لیکن ہندوستان میں سیکولرزم کو ایک خاص مفہوم میں اختیار کیا گیا ہے۔ ہندوستان میں مختلف مذاہب پائے جاتے ہیں جس میں ہندو مذہب کے ماننے والوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔اس کے بعد اسلام، عیسائیت، سکھ مت، جین مت، بودھ مت اور دیگر مذہبوں اور متوں کے لوگ بھی پائے جاتے ہیں۔ ہندوستان کے دستور ساز رہنماؤں نے یہ محسوس کیا کہ اگر کسی ایک مذہب کو ریاست کے مذہب کے طور پر تسلیم کیا جائے گا تو دوسرے مذاہب کے لوگوں کو اس سے اختلاف ہوگا جو قومی یکجہتی کے لیے نقصان دہ ثابت ہوسکتا ہے۔اس لیے انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ فرد او رسماج کا چاہے جو مذہب ہو، ان کے عقیدے، نظام عبادت اور اخلاق وشریعت پر کوئی پابندی نہیں ہوگی۔ بلکہ اس کی پوری آزادی ہوگی تا کہ لوگ اپنے مذہب پر پوری طرح عمل کرسکیں۔اپنے بچوں کو اس کے مطابق تعلیم دے سکیں اوران کو تبلیغ واجتماع کا حق بھی حاصل ہوگا۔مگر ریاست کا کوئی مذہب نہیں ہوگا یعنی ریاست اپنے اجتماعی قانون کو وضع کرتے وقت مفاد عامہ کے تحت جو قانون سازی کرے گی اس کا کسی مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔دوسرے ریاست کسی مذہب کی طرف دار نہیں ہوگی۔ تیسرے ریاست کسی مذہبی گروہ کے ساتھ مذہبی بنیاد پر کوئی امتیازی سلوک نہیں کرے گی۔ان کے عقائد ومعاملات میں کوئی مداخلت نہیں کرے گی۔

اسلام کا اصول ہے کہ دین کے معاملے میں کسی پر کوئی جبر نہیں کیا جائے گا۔اگر کسی آبادی اور ملک میں ایک سے زیادہ مذاہب کے لوگ رہتے ہیں تو ان کے درمیان تبلیغ ودعوت کا رشتہ تو رہے گا مگر جبر ومداخلت سے گریز کیا جائے گا۔تمہارا دین تمہارے لیے اور ہمارا دین ہمارے لیے۔

جماعت اسلامی سیکولرزم کے اس مفہوم کو ہندوستان کے موجودہ تناظر میں قومی تعلقات کے باب میں ایک قابل قبول ورکنگ فورمولہ مانتے ہوئے اس صورت کو گوارہ کرتی ہے۔یہ صورت سماجی امن،قومی استحکام اور ملی تحفظ و بقا کے نقطۂ نظر سے ایک پسندیدہ نظریہ

ہے۔اس لیے جماعت نے جمہوریت ،سماجی انصاف ،انسانی مساوات اور مذہبی رواداری کے وسیع تر تصور کوتسلیم کرتے ہوئے ڈکٹیٹر شپ کے مقابلے جمہوریت اور فسطائیت کے مقابلے سیکولزم کی حمایت میں نہ صرف اپنے ارکان اور کارکنان پر سے ووٹ کی پابندی ہٹالی ہے بلکہ اس سلسلے میں بھرپور اور سرگرم حصہ داری کی مدعی ہے۔تاکہ اس کا اثر محسوس کیا جاسکے اور ملک کی گاڑی کو غلط سمت میں جانے سے روکا جاسکے۔لیکن جماعت اسلامی کی پہنچ اور اثرات ابھی محدود ہیں اس کی قیادت ملک وملت کے وسیع تناظر میں کوئی مؤثر رہنمائی فراہم کرنے میں ناکام ہے۔

سیاسی قیادت کا ایک جائزہ:

یہ تو رہی چند جماعتوں کی بات۔آزادی کے بعد مسلمانوں نے قیادت کے خلاء کو پُر کرنے کے لیے چند قابل ذکر اجتماعی کوششیں کی ہیں جس کا تذکرہ ضروری ہے۔آزادی کے فوراً بعد شمالی ہندوستان کے بڑے حصے میں فساد پھوٹ پڑا اور مسلمانوں کے پاؤں اکھڑنے لگے۔اس وقت مولانا آزاد اوران کے چند ساتھیوں نے ملت کو بڑا سہارا دیا۔اس دور میں جواہرلال کا کردار بھی قابل ستائش رہا۔دستور کے نفاذ کے بعد ملک میں مرکزی اور ریاستی سطح پر جو سرکاریں بنیں ان میں بعض ریاستوں بالخصوص اتر پردیش کی حکومت میں ایسے لوگ حکمراں ہوگئے جو مسلمانوں سے حد درجہ بغض وعناد رکھتے تھے اوران کی زبان وتہذیب کو مٹادینا چاہتے تھے۔دستور ہند میں اگر چہ عام شہریوں اور اقلیتوں کو تمام ضروری تحفظات فراہم کئے گئے ہیں۔ تاہم اس میں بعض ایسی دفعات بھی ہیں جو اقلیتوں کے سر پر تلوار بن کر لٹک رہی ہیں۔جن سے ان کے دلوں میں خوف اور اندیشے کا ماحول بنا ہوا ہے۔دستور کے رہنما اصول ۴۵ میں ۵ سے ۱۴ سال کے بچوں کی لازمی تعلیم کی بات کہی گئی ہے ۔سمپورنانند نے جب یوپی میں ابتدائی اورثانوی درجات سے اردو کو نصاب سے خارج کردیا تو یہ اندیشہ لاحق ہوا کہ شاید حکومت مسلمان بچوں کو اپنی دینی وثقافتی تعلیم سے محروم رکھنا چاہتی ہے جو کسی بھی نسلی تطہیر کے عمل سے

زیادہ خطرناک ہے۔ چنانچہ اس وقت ملک میں موجودہ دینی قیادت اور تمام ذمہ دار افراد نے یوپی میں دینی تعلیمی کونسل بنائی اور ایک طرف جہاں مسلمانوں کو جبری بنیادی تعلیم کی کسی اسکیم سے مستثنٰی رکھنے وہیں دوسری طرف مسلمان بچوں کی دینی ولسانی تعلیم کی زوردار کوشش شروع کی۔ اس تحریک میں مولانا حفظ الرحمٰن پیش پیش تھے۔ ان لوگوں کی کوششوں سے صرف یوپی میں ہزاروں ارد و مدارس قائم ہوئے جس نے مسلمان بچوں کی ایک بڑی تعداد کا رشتہ اپنے مذہب اور اردو زبان سے قائم رکھنے میں مدد دی۔ یہ غالباً آزاد ہندوستان میں اپنے زندہ ہونے کا پہلا اجتماعی ثبوت تھا۔

تقسیم ملک کے بعد مسلمانوں کی کوئی سیاسی جماعت باقی نہیں رہی مسلم لیگ جس کا نارتھ انڈیا میں بہت زور تھا بالکل ختم ہوگئی۔ اس کے باقیات میں تامل ناڈو اور کیرالہ میں کچھ تھوڑے لوگ ہیں جو مسلم لیگ کے نام سے سرگرم ہیں۔ ان علاقوں سے ایک دو ایم پی پارلیمنٹ میں جیت کر آتے ہیں۔ کیرالہ میں اس کی پوزیشن بہتر ہے۔ مخلوط حکومت ہونے کی صورت میں اس کی کچھ پوچھ ہو جاتی ہے۔ لیکن مسلم لیگ کا مسلم سیاست میں اب کوئی اثر نہیں ہے۔ نارتھ انڈیا میں اس کو زندہ کرنے کی اب تک کی تمام کوششیں ناکام ہو چکی ہیں۔ جب سے اس کے دو دھڑے ہوئے ہیں اس کی پوزیشن اور بھی کمزور ہوگئی ہے۔

یوپی میں ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی نے ستر کی دہائی میں مسلم مجلس بنائی تھی۔ جس نے ایک سیاسی ہل چل پیدا کی تھی۔ مگر ڈاکٹر فریدی کے انتقال کے بعد یہ بھی انتشار کا شکار ہوگئی اور اس کا زور و اثر ٹوٹ گیا۔ سلطان صلاح الدین اویسی نے مجلس اتحاد المسلمین کے نام سے حیدرآباد میں ایک سیاسی جماعت بنائی ہے جہاں سے ایک دو آدمی ایم ایل اے اور ایم پی بن جاتے ہیں۔ حیدرآباد کی میونسپل کارپوریشن پر اس جماعت کا غلبہ ہے۔ حال کے دنوں میں ان کے صاحبزادے اسدالدین اویسی جولندن سے بیرسٹری کر کے لوٹے ہیں اپنی پارٹی کو ملک گیر بنانے میں لگے ہیں۔ لہذا سیاسی جماعت کے نام پر مسلمانوں میں کوئی قابل ذکر جماعت نہیں ہے اور اس کا دور دور تک کوئی امکان بھی نہیں ہے۔ اسی طرح کی کوشش آسام میں مولانا بدر

الدین اجمل نے کی ہے اور انہیں بھی کچھ محدود کامیابی ملی ہے۔

۱۹۶۰ء میں آزادی کے بعد اس وقت کا سب سے بڑا فساد جبل پور، مدھیہ پردیش میں ہوا۔جس نے ہندوستان کے مسلمانوں کو ہلا مارا۔اس فساد میں حکومت اور اس کے انتظامی مشنری کی ناکامی کھل کر سامنے آئی۔پہلی بار مسلمانوں نے اس طرح کی صورتحال سے بچنے کے لیے ایک نئے سیاسی عمل کی تلاش شروع کی اور کانگریس کا بدل تلاش کیا جانے لگا۔اس غور وفکر کے نتیجے میں مسلمانوں نے اپنی کوئی سیاسی جماعت تو نہیں بنائی مگر سیاسی رہنمائی کے لیے سید محمود کی قیادت میں مسلم مجلس مشاورت تشکیل دی۔مشاورت کو مسلمانوں کی زبردست اخلاقی حمایت حاصل ہوئی اور محسوس ہوا کہ مسلمانوں میں سیاسی بیداری آرہی ہے۔مگر سید محمود کے انتقال کے بعد مشاورت کو کوئی مضبوط قیادت ہاتھ نہیں آسکی اور کچھ لوگوں نے اس کو اندر سے سبوتاژ کر دیا۔جس کے نتیجے میں ایک اچھی کوشش بے اثر ہوگئی ابھی بھی کچھ لوگ اس کو زندہ کئے ہوئے ہیں مگر یہ غیر موثر ہوگئی ہے۔

مسلمانوں میں اجتماعیت کا زبردست رجحان پایا جاتا ہے۔اب تک جب بھی کوئی ایسا مسئلہ سامنے آیا ہے جس نے مسلمانوں کے وجود اور شناخت پر حملہ کیا ہے۔مسلمانوں کی اجتماعی روح بیدار ہوئی ہے اور انہوں نے اس کے تدارک کے لئے مؤثر اقدام کیا ہے۔جب اندرا گاندھی نے علی گڑھ مسلم یونیورسیٹی کے اقلیتی کردار کو چھیننا چاہا تو مسلمانوں نے اس کی شدید مخالفت کی بالآخر حکومت کو اپنے ترمیمی ایکٹ میں بعض ضروری تبدیلی لا کر اقلیتی کردار کو یک گونہ بحال کرنے کی یقین دہانی کرنی پڑی۔اسی طرح اردو زبان کو دوسری سرکاری زبان بنانے،اس کی تعلیم کا بہتر انتظام کرنے،اس کو روزگار سے جوڑنے اور اس کو فروغ دینے کے لیے مختلف ریاستوں میں کامیاب مہم چلائی گئی جس میں خاصی کامیابی حاصل ہوئی۔

مسلمانوں نے اپنی اجتماعیت اور اتحاد کا سب سے عدیم المثال مظاہرہ شاہ بانو کیس کے معاملے میں مسلم پرسنل لاء میں کی جانے والی مداخلت کے خلاف کیا۔پھر بابری مسجد کے سانحہ کے خلاف مسلمانوں نے اجتماعی طور پر جس طرح کے غم وغصہ کا مظاہرہ کیا اس سے اندازہ

ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں اتحاد کی ساری علامتیں موجود ہیں اگر ان کو ایک مضبوط اور مؤثر قیادت ہاتھ آ جائے تو وہ حالات کو اپنے حق میں بدل سکتے ہیں۔

اس وقت مسلم پرسنل لاء بورڈ کی شکل میں مسلمانوں کے پاس ایک مضبوط پلیٹ فارم ہے جس پر ملت کے ہر طبقہ کا اعتماد ہے اور اس میں ملت کے ہر طبقہ کی نمائندگی موجود ہے۔ اس تجربہ کو مزید مضبوط، مستحکم اور وسیع کرنے کی ضرورت ہے۔ افسوس کی بات ہے کہ کچھ لوگوں نے اس کو کمزور کرنے کے لیے الگ الگ ناموں سے کئی بورڈ بنانے کی کوشش کی ہے جو نیک فال نہیں ہے۔ بابری مسجد ایکشن کمیٹی اپنی بعض کمیوں کے باوجود ایک اجتماعی ادارہ ہے۔ کچھ لوگوں نے ملی کونسل کے نام سے سیاسی رہنمائی کی کوشش کی ہے۔ حال کے دنوں میں ویلفیئر پارٹی آف انڈیا کے نام سے ایک سیاسی جماعت بنانے کی کوشش کی جاری ہے۔

لیکن اس پوری تفصیل سے جو ایک بات واضح ہوتی ہے کہ ہندوستان میں مسلمان خوف کی نفسیات کے ساتھ جیتے ہیں۔ وہ اپنے عقائد، زبان، تعلیمی ادارے، شریعت اور جان و مال کے معاملے میں بے حد حساس ہیں اور جب ان چیزوں پر کسی جانب سے حملہ ہوتا ہے تو وہ اتحاد و تنظیم کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ لیکن یہ صورت حال بتاتی ہے کہ بچی کھچی روایات اور شناخت کی حفاظت میں ہی ان کا سارا وقت گذر جاتا ہے اس لیے وہ اپنی ترقی اور استحکام کے بارے میں کچھ سوچ اور کر نہیں پاتے ہیں۔ ساتھ ہی ملک کی تعمیر و ترقی میں جس طرح بڑھ چڑھ کر حصہ لینا چاہیے نہ تو انہیں اس کا موقع دیا جاتا ہے اور نہ وہ خود اس کے لیے وقت نکال پاتے ہیں۔

ہندوستان میں چاہے جو معاملہ ہو اور اکثریت کے درمیان چاہے جس قسم کا تنازعہ پیدا ہو اس کا رخ پھر کر مسلمانوں کی جانب کر دیا جاتا ہے گویا برق گرتی ہے تو بے چارے مسلمانوں پر۔ ہندوستان میں ہندو پسماندہ ذاتوں کو اس لیے ریزرویشن دیا گیا تاکہ وہ مسلمان یا عیسائی نہ ہو جائیں۔ جب منڈل کمیشن کی سفارشات نافذ کر کے بعض ہندو پچھڑی ذاتوں کو ریزورشن کی سہولت دی گئی اور اکثریت کے دو طبقے اگڑے اور پچھڑے کے درمیان شدید کش مکش شروع ہوئی تو فوراً رام مندر کا مسئلہ کھڑا کر کے اس کو فرقہ وارانہ رنگ دے دیا گیا۔

ہر تھوڑے دنوں پر ملک میں ایک بڑ افساد کرا کے مسلمانوں کے اندر خوف اورعدم تحفظ کے احساس کو گہرا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔تا کہ ان کو بے خوفی اور خود اعتمادی کے ساتھ ملک وملت کی تعمیر میں بھر پور حصہ لینے سے روکا جاسکے۔ یہ حالات ابھی ہمارا مقدر ہیں اورابھی باقی رہیں گے۔اس لیے ہمیں اس کوایک ٹھوس زمینی حقیقت مانتے ہوئے اصلاح وتعمیر اورترقی واستحکام کی راہ ہموار کرنی ہے۔

ہندوستان میں مسلمانوں نے ابھی تک جوطرز عمل اختیار کیا ہے اوران کی جو قیادت ہے وہ جذباتی اور ہنگامی ہے۔جیسے ہی کبھی کوئی چوٹ لگی یا زخم لگا لوگ چیخ پکار کرنے لگے پھر دھیرے دھیرے چوٹ کے اثرات کم ہوئے یازخم مندمل ہوگیا تو پھر خواب خرگوش میں مبتلا ہوگئے۔ پھر جب چوٹ لگی تو تلملا کر اٹھ گئے۔گذشتہ چھ دہائیوں سے مسلمان اسی طرح جیتے مرتے چلے آرہے ہیں۔

ابھی تک ہم نے عرض داشتوں اورمطالبات کے سہارے اپنی بات منوانے کی کوشش کی ہے۔یا خوشامد اور دھمکی سے کام نکالنا چاہا ہے۔ہم ہمیشہ خود کو ووٹ بینک کے طور پر پیش کرتے رہے ہیں۔اورلوگوں نے بھی ہم کوووٹ بینک ہی سمجھا ہے۔ہمیں خوداپنے مسائل اور معاملات کا صحیح علم نہیں ہے تو ہم دوسروں سے کیا شکایت کرسکتے ہیں؟اڈوانی صاحب نے سیوڈ وسیکولرزم بنام مائنوریٹی اپیزمینٹ کے نام سے ملک میں ایک بحث شروع کی۔انہوں نے غیر بی جے پی جماعتوں کوسیوڈوسیکولر کہا اور یہ بتایا کہ ان کے ذریعہ اقلیتوں کے جابے جا منھ بھرائی کی جاتی ہے۔تا کہ ان کا ووٹ بینک محفوظ رہے۔میں مانتا ہوں کہ اڈوانی صاحب کی بات میں آدھی سچائی ہے۔جو غیر بی جے پی جماعتیں ہیں وہ نقلی سیکولر ہیں اس میں کوئی شک نہیں کیونکہ تقریباً تمام جماعتیں بشمول کانگریس،سوشلسٹ،کمیونسٹ اور دیگر علاقائی پارٹیاں جوخود کوسیکولر کہتے نہیں تھکتیں،انہوں نے مسلمانوں کی حفاظت،ترقی اوراستحکام کی کوئی ایماندارانہ کوشش نہیں کی۔جس کی وجہ سے مسلمان زندگی کے ہر معاملے میں ہندوستان کی تمام ہم عصر قوموں سے پیچھے ہیں۔اور یہی حقیقت اس بات کی دلیل ہے کہ اقلیتوں کی منھ بھرائی کاالزام بے بنیاد ہے۔

ہاں یہ سچ ہے کہ اقلیتوں کو بیوقوف بنانے کی کامیاب کوشش کی جاتی رہی ہے اور اقلیت اس کی شکار ہوتی رہی ہے۔

اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ صحیح معنوں میں مسلمانوں میں سیاسی شعور کا فقدان ہے۔ ان کے یہاں کوئی سیاسی عمل شروع ہی نہیں ہوا اور ان کے اندر کوئی مضبوط زمینی قیادت ابھر کر سامنے نہیں آئی جو ہندوستان کی حکمراں جماعت یا حکمرانی کی دعویدار پارٹیوں سے برابر کی سطح پر بات کر سکے۔

مسلمانوں میں اس وقت جو سیاسی قیادت پائی جاتی ہے وہ حقیقی لیڈر شپ نہیں ہے بلکہ Shadow Leadership ہے۔ ملک کی تمام سیاسی پارٹیاں خواہ وہ علاقائی ہوں، یا ذات کے نام پر سیاست کرتی ہوں یا ملکی سطح کی پارٹیاں ہوں سب کو اپنے آپ کو پورے سماج کی نمائندہ جماعت ثابت کرنے کے لیے کچھ مسلمان نما ناموں کی بھی ضرورت ہوتی ہے یہاں تک کہ وہ ہندوتو نواز پارٹیاں جن کی بنیاد ہی مسلم دشمنی پر ہے جیسے بی جے پی، شیو سینا وغیرہ ان کو بھی خود کو سیکولر اور تمام طبقات کی نمائندہ جماعت ثابت کرنے کے لیے کچھ مسلمان چہرہ چاہیے۔ ان جماعتوں کو وہ مسلمان بہت پسند آتے ہیں جو پڑھے لکھے تیز طرار تو ہوں لیکن جن کی اپنی کوئی جڑ بنیاد نہ ہو اور وہ بڑی آسانی کے ساتھ اپنے دین وضمیر کا سودا کرنے کو تیار ہوں۔ انگریزی تعلیم وتربیت کے نتیجے میں ان کو بڑی آسانی کے ساتھ ایسے لوگ مل جاتے ہیں۔ جو اپنے مفاد کے معاملے میں بہت حساس مگر اپنے دین وملت کے معاملے میں سرے سے کوئی جذبہ نہیں رکھتے ہیں۔ اس لیے کہ ان کی اٹھان ہی اس ماحول اور نظام تربیت میں ہوئی ہے جہاں ان باتوں کا چرچہ تک نہیں ہوتا۔ ہاں ان کو یہ گُر ضرور سکھائے جاتے ہیں کہ ملت فروشی اور دین فروشی کیسے کی جاتی ہے؟ معاملہ اگر سیکولر تعلیم یافتہ لوگوں تک ہی رہتا تو صورتحال اتنی خطرناک نہیں ہوتی۔ ہمارے درمیان ایسے علمائے کرام بھی ہیں جو اس حمام میں پوری طرح ننگے ہیں۔ بہرحال یہ لیڈر شپ ملت کی رہنمائی نہیں کرتی بلکہ ملت میں اپنی پارٹی کی نمائندگی کرتی ہے۔ اس کا کام یہ ہے کہ ملت کو اس پارٹی سے جوڑے اور ملت میں پارٹی ووٹ بینک کو

مضبوط کرے اس کے عوض پارٹی ان کو اسمبلی اور پارلیامنٹ کی رکنیت، یا پھر حکومت میں وزارت یا تنظیم میں کوئی عہدہ فراہم کرتی ہے۔ یہ اپنی مرضی سے کچھ بول نہیں سکتے اور اپنے طور پر کوئی اقدام نہیں کر سکتے۔ پارٹی قیادت ان کو جن امور میں جتنا بولنے کی اجازت دیتی ہے وہ بس اتنا ہی بولتے ہیں۔ اس سے زیادہ پر مارنے کی اجازت نہیں ہے۔ ہاں جب کسی وجہ سے پارٹی قیادت سے ان کا اختلاف ہوجاتا ہے اور وہ پارٹی سے نکل جاتے ہیں یا نکال دیئے جاتے ہیں تب وہ ساری باتیں کہتے ہیں۔ لیکن جب تک ان کا الو سیدھا ہوتا رہتا ہے وہ پارٹی قیادت کے سامنے ملت کی واجبی مسائل کو بھی پیش کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ساٹھ کی دہائی کے بعد اب کسی بھی پارٹی میں ایسا کوئی بھی مسلمان لیڈر نہیں ہے جو ملت کے کسی بھی طبقہ کی نمائندگی کرتا ہو۔ اس وقت جو لوگ برسر اقتدار یا اپوزیشن میں ہیں مسلمان انہیں ہی اپنا لیڈر مانتے ہیں۔ ان کی باتوں پر ملت کو جتنا اعتماد ہے ان پارٹیوں میں رہنے والے مسلمان لیڈروں پر نہیں ہے۔ اس کی ایک بڑی مثال یہ ہے کہ چودھویں لوک سبھا اور پندرہویں لوک سبھا کا الیکشن ہوا، اس الیکشن میں ترقی اور سیکولرزم بڑا مسئلہ بن کر سامنے آیا لیکن پورے ہندوستان میں کسی پارٹی نے کسی بھی مسلمان لیڈر کو پروجیکٹ نہیں کیا۔ بعض لوگوں کو پوسٹر بوائے اور پوسٹر گرل کہہ کر پکارا بھی گیا مگر کہیں کسی پوسٹر میں ان کا چہرہ نظر نہیں آیا۔ اس الیکشن میں مسلمانوں کی بے چہرگی جتنی دیکھنے کو ملی شاید اس سے پہلے کبھی نہیں تھی۔ اگر اس کو مستقبل کا اشارہ مان لیا جائے تو اندیشہ ہے کہ مسلمان ووٹ بینک تو رہے گا مگر اس کی شناخت اور اہمیت ختم ہوجائے گی اس لیے کہ لیڈر شپ ہی کسی قوم کو اس کی پہچان دلاتی ہے۔

یہ ہے وہ صورتحال جس کے تناظر میں میں ایک صالح قیادت کو ملی تعمیر کی لازمی شرط مانتا ہوں۔ لیڈر شپ کی اس بحث میں دو اور باتیں قابل لحاظ ہیں۔ جس کے پیدا ہونے اور پروان چڑھنے میں وقت لگے گا۔ ایک یہ کہ لیڈر شپ ایک تدریجی اور ارتقائی عمل ہے۔ لہٰذا یہ مشورہ تو نہیں دیا جاسکتا کہ اس وقت جو بھی دینی اور سیاسی لیڈر شپ موجود ہے اس کو گندے انڈے کی طرح باہر گلی میں پھینک دیا جائے۔ جب تک ہمارے پاس کوئی قابل اعتماد متبادل

سامنے نہیں آجاتا ہے ہمیں اسی لیڈر شپ سے کام چلانا ہوگا۔ یہ لیڈر شپ زیادہ گڑ بڑ نہ کرے اور اس کو مناسب سمت و رفتار میں قائم کیا جاسکے اس کے لیے ضروری ہے کہ ایک بیدار رائے عامہ اس پر نگراں رہے جمہوریت میں بیدار اور مؤثر رائے عامہ کی بڑی اہمیت ہوتی ہے ہمیں صحیح معلومات کے ذریعہ ایسی رائے عامہ پیدا کرنی چاہیے۔ اس معاملے میں دینی و سماجی تنظیمیں اور ذمہ دار پریس اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔

اکثر یہ دیکھا جاتا ہے جب مسلمانوں میں کوئی چھوٹی یا بڑی تنظیم بنتی ہے۔ مقامی سطح پر یا برادری کے نام پر کوئی جماعت کھڑی کی جاتی ہے تو لوگ اسے ملی انتشار کی علامت ماننے لگتے ہیں۔ جبکہ بات الٹی ہے، جہاں کوئی اجتماعیت نہیں ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر فرد کمزور ہے، ہر فرد الگ ہے، اور ہر فرد منتشر ہے۔ لیکن جہاں کوئی اجتماعیت ہوتی ہے اس کا مطلب ہے کہ کم از کم اتنے افراد دو تو ایک جگہ جمع ہیں۔ ایک مقصد کے لیے اکٹھے ہو کر چھوٹا یا بڑا کوئی کام کرنا چاہتے ہیں۔ اس لیے یہ صورتحال پہلی صورتحال سے بہتر اور قابل گوارہ ہے۔ یہاں تک کہ برادری اور مسلک کے نام پر بھی جو جماعت سازی کی گئی ہے۔ اس کے بھی کچھ مثبت پہلو ہیں۔ جس کو نظر انداز نہیں کیا جانا چاہیے۔ ہندوستان میں لگ بھگ پندرہ کروڑ مسلمان ہیں جو پندرہ لاکھ مربع میل میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اتنی بڑی آبادی جو اتنے بڑے علاقے میں پھیلی ہوئی ہے اس کے معاملات و مسائل کو دیکھنے اور اس کی رہنمائی کے لیے ایک پوری حکومت درکار ہے۔ کوئی جماعت خواہ وہ کتنی ہی بڑی ہو پوری ملت کی کفیل نہیں ہو سکتی ہے۔ ملت کے معاملات و مسائل کی دیکھ ریکھ کے لیے ہر سطح پر مختلف کاموں کے لیے بہت ساری جماعتوں اور کافی بڑی تعداد میں کارکنوں کی ضرورت ہے۔ جس طرح افراد میں طبائع، مفاد اور مزاج میں اختلاف ہوتا ہے اسی طرح جماعتوں میں بھی اختلاف فطری ہے۔ دیکھنا یہ نہیں ہے کہ کون کس کے خلاف ہے، دیکھنا یہ ہے کہ مجموعی اعتبار سے ان کی کوششیں ملت کی عمومی مفاد میں ہیں یا نہیں؟ اگر فائدے کا پہلو نقصان کے پہلو پر غالب ہے تو اسے پسندیدہ اجتماعیت قرار دیا جائے گا اور اگر نقصان کا پہلو فائدے پر غالب ہے تو اسے ناپسندیدہ اجتماعیت مانا جائے گا۔ ہندوستان جیسے

ملک میں مسلمانوں میں دینی،مسلکی یابرادری کی بنیاد پرکچھ تنظیمیں پائی جاتی ہیں یاپھرتعلیم اورصحت عامہ کے باب میں کچھ کوششیں ہورہی ہیں۔لیکن زیادہ تر مقامی نوعیت کی ہیں اوران میں انفرادی کوششوں کا خاصہ رول ہے ملت اپنی تمام تر کمزوریوں کے باوجود حساس ہے اور اپنے حالات کو بدلنا چاہتی ہے۔اس کو رہنمائی چاہیے۔مقامی سطح پر بھی اورملکی سطح پر بھی۔اس لیے ملت میں اگر پانچ ہزار جماعتیں ہوں اور پندرہ لاکھ چھوٹے بڑے قائدین ہوں تب بھی یہ تعداد کم مانی جائے گی۔ہمیں ہر جگہ اور ہرسطح پر ایسے لوگوں کی تلاش کرنی چاہیے جن میں کچھ بھی قائدانہ صلاحیت ہے اوران پر اعتماد کرتے ہوئے ان کو آگے بڑھانا چاہیے اوران کا تعاون کرنا چاہیے تاکہ وہ ملت کی تعمیر وترقی میں اپنا کردار ادا کرسکیں۔ خود کچھ نہ کرنااورکسی کومشکوک نگاہوں سے دیکھنا،ان کی نیتوں پرحملہ کرنااوران کے ساتھ عدم تعاون کرنا یہ نکموں،نِٹھلوں اور خودغرضوں کا شیوہ ہے کسی ذمہ دارفرد کانہیں۔آپ خود کچھ کرنانہیں چاہتے اور دوسروں کو کچھ کرنے دینے کے لیے آمادہ نہیں ہیں تو پھر گاڑی چلے گی کیسے اوراس صورتحال میں کیسے تبدیلی آئے گی؟ ملت اور اس کی قیادت اسی دلدل میں پھنسی ہے ۔اولاً تو کوئی ہمت کرکے اٹھنا نہیں چاہتا اوراگرکوئی اٹھتا ہے تو ملت ہرقدم پرٹانگ کھینچتی ہے،طعن کے کوڑے برساتی ہے۔ پھبتیوں کے پتھر پھینکتی ہے سردمہری اور بے مہری کا مظاہرہ کرتی ہے۔اب وہ شخص جو اٹھا ہے وقت کا رسول تو ہےنہیں کہ اسے آسمان سے تقویت کا سامان بہم ہورہاہے۔وہ آپ ہی کی طرح کا گوشت پوست کاانسان ہے جس کے اپنے بھی مفادات ہیں،درد ہیں،آرزوئیں اورتمنائیں ہیں۔اس کے بھی بیوی بچے ہیں۔ اس لیے اس کوکمزور انسان سمجھ کر ہی معاملہ کرنا چاہیے۔ اگرآپ غالبؔ کی زبان میں یہ کہنا شروع کردیں کہ ؎

جس کو ہو جان و دل عزیز
اس کی گلی میں جائے کیوں

تو آپ کی سمجھ پر ماتم کرنے کے سوا اور کیا کیا جاسکتا ہے؟

صالح قیادت کا مفہوم اور اس کے ارتقاء کا طریقہ:

اس صورتحال اور پس منظر میں ہمیں ایک صالح قیادت کی تلاش کرنی ہے۔ دراصل ہمیں صرف قیادت نہیں چاہیے بلکہ صالح قیادت چاہیے۔ قیادت میں صالحیت کی شرط اس لیے ضروری ہے کہ اس کے بغیر وہ قیادت بغیر لنگر کا جہاز ہوگی جو نہ پسندیدہ سمت میں جہاز کو لے چلنے کی اہل ہوگی اور نہ حوادث و آفات میں اس کو ڈوبنے سے محفوظ رکھ سکے گی، سوال یہ ہے کہ صالح قیادت کا مفہوم کیا ہے؟

صالح قیادت کا مطلب ایک ایسی قیادت ہے جس کی جڑیں اپنے دین وملت میں کافی گہری ہوں۔ وہ دینی اور ملی مفاد کو ذاتی اور گروہی مفاد سے اوپر رکھتی ہو۔ اس کے اندر زمانے اور حالات کی پرکھ ہو۔ وہ معاملات ومسائل کو صحیح تناظر میں دیکھنے اور سمجھنے کی صلاحیت رکھتی ہو، اس میں وسعت نظری اور وسعت قلبی ہو۔ وہ ملت کے ہر فرد اور ہر طبقے کو جوڑ کر ایک ساتھ لے چلنے کی اہل ہو۔ اس کی اپیل عوام وخواص دونوں میں یکساں ہو۔ لوگ اس کے سیرت و کردار اور فہم پر اعتماد رکھتے ہوں۔ وہ ہمت وحوصلہ، جرأت مندی اور بصیرت وبصارت سے متصف ہو۔ اس کے اندر فیصلہ لینے، اقدام کرنے اور جوکھم اٹھانے کی صلاحیت ہو۔ اس کا ذہن صاف اور نقطۂ نظر واضح ہو دوسرے لفظوں میں ریزن اور وژن کے ساتھ کام کرنے کی اہل ہو۔ اس کے نقطۂ نظر میں عالمگیریت ہو۔ وہ اپنے اور پرائے کے فرق سے بے نیاز امن وانصاف، خدمت ومحبت اور مساوات و بھائی چارہ کی علم بردار ہو۔ وہ صرف مسلمان عوام سے ہی تعلق نہیں رکھتی ہو اور صرف انہیں کی بھلائی کی کوشش نہیں کرتی ہو بلکہ وہ تمام انسانوں کی بھلائی کے لیے کوشاں اور خواہش مند ہو۔ ظلم چاہے کوئی کرے اور ظلم کسی کے ساتھ ہو، وہ ظالم کا ہاتھ پکڑنے اور مظلوم کی داد رسی کرنے میں پیش پیش ہو۔ جس طرح خدا سب کا خدا ہے۔ رسول سب کے رسول ہیں اسی طرح وہ تمام انسانوں کے ساتھ رحمت ورأفت، محبت وہمدردی، خدمت وغم گساری کا نمونہ ہو۔ اس کے اندر فکرو کردار کی اصابت کے ساتھ ساتھ چوٹ کھانے، زخم سہنے، قربانی دینے، جیل جانے اور اپنا ٹوٹا برداشت کرنے کی صلاحیت ہو۔ صبر

واستقامت اصرار ومداومت اس کے کردار کا جوہراصلی ہو۔ اس کے اندر ٹھوس اجتماعیت پید اکرنے ،مضبوط کیڈر ابھارنے ،اپنے معاونین میں ٹیم اسپرٹ پیدا کرنے اوراپنے کیڈر میں جوہر اعتماد نیز قربانی کا جذبہ بھرنے کی صلاحیت ہو۔ سب سے اہم اورسب سے ضروری بات یہ ہے کہ اس کے اندر بلند ذہنی اوراعلیٰ حوصلگی ہو اور سخت سے سخت حالات میں بھی جمے رہنے اورآگے بڑھنے کا داعیہ موجود ہو۔ اس کی سوچ مثبت اوررجائی ہونی چاہیے۔ ایسی ہی کوئی قیادت وقت کی اہم ضرورت ہے۔

افسوس یہ ہے کہ دور دور تک ایسی کوئی قیادت نظر نہیں آتی۔ یہ صحیح ہے کہ قیادت نہ تو کارخانوں میں ڈھالی جانے والی چیز ہے اورنہ یہ بازار میں ملتی ہے۔ میرے خیال میں قیادت کسبی نہیں بلکہ وہبی ہوتی ہے۔ اس لیے اگر آپ کسی شخص اور گروہ کے سر پر قیادت کا تاج پہنا بھی دیں تو کوئی ضروری نہیں کہ وہ صحیح قیادت فراہم کرسکے۔ اوراگر کوئی فطری قائد ہوگا تو خود وہ ایسے حالات پیدا کرلے گا کہ لوگ اس کی قیادت کو تسلیم کرلیں اس لیے کوئی قیادت تھوپنے سے بھی یہ مسئلہ حل نہیں ہوگا۔

میرے خیال میں قیادت ایک تدریجی سماجی اورسیاسی عمل کا حصہ ہے ۔کبھی ایسے حالات ومعاملات سامنے آجاتے ہیں، یا کوئی شخص سامنے آجاتا ہے، یا پھر ایک پروسس سے گزرکر کوئی شخص یا اجتماعیت قائدانہ صلاحیت سے متصف ہوجاتی ہے۔ مسلمانوں میں اس وقت جو قیادتیں ہیں الگ الگ رہ کر شاید وہ اس خلا کو پُر نہ کرسکیں لیکن اگروہ ایک پریذیڈیم (Presidium) بنالیں اورایک کومن مینیمم پروگرام Common Minimum Programe طے کرلیں اورایک حد تک ایک دوسرے کو برداشت کرنے کا جذبہ پیدا کرلیں تو قیادت کے موجودہ خلاء کو بڑی حد تک پُر کیا جاسکتا ہے۔ میرے خیال میں ہر گاؤں اور ہر شہر میں ایسے سنجیدہ نوجوانوں کو جو ملک وملت کے حالات سے واقف ہیں اوراس صورتحال کو بدلنا چاہتے ہیں، سر جوڑ کر بیٹھنا چاہیے اور ٹھوس تجاویز اورعملی اسکیموں کے ساتھ ملت کے بڑوں کو اعتماد میں لے کر اتحاد فکروعمل کے لیے کوشش کرنی چاہئے۔

وہی جواں ہے قبیلے کی آنکھ کا تارا
شباب جس کا ہے بے داغ ضرب ہے کاری
اگر ہو رزم تو شیرانِ غار سے بڑھ کر
اگر ہو بزم تو شیریں غزالِ تاتاری

شراب کہن پھر پلا ساقیا
وہی جام گردش میں لا ساقیا
مجھے عشق کے پر لگا کر اڑا
مری خاک جگنو بنا کر اڑا
خرد کو غلامی سے آزاد کر
جوانوں کو پیروں کا استاد کر
ہری شاخ ملت ترے نم سے ہے
نفس اس بدن میں ترے دم سے ہے
تڑپنے پھڑکنے کی توفیق دے
دل مرتضیٰؓ سوز صدیقؓ دے
جگر سے وہی تیر پھر پار کر
تمنا کو سینوں میں بیدار کر
ترے آسمانوں کی تاروں کی خیر
زمینوں کے شب زندہ داروں کی خیر
جوانوں کو سوز جگر بخش دے
مرا عشق میری نظر بخش دے
میری ناؤ گرداب سے پار کر
یہ ثابت ہے اس کو سیار کر
مرے دیدۂ تر کی بے خوابیاں
مرے دل کی پوشیدہ بے تابیاں
مرے نالۂ نیم شب کا نیاز
مری خلوت و انجمن کا گداز
امنگیں مری آرزوئیں مری
امیدیں مری جستجوئیں مری
مری فطرت آئینۂ روزگار
غزالان افکار کا مرغزار
مرا دل مری رزم گاہ حیات
گمانوں کے لشکر یقیں کا ثبات
یہی کچھ ہے ساقی متاع فقیر
اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر
مرے قافلے میں لٹادے اسے
لٹا دے! ٹھکانے لگا دے اسے
(ساقی نامہ، اقبالؔ)

مسلم قیادت اور رائے عامہ
کے سامنے چند غور طلب پہلو

مسلمان سماج اور ہندوستان کی دیگر سماجی اکائیاں

ہندوستان کا مسلم سماج ایک بیمار اور پس ماندہ سماج ہے۔ جہالت، غربت، بیماری اور بیکاری ہمارا مقدر ہے۔ مسلکی جھگڑے اور برادرانہ چشمک نے ہماری ہوا اکھاڑ دی ہے۔ ملت فروشی اور مفاد پرستی عام ہے۔ خداوندان مکتب ہوں یا ارباب سیاست سبھی نے پوری ملت کو مال غنیمت سمجھ لیا ہے۔ گویا ملت ایک مردار ہے جس کو ہوس کے گدھ نوچ نوچ کر کھا رہے ہیں۔ جب اپنوں کا یہ رویہ ہے تو غیروں سے کیا گلہ شکوہ؟

آزادی کے بعد ملک کی پسماندہ ترین آبادیوں نے بھی ترقی کی ہے۔ ان کے لیے تعلیم اور روزگار کے مواقع بڑھے ہیں۔ انہوں نے سیاسی قوت بھی حاصل کی ہے اور سماجی اعتبار سے بھی ان کا وزن بڑھا ہے۔ جب کہ مسلمانوں کے معاملہ میں صورت حال بالکل الٹی ہے۔ ان کی سیاسی ضرورت سبھی کو ہے مگر ان کے حقیقی مسائل سے کسی کو کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ بیشتر مواقع پر مسلمانوں کو بطور یرغمال استعمال کیا جاتا ہے۔ وہ جذباتی نعروں اور خوشنما وعدوں کی بھول بھلیوں میں گرفتار ہیں۔ ملت نے خدا پر اور خود پر بھروسہ کرنا چھوڑ دیا ہے۔ دوسروں کی بیساکھی کے سہارے چلنا اس کا مقدر ہے۔ لہٰذا ذلت و نکبت اس کی تقدیر بن چکی ہے۔ مسلمان ملک کی آبادیوں میں ایک بے وزن اور بے وقعت گروہ ہے جس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے

کہ کوئی کسی مسلمان کو صحیح نام اور صحیح انداز سے مخاطب بھی نہیں کرتا۔ یہ صورتحال اس وقت ہے جب کہ اکثریتی سماج ٹوٹا اور بکھرا ہوا ہے۔ ان میں تین واضح گروہ ہیں۔ ایک اعلیٰ ذات کا طبقہ ہے جو برہمن، بھومی ہار، کائستھ اور چھتریوں پر مشتمل ہے۔ دوسرا درمیانی طبقہ ہے جو بالعموم بیک وارڈ کہے جاتے ہیں جس میں گوالے، کوئری، کرمی اور چند دیگر ذاتیں نمایاں ہیں۔ اس طبقہ نے ساٹھ کی دہائی کے بعد زبردست قوت حاصل کی ہے اور اس وقت ملک کی بیشتر ریاستوں میں اس کا دبدبہ ہے۔ تیسرا طبقہ پسماندہ ذاتوں کا ہے جس میں ہری جن اور آدی باسی آتے ہیں۔ ان کو خاص مراعات اور تحفظات حاصل ہیں جس کی وجہ سے انہوں نے کافی ترقی کی ہے اور ملکی سیاست میں ایک مضبوط قوت بن کر ابھر رہے ہیں۔ ملک کی آبادی کے لحاظ سے اعلیٰ طبقہ صرف پانچ فیصد ہے لیکن سیاسی، تعلیمی اور سماجی لحاظ سے یہ ملک کا مضبوط ترین طبقہ ہے۔ اس طبقے میں لگ بھگ صد فی صد تعلیم ہے اور یہ اسّی سے نوے فیصد تک روزگار سے بہرور ہیں۔ کچھ دن قبل تک ملک کے اقتدار کی کنجی ریاست سے مرکز تک بالعموم اسی طبقہ کے ہاتھ میں تھی۔ اب صورت حال نے کروٹ بدلی ہے تو ان کے پاؤں تلے سے زمین کھسکتی نظر آ رہی ہے۔ لہٰذا اس وقت یہ ملک کا سب سے زیادہ بے چین عنصر ہے جو اپنے گرتے ہوئے اقتدار کی واپسی کے لیے ہر جانب ہاتھ پاؤں مار رہا ہے۔ کل تک کانگریس ان کا محفوظ قلعہ تھا۔ اب جبکہ اس قلعہ میں دراڑ آ چکی ہے اس طبقہ نے بی جے پی کے سایۂ عاطفت میں پناہ لے لی ہے اور ملک میں فرقہ پرستی کا زہر پھیلانے میں اپنی پوری ذہنی صلاحیت، فنی مہارت اور وسائل کا استعمال کر کے پوری ہندو قوم کو ایک نئے مذہبی جنون میں مبتلا کر کے اپنے اقتدار کو دوام بخشنے کے لیے پورا زور صرف کر رہا ہے تا کہ یہ ملک کا مراعات یافتہ طبقہ بنا رہے۔

دوسری طرف بیک وارڈ ہیں۔ جب انہیں اپنی عددی قوت کا اندازہ ہوا، ان کے اندر تعلیم آئی اور معاشی استحکام کے دروازے کھلے اور ان میں سیاسی بیداری آئی تو وہ ایک زبردست متحارب قوت بن کر ابھرے۔ ہندوستانی گاؤں میں اسی طبقہ کی اکثریت ہے اس لیے یہ لوگ سوشلزم کے جھنڈے تلے ایک نئی بیداری کے تحت جمع ہونے لگے اور دیکھتے دیکھتے ستر

(۷۰) کی دہائی میں انہوں نے کئی ریاستوں میں اپنی حکومت بنالی۔ چونکہ یہ لوگ مخصوص ذات کی حفاظت کے نام پر اقتدار میں آئے اس لیے انہوں نے کھلم کھلا اس کی وکالت بھی شروع کردی۔ ریزرویشن تحریک نے اس طبقہ کو ہتھیار فراہم کردیا جس کے نتیجے میں دیکھتے ہی دیکھتے یہ ملک کی غالب اور فیصلہ کن قوت بننے کے اہل ہوگئے اور ملک کے اجتماعی معاملات بہت حد تک ان کی مرضی کے مطابق طے ہونے لگے۔

تیسرا طبقہ دلتوں اور آدیباسیوں کا ہے۔ یہ ملک کی آبادی کا ۳۵ فیصد ہیں لیکن ہندوستان کے دیومالائی نظام کے تحت یہ طبقہ شودر اور اچھوت مانا جاتا ہے اور پچھلے پانچ ہزار سالوں مین ان کے ساتھ جانوروں سے بھی زیادہ بدتر سلوک کیا گیا ہے۔ بودھ دھرم نے انہیں کچھ اوپر اٹھانے کی کوشش کی لیکن چونکہ وہ ہندوستانی تہذیب وروایات سے اپنا پیچھا نہیں چھڑا سکا اس لیے بہت جلد اس کا زور ٹوٹ گیا اور وہ انہیں اس ظالمانہ نظام سے باہر نہیں نکال سکا۔ اسلام کی آمد نے حالات کا رخ بہت حد تک بدل دیا اور طبقاتی تفاوت میں پھنسے ہندوستانی سماج کو وحدت، مساوات اور اخوت انسانی کا سبق پڑھایا جس کا ہندوستانی سماج اور روایت پر غیر معمولی اثر ہوا۔ چونکہ ہندوستان میں اسلام ملوکیت کے دروازے سے داخل ہوا تھا جس میں ایرانی، تورانی، مغل اور منگول روایات اس طرح گڈمڈ ہوگئے تھے کہ اسلام نے اپنا فطری اثر کھودیا۔ تاہم مسلمان علما، صوفیا اور دیگر افراد نے ہندوستان میں اپنے قول وعمل سے جو مثالیں پیش کیں وہ پست اقوام کے لیے حیات نو کا پیغام تھیں۔ اس لیے بہت سے لوگ جو ظالمانہ روایت کے جبر سے کسی طرح نکلنے میں کامیاب ہوگئے، انہوں نے اسلام کے سایۂ عاطفت میں پناہ لے لی۔ لیکن ان کی تربیت کا کوئی معقول انتظام نہیں ہوسکا اور نہ اس طبقہ سے آئے ہوئے لوگوں کو اس انداز کی تربیت دی جاسکی کہ وہ اپنے ابنائے نوع میں اسلام کی دعوت پیش کرنے کی منظّم کوشش کریں۔ بلکہ الٹا یہ ہوا کہ عصبیت زدہ مسلمانوں نے جاہلی اثرات کے تحت نئی عصبیت کو پھر سے ہوا دینا شروع کیا اور اس طبقہ کے ساتھ کوئی بہتر سلوک نہیں کیا اس لیے خود مسلم سماج بھی اشرف اور ارذل گروہ میں تقسیم ہوگیا جن کے درمیان اسلام کے جذباتی رشتہ

کے علاوہ کوئی سماجی رابطہ نہیں تھا۔ لہٰذا مسلمانوں کو ہریجنوں کی حالت سدھارنے کا جو سنہرا تاریخی موقع ہاتھ آیا تھا انہوں نے اس کو اپنی ناعاقبت اندیشی سے گنوادیا جس کے نتیجے میں آج وہ اس کا خمیازہ بھگت رہے ہیں۔

انگریزوں کی آمد نے ہندوستان کی سماجی حالت میں ایک انقلاب پیدا کردیا۔ انگریزوں نے عیسائی مشنریوں کی مدد سے ہریجنوں اور آدی باسیوں کی آبادیوں میں دور دراز جنگلوں اور مشکل مقامات پر جدید تعلیم کے ادارے کھولے، سڑکیں بنوائیں، اسپتال قائم کئے اور دیگر ذرائع سے خدمت کرکے ایک تو ان کو مہذب دنیا سے جوڑنے کی کوشش کی دوسرے ان کی ایک بڑی تعداد کو عیسائی بنانے کی کوشش کی جس میں ان کو کافی کامیابی ملی اور ان کا ایک طبقہ عیسائیت کا حلقہ بگوش ہوگیا، تاہم اتنے بڑے ملک میں اتنی پھیلی ہوئی آبادی کے ہر حصے میں دعوت پہنچانا عملاً ناممکن تھا اس لیے ان کی اکثریت اپنے سابقہ مذہب اور روایات پر قائم رہی۔ چنانچہ اپنی مخصوص سیاسی پالیسی کے تحت انگریزوں نے اس طبقہ کو اعلیٰ ذات کے ہندؤں کے خلاف ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کیا۔ انگریزی دور اقتدار میں ملک کے مختلف حصوں میں ان طبقات کی اصلاح حال کے لیے زبردست مہم شروع ہوئی جس کی انگریزوں نے بھرپور حمایت کی جس کے نتیجے میں ہریجنوں اور آدی باسیوں میں ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ پیدا ہوگیا جو اپنے مفادات کی جنگ لڑنے کے لیے تیار تھا۔ ابھی تک جتنی کوششیں ہو رہی تھیں وہ سب سماجی اور مقامی نوعیت کی تھیں، اس نے سیاسی رخ اختیار نہیں کیا تھا۔ ۱۹۲۰ء کے بعد جب ہندوستان میں آزادی کی تحریک زور پکڑنے لگی اس وقت ڈاکٹر امبیڈکر کی شکل میں دلتوں کو ایک ذہین و زیرک رہنما کی قیادت نصیب ہوگئی۔ ڈاکٹر امبیڈکر نے اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کی طرف سے دلتوں پر ہونے والے مظالم کے خلاف زبردست احتجاج کیا۔ یہاں تک کہ انہیں ہندو سماج سے الگ کردینے کی دھمکی دی۔ جب پانی سر سے اونچا ہونے لگا تو اس وقت کی کانگریسی قیادت نے محسوس کیا کہ یہ چیز عام ہندوؤں کے مفاد میں نہیں ہے اس لیے گاندھی جی نے مرن برت شروع کیا جو بالآخر گاندھی اور امبیڈکر کے درمیان پونا پیکٹ پر منتج ہوا۔ جس کے نتیجے میں

ہریجنوں کا ہندو قوم سے انخلاء رک گیا اور اس کے بدلے ان کو سیاسی، سماجی، معاشی، مذہبی، تعلیمی اور ثقافتی تحفظات اس شرط کے ساتھ دئے گئے کہ وہ ان مراعات سے اس وقت تک فائدہ اٹھاتے رہیں گے جب تک وہ ہندو قوم کا حصہ رہیں گے۔ اس طرح آزادی کے بعد پانچ ہزار سال کا پاپ پچاس سال میں دھونے کی کوشش کی گئی۔ اگر چہ ابھی بھی اس طبقہ میں سب سے زیادہ جہالت اور غربت ہے اور سماجی اعتبار سے ابھی بھی یہ طبقہ نیچ اور ذلیل شمار کیا جاتا ہے اور سیاسی طور پر دی گئی مراعات کو سماج نے کھلے دل سے قبول نہیں کیا ہے اس لیے ہریجنوں پر ظلم آج بھی جاری ہے۔ ان کی عورتوں کی عزت آج بھی لوٹی جارہی ہے اور ان کے گھروں میں آگ لگانے اور ان کو زدوکوب کرنے کے واقعات عام ہیں تاہم اب ان میں مقابلے کی صلاحیت پیدا ہو رہی ہے اور ان کو سیاسی اور قانونی تحفظات حاصل ہیں۔ اس اعتبار سے ان کی رفتار ترقی ہندوستان کے دیگر پسماندہ طبقات بالخصوص مسلمانوں سے کہیں زیادہ ہے۔ کیونکہ ان کو اٹھانے اور مسلمانوں کو گرانے کی پالیسی پر عمل کیا جاتا ہے۔ اب اس طبقہ میں سیاسی شعور اتنا بالیدہ ہو چکا ہے اور وہ اتنے بیدار ہو چکے ہیں کہ انہوں نے اپنے متعدد سیاسی پلیٹ فارم بنا لیے ہیں۔ ایک تو ہر پارٹی میں ان کی مؤثر لیڈر شپ ہے جو بغیر کسی ہچک اور خوف کے اپنے گروہی مفاد کی نگرانی کرتی ہے اور دستوری ضمانتوں اور تحفظات کو حاصل اور مستحکم کرنے کے لیے کوشاں ہے۔ دوسرے ان کی اپنی سیاسی جماعت ہے جس کو اس طبقے کی بھرپور حمایت حاصل ہے۔ آج ہندوستان کی ہر اسمبلی، پارلیامنٹ اور ذرائع ابلاغ کے ہر شعبہ میں ان کے مفاد کو ہر طرح کا تحفظ فراہم کرنے کی گونج ہے۔ سابق صدر جمہوریہ شری کے آر نارائن اسی طبقہ سے آتے تھے۔ ۱۵؍اگست ۱۹۹۸ء کو پارلیامنٹ کے سنٹرل ہال میں آزادی کی گولڈن جبلی تقریبات کے اختتام پر انہوں نے جس بے باکی، صفائی اور بے خوفی کے ساتھ اس طبقہ کے مفادات کے تحفظ کی بات کی اور حکومت کو اس کی کمزوری یاد دلا کر جس طرح درج فہرست ذاتوں کے لیے اعلیٰ اختیاراتی عہدوں میں محفوظ جگہوں پر تقرری کی ہدایت کی وہ جہاں ان کی خود اعتمادی کی جھلک پیش کرتی ہے وہیں اپنے گروہی مفاد کی حفاظت کے لیے صدر جمہوریہ کی بے چینی کی بھی آئینہ

دار ہے۔ان سے پہلے دومسلمان ہندوستان کے صدر رہ چکے ہیں لیکن انہوں نے کبھی بھی اس طرح اس بے باکی اور ہمت کے ساتھ مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت یا ان کوان کا جائز حق دلانے کے لیے برسر عام سرکاری یا عوامی پلیٹ فارم سے اس انداز میں نہ تو کبھی وکالت کی اور نہ حکومت کوکوئی ہدایت دی۔اس سے مسلم لیڈر شپ اور دیگر اقوام کی لیڈر شپ کا فرق آسانی سے سمجھا جاسکتا ہے۔

مسلمانوں کی آبادی کی معاشی،سماجی،اور تعلیمی حالت کے سلسلے میں ایک طرفہ تماشہ یہ ہے کہ ان کے سلسلے میں مستند ڈاٹا موجود نہیں ہے اور جو ڈاٹا موجود ہے اس کی اشاعت کا بار بار مطالبہ کرنے کے باوجود اس کی اشاعت نہیں کی جاتی ہے تاکہ صحیح طور پر معلوم ہوسکے کہ واقعتہً ان کی صورت حال کیا ہے؟ جب کہ شیڈول ٹرائبس کے سلسلے میں اس کا باضابطہ اہتمام کیا جاتا ہے،چنانچہ اس معاملہ میں لوگ افراط وتفریط کے شکار ہیں۔کبھی ان کی آبادی بڑھا چڑھا کر بتائی جاتی ہے اور کبھی گھٹا کر دکھائی جاتی ہے۔ جب یہ پروپیگنڈہ کرنا ہوتا ہے کہ مسلمان چار چار شادیاں کرتے ہیں اور ایک کے ۳۵۔۳۵ بچے ہیں اوران کی شرح پیدائش ملک کے دیگر طبقات سے دوگنی اور چارگنی زیادہ ہے تو اشوک سنگھل جیسے لوگ ان کی آبادی ۲۵ رکروڑ بتاتے ہیں جب کہ سرکاری اعداو شمار کے مطابق یہ ملک کی آبادی کا آٹھواں حصہ ہیں یعنی مسلمانوں کی آبادی ۱۵ رکروڑ سے تھوڑی زیادہ ہے۔مسلمانوں کے یہاں اس وقت ایسے کئی ادارے اور تنظیمیں ہیں جو سروے کراتی ہیں۔جیسے ہمدرد فاؤنڈیشن،آئی او ایس وغیرہ۔سرکاری طور پر اقلیتی کمیشن کو بھی بعض علاقوں کا رینڈم سیمپل سروے کرکے اس کا جائزہ لینا چاہیے کہ واقعتہً مسلمانوں کی مردم شماری میں ڈنڈی ماری کی جاتی ہے یا نہیں اور اگر ان کی گنتی کم کی جاتی ہے تو اس کا تناسب کیا ہے؟ یہ سروے چند ریاستوں کے چند دیہی اور شہری مقامات پر کرکے دیکھا جانا چاہیے۔تبھی اگر کوئی بات کی جائے گی تو وہ وزن دار ہوگی۔ معاشی تعلیمی اور دیگر معاملات کے لیے حکومت پر بار بار زور دیا جا رہا ہے لیکن حکومت ہمیشہ پہلوتہی برتتی ہے۔ اگر حکومت شہریوں کی جانکاری کے حق کو بنیادی حق تسلیم کرنے سے انکار کرتی ہے تو سیاسی دباؤ

کے علاوہ عدالت عظمیٰ سے بھی رجوع کیا جانا چاہیے تاکہ وہ حکومت کو پابند کرے کہ وہ مسلمانوں کے سلسلے میں صحیح معلومات ہر مقررہ وقفہ پر بہم پہنچائے۔ضرورت ہوتو اس کے لیے عوامی مہم بھی چھیڑی جاسکتی ہے۔

۲۰۰۵ء میں حکومت نے جسٹس راجندر سچر کی قیادت میں مسلمانوں کی سماجی، معاشی اور تعلیمی صورت حال جاننے کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی جس نے نومبر ۲۰۰۶ء میں اپنی تفصیلی رپورٹ حکومت کے سامنے پیش کردی۔جس سے پہلی بار سرکاری اعداد وشمار اور مستند ڈاٹا کے حوالے سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ ہندوستان میں اس وقت بحیثیت مجموعی مسلمان تمام طبقات اور برادریوں کے مقابلے سب سے زیادہ پسماندہ ہیں بلکہ دلتوں سے بھی زیادہ پس ماندہ ہیں۔

بہر حال سرکار کی طرف سے جاری آدھی ادھوری معلومات کی بنا پر ہی مسلمان اس ملک کی آبادی کا آٹھواں حصہ ہیں اور سب سے بڑی اقلیت ہیں۔دوسرے لفظوں میں ہندوؤں کے بعد دوسری بڑی اکثریت ہیں جو پس ماندگی کی عمیق کھائی میں گری ذلت کی زندگی گزار رہے ہیں۔آزاد اور نیم سرکاری اداروں کی طرف سے تعلیم، معاش، روزگار، صنعت، سرکاری نوکریوں اور زندگی کے دیگر شعبوں میں ان کے سلسلے میں جو اعداد وشمار اکٹھا کئے گئے ہیں وہ بتاتے ہیں کہ مسلمانوں کا تناسب سرکاری اور نیم سرکاری اور غیر سرکاری اداروں میں بہت معمولی ہے۔ جو دو باتوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔اولاً ان کو آگے بڑھنے کا موقع نہیں دیا جاتا ہے۔ دوئم ان کے ساتھ متعصّبانہ اور معاندانہ سلوک کیا جاتا ہے جس کی وجہ سے ان کی نمائندگی تمام اجتماعی اداروں اور مقامات میں بے حد معمولی ہے۔صرف غربت اور جہالت میں ان کا تناسب سب سے زیادہ ہے۔اقلیتوں میں سکھ، عیسائی، جین، بودھ، پارسی، یہودی سب کے سب اپنی آبادی کے لحاظ سے زندگی کے جملہ شعبہ جات میں اکثریتی طبقہ سے بھی کہیں اوپر ہیں۔جو صاف ظاہر کرتے ہیں کہ ان طبقات کو آگے بڑھنے کے لیے مواقع عطا کئے گئے ہیں ان کے ساتھ کہیں کوئی تعصب نہیں برتا جاتا ہے۔ جب کہ مسلمانوں کو بعض تاریخی اور سیاسی وجوہات سے ہمیشہ نیچا رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔مسلمانوں کی موجودہ پس ماندگی قدرتی اور

فطری نہیں ہے۔ بلکہ یہ انسانی اورموجودہ جمہوری نظام کی منفی برکتوں کی وجہ سے ہے۔ مسلمانوں کی موجودہ حالت زار کی تمام تر ذمہ داری حکومت اوراکثریت پرڈالنا قرین انصاف نہیں ہے۔ اس کے لیے بڑی حد تک خود مسلمان عوام، ان کے علماا ورزعمانیز ان کی تنظیمیں، ادارے اورتحریکیں بھی ذمہ دار ہیں۔ مسلمانوں نے پچھلے ساٹھ سالوں میں زیادہ ترمنفی انداز کے ردعمل کی پالیسی اختیار کی ہے۔ ان کے اندرتعمیری رجحانات اورمثبت اندازفکر کا فقدان ہے۔ یہ صحیح ہے کہ انہیں آزادی کے بعد بے دلی سے کام کرنے والے بہی خواہوں اور جارح بدخواہوں سے واسطہ رہا جنہوں نے نت نئی سازشوں کے ذریعہ ان کو اپنے وجود وشناخت کے مسائل میں گرفتار رکھا۔ جس کی وجہ سے وہ اپنی تعمیر وترقی کی جانب پورے طور پرتوجہ نہیں دے سکے، آزادی کے بعد فسادات کا لامتناہی سلسلہ ،خوف کا ماحول ،زبان ،شریعت، اوقاف، مساجد، قبرستان اورتعلیمی اداروں پر پے درپے حملے،کبھی قرآن پاک کی تنسیخ کے لیے مقدمہ، کبھی اہانت رسولؐ کی مذموم کوشش۔ ان سب نے مسلمانوں کو نہ تو ملک کی ترقی کے قومی دھارے میں شریک ہونے دیا اورنہ خود کوئی منظّم ومثبت تعمیر وترقی کی تحریک چلانے کی فرصت عطا کی۔ اس پرمستزاد یہ کہ مسلمانوں کوطالع آزما سیاسی اوردینی لیڈرشپ نے اوربھی ادھ مرا کردیا۔ اس لیڈرشپ نے طرح طرح کے اختلافات پیدا کرکے مسلمانوں میں انتشار وافتراق کوہوادی ۔لہٰذا مسلمان خارجی حالات کا مقابلہ کرنے کے بجائے گھریلو سازشوں کے شکار ہوگئے ۔جس نے ان کی رہی سہی کسر نکال دی۔ اس لیے ہماری موجودہ تباہی کی بڑی حد تک ذمہ داری خود ہمارے سرآتی ہے۔

مسلمان ہندوستان کی آزادی کے بعد

ہندوستان اپنی آزادی کے اکہتر سال سے زائد پورے کر چکا ہے ۔اکیسویں صدی شروع ہوچکی ہے۔ آزادی کا ہراول دستہ دنیا سے کوچ کر چکا ہے۔ دوسری نسل کی لیڈرشپ اس وقت میدان میں ہے ۔جس شخص کی پیدائش ۱۵؍اگست ۱۹۴۷ء کو ہوئی تھی اس کی عمر اس وقت

۷۱؍سال ہے ۔۷۱؍سال کسی فرد کی حیات میں بڑی مدت ہوتی ہےلیکن قوموں کی تاریخ میں ا
س کو درمیانی مدت مانا جاسکتا ہے ۔کہا جاتا ہے کہ ہر سو سال میں تاریخ اپناایک سرکل پورا کر لیتی
ہے ۔لہٰذا اب تاریخ ترقی معکوس کی طرف گامزن ہے ۔ایسے وقت ہندوستان کے درو بست
پر جس قوت کی حکومت ہے وہ جارح ہندوقوم پرستی میں یقین رکھتی ہے اور اس ملک کو اپنے
خوابوں کا ملک بنانے کے لیے پوری صلاحیت اورمہارت خرچ کرتی رہی ہے ۔اگر چہ اس کے
مقابل ایک دوسری مضبوط قوت ہےلیکن اس قوت میں ایسے عناصر اور افراد شامل ہیں جن پر
اعتبار کرنا مشکل ہے ۔کون کس وقت اپنا رخ تبدیل کر کے کس خیمہ میں چلا جائے گا یہ کہنا کٹھن
ہے۔مسلمانوں نے ملک کے سیکولر عناصر پر ابھی تک پورا اعتبار کیا ہے اوراپنا بھر پور تعاون
دیا ہے۔لیکن یہ عناصر کردار کے کچے اور طالع آزمالوگوں پر مشتمل ہیں اس لیے ان پر اعتماد
کر کے اور مطمئن ہو کر بیٹھا نہیں جا سکتا۔لہٰذا ایک نئی سوچ اور نئی حکمت عملی کی ضرورت ہے ۔

۱۵؍اگست ۱۹۴۷ء کے بعد ملک میں مسلمانوں کی کوئی مؤثر قیادت نہیں رہی جس
کے جھنڈے تلے تمام مسلمان جمع ہوتے ۔مولانا آزاد کی ایک قد آور شخصیت تھی جس کو لوگوں
نے بری طرح مجروح کر دیا تھا۔ اس لیے مولانا نے حالات کے تقاضے کے تحت براہ راست
ملت کی قیادت اپنے ہاتھ میں لینے کے بجائے کانگریسی قیادت پر اثر انداز ہو کر جتنا کچھ تحفظ وہ
مسلمانوں کو فراہم کرا سکتے تھے اس کو کرانے کے لیے سرکار میں شامل ہوگئے اور بڑی حد تک
مسلمانوں کا حوصلہ ٹوٹنے سے روکا ۔لیکن ان کے انتقال کے بعد جو لیڈر شپ تھی وہ اتنی قد آور،
معیاری اور محترم نہیں تھی۔اس لیے گاڑی پھر پٹری سے اتر گئی اور آج تک اتری ہوئی ہے ۔

مسلمانوں نے سیاسی معاملوں میں کانگریس کو اپنا پشت پناہ مان لیا اور اسی کے ہو کر
رہ گئے جب کہ یوپی اور بہار میں جہاں کانگریسی قیادت تھی اس نے مسلمانوں کے خلاف
معاندانہ رویہ رکھا اور ان کو نت نئے مسائل میں الجھائے رکھا۔ اس لیے مسلمانوں کو کبھی فساد
سے بچاؤ اور ریلیف کے لیے،کبھی اردو زبان کی حفاظت کے لئے ،کبھی پرسنل لاء کی حفاظت
کے لیے،کبھی دینی تعلیم کے بچاؤ کے لیے،کبھی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور اوقاف کے بچاؤ کے

لیے جدو جہد کرنی پڑی۔جس نے اس عالم بے پناہی میں ان کے وقت ،وسائل اور صلاحیتوں کا بڑا حصہ ہضم کرلیا۔

اس لیے وہ تعلیم ،معاش اور دیگر امور کی طرف پوری طرح توجہ نہیں دے سکے۔تاہم آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کی جانب سے اردو زبان کی حفاظت ،دینی تعلیمی کونسل،مجلس مشاورت،مسلم پرسنل لاء،مسلم یونیورسیٹی کے اقلیتی کردار کی بحالی کی جوتحریکیں شروع کی گئیں اس سے ملت میں زندگی کی علامت کا پتہ چلتا ہے۔اور لاکھ آزمائشوں کے باوجود ملت نے اپنی ہمت وحوصلے کوٹوٹنے سے بچائے رکھا ہے۔یہ اس کی اندرونی قوت مزاحمت کی غماز ہے لہٰذا مستقبل میں پرامید اقدام کے امکانات موجود ہیں ع

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

۶ ر دسمبر ۱۹۹۲ء کو بابری مسجد کے انہدام کے بعد مسلمانوں میں نئی نئی قیادتیں ابھر کر سامنے آنے لگیں جس نے مروجہ قائدین ،جماعتوں اوراداروں پرعدم اعتماد کااظہار کرتے ہوئے ایک نئی تعلیمی ،معاشی ،سماجی اور ثقافتی قیادت فراہم کرنے کانعرہ دیا۔مسلمانوں نے بڑھ چڑھ کر ان کی پذیرائی کی لیکن یہ قیادت جدو جہد وقربانی سے ناآشنا تھی۔اس کا انداز افسرانہ تھا۔لہٰذا تھوڑا وقتی ارتعاش پیدا کرنے کے بعد خاموش ہوگئی۔قیادت بھاڑے کے ٹٹوؤں اور کرائے کے آدمیوں سے نہیں ہوسکتی ہے۔اس کے لیے علم اور ذہانت کے ساتھ ساتھ اخلاص اور قربانی کا جذبہ ہونا بھی ضروری ہے۔تحریکوں کا سرمایہ منفعت نہیں، نقصان ہوا کرتا ہے۔ جب تک نقصان اٹھانے اور زخم کھانے کا جذبہ پیدا نہیں ہوگا کوئی قیادت پیدا نہیں ہوسکتی ہے۔ اسی لیے یہ قیادتیں آج ہوا ہوگئی ہیں اور ملت پھر اپنی ڈگر پر چل پڑی ہے۔لیکن حالات میں تبدیلی ضروری ہے اس لیے ایک نئی اور مضبوط قیادت کا پیدا کرنا وقت کی اہم ضرورت ہے۔

قیادت کے اجزائے ترکیبی

قیادت کیسے پیدا ہوتی ہے؟ ایک تو قیادت اپنی ذہانت ،اخلاص اور قربانی سے پہچانی

جاتی ہے،دوسرے لوگوں کے تعاون اور اشتراک سے مضبوط اور مؤثر بنتی ہے۔لہٰذا اس کے لیے قائد کی شخصیت اور عوام دونوں کا میل ضروری ہے۔موجودہ صورتحال میں کوئی ایک فرد اور جماعت اس پوزیشن میں نہیں ہے جو ملت کو مؤثر قیادت فراہم کر سکے۔اس لیے مشترکہ حکمت عملی اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔مسلم مجلس مشاورت اس خلاء کو پُر کر سکتی ہے۔ضرورت ایک نئے اقدام کی ہے۔حال کے دنوں میں کچھ لوگوں نے ملی کونسل کے نام سے ایک مشترکہ پلیٹ فارم بنایا ہے لیکن اس میں گروہی عصبیت کا دور دورہ ہے۔یہ ملی قیادت کی اہل نہیں ہے۔ایک بات اچھی طرح یاد رکھنی چاہیے کہ ملک میں جو بھی تحریک اٹھے اس کی فنڈنگ خود اندرونی وسائل اور عوامی تعاون سے ہونی چاہیے۔بیرونی سرمایہ کے سہارے کوئی کام خطرے سے خالی نہیں ہے۔خود ہندوستان میں اتنا سرمایہ ہے اور ایسے لوگ موجود ہیں جو بڑی تحریک کو چلا سکتے ہیں لیکن ہماری اصل قوت تو ہمارے عوام ہیں جب تک ہم عوام تک نہیں پہنچیں گے اس وقت تک ہماری قیادت نہ عوامی ہوگی اور نہ مؤثر اس صورت میں اخبار والوں کو کھلا پلا کر کچھ خبریں شائع کرائی جاسکتی ہیں لیکن عوام تک نہیں پہنچا جاسکتا ہے۔ہمیں ایک عوامی نعرے کے تحت ایک نوٹ ایک ووٹ حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے اور گاؤں اور شہر کے تمام مقامات میں ایک جوڑ پیدا کرنا چاہیے تاکہ ہر مسجد، ہر محلّہ ایک اکائی کے طور پر کام کرے۔قیادت ریڈنگ روم میں بیٹھ کر مقالے لکھنے سے پیدا نہیں ہوتی ہے بلکہ عوام میں چلنے پھرنے اور عوامی مسائل سے جڑنے سے پیدا ہوتی ہے۔ہمیں اپنا انداز فکر و عمل تبدیل کرنا ہوگا اور ایک نئی حکمت عملی اور نئے پروگرام کے ساتھ لوگوں کے سامنے آنا ہوگا۔

ہم ایک مشترک سماج میں رہتے ہیں۔لہٰذا ہمارے عملی پروگراموں میں سماج کے ہر طبقہ کے لیے اپیل ہونی چاہیے۔ہم اپنے مسائل بغیر اکثریتی طبقہ کے گڈول اور حمایت کے حل نہیں کر سکتے ہیں۔اس لیے ہمارے کام اور پروگرام میں ان کے لیے بھی گنجائش ہونی چاہیے تاکہ ان کا اعتماد اور تعاون حاصل ہو اور ہماری ایک مضبوط عوامی پہچان بن سکے۔ہمارے اسکول، کالج، ہسپتال، رفاہ عام کے ادارے اپنے معیار کے لحاظ سے پرکشش ہوں نیز اس کے

دروازے سبھوں کے لیے کھلے ہونے چاہیے۔ تحفظ کی جنگ فیاضی اور خدمت سے ہی جیتی جاسکتی ہے۔ بھارت میں مسلمان لیڈرشپ نے اس پہلو پر کما حقہ توجہ نہیں دی ہے۔

فرقہ وارانہ خیر سگالی وقت کی ایک اہم ضرورت ہے۔ ہمیں اس معاملے میں پہل کرنا چاہیے۔ ہمیں اپنے سماج کو یہ باور کرانا چاہیے کہ ہم امن و امان سے رہنا چاہتے ہیں اس کے لیے ہم ہر کسی کا تعاون کرنے کے لیے تیار ہیں۔ لہٰذا اس معاملے میں مدعو بن کر رہنے کے بجائے داعی بن کر ابھرنا چاہیے اور عام لوگوں کو خیر سگالی مہم میں جوڑنے کا اہتمام کرنا چاہیے۔

اس وقت اسلام او رمسلمان غلط فہمی اور شبہ کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ ہماری کمزوریاں اور بعض اوقات ناعاقبت اندیش جذباتیت مزید غلط فہمی پیدا کرتی ہے۔ ہمیں محتاط مگر باہمت اور بولڈ رویہ اختیار کرنا چاہیے۔ اپنی کمزوریوں پر گرفت کرنے کا حوصلہ پیدا کرنا چاہیے تبھی ہم اخلاقی طور پر دوسروں کی غلطی پر انگلی اٹھا سکتے ہیں۔

ہمیں اس ملک سے کوئی نکال نہیں سکتا۔ بدامنی اور خوف کی حالت میں مبتلا رہنا کسی سماج کے حق میں نہیں ہے۔ اس لیے حکومت پر یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ اگر اس نے صالح اور تعمیر پسند قیادت کی بات نہیں سنی تو تخریب پسندی اور انتشار سے بچنا محال ہوگا۔ ایسے ہی ملک میں جرائم بہت تیزی سے بڑھ رہے ہیں اس میں اگر سماجی انتشار اور تخریب پسندی کو بڑھاوا ملے گا تو ملک تہس نہس ہو جائے گا۔ اس لیے نوجوانوں کے امنگوں کو دھیان میں رکھ کر ان کے مسائل کو حل کرنے کی سنجیدہ کوشش کرنا حب الوطنی ہے ورنہ ابنائے وطن سے غداری وطن سے غداری شمار کی جائے گی جس کو تاریخ وتہذیب کبھی معاف نہیں کرے گی۔ دراصل حکومت کو مسائل کو ہندو اور مسلمانوں کے عینک سے نہیں دیکھنا چاہیے بلکہ اسے ملک کے مسائل کے طور پر دیکھنا چاہیے۔ مسلمان بھی اسی طرح اس ملک کے شہری ہیں جیسے ہندو، سکھ، عیسائی اور دیگر مذاہب کے لوگ ہیں لہٰذا ان کے ساتھ تعصب و تنگ نظری کی پالیسی یا معاندانہ اور جارحانہ رویہ وطن اور انسانیت دونوں کے ساتھ غداری ہے اور ایسے تنگ نظر لوگ حکومت کی اونچی کرسیوں پر ہیں تو انہیں وہاں سے فوراً ہٹایا جانا چاہیے۔

فی الوقت ملک میں سیکولرزم ایک مذاق بن کر رہ گئی ہے۔ تمام متعصب اور جارح طبقہ بھی خود کو سیکولر کہتا ہے اور جو لوگ سیکولر ہیں ان کو نقلی سیکولر کہہ کر پکارتا ہے۔ اس میں جزوی سچائی ہے۔ حال کے برسوں میں سیکولر عناصر نے جیسی جیسی قلابازیاں دکھائی ہیں ان سے اس امر کی تصدیق ہوتی ہے۔ تاہم ہمیں ان بہروپیوں اور مخلص لوگوں کو الگ کر کے دیکھنا ہوگا اور جن پر کسی درجہ میں اعتماد ہو کہ یہ سیکولر ہیں ان کا بھرپور تعاون کرنا چاہیے۔ اس وقت یہی صحیح حکمت عملی ہے۔

مسلمانوں کی اپنی الگ کوئی سیاسی جماعت ہو یا نہ ہو یہ بڑا ہی نازک مگر اہم سوال ہے۔ میں واضح طور پر کسی ایک نتیجہ پر نہیں پہنچا ہوں۔ مگر میری رائے ہے کہ اس پر مختلف فورموں میں کھلی بحث ہونی چاہیے۔ جلد بازی میں کوئی قدم اٹھانے سے گریز کرنا چاہیے۔ اس وقت مسلمانوں کی نمائندگی ریاستی اسمبلیوں اور پارلیمنٹ میں گھٹتی جارہی ہے۔ ملک کی ۱۴ ریاستوں کی اسمبلیوں میں ایک بھی مسلمان ممبر نہیں ہے اور جہاں ہے وہاں تعداد گھٹ رہی ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ مسلم اکثریتی سیٹ سے غیر مسلم بلکہ جارح فرقہ پرست پارٹی کا امیدوار جیت جاتا ہے اور مسلمان ہار جاتے ہیں۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ایسے مقامات پر کثیر تعداد میں مسلمان امیدوار کھڑے ہو جاتے ہیں جس کی وجہ سے ان کے ووٹ بری طرح بٹ جاتے ہیں اور اس کے مقابلے کم ووٹ لانے کے باوجود دوسرے امیدوار جیت جاتے ہیں۔ ایسی تمام کنسٹی ٹیوئنسی میں مقامی آبادی کو برادری، مسلک اور وقتی مفادات کو نظر انداز کر کے بہتر امیدوار کی حمایت کر کے اسے جتانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ہندوستان میں ایسی ۶۰ پارلیمانی سیٹ ہیں جہاں مسلمان اگر شعور سے کام لیں تو ان کی نمائندگی بڑھ سکتی ہے۔ اس معاملے میں ہماری دینی اور سماجی لیڈر شپ کو عوام کو سمجھانے کی ضرورت ہے۔ مسلمان برادری اور مسلک کے جھگڑے سے اوپر اٹھ کر مسلمان کو مسلمان کے طور پر دیکھنے کے لیے تیار ہو جائیں تو ان کے بہت سے مسائل آپ سے آپ حل ہو جائیں گے۔

بہر حال حالات کا تقاضہ ہے کہ ہم اپنی صفوں میں عملی اتحاد کی صورتیں پیدا

کریں۔یہی ہماری حفاظت کی مضبوط ضمانت ہوگی۔

استحکام وعمل کے رہنما نکات

مسلمان کی شناخت اسلام سے ہے۔اس لیے اسلام سے تمام اہل ملک کو صحیح طور پر واقف کرانا اور ایک بہتر اسلامی معاشرہ کی تشکیل وہ لازمی شرط ہے جس سے دنیا کی ذلت اور آخرت کے خسارہ سے بچ سکتے ہیں۔مسلمان اسلام کے بغیر ایک بے روح جسم ہے۔اس لیے روح اسلام کو جتنا زندہ اور بالیدہ کیا جائے گا مسلمان اتنا ہی زندہ اور بالیدہ ہوگا۔اس کو ملائیت کہہ کر رد کرنا گویا اپنے فلاح کے خدائی منصوبے کو رد کرنا ہے جس کے نتیجے میں ذلت وغلامی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آسکتا ہے۔لہٰذا پوری مسلمان ملت بالخصوص اس کے نوجوانوں میں ایک عالمی داعی امت ہونے کا احساس بھرنے کی ضرورت ہے اور اس کام کے لیے انہیں منظم کرنا وقت کا اہم ترین تقاضہ ہے۔آج کے دور میں اسلام آؤٹ آف ڈیٹ نہیں ہوا ہے بلکہ مسلمانوں کا موجودہ ماڈل آؤٹ آف ڈیٹ ہوگیا ہے۔ترکی میں مصطفےٰ کمال پاشا نے اسلام کو دیس نکالا دے دیا تو کیا ترکی ترقی کر گیا؟ وہ آج بھی یورپ کا مرد بیمار ہے۔سائنس کی ترقی، معاشی بہتری کی جدوجہد،اچھے شہری نظام کا حصول،شرف انسانیت اورآزادی اسلام کا طرہ امتیاز ہے۔لیکن اسلام کا یہ جامع مثبت اورتعمیری رخ بہت کم لوگوں کومعلوم ہے اور جو جانتے ہیں وہ بھی وقت کے تقاضے کو پورا کرنے کے اہل نہیں ہیں اس لیے انسانی معاشرے میں نکو بن رہے ہیں۔ہمیں علم کو بالخصوص سائنس اور ٹکنولوجی کے علم کو ایک جذبہ عبادت اور جذبہ جہاد کے ساتھ سیکھنا چاہیے اور اپنانا چاہیے۔امامت عالم کے لیے امامت علم ضروری ہے۔ ہماری لیڈر شپ کو اس پہلو پر بھرپور دھیان دینا چاہیے بالخصوص علمائے کرام کو جمعہ کے خطبہ اور عیدین کے خطاب میں مسلمانوں کو اس کی ضرورت واہمیت سے آگاہ کرنا چاہئے۔

اس ضمن میں آخری بات یہ ہے کہ مسلمان لیڈر شپ کو، مسلم ملت کو ملک کے لیے ایک بوجھ اور ذمہ داری بنانے کے بجائے ایک سرمایہ اور اثاثہ بنانے کا اہتمام کرنا چاہیے تاکہ

مسلمان اپنا کھویا ہوا وقار حاصل کرسکیں۔

ہمارے مسائل بہت ہیں۔سب لوگ الگ الگ ٹکڑوں (Piece Meal) میں ان کے حل کے لیے کوشاں ہیں۔لیکن اصل مسئلہ ایک مؤثر قیادت کا فقدان ہے۔اگر وہ قیادت نصیب ہوجائے تو ایک شکست خوردہ فوج فتح مندی کے جھنڈے گاڑ سکتی ہے۔کیا ایسی قیادت موجود ہے؟ اگر ہے تو اس کو سامنے آنا چاہیے۔نہیں ہے تو پیدا کرنا چاہیے۔اس معاملہ میں عوام،علماء اور دانش ور تینوں پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ سر جوڑ کر بیٹھیں اور مسلمانوں اور ملک کو ایک متبادل قیادت فراہم کریں۔

وقت آ گیا ہے کہ ہندوستان کی تمام ملی تنظیمیں اور سرکردہ افراد سر جوڑ کر بیٹھیں اور حالات کا غیر جذباتی اور معروضی انداز سے جائزہ لے کر مسلم عوام بالخصوص مسلم نوجوانوں کے سامنے واضح لائحۂ عمل پیش کریں کہ انہیں اس وقت کیا کرنا چاہیے اور کیسے کرنا چاہیے؟ اس سلسلے میں واضح رہنمائی کی ضرورت ہے۔

دہشت گردی کے نام پر مسلمانوں پر ایک دوسری جنگ تھوپ دی گئی ہے۔اور ہزاروں بے قصور مسلمان نوجوانوں کو جو بیشتر غریب اور متوسط گھرانوں کے چشم و چراغ ہیں ان کو بغیر کسی ثبوت کے جیلوں میں بند رکھا جا رہا ہے اور ان کی زندگی تباہ کی جا رہی ہے۔ادھر کچھ انصاف پسند لوگوں اور غیر جانب دار میڈیا کی طرف سے جب آواز اٹھائی گئی ہے تو کچھ لوگوں کو رہا کیا گیا ہے۔مگر ان کو کوئی معاوضہ نہیں دیا گیا۔اس طرح وہ رہائی کے بعد بھی کسمپرسی کی حالت میں جی رہے ہیں۔ملک میں ایک بار پھر فسطائیت منظّم ہوکر پوری قوت سے سر اٹھانے کی کوشش کر رہی ہے۔ملک تیزی سے اکثریت کی ڈکٹیٹر شپ کی طرف بڑھ رہا ہے۔فسطائی جارحیت کے لیے عوامی سند حاصل کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔تمام جرائم پر پردہ ڈالا جا رہا ہے اور نئے حملے کی تیاری ہو رہی ہے۔تمام دستوری ادارے یا تو اس کھیل میں شامل ہیں یا تماشائی بنتے جا رہے ہیں حالات انتہائی سنگین ہیں تاہم مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔خود پر اعتماد اور خدا پر اعتماد کے ذریعہ ہر مشکل آسان کی جا سکتی ہے۔مگر اس کے لیے پر

عزم جد وجہد ضروری ہے ۔اس کے لیے ہمیں ایک واضح قومی ایجنڈا بنا کر آگے بڑھنا ہوگا۔ میرے خیال میں اس کے مندرجہ ذیل نکات ہو سکتے ہیں۔

(۱) تعلیم کا فروغ: ہمیں اپنے بچوں، عورتوں اور نوجوانوں میں تعلیم عام کرنا ہے اور تعلیم کو ہتھیار بنا کر اپنا دفاع کرنی ہے۔

(۲) سماجی امن واتحاد: آپس میں مسلکی اور ذات برادری کے جھگڑے کو کم کرنا ہے اور اسلامی بھائی چارہ کو فروغ دینا ہے۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ اتحاد سے ہم کھڑے ہوں گے اور انتشار سے ہم پامال ہو جائیں گے۔

(۳) مؤثر قیادت کا فروغ: اپنی صفوں سے مقامی، ریاستی اور مرکزی سطح پر مؤثر قیادت پیدا کرنا ہے۔ اس وقت جو قیادت موجود ہے اس کو مضبوط کرنا ہے اور اس کے ساتھ چل کر آگے کی منزل طے کرنا ہے۔

(۴) فرقہ وارانہ خیر سگالی: اپنی طرف سے ایسا کوئی کام نہیں کرنا ہے جو فرقہ وارانہ فضا کو خراب کرنے والی اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات کو بگاڑنے والی ہو بلکہ خدمت اور محبت کی فضا کو قائم کرنا ہے۔

(۵) حوصلہ بلند رکھنا: اس وقت سب سے ضروری ہے خود پر اور خدا پر اعتماد رکھنا، حوصلہ بلند رکھنا، قوم کو خوف کی نفسیات سے نکالنا۔ مظلوموں کی مدد کرنا۔ ظالم کا ہاتھ پکڑنا، ہر مقام پر اجتماعیت کے ساتھ جینا۔ اگر کسی مقام پر کسی مسلمان کی گرفتاری ہوتی ہے یا ظلم ہوتا ہے تو اس مقام کے تمام مسلمانوں کو متحد ہو کر اور انصاف پسند عناصر کو ساتھ لے کر آواز اٹھانی چاہیے ۔کوئی قوم صبر وعزیمت سے زندہ رہتی ہے آگے بڑھتی ہے۔ قرآن کا حکم ہے، اے ایمان والو! صبر سے کام لو، ثابت قدم رہو، باہم مربوط رہو اللہ سے ڈرو امید ہے فلاح پاؤ گے۔ (آل عمران ۲۰۰)۔ ہمیں اس ہدایت پر عمل کرنا ہے۔ انشاء اللہ ہم ہی غالب رہیں گے اگر مومن ہوں گے۔

تین سو سال سے ہیں ہند کے میخانے بند
اب مناسب ہے تیرا فیض ہو عام اے ساقی

ملک کے موجودہ حالات میں ہماری حکمت عملی

اٹھو کہ پھر نہ ہوگا کبھی حشر اب بپا
دیکھو زمانہ چال قیامت کی چل گیا

احوال وطن:

بھارت زرد انقلاب (Saffron Revolution) کی زد میں ہے اس کے دور رس نتائج ہوں گے۔ ہندوستان کے تکثیری سماج میں سکھ، بودھ، اور جین تہذیبی طور پر ہندو سماج کا حصہ ہیں۔ پارسی اور یہودی اتنی کم تعداد میں ہیں کہ انہیں انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے۔ مذہبی اور ثقافتی طور پر دو ہی بڑی اقلیتیں ہیں جو کش مکش کی شکار ہیں۔ ایک عیسائی اور دوسرے مسلمان۔ عیسائیوں میں اینگلو انڈین کی تعداد زیادہ ہے جو زیادہ تر کنورٹڈ عیسائی ہیں۔ جو ٹرائیبلس اور بعض پسماندہ طبقات سے آتے ہیں۔ مجموعی طور پر عیسائی معاشی، تعلیمی اور تہذیبی اعتبار سے نسبتاً بلند تر اور بہتر ہیں، نیز انہیں پوری عیسائی دنیا جو اس وقت عالمی طاقت کے مراکز ہیں کی بھرپور اخلاقی اور مادی حمایت حاصل ہے۔ اور ان کی زبان وتہذیب کو غلبہ حاصل ہے۔ اس لیے وہ ایک حد تک Priviledged Position میں ہیں۔ حال کے دنوں میں سنگھ پریوار نے کنورژن کے خلاف جو مہم چھیڑ رکھی ہے اس کی وجہ سے کبھی کبھی کچھ کش مکش دیکھنے کو ملتی ہے۔ مگر عالمی میڈیا اور خود ہندوستانی میڈیا آزادیٔ رائے اور ہیومین رائٹس کے نام پر جس طرح ان کے حق

میں کھڑی نظر آتی ہے اس کی وجہ سے ان کے سامنے مسائل کم ہیں تاہم عیسائی اقلیت یک گونہ دباؤ میں ضرور ہے۔

اس وقت پورے ہندوستان میں سب سے زیادہ Disadvantaged group مسلمانوں کا ہے جو سخت نفسیاتی دباؤ کے دور سے گذر رہا ہے۔ مسلمانوں کے برے دن کی شروعات آج اور ابھی سے نہیں ہوئی ہے۔ بقول اقبال تین سو سال سے ان پر ہند کے مئے خانے بند ہیں اور وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ ان کی محرومی اور مایوسی بڑھتی جا رہی ہے۔

امتحان ہے صبر اور حوصلہ مندی کا۔ یہ وقت نہ خوف زدہ اور مایوس ہونے کا ہے اور نہ ہی Reactionary اور Aggressive ہونے کا ہے، بلکہ بہت ہی Cool اور Calm ہوکر حالات اور مسائل کا تجزیہ کرکے ایک عارضی، وسط مدتی اور طویل المیعاد منصوبہ بندی کے ساتھ بولڈ Assertive اور Proactive ہوکر منظّم جدو جہد کرنے کا ہے۔

اس وقت ہندوستان میں کوئی تیسری طاقت نہیں ہے، جس سے مصالحت (Arbitration) یا مداخلت (Intervention) کی درخواست کی جاسکتی ہے۔ اس لیے آزادی کے پہلے کی ذہنیت (Mindset) اور نفسیات کو ختم کرکے ایک نئی حکمت عملی اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔

دو قومی نظریہ، تین قومی نظریہ، متحدہ قومیت، مشترکہ قومیت اور اس جیسی سای اصطلاحیں فضول ہیں۔ ہم ان حصارات سے جتنی جلدی باہر نکلیں یہ بہتر ہے۔ ہندوستان ہمارا ملک ہے اور ہم اس ملک کے فطری پیدائشی اور مساوی حیثیت کے باوقار شہری ہیں جس کے حقوق واختیارات ملک کے دیگر شہریوں کی طرح برابر ہیں۔ ہمارے شہری حقوق پر کوئی قدغن لگاتا ہے تو ملک کے دستور اور قانون میں جو بھی تحفظات موجود ہیں اور تدارک (Redressal) کے جو ذرائع حاصل ہیں ان کا استعمال کرکے دستوری اور جمہوری طریقے سے ہم اس کو حاصل کریں گے اور جب تک وہ حقوق حاصل نہیں ہوجاتے ہیں اپنی جدو جہد جاری رکھیں گے۔

ملک کی اٹوٹ اکائی

ہندوستانی مسلمان اس ملک کی اٹوٹ اکائی ہیں،جن کوکسی طرح سے کاٹااور بانٹا نہیں جاسکتاہے۔ یہ بھارت کےجسم کالازمی عضو ہیں۔اس کوکاٹنے اورکمزور کرنے کی کوئی بھی کوشش اورسازش ملک کونقصان پہنچانے اورکمزورکرنے والی ہوگی جس طرح ہمالیہ پہاڑ اورگنگا ندی ہندوستان کی عظمت وتقدس کی علامت ہیں،اسی طرح ہندوستانی مسلمان، ہندوستان کی عظمت،وحدت اورتقدیس کی علامت ہیں۔ہندوستانی مسلمانوں کی شرکت شمولیت اور تذکرے کے بغیر ہندوستان کی کوئی تعریف اورتشریح اس کی تاریخ وتمدن نہ صرف نامکمل اور ناقص ہوگی۔بلکہ جھوٹی اورتصوراتی قراردی جائے گی۔

خوف کی نفسیات سے باہر نکلیں:

ایک دوسری حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان پراگرکسی فرعون وقت،ہٹلراورموسلینی کی بھی حکومت قائم ہوجائے تووہ بھی اس ملک سے مسلمانوں کوختم یا نکال باہرنہیں کرسکتاہے۔ کچھ وقتی پریشانی میں ضرور ڈال سکتاہےلیکن مٹانے والےخودمٹ جائیں گے۔مسلمان انشاء اللہ زندہ اورباقی رہیں گے۔اس لیے بیجاخوف اوراندیشے میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔دنیا کی تمام زندہ اورترقی پذیرقوموں کوآزمائش اورمصائب سے دوچار ہونا پڑتاہے۔ہم بھی ایک قوم ہیں۔ہم پربھی آزمائش آئی ہے اورہم ان آزمائشوں کاصبر وحکمت کے ساتھ مردانہ وارمقابلہ کریں گےاوراپنی جوہری صلاحیتوں کو بروئے کارلاکراس کاتدارک ڈھونڈیں گے۔قرآن کااعلان ہے ہرتنگی کے بعدآسانی ہے۔تو ہم اس تنگی سے باہرآئیں گے۔مشہور مقولہ ہے،اگرموسم خزاں آگیاہےتو کیاموسم بہاردورہوگا؟جس طرح ہرشام کے بعدصبح ہوتی ہےاسی طرح اندھیری رات کے بعددن کاسورج ضرورطلوع ہوگا۔اس لیے ہمت وحوصلہ بلندرکھنا ہےاور ہرمشکل کوسرکرتے ہوئے آگے بڑھنے کاداعیہ پیداکرناہے۔مسلمانوں کے اندراس وقت جوبھی ملی، مذہبی،اورسیاسی قیادت ہےاس کاسب سے پہلاکام یہ ہے کہ قوم کے

Morale کو High رکھیں ان کے اندر خوف کی نفسیات پیدانہ ہونے دیں۔ ہمارے علماء دانشوروں، شاعروں ،ادیبوں،افسانہ نگاروں اخبار نویسوں اور تمام دیگر طبقات کے لوگوں کو شعوری طور پراس کی کوشش کرنی ہے۔ یہ اس وقت ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔

مرثیہ پڑھنے او رسینہ کوبی کرنے ،رورو کرقوم کی مظلومیت اور معصومیت کا تذکرہ کرنے اور پھر ظالم کے حق میں تبرہ پڑھنے سے قوم کی تقدیر نہیں سنور سکتی ہے۔قوم کی تقدیر سنوارنے کے لیے عزم وحوصلہ کے ساتھ ٹھوس پہل کی ضرورت ہے۔

اس لیے اس وقت جولوگ بھی مسلمانوں کے بہی خواہ ہیں ان سے گذارش ہے کہ قوم کو ڈرانا بند کردیں اور قوم کو خوف کی نفسیات سے باہر نکالنے میں مدد کریں۔ ان کے اندر احساس کمتری دور کرنے میں مدد کریں اوران کوہمت وحوصلہ دیں۔ اگرقوم میں ہمت وحوصلہ پیدا ہوگیا توان کے اندراتنی ذہانت موجود ہے اوران کے بازؤوں میں اتنی قوت ہے کہ وہ ہر آزمائش کا آسانی سے مقابلہ کرسکتے ہیں اوراپنی بگڑی سنوار سکتے ہیں۔

مسلمانوں کے چند بڑے مسائل:

اگرآپ ہندوستانی مسلمانوں کے حالات اورمسائل کا گہرائی سے جائزہ لیں توان کا پہلامسئلہ خوف کی نفسیات اوراحساس کمتری ہے اور دوسرا مسئلہ خوداعتمادی اور خدااعتمادی کی کمی ہے۔تیسرا مسئلہ اتحاد،اجتماعیت اورمنصوبہ بندی کا فقدان ہے اور چوتھا مسئلہ تعمیری، ذہین، صالح،مضبوط اور بے لوث لیڈر شپ کی کمی ہے۔ ان تمام امور نے مل کر ایک Vicious circle بنادیا ہے۔جس کے حصار سے مسلمان نکل نہیں پارہے ہیں۔ جب تک یہ Vicious circle نہیں ٹوٹتا ہے قوم کی ترقی کی راہ ہموار نہیں ہوسکتی ہے۔سوال یہ ہے کہ اس کو کیسے توڑا جائے؟ ان امور پر مختلف دانشوروں کی مختلف رائیں ہوسکتی ہیں۔میرے خیال میں اس کے لیے کچھ بنیادی چیزوں کی ضرورت ہے۔اس وقت مسلمانوں کوسیاسی لیڈرشپ سے زیادہ سماجی لیڈر شپ کی ضرورت ہے۔ ہم نے شعوری طور پر سماجی لیڈر شپ کی بات کی ہے،مذہبی

لیڈر شپ کی بات نہیں کی ہے ۔حالانکہ مذہبی لیڈر شپ سماجی لیڈر شپ کالازمی حصہ ہے مگر چونکہ مسلمان مذہبی اور مسلکی طور پرآپس میں اس قدر بٹے ہوئے ہیں کہ انہیں مذہب کے نام پر ایک جگہ جوڑانہیں جاسکتا ہے۔اور اگر وقتی طور پرایک جگہ جمع بھی ہوجائیں تو آپسی تعصّبات اتنے گہرے ہیں کہ ان کوایک جگہ بہت دیر تک جوڑ کر رکھنا مشکل ہوگا۔اس لیےممکن ہے کہ بعض لوگ اس پر برامانیں مگر دیکھنے کو ملتا ہے کہ مذہب اورعقیدہ اس وقت مسلمانوں میں Cementing force نہیں ہے۔کیونکہ مسلمان خدا اوررسول کے نام پرجمع ہونے کے بجائے اب خدااوررسول کے نام پرہی لڑرہے ہیں، جو چیز بنائے اتحادتھی وہی بنائے اختلاف بن گئی ہے۔اسی لیےمسلمانوں کوجوڑنے کے لیے مذہب کے علاوہ کوئی ایسی چیز تلاش کرنی ہوگی جس میں سب کی دلچسپی ہےاور جسے سب ضروری سمجھتے ہیں۔

انسانی وسائل کی صحیح آبیاری:

اس میں سب سے پہلا ایجنڈا تعلیم ہے۔یہ اکیسویں صدی ہے۔اکیسویں صدی علم و ہنر، تحقیق و ایجاد اورفکری اجتہاد کی صدی ہے۔صرف ہندوستان ہی نہیں عالمی طور پر اگر آپ اسلام اورمسلمانوں کی کمزوری اور پسماندگی کا جائزہ لیں تو آپ کومعلوم ہوگا کہ دنیا کی دیگر قوموں کے مقابلےاسلام کے پاس جوانسانی وسائل ہیں وہ کم تر درجے کے ہیں جوآج کی ترقی یافتہ دنیاکے ساتھ قدم سے قدم ملاکر چلنے کی صلاحیت نہیں رکھتے ہیں۔اس لیے یہ زندگی کے دوڑ میں پیچھے رہ گئے ہیں اوردنیا کی پسماندہ قوموں کی فہرست میں آتے ہیں۔تیل کے کنوئیں اور بڑے معدنی ذخائر کے باوجودان کی مثال اس جاہل سیٹھ اور جاگیردار کی ہے جس کوخود پتہ نہیں ہے کہ اس کی طاقت ودولت کتنی ہے اور اس کا کتنا حکیمانہ استعمال کیاجاسکتا ہے۔ دوسرے لوگ اس کو بیوقوف بناکر لوٹ رہے ہیں، اوروہ ہیں کہ خواب غفلت میں گرفتار ہیں۔ دنیا کی قومیں جس طرح ان کامذاق ااڑاتی ہیں کسی دولت مندگروہ کی کوئی اس قدر تضحیک نہیں کرتا ہے۔مگر وہ ہیں کہ اپنی سرمستیوں میں گم عالمی طاقتوں کے ہاتھوں کاکھلونہ بنے ہوئے

ہیں۔ وہ انہیں جس طرح چاہتے ہیں استعمال کرتے ہیں۔ تاریخی طور پر دیکھا جائے تو پچھلی تین صدیوں میں مسلمانوں نے بہت کم پڑھا ہے ان کا کوئی بڑا علمی کارنامہ نظر نہیں آتا اور تحقیق و ایجاد کے معاملے میں ان کا نامہ اعمال بالکل خالی ہے یہاں تک کہ مذہبی علوم میں بھی اعلیٰ معیار کے اوریجنل ورک کی بڑی کمی نظر آتی ہے۔ دس بیس لوگوں کو چھوڑ کر ڈھنگ کا عالم دین بھی نظر نہیں آتا ہے۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ تعلیم کے میدان میں سب قوموں اور برادریوں سے پیچھے ہیں۔ کہاوت مشہور ہے، جاہل آدمی دیوار برابر ہوتا ہے۔ اسی طرح یہ قوم بھی جہالت کے سبب خس وخاشاک کا ڈھیر بن گئی ہے۔ مسلمانوں میں جہالت کے تین بڑے اسباب ہیں پہلا سبب تعلیم کی اہمیت سے لاشعوری ہے۔ دوسرا سبب تعلیم کا ناقص تصور ہے یعنی پوری قوم دینی تعلیم اور دنیوی تعلیم کے غلط تقسیم میں الجھی ہوئی ہے اور کون سی تعلیم اور کیسی تعلیم دی جائے۔ اس بارے میں کنفیوز ہے اور تیسرا سبب تعلیم کے ذرائع اور مواقع کی کمی ہے۔

تعلیمی بیداری:

لہٰذا پہلی ضرورت مسلمانوں میں تعلیمی بیداری لانا ہے اور عام وخاص سب کو تعلیم کے بارے میں باشعور بنانا ہے۔ دوسری ضرورت تعلیم کے ناقص تصور کو دور کرنا ہے۔ تعلیم ہر مسلمان پر فرض ہے چاہے وہ مرد ہو یا عورت دینی تعلیم اور دنیوی تعلیم کی یہ تقسیم غلط ہے۔ قرآن وحدیث میں علم نافع کی بات کی گئی ہے اور اس کے دائرے میں پوری کائنات آجاتی ہے اس لیے ہر اس تعلیم کی ضرورت ہے جس سے لوگوں کو فائدہ پہنچے۔ تیسری ضرورت تعلیم کے مواقع اور ذرائع کا فروغ ہے تاکہ عام لوگوں کو تعلیم حاصل کرنے میں آسانی ہو۔

ہندوستان میں مسلمانوں میں پہلا کام تو یہ ہے کہ تعلیم عام ہو۔ کوئی مسلمان فرد، مرد، عورت، بچہ، بوڑھا، جوان شہری اور دیہاتی ترقی یافتہ، یا پسماندہ بالخصوص بیس سال سے کم عمر کا

کوئی لڑکا اور لڑکی جاہل اور ان پڑھ نہ رہنے پائے اس پر خصوصی توجہ دینی ہے۔

پرائمری تعلیم کا فروغ اور ڈراپ آوٹ روکنے کی کوشش۔ دوسرا کام یہ ہے کہ مسلمانوں میں تعلیم کے پھیلاؤ کے لیے اسکولوں اور مدرسوں میں داخلے بڑھائے جائیں اور ان کو صد فیصد کیا جائے۔ کسی علاقہ میں کوئی بچہ چاہے لڑکا ہو یا لڑکی، کسی برادری اور طبقہ سے تعلق رکھتا ہو، اس کے پاس وسائل ہوں یا نہ ہوں وہ تعلیم سے محروم نہ رہے، اور جس کا داخلہ ہو جائے وہ کسی طرح اسکول نہ چھوڑنے پائے یعنی Drop outs روکا جائے۔ ہمارا یہ ہدف ہونا چاہیے کہ 2030 تک تمام مسلمان بچے جو اٹھارہ سال کی عمر تک کے ہوں وہ لازماً میٹرک پاس ہوں، میٹرک پاس سب سے کمتر تعلیمی لیاقت مانی جانی چاہیے۔ اس کے بعد ہی کوئی لڑکا یا لڑکی شادی کے لائق مانا جائے۔ مسلمانوں میں بچہ مزدوری روکنے اور تعلیم سے ہٹا کر کوئی اور کام کرانے کی ہمت شکنی کی جانی چاہیے۔ اس کے لیے ہر بستی، ہر گاؤں، ہر وارڈ اور ہر پنچایت میں علم دوست افراد کی ایک تنظیم تشکیل دی جائے جس میں ہر عمر، ہر برادری، ہر طبقہ اور ہر مسلک کے لوگ شامل ہوں اور وہ مل جل کر یہ مہم چلائیں۔ مثال کے طور پر گیارہ افراد کی ایک تعلیمی کمیٹی تشکیل دی جائے اور جس میں علم، عمر، تجربہ اور اخلاص کی بنیاد پر ایک شخص کو اس کا کنوینر یا محرک بنایا جائے۔ ان گیارہ افراد میں محلے کے عالم دین یا امام، تعلیم یافتہ ریٹائرڈ بزرگ ایک دو خاتون اور چند باشعور نوجوانوں کو شامل کیا جائے۔ سب سے پہلا کام اس محلّہ اور گاؤں کا سروے ہے۔ جس سے پتہ چل جائے گا کہ اس محلّہ اور گاؤں میں اسکول جانے والی عمر کے کتنے بچے بچیاں ہیں۔ کن خاندانوں کے ہیں، ان کے حالات کیا ہیں؟ ان کی سوچ سمجھ کیسی ہے؟ ان کی ضرورتیں اور مسائل کیا ہیں اور ان کو کیا تعلیمی مدد درکار ہے؟ ان تمام باتوں کا جائزہ لے کر وہ کمیٹی مقامی طور پر اپنا تعلیمی منصوبہ بنائے اور پھر اس کو نافذ کرنے کا اہتمام کرے۔

ہر کام کو کرنے کے لیے کچھ پیسوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو افراد اس تعلیمی کمیٹی میں شریک ہوں وہ محلے اور گاؤں کی سطح پر ایک تعلیمی فنڈ بنائیں اور اس تعلیمی فنڈ میں ہر گھر سے پانچ روپیہ ماہانہ وصول کریں۔ اس کے علاوہ اس علاقے کے لوگوں سے خصوصی چندہ اکٹھا

کریں۔ مقامی طور پر جو لوگ عشر اور زکوٰۃ نکالتے ہیں ان سے یہ رقم حاصل کریں اور ان سبھوں کو ملا کر ان بچوں کی تعلیمی ضرورت پوری کرنے میں مدد کریں۔ جن کو اس کی ضرورت ہے۔

تعلیم کے مواقع اور اس کے پھیلاؤ کی کوشش:

دوسرا کام گاؤں اور محلّہ میں جو اسکول اور مدرسہ قائم ہے، اس کا جائزہ لیں۔ اگر آپ کے محلّہ اور گاؤں میں اسکول یا مدرسہ نہیں ہے تو اس کو قائم کرانے کی کوشش کریں۔ یہ چیزیں سرکاری پالیسی میں شامل ہیں۔ تھوڑی توجہ سے یہ کام کیا جاسکتا ہے۔ اس کے لیے مقامی مکھیا، وارڈ کمشنر مقامی ایم، ایل، اے اور ایم، پی نیز شعبۂ تعلیم کے افسر یا ضلع کلکٹر سے رابطہ قائم کر کے یہ کام کرایا جاسکتا ہے۔ تعلیمی دوست کمیٹی یہ کام آسانی سے کرسکتی ہے۔

آپ کے محلّہ، گاؤں یا آس پاس جو اسکول، مدرسہ، ہائی اسکول یا کالج قائم ہیں۔ وفد بنا کر وہاں جائیں اور ان اداروں میں جو تعلیم دی جارہی ہے اور وہاں جو سہولتیں میسر ہیں یا ان کے جو مسائل ہیں ان کا جائزہ لیں، اور ان اسکولوں کے ذمہ داروں سے عزت و سہولت کے ساتھ پیش آئیں، اور ان کو بتائیں کہ ہم آپ کے ساتھ تعاون کرنا چاہتے ہیں تا کہ آپ بچوں کو اچھی تعلیم دے سکیں، اور آپ کے مسائل حل کرنے میں ہم آپ کا ساتھ دیں گے۔ سماج کی بیداری اور سماج کی طاقت سے بہت سے کام آسانی سے ہوجاتے ہیں۔

آج کل سرکار نے تعلیم کے پھیلاؤ اور ڈراپ آؤٹ روکنے کے لیے خصوصی مہم چھیڑ رکھی ہے۔ بچوں بالخصوص بچیوں کو بہت سی سہولتیں مہیا کرائی جارہی ہیں۔ مفت تعلیم کے ساتھ ساتھ بچوں کو کتابیں، پوشاک، سائیکل، دن کا کھانا، اور اسکالرشپ وغیرہ کی سہولیات دی جارہی ہیں۔ کیا یہ چیزیں صحیح ڈھنگ سے ان بچوں کو مل رہی ہیں۔ یا نہیں؟ یہ دیکھنا اور اس پر نظر رکھنا اس تعلیمی دوست کمیٹی کا کام ہونا چاہیے۔ بس یہ طے کیجئے کہ کوئی بچہ آپ کے علاقہ کا دینی تعلیم اور کم از کم میٹرک تک کی تعلیم سے محروم نہ رہے۔

نارتھ انڈیا کے مسلمانوں کی زبان اردو ہے۔ ساؤتھ انڈیا کے مسلمان الگ الگ

زبانیں بولتے ہیں۔ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ تعلیم کے باب میں دین اور دنیا کی تقسیم غلط ہے۔ تعلیم کا مقصد اپنے عقائد زبان اور تہذیب کی حفاظت اور فروغ ہے۔ لہٰذا اپنے بچوں کی ابتدائی بنیادی تعلیم میں عقائد وزبان کی تعلیم کو اولیت دینے کی ضرورت ہے۔ لہٰذا جہاں ایسے ادارے قائم ہیں ان کو مضبوط و مستحکم کرنے کی ضرورت ہے۔ جہاں نہیں ہیں ان کو قائم کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمیں اپنے گھروں میں ایک اچھا اور پاکیزہ ماحول بنانے کا اہتمام کرنا چاہیے تاکہ ہم بچوں کے سامنے اچھی مثال پیش کرسکیں۔ ہمیں ایک اچھا مسلمان، اچھا انسان اور اچھا شہری بننا اور بنانا ہے۔ اس کی ابتداء ابتدائی تعلیم سے ہی ہوتی ہے۔

ہمارے عقائد ہماری زبان:

قومیں کب مٹتی اور ہلاک ہوجاتی ہیں؟ جس کسی قوم کے عقائد، زبان وتہذیب پر گہن لگ جاتا ہے۔ یعنی اس معاملہ میں اس کی موجودہ نسل غیر حساس اور لاپرواہ ہوجاتی ہے، تو قوم کی پہچان اور شناخت ختم ہوجاتی ہے۔ ہماری پہچان ہمارا عقیدہ ہے۔ ہم ایک خدا کے ماننے والے ہیں۔ حضرت محمد ﷺ کو آخری رسول مانتے ہیں۔ آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔ قرآن پاک کو اللہ کی کتاب اور کتابِ ہدایت مانتے ہیں۔ خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کو اپنی زندگی کا مقصد سمجھتے ہیں۔ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ ہماری عبادت کا طریقہ ہے۔ جمعہ اور جماعت کا اہتمام ہمارا قومی شعار ہے۔ برابری اور آپسی بھائی چارہ ہمارا قومی امتیاز ہے، اخلاق و خدمت ہمارا وظیفۂ حیات ہے۔ ہم اسی پہچان کے ساتھ اپنی نسلوں کی پرورش کرنا چاہتے ہیں۔ جب تک ہم ان باتوں پر قائم رہیں گے ہم زندہ اور باقی رہیں گے اور ہماری پہچان قائم رہے گی لیکن جس آن ہم نے ان سے غفلت برتی ہماری پہچان مٹ جائے گی، اور ہم دنیا کی قوموں کی بھیڑ میں ایسے گم ہوجائیں گے کہ ہمارا پتہ بھی نہیں چلے گا۔ اس وقت ہمیں باہری سے زیادہ اندرونی طور پر زیادہ خطرہ ہے جس میں ہماری کوتاہیوں اور انتشار فکر کا بے حد دخل ہے، دوسری ضرورت اردو زبان کی تعلیم ہے۔ ہم دنیا کی ہر زبان سیکھیں اور پڑھیں اس میں اچھی مہارت حاصل

کریں۔ اس وقت ہندی اور انگریزی زبانوں کا غلبہ ہے لہٰذا ان زبانوں کو پوری مہارت کے ساتھ سیکھنا اور ان میں کمال حاصل کرنے کی کوشش کرنا چاہیے تا کہ ملکی ضرورتوں اور بازار اور اعلیٰ تعلیم کے تمام تر مواقع ہماری گرفت میں رہیں۔ مگر چونکہ اردو زبان ہماری دین وثقافت کا حصہ بن چکی ہے، اس لیے اپنی پہچان کو مستحکم رکھنے کے لیے اس کی تعلیم ضروری ہے۔ اردو بڑی میٹھی اور خوبصورت زبان ہے جس کا پڑھنا لکھنا، آسان ہے۔ ایک زمانے میں یہ اس ملک کی سرکاری زبان تھی بعض تاریخی وسیاسی وجوہات سے آج اس زبان کو دبانے اور مٹانے کی سازش ہو رہی ہے۔ اس سازش کا توڑ یہ ہے کہ ہم رضا کارانہ طور پر اس زبان کو سیکھنے، اس کے رسم الخط کو باقی رکھنے، اس کو بولنے، لکھنے اور اپنے اظہار وترسیل کا ذریعہ بنانے کا اہتمام کریں۔ اس کے لیے ہر گھر میں اس کو فروغ دینے کی ضرورت ہے۔ اگر یہ صحیح معنوں میں ہمارے گھروں میں ہماری ماؤں کی زبان بن جائے تو آسانی سے یہ بچوں کی زبان بنے گی اور پھر سماج میں اس کا چلن عام ہوگا۔ اس لیے ماؤں اور بالخصوص بچیوں کو اردو زبان کی تعلیم لازمی طور پر دی جانی چاہیے اور گھروں میں اردو تعلیم کا خاص اہتمام کیا جانا چاہیے۔ اردو میڈیم کے اسکول کھولے جائیں اور وہاں اردو کی اچھی تعلیم پر زور دیا جائے اس وقت یہ ایک افسوسناک حقیقت ہے کہ جو لوگ بطور اردو اساتذہ بحال ہیں ان کی اردو اچھی نہیں ہے اور وہ اردو تعلیم وتعلم کے معاملے میں حساس نہیں ہیں۔ جس کی وجہ سے اردو تعلیم وتعلم کا معیار لگا تار گر رہا ہے۔ یہ لاپرواہی اور بے توجہی اردو تعلیم کے باب میں خودکشی کے مترادف ہے۔ اس طرح جب کہ اردو کو مٹانے اور ختم کرنے کی سازش اور کوشش ہو رہی ہے۔ آپ کی یہ لاپرواہی اس کو ختم کرنے میں سم قاتل ثابت ہوگی۔ اس وقت اردو زبان کو باہر سے زیادہ اردو والوں کی لاپرواہی سے خطرہ ہے۔ لہٰذا اردو اساتذہ کو خاص طور پر اور اسکول کالج میں جو طلبہ اردو کے ذریعہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرتے ہیں ان کو اس باب میں حساس بنانے کی ضرورت ہے تا کہ اس ملک میں اردو زبان کو اور اردو ثقافت کو نہ صرف زندہ اور باقی رکھا جا سکے بلکہ اس کو فروغ دیا جائے۔

فنی، ثانوی اور اعلیٰ تعلیم:

ابتدائی تعلیم کے بعد دوسرا مرحلہ سکنڈری تعلیم کا ہے۔ بہتر ثانوی تعلیم سے ہی اعلیٰ اور فنی و تکنیکی اور مسابقتی تعلیم کے دروازے کھلتے ہیں۔ لہٰذا اس پر بھرپور توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ ہمارے پاس جو مطالعات موجود ہیں اس کی رو سے پرائمری درجات سے ثانوی درجات تک آتے آتے دو تہائی بچے تعلیم چھوڑ دیتے ہیں، اور چھوٹے موٹے کاموں میں Non-Skilled ورکر کی طرح کام کرتے ہیں۔ جس میں انہیں بہت کم مزدوری ملتی ہے اور زندگی بھر سخت محنت کرنے کے باوجود وہ غربت و محرومی سے باہر نہیں آپاتے ہیں۔ ظاہر سی بات ہے سبھی بچوں کو ڈاکٹر، انجینئر، ٹکنوکریٹ، پروفیشنل اور بیورو کریٹ نہیں بنایا جاسکتا ہے مگر ان کو وقت اور بازار کی ضرورتوں کے مطابق مختلف کاموں میں ٹرینڈ کر کے اس لائق ضرور بنایا جاسکتا ہے جس سے وہ اچھی آمدنی حاصل کرسکیں، اور ایک بہتر زندگی گذار سکیں۔ مسلمان روایتی طور پر صناع قوم رہی ہے اور بعض معاملات میں انہیں خاص مہارت ہے۔ جدید علم اور تکنلوجی سے ناواقف رہنے کی وجہ سے وہ اس وقت پیچھے ہوگئے ہیں۔ لہذا ان کی ضرورتوں کے لحاظ سے تعلیمی و تربیتی مواقع بہم پہنچانے کی ضرورت ہے۔ میٹرک تک کی تعلیم معیاری اور بہتر ہو اس کے لیے ان بچوں کی اچھی کوچنگ اور گائڈنس کے لیے خصوصی منصوبہ بنایا جانا چاہیے۔ جو ادارے مسلمانوں کے زیر اہتمام ہیں ان کا نظم اور معیار تعلیم بہت ہی ناقص ہے۔ بھائی بھتیجا واد نے اسے بہت نقصان پہنچایا ہے۔ یہ ادارے ملت کے استحکام و ترقی کا ذریعہ بننے کے بجائے کچھ لوگوں کی ذاتی منفعت کا سامان بن گئے ہیں۔ لہٰذا ان میں ضروری اصلاح کی کوشش ملی استحکام کا ایک اہم حصہ ہے۔ جس پر باشعور لوگوں کو توجہ دینی چاہیے۔

ہمارے معاشرے میں غربت ایک بڑا مسئلہ ہے، جس میں مسلمان سماج کے بہت سے غریب بچے جو بہت Talented ہیں غربت اور صحیح گائیڈنس نہیں ملنے کی وجہ سے ضائع ہوجاتے ہیں۔ ملت کو ان بچوں کی تعلیمی ضرورت کی کفالت کے لیے آگے آنا چاہیے اور ایسی

اسکیم اورادارے بنانے چاہیے، جہاں ان کی صحیح رہنمائی کے ساتھ مالی اور عملی تعاون دی جائے تاکہ وہ اپنی صلاحیتوں کو صحیح ڈھنگ سے بروئے کار لاسکیں اور قوم وملت کا سرمایہ بن سکیں۔ اس سلسلے میں میٹرک اور سنیئر سکنڈری لیول یعنی 2+ کی تعلیم پر خصوصی توجہ دینی چاہیے۔

پرائمری اور سکنڈری تعلیم کی حیثیت Literacy campaign کی ہے، ترقی کے سارے دروازے اعلیٰ تعلیم سے کھلتے ہیں۔ اعلیٰ تعلیم میں مسلمانوں کا تناسب کم ہے۔ ظاہر سی بات ہے جب گریجویٹ اور پوسٹ گریجویٹ لیول پر مسلمان کم ہوں گے تو ڈاکٹر، انجینئر، وکیل، چارٹرا کاؤنٹنٹ، صحافی، افسر، لیکچرر، پروفیسر، سائنسداں، محقق اور سیاست دان وغیرہ بھی کم ہوں گے۔ تحقیق کے میدان میں مسلمان اتنے بھی نہیں ہے جن کو انگلیوں پر گنا جاسکے۔ اس صورت میں قوم کا وقار کیسے بلند ہوسکتا ہے۔؟ موجودہ حالات میں تعلیم وہ نسخۂ کیمیا ہے جس سے قوم کی بگڑی تقدیر سنواری جاسکتی ہے۔ اور اپنے وجود کا استحقاق ثابت کیا جاسکتا ہے۔ لہٰذا یہ ہماری توجہ کا اولین نکتہ ہونا چاہیے اور پوری قوم کو پورے شعور اور دلجمعی کے ساتھ منصوبہ بند ڈھنگ سے اگلے بیس سال تک اس کام کو کرنے کے لیے کمر کس لینا چاہیے۔ قوم کی بہتری ترقی، استحکام عزت اور عروج اسی راستے پر چل کر حاصل ہوگی۔

تعلیم سے ہی غربت اور بے وقعتی دور کی جاسکتی ہے۔ لوگوں کے اندر سوچنے سمجھنے کی صلاحیت پیدا کی جاسکتی ہے اور لوگوں کو منظم اور بیدار کر کے ملی استحکام کی ایک جاندار تحریک شروع کی جاسکتی ہے۔ لہٰذا تعلیمی بہتری ہمارا اولین ایجنڈا ہونا چاہیے۔ یہی وہ شاہ کلید ہے جس سے عزت وقوت کے دروازے پر لگا تالا کھولا جاسکتا ہے۔

اتحاد و جمعیت:

ہماری دوسری ضرورت آپسی اتحاد و جمعیت ہے۔ مثل مشہور ہے گھر ٹوٹے گنوار لوٹے۔ آج ہماری سماجی وسیاسی بے وزنی کی پہلی وجہ ہماری جہالت وغربت ہے اور دوسری وجہ آپسی انتشار وافتراق ہے۔ ہمیں اچھی طرح معلوم ہونا چاہیے کہ ہم ہندوستان میں گنتی میں کم

ہیں۔ ہندوستان ایک سوتیس کروڑ کی آبادی کا ملک ہے۔جس میں ہندوؤں کی تعداد %82 ہے اور مسلمان محض %15 ہیں۔ اتنے بڑے ملک اور اتنی بڑی آبادی میں اگر ہم مل جل کر نہیں رہیں گے تو بڑی آسانی سے اچک لیئے جائیں گے۔ اس لیے چاہے جو بھی ہو ہمیں ایک دوسرے سے مل کر رہنا ہوگا۔مسلک، جماعت، برادری یہ تبھی بچے گا جب آپ بچیں گے۔ جب آپ ہی نہیں بچیں گے تو ان کو کون بچائے گا؟ اس لیے ہمیں اپنے تمام تر اختلافات کو بھلا کر اپنے دین و مذہب، ملت وثقافت، ادارے اور اقدار کی حفاظت کے لیے ایک ہونا ہوگا۔ہم نے ماضی میں انتشار کے نقصانات دیکھے ہیں اگر ہم اب بھی ہوش میں نہیں آئے تو پھر تباہ ہونے اور قصہ پارینہ ہونے سے کوئی نہیں بچا سکتا ہے۔

اتحاد بمعنی برداشت ورواداری:

اتحاد کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اپنا مسلک چھوڑ دیں، اپنی جماعت سے الگ ہو جائیں یا اپنی برادری سے باہر نکل جائیں یہ سب پہچان کے لیے ہیں اس پر قائم رہیں بس اس سے جڑی جو عصبیتیں ہیں اس سے باز آئیں۔اختلاف کے باوجود ایک دوسرے کو برداشت کرنے کا سلیقہ سیکھیں اور متحدہ نکات پر ساتھ چلنے کا داعیہ پیدا کریں جن باتوں میں ملت میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔مثلاً خدا کی وحدت اور حضورؐ کی رسالت اور ختم نبوت، قرآن کے کتابِ ہدایت ہونے، نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کے فرائض، اخلاق و خدمت، تعلیم اور نیکی کا فروغ، برائی، منکرات اور گناہ سے اجتناب، مسلمانوں کی عزت، حفاظت، راحت و آبادکاری کے کام ان امور میں مل جل کر آگے بڑھیں اپنی زبان، شریعت، دینی اداروں کی حفاظت، اوقاف اور شعائر اسلامی کی حفاظت، بچوں کی تعلیم، عورتوں کے حقوق، صحت و حفظان صحت کا التزام، پاکی صفائی موذی امراض سے بچاؤ ان امور میں مشترکہ اور متحدہ جدو جہد کو فروغ دیں اور بلا لحاظ مسلک و جماعت، برادری اور رنگ ونسل مل جل کر ان کاموں کو انجام دیں۔ پھر دیکھیں کس طرح ان کی برکت سے پورا معاشرہ اچھائی اور بھلائی سے بھر جاتا ہے، اور مسلمانوں کی کھوئی

عزت واپس آتی ہے۔ اس معاملہ میں ہمارے نوجوانوں کو آگے آنے کی ضرورت ہے۔ ایسے نوجوان جو اسکول کالج، مدرسہ اور دیگر اداروں میں تعلیم حاصل کررہے ہیں، نوکری پیشہ ہیں یا تجارت کررہے ہیں، ان کو آگے بڑھ کر ملت کو جوڑنے کے عمل میں سرگرمی سے حصہ لینا چاہیے، اور جو لوگ ملت کو توڑنے یا لڑانے کی کوشش کرتے ہیں پہلے تو ان کو سمجھا بجھا کر اس سے باز رکھنے کی کوشش کریں اور اگر اس کے بعد بھی نہ مانیں تو ان کا بائیکاٹ کریں اور انہیں ملت میں انتشار پھیلانے سے روکیں۔ ہماری علما اور دینی رہنماؤں سے بھی گذارش ہے کہ وقتی، ذاتی اور گروہی فائدہ کے لیے ملت کو توڑنے کی کوشش نہ کریں۔ بلکہ جوڑنے میں مدد کریں۔ ہمارے جو سیاسی اور سماجی قائدین ہیں دانشور اور صحافی حضرات ہیں ان سے بھی گذارش ہے کہ وہ نوشتہ دیوار کو پڑھنے کی کوشش کریں۔ اپنے عافیت کدوں سے باہر نکلیں اور ملت کو جس طرح اور جتنا جوڑنے میں مددگار ہوسکتے ہیں اپنی سی کوشش ضرور کریں۔ ہمارے پاس اینٹ پر اینٹ رکھی ہوئی ہے صرف اس میں سیمنٹ اور بالو ملا کر لگا دینا ہے یہ بکھری ہوئی اینٹ ایک مضبوط دیوار بن جائے گی۔ ہم میں وہ صلاحیت ہے۔ ملت کے اندر یہ تڑپ بھی موجود ہے۔ لہٰذا ایک مثبت پہل کی ضرورت ہے۔ اگر ہمارے دینی وسیاسی قائدین دانشور اور اعلیٰ طبقہ کے لوگ اپنے اندر تھوڑی سی وسعت پیدا کریں تو ملت کل بھی متحد ہونے پر آمادہ تھی اور آج بھی متحد ہونے کو تیار ہے۔ انتشار ہماری اوپری سطح پر ہے جس نے نیچے کے لوگوں کو منتشر کر رکھا ہے۔

ملت کو جوڑنے کی ماضی میں تمام کوششیں ناکام ہوچکی ہیں اور لوگ جتنی مشکل سے جمع ہوئے اتنی ہی آسانی سے بکھر گئے۔ مگر اس کی وجہ سے ہمت ہارنے کی ضرورت نہیں ہے۔ قائدین میں اتحاد کا داعیہ ہو یا نہ ہو عوام میں اور بالخصوص نوجوانوں میں یہ داعیہ پوری شدت کے ساتھ موجود ہے۔ لہٰذا ہمیں پھر سے اس کی کوشش کرنی چاہیے اور بہار کو اتحاد ملت کا تجربہ گاہ بنانے پر غور کرنا چاہیے۔ یہ اتحاد مسلک اور جماعت کی بنیاد پر نہیں ہوگا۔ بلکہ مدوں اور امور کی بنیاد پر ہوگا۔ مشترکہ امور میں مشترکہ حکمت عملی اختیار کرکے اور اجتماعی قیادت کا ایک ایسا نظم پیدا کرکے جس میں سب کو ساتھ لے کر چلنا ممکن ہو اور سب کو صحیح مقام اور رول ملے یہ تجربہ

کیا جاسکتا ہے، بلکہ یہ تجربہ کرنا چاہیے۔ اگر سب نہیں پچاس فیصد لوگ بھی اس فکر سے اتفاق کرکے آگے آنے کو تیار ہوجائیں تو پھر ایک بڑی تبدیلی لائی جاسکتی ہے۔ اگر آدمی عزم وارادہ کرلے تو ایسی ہوا فضا بنانا ناممکن نہیں ہے۔

دوسروں سے سبق لیں:

ہم دیکھ رہے ہیں کہ ملک میں بڑی بڑی سیاسی جماعتیں اور لیڈران وقت اور حالات کے مطابق اپنے مفادات اور انا کو طاق پر رکھ کر ایک دوسرے سے گلے ملنے اور ہاتھ ملانے اور ساتھ چلنے کو تیار ہوجاتے ہیں۔ یہاں تک کہ اپنی پارٹی کا وجود ختم کرکے اور اپنی شناخت مٹا کر ایک ہوجاتے ہیں۔ ایک وقت تھا جب جن سنگھ نے خود کو جنتا پارٹی میں ضم کردیا تھا اور اپنے وجود کو ختم کرکے ملک کی سیاست میں ایسی پیٹھ بنائی کہ جب جنتا پریوار منتشر ہوا تو وہ نئے اوتار میں سامنے آئی اور بھارتیہ جنتا پارٹی کے نام سے دوبارہ ایسی جدوجہد شروع کی کہ آج ملک کے اقتدار پر قابض ہے۔ اس وقت ملک میں اس کے مقابل کوئی پارٹی نہیں۔ حالیہ پندرہویں لوک سبھا الیکشن میں ہار کے بعد جنتا پریوار کے دوبارہ انضمام کی کوشش ایک حالیہ مثال ہے۔ ان ڈی اے اور یو پی اے کا قیام بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ ایسے سیکڑوں تجربات ہے ہیں جن سے ہم سیکھ سکتے ہیں بشرطیکہ ہمارے اندر صحیح طور پر سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت ہو اور وقت کے مطابق فیصلہ لینے کی اہلیت ہو۔

قیادت کا مسئلہ:

اس وقت ہمارا سب سے بڑا مسئلہ قیادت کا فقدان ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ قیادت کہاں سے آئے گی؟ قیادت نہ قبروں سے اٹھ کر آئے گی اور نہ آسمان سے اس کا نزول ہوگا۔ قیادت اپنی صفوں سے ہی پیدا کرنی ہوگی۔ اپنے موجودہ قائدین کی خامیاں گنا کر ہم اس خلاء کو پُر نہیں کرسکتے ہیں۔ ان کو عزت دینی ہوگی۔ ان پر اعتماد کرنا ہوگا۔ ان کا ساتھ دینا ہوگا اور ان کو مشورہ دینا ہوگا اور مل جل کر ایسا ماحول بنانا ہوگا تاکہ ہمارے قائدین یہ محسوس کریں کہ جب

تک ہم اپنی انا کے گنبد سے باہر نہیں نکلتے عوام ہماری بات نہ سنے گی اور نہ مانے گی۔ جب نیچے سے دباؤ بنایا جائے گا تو اوپر کے لوگ دباؤ محسوس کریں گے۔ اس لیے ایک بڑا کام یہ ہے کہ ملت میں بیداری پیدا کی جائے، نوجوانوں کو جوڑا جائے اور ان کو مشترکہ قیادت کے حق میں آواز بلند کرنے کے لیے تیار کیا جائے۔ اس طرح Grassoot level سے زمینی اور حقیقی قیادت پیدا کرنے کی کوشش کی جائے تو ایک فطری عمل کے ذریعہ اس خلاء کو پُر کیا جاسکتا ہے۔ ایک بار جب یہ مرحلہ شروع ہوگا تو ہم دیکھیں گے کہ ہمارے دیہاتوں، قصبوں اور شہروں میں ایسے ہزاروں لوگ ابھر کر آئیں گے جو مختلف قسم کی قائدانہ صلاحیتیں رکھتے ہیں اور ان کے زور و اثر سے ایک نئی قوت پیدا ہوگی۔ جو ہماری تقدیر بدل دے گی۔

گاندھی جی جب ساؤتھ افریقہ سے ہندوستان آئے تھے تو پوری قوم ڈری سہمی تھی۔ انگریزوں نے ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی کو کچل کر رکھ دیا تھا اور تمام عسکری تحریکیں دم توڑ چکی تھیں، لوگوں کے حوصلے خطا ہو چکے تھے۔ انگریز ظلم و بربریت کا ننگا ناچ کر رہے تھے لوگ پولیس کی لال پگڑی دیکھ کر ڈر کر گھر کا دروازہ بند کر لیتے ہیں۔ مگر گاندھی جی نے پورے ملک میں گھوم کر لوگوں کو سچائی اور عدم تشدد کا سبق پڑھایا۔ بے خوفی اور بے لوث خدمت کی تعلیم دی، سماج کی برائیوں کو ختم کرنے پر زور دیا، عورتوں اور مظلوموں کے حق میں آواز اٹھائی۔ ایک نئی سماجی بیداری پیدا کی۔ دیکھتے دیکھتے لوگوں کے دل و دماغ میں تبدیلی آئی۔ حکومت وقت کا خوف کم ہونے لگا۔ لوگ مجتمع ہونے لگے۔ ہر جگہ چھوٹی بڑی قیادت پیدا ہوئی۔ پولیس کی لاٹھی برسے، لوگوں پر جھوٹے مقدمات چلے۔ جیلوں کو بھر دیا گیا، مگر قوم بیدار ہو چکی تھی۔ کمزوروں اور ڈرے سہمے لوگوں میں ہمت آگئی تھی اب وہ بڑے سے بڑے افسر اور حکمراں کے سامنے سینہ تان کر کھڑے ہونے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستانی جو جنگ کم وبیش ۱۵۰ سال کی مسلح جدو جہد کے بعد بھی نہیں جیت سکے۔ محض بیس سال کی پرامن مگر متحدہ جدو جہد کے نتیجے میں جیتنے میں کامیاب ہوگئے اور برٹش سامراج جس کی حکومت میں سورج نہیں ڈوبتا تھا، ہندوستان کی آزادی کے بعد ایسا غروب ہوگیا کہ خود انگلینڈ میں کبھی کبھی طلوع ہوتا ہے۔ یہ اتحاد و جمعیت کی وجہ سے ہوا

۔ ہر جنگ صرف تلوار سے نہیں لڑی جاتی ہے بلکہ قوت ارادی، صحیح سوچ اور صحیح طریق عمل سے لڑی جاتی ہے۔ اور جیتی بھی جاتی ہے۔ اقبال نے کہا تھا مومن ہو تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی۔ اس وقت ہمیں تلوار کی نہیں علم اور اتحاد کی ضرورت ہے۔ اگر ہم ان دو ہتھیاروں سے لیس ہوں گے تو اپنی بگڑی تو سنوار ہی لیں گے، دوسروں کی بگڑی سنوارنے میں بھی کامیاب ہوں گے ۔اور جس کے اندر یہ صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے وہی وقت کا قائد ہوتا ہے۔ کیا ہم اس طرح سوچنے اور پہل کرنے کے لیے تیار ہیں؟ میرا یقین ہے کہ ہمارے پاس اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں ہے۔ ہندوستان ایسے مسلمان کی راہ دیکھ رہا ہے۔ اس وقت ہمارے پاس کھونے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے اور پانے کے لیے ایک جہان شش جہات ہے۔ ہمیں جو کچھ ملے گا اتحاد و اجتماعیت سے ملے گا۔ لہذا اس کی کوشش ہر سطح پر اور ہر وقت جاری رہنی چاہیے۔

فرقہ وارانہ خیر سگالی:

اس سلسلہ کی تیسری پہل فرقہ وارانہ خیر سگالی ہے۔ ہم ایک مشترکہ سماج اور ریاست میں رہتے ہیں لہٰذا نہ تو ہم الگ تھلگ رہ سکتے ہیں اور نہ متحارب اور متصادم ہو کر رہ سکتے ہیں ہندوستان ایک کشتی ہے جس میں ہندو، مسلمان، سکھ عیسائی سب سوار ہیں کچھ لوگ یقیناً اس کشتی سے مسلمانوں کو دھکیل کر نیچے گرانا اور ڈوبانا چاہتے ہیں۔ مگر ان کی ایسی کوشش کبھی کامیاب نہیں ہوگی۔ اگر اس ملک کے مسلمان ڈوبیں گے تو پوری کشتی ڈوب جائے گی کوئی نہیں بچے گا۔ یہ بات ہر سمجھدار ہندوستانی کو معلوم ہے اس لیے اس ملک میں ایک بڑا طبقہ ایسا موجود ہے جو اس فکر اور اس ذہنیت کی مخالفت کرتا ہے۔ ہندوستان کے عام عوام ،مزدور کسان شہری دیہاتی جو اس ملک کا سواد اعظم ہیں ایسی کسی فکر کے حامی نہیں ہے۔ برداشت و رواداری اس ملک کے خمیر میں ہے۔ لہٰذا ہندوستان کے ذہن و مزاج کو اتنی آسانی سے نہیں بدلا جا سکتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ شر اور انتشار کی قوتیں بہت منظّم اور سرگرم ہیں جب کہ خیر و رواداری کی حامل قوتیں سہل پسندی سے کام لے رہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان قوتوں کو راہ پانے کا موقع

مل رہا ہے اور حال کے دنوں میں انہیں قبولیت اور مقبولیت حاصل ہو رہی ہے۔ اور وہ سماج و سیاست پر قابض ہو رہے ہیں اور ملک کی ہوا فضا کو مسموم کر رہے ہیں۔ اس پر بند ھ باندھنے کی ضرورت ہے۔ مسلمان ہمیشہ Receiving end پر رہے ہیں اور انہوں نے دوسروں کے رحم و کرم اور شفقت و مہربانی پر جینے کی عادت ڈال لی ہے۔ یہ بات قومی اور ملی حیثیت سے بہت نقصان دہ ہے جب اللہ نے ہمیں دو پاؤں عطاء کئے ہیں اور وہ صحیح و سالم ہیں تو پھر بیساکھی کے سہارے چلنے کی عادت ڈالنا خود کو ذلیل اور بے عزت کرنے کے مترادف ہے۔

یہ ملک ہمارا ہے۔ یہاں کے لوگ ہمارے بھائی بند ہیں۔ ان کی بھلائی میں ہماری بھلائی ہے، ان کے نقصان میں ہمارا نقصان ہے۔ اگر ملک میں امن اور بھائی چارہ ہوگا تو سب کو فائدہ ہوگا اور اگر ملک میں بدامنی اور انتشار ہوگا تو سب کا نقصان ہوگا۔ لہذا ملک میں امن، بھائی چارہ، محبت اور آپسی میل ملاپ کی کوشش سب کو مل جل کر کرنی چاہیے اور اس معاملہ میں مسلمانوں کو اپنی تنگ ذہنی اور بے جا خوف کو چھوڑ کر پوری وسعت ذہنی اور وسعت قلبی کے ساتھ خیر و رواداری کی فضا بنانے کی کوشش میں سرگرم حصہ لینا چاہیے۔

لہٰذا مسلم جماعتوں اور اداروں کو، دانشوروں اور صحافیوں کو، علما، سماجی وسیاسی کارکنوں کو، نوجوانوں اور فعال افراد کو آگے بڑھ کر انسانی بھائی چارہ اور فرقہ وارانہ خیر سگالی کو فروغ دینے کے لیے آگے آنا چاہیے اور ایک پلیٹ فارم بنا کر منظم جدو جہد کا آغاز کرنا چاہیے۔ ہمیں اپنی ملت میں بھی اور دوسری ملتوں کے درمیان بھی خدمت و محبت کے ساتھ بہتر انسانی رشتہ کی پہل کرنی چاہیے۔ بھوکا، بیمار، مظلوم اور پریشان حال جو بھی ہے ہمارا دست تعاون دراز ہونا چاہیے۔ انسان کو انسان سمجھنا اور اس کے ساتھ عزت، محبت، رواداری انصاف اور اخلاص سے پیش آنا ایک مسلمان کی پہچان ہونی چاہیے۔

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے:

وقت آ گیا ہے کہ ہم اپنی تنگ نائیوں سے باہر نکلیں، اپنے ذہنی تحفظات کو ختم کریں،

خود کو محصور اور حصار بند نہ رکھیں بلکہ ملک کے تمام ہندوؤں، سکھوں، عیسائیوں، تمام برادریوں، ذاتوں اور جماعتوں سے بہتر انسانی رشتہ استوار کریں۔ ایک دوسرے سے Dialogue process شروع کریں ان کا نقطۂ نظر معلوم کریں، اپنا نقطۂ نظر بتائیں۔ اتفاق اور اختلاف کا معروضی جائزہ لیں۔ کن امور میں اشتراک ہوسکتا ہے، اس کو دیکھیں، کن امور میں اشتراک ممکن نہیں ہے اس کو الگ کریں۔ اختلاف کے باوجود پُر امن بقائے باہم کی کیا صورت ہوسکتی ہے، اس کا شعوری جائزہ لیں اور پورے یقین و اعتماد کے ساتھ ملک کی تعمیر اور سماج کی بہتری میں اپنا رول پلے کریں۔

محبت اور خدمت کے لیے، ظالم کا ہاتھ پکڑنے کے لیے، مظلوم کی مادی اور معنوی مدد کے لیے کسی بحث و تمحیص کی ضرورت نہیں ہے۔ لہذا ہم صرف اپنے مسائل اور مصائب کا رونا نہ روئیں اور مظلوم و کمزور بن کر جینے کی عادت ترک کریں۔ ہم تمام مظلوموں اور مصیبت زدہ لوگوں کا ہاتھ تھامنے والے بنیں اور اس طرح تمام مظلوموں کو جوڑ کر ایسی قوت بنانے کی کوشش کریں جو ظالموں کا گریبان تھام سکے اور ان کو ظلم سے باز رکھ سکے۔

یہ اس وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے لہٰذا مسلمانوں کے تمام سمجھدار افراد اور جماعتوں کو سر جوڑ کر بیٹھنا چاہیے اور اس جانب پہل کرنی چاہیے آپ اس راہ پر دو چار قدم چل کر دیکھیں آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ کیسے نفرت کی موجودہ فضا اس نئی اور صاف ہوا کے سمپرک میں آ کر خوشگوار ہو جاتی ہے۔

یقیناً یہ مشکل اور صبر آزما کام ہے اور ابتدا میں بہت سی رکاوٹیں اور مشکلات آئیں گی۔ مگر یہ ایک ضروری کام ہے جس پر ملت کی بقا و استحکام اور ہندوستان کی امن و سلامتی نیز ترقی اور استحکام منحصر ہے۔ اور ایک محبِّ وطن قوم ہونے کے ناطے ہمیں یہ فریضہ انجام دینا ہوگا۔

تین محاذ، تین طبقات اور جمہوری و آئینی طریق کار:

اس طرح ہمیں اس وقت تین محاذ پر کام کرنے کی ضرورت:

(۱) مسلمانوں کی اندرونی اصلاح اور تعلیم پر زور۔

(۲) مسلمانوں میں اتحاد و جمعیت کی کوشش۔

(۳) فرقہ وارانہ خیر سگالی اور بہتر انسانی رشتہ کے فروغ پر زور۔

ان کاموں کے لیے ہمیں ابتداءً تین طبقات کو جوڑنا ہوگا۔

(۱) علماء، دانشور، صحافی، سرگرم سماجی وسیاسی کارکنان وغیرہ۔

(۲) طلباء اور نوجوان

(۳) خواتین اور پسماندہ برادریاں وغیرہ۔

اس طرح ہمیں گھر گھر، گاؤں گاؤں اور شہر شہر، جا کر ایسے تمام افراد کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر جمع کرنا ہوگا جو موجودہ حالات سے پریشان ہیں اور کچھ کرنا چاہتے ہیں۔ مگر انہیں یہ نہیں معلوم ہے کہ کیا کرنا ہے، اور کیسے کرنا ہے؟ ان کے جوش و جذبہ کو تمام منفی رجحانات سے بچا کر ایک تعمیری رخ دینا ہوگا۔ ہمارے گاؤں اور شہروں میں ایسے ہزاروں افراد ہیں جو ہماری طرح سوچتے ہیں اور ہم سے جڑ سکتے ہیں۔ ہمیں ان کو تلاش کرنا ہے اور ایک کارواں بنانا ہے اور اللہ کا نام لے کر اپنی بگڑی سنوارنے کے لیے اپنی بساط بھر اپنی سی کوشش کرنی ہے۔

ہم فی الوقت ہر طرح کے تعصب اور تشدد سے بچتے ہوئے پُر امن، آئینی اور جمہوری طریقے سے اپنی کوشش شروع کریں اور ابتداء پمفلٹ، ہنڈ بل، اخباری بیانات، مضامین، پریس کانفرنس، چھوٹے بڑے جلسے، ٹی پارٹی، ضلعی اور صوبائی کانفرنس، سمپوزیم، سیمینار اور ریسرچ اسٹڈیز کے ذریعہ مندرجہ بالا امور پر عام بیداری پیدا کرنے کی کوشش کریں تا کہ ہماری آواز مؤثر ہو اور ہم مل جل کر حالات کی اصلاح کے لیے آگے آئیں۔ اللہ ہمارا حامی و ناصر ہو۔

(آمین)

ہندوستان میں مسلمانوں کے مسائل اوران کاحل

۲/ جون ۲۰۱۱ء کو پٹنہ کے رونددر بھون میں ای ٹی وی اردو ہندی چینل کے چیف جگدیش چندرا نے اقلیتوں کے مسائل پر ایک روزہ قومی سیمینار کا انعقاد کیا تھا جس میں ملک کی تمام سیاسی جماعتوں کے بیشتر مسلمان نمائندوں نے حصہ لیا۔ کچھ علمائے کرام، دانشور اور صحافی حضرات کے ساتھ بہار سرکار کے مکھیا شری نتیش کماراوران کے نائب سوشیل مودی وغیرہ شریک تھے۔ سابق وزیراعلیٰ بہار جگناتھ مشرا جن کی اقلیت دوستی مشہور رہی ہے وہ بھی شریک ہوئے۔

مسلمان ہندوستان کی اٹوٹ اکائی ہیں مسلمان کا مسئلہ ہندوستان کا مسئلہ ہے:

اس سیمینار میں اقلیتوں کے سلسلے میں جو گفتگو ہوئی وہ زیادہ تر رٹی رٹائی تھی، اور لفاظی زیادہ تھی۔ ہر پارٹی اور فرد نے اپنی پارٹی کی تعریف کی اور خوب اپنی پیٹھ تھپ تھپائی۔ گفتگو اور بات چیت کے علاوہ کوئی کمٹ منٹ، کوئی روڈ میپ اور کوئی منصوبہ بندی نظر نہیں آئی جو ان کے مسائل کے دیر پا حل میں مدد گار ہو سکے۔ مسلمانوں کے مسائل کے سلسلے میں ملی پہل (Community initiative)، حکومت، اکثریت اور سول سوسائیٹی کے رول پر بھرپور گفتگو نہیں ہوئی۔ اگر میں تمام سیاسی جماعتوں کے سربراہان اور ذمہ داران کے اقوال و بیانات کو فیس ویلو میں لوں تو سب مسلمانوں کی حالت زار سے پریشان ہیں، ان سے ہمدردی رکھتے ہیں اور اپنا دل اور کلیجہ نکال کر دینے کو تیار ہیں۔ اتنی حمایت اور ہمدردی کے باوجود مسلمان اس ملک

میں ڈرے سہمے، پس ماندہ، نفسیاتی عدم تحفظ کا شکار، احساس کمتری میں مبتلا، حاشیہ پر کھڑے، دوسرے درجہ کے شہری کی حیثیت میں کیوں ہیں؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ ان کی عوامی گفتگو اور خلوت میں ان کی سوچ اور پالیسی میں تضاد ہے۔

ہندوستان میں مسلمانوں کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ دستور کا حلف لینے والے حضرات دستور کے وفادار نہیں ہیں۔ اگر بھارت میں دستور کا ایمانداری سے نفاذ ہو تو مسلمان اقلیت کے مسائل کا حل ڈھونڈنا آسان ہوجائے گا۔ اس لیے یہ اقلیتوں کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ دستور کے ایماندارانہ نفاذ میں پیدا شدہ بحران کا مسئلہ ہے۔ جب دستور کا حلف لینے والے لوگ ہی اس کو ناکام اور معطل بنانے کی کوشش کریں گے تو ملک کی سالمیت، اتحاد، امن اور خوش حالی سب پر خطرہ لاحق ہوگا۔ مسلمان اقلیت کا مسئلہ اس کی واضح علامت ہے۔ اس لیے مسلمانوں کے مسئلے کو ملک سے الگ کر کے مت دیکھئے۔ مسلمان ہندوستان کی اٹوٹ اکائی ہے، جس کو کاٹ کر، جلا کر، مار کر، توڑ کر کسی صورت میں اس ملک سے الگ نہیں کیا جاسکتا ہے۔ بھارت اسلام اور مسلمان کا دوسرا سب سے بڑا اور سب سے اچھا گھر ہے۔ مسلمان جان دیدیں گے مگر اس ملک سے الگ نہیں ہوسکتے ہیں یہ گنگا ہمالہ ہوا پانی دھوپ اور دھرتی کی طرح لازمی عنصر ہیں۔ مسلمان کو چھوڑ کر ہندوستان کی کوئی تعریف یا تصویر ناقص اور نامکمل ہی نہیں بلکہ جھوٹی اور غلط ہوگی اور شاید ایسا کرنا ناممکن بھی ہے۔

مسلمانوں کے مسائل

(۱) مسلمانوں کا سب سے پہلا مسئلہ غربت، جہالت، بھوک، بیماری اور بے کاری ہے۔ یہ صرف مسلمانوں کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ اس ملک کے تمام غریب، کمزور، پسماندہ اور محروم طبقات کا مسئلہ ہے۔ لہٰذا اس مسئلہ کو مشترکہ انسانی اور عوامی مسئلہ کے طور پر دیکھنا چاہیے۔

پلاننگ کمیشن کے ذریعہ جاری کردہ سریش تندولکر کمیٹی کی رپورٹ کے مطابق

2009-10 میں غریبی کا جو جائزہ پیش کیا گیا ہے اس میں کہا گیا ہے کہ پورے ملک کی سطح پر HCR یعنی Head Count Ratio میں 2004-05 کے مقابلے 2009-10 میں غریبی کے Percentage point میں 7.3% کی کمی ہوئی ہے۔ یعنی 2004-05 میں 37.2% غریبی تھی جو 2009-10 میں کم ہوکر 29.8% ہوگئی۔ دیہی غربت میں 8.0% کی کمی ہوئی ہے جو 41.8% سے 33.6% ہوگئی اور شہری غربت میں 4.8% کمی ہوئی جو 25.7% سے گھٹ کر 20.9% ہوگئی۔

دیہی علاقوں میں درج فہرست قبائل میں سب سے زیادہ غربت دیکھنے کو ملتی ہے جو 47.4% ہے، درج فہرست ذاتوں میں 42.3% ہے اور دیگر پسماندہ برادریوں میں 31.9% غربت ہے اور مجموعی اعتبار سے تمام طبقات میں 33.8% ہے۔

سکھوں میں دیہی علاقوں میں سب سے کم HRC یعنی فی کس غربت ہے۔ ان میں دیہی علاقوں میں غربت کی شرح 11.9% ہے۔ شہری علاقوں میں کرشچن سب سے کم غریب ہیں جن کی شرح 11.9% ہے۔

دیہی علاقوں میں مسلمانوں میں غربت پورے ملک میں سب سے زیادہ یعنی 33.9% ہے۔ اسی طرح شہروں میں بھی مسلمانوں میں غربت کا تناسب سب سے زیادہ 26.5% ہے۔

(۲) مسلمانوں کا دوسرا مسئلہ ان کے تحفظ اور شناخت کا مسئلہ ہے۔ فسادات اور دہشت گردی کے نام پر ان کو مستقل خوف اور عدم تحفظ کے ماحول میں رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے تاکہ وہ کھل کر اپنی صلاحیتوں کے مطابق جینے کا حوصلہ پیدا نہ کرسکیں۔ ایک گھیٹوسوچ Ghetto mentality کے ساتھ بند خول میں جینے پر مجبور رہیں۔ مسلمان ایک دینی وملی گروہ ہیں جن کے عقائد، مقامات عبادات، دین وشریعت، زبان وتہذیب، تعلیم گاہیں اور اوقاف وثقافت پر ہرآن شب خون مارنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ لہٰذا وہ دن رات اپنی بچاؤ کی فکر میں سرگرداں نظر آتے ہیں اور

ہر موہوم سہارے کی طرف دوڑ پڑتے ہیں جب کہ وہ ایک فریب فکر ونظر کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ ہندوستان کی آزادی کے بعد کی تاریخ اس حقیقت کی منہ بولتی تصویر ہے۔

(۳) مسلمانوں کا تیسرا مسئلہ طاقت اور حصہ داری کا فقدان ہے۔ تعلیم گاہیں ہوں کہ تجارت وصنعت کے مراکز، زراعت ہو یا مویشی پروری، انتظامیہ، پولیس، فوج ہو یا تکنیکی اور فنی میدان، ایوان سیاست ہو یا سرکاری اور نجی سکٹر تمام تر شعبہ جات اور اداروں میں مسلمانوں کی نمائندگی صفر سے تھوڑا اوپر ہے۔ اس وقت ہندوستان Inclusive نہیں Exclusive growth کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ملک میں Participatory Democracy کے بجائے Ethnic اور Majoritarian democracy ہے۔ ہندوستان کی ۲۰ ؍ایسی ریاستیں اور پانچ یونین ٹیریٹری ہیں جہاں کسی بھی پارٹی کا ایک بھی مسلمان ممبر، پارلیامنٹ کے دونوں ایوانوں میں سے کسی ایوان کا رکن نہیں ہے، یہی حال ریاستی اسمبلیوں کا بھی ہے۔ یہ جمہوریت نہیں ہے بلکہ جمہوریت کا فقدان ہے۔

میڈیا کا رول

(۴) میڈیا کو حکومت، حزب اختلاف اور عدلیہ کے بعد جمہوریت کا فورتھ اسٹیٹ یا چوتھا کھمبا کہا جاتا ہے۔ یہ سماج کی آنکھ اور اس کی زبان مانا جاتا ہے اور اس کو جمہوریت میں حقائق کو سامنے لانے اور حکومت اور دیگر اداروں پر بے باکانہ تنقید کرنے کی پوری آزادی حاصل ہے اور ملک کے ننانوے فیصد لوگوں کا وہی ذریعہ معلومات ہے۔ لہٰذا میڈیا جو چھاپتا ہے، بولتا ہے اور دکھاتا ہے لوگ اسی کو سچ مان کر اسی کے مطابق اپنی رائے بناتے ہیں اور اپنا رویہ طے کرتے ہیں۔ اس میڈیا نے مسلمانوں کی شبیہ بگاڑنے اور ان کے سلسلے میں غیر ہمدردانہ رویہ پیدا کرنے میں اہم رول

ادا کیا ہے۔

بھارت میں پرنٹ میڈیا اور الیکٹرونک میڈیا یہاں تک کہ فلم، تھیٹر، ڈراما اور فائن آرٹ میں چند مستثنیات کو چھوڑ کر باقی سب نے امریکن اور یورپین حکومت اور میڈیا کی نقالی میں مسلمانوں کو بالعموم ڈارکسٹ کلر میں پیش کرنے کا بیڑا اٹھالیا ہے، گویا اس قوم میں کوئی اچھائی ہے ہی نہیں۔ کل تک میرا خیال تھا کہ پاکستان امریکہ کی ۵۳ ویں ریاست ہے اور آج میرا احساس ہے کہ ہماری مین اسٹریم میڈیا جس میں ہندی، انگریزی اور دیگر علاقائی زبانوں کا میڈیا آتا ہے، نے بھارت کو امریکہ کا ۵۴ واں ان ڈکلیرڈ اسٹیٹ بنادیا ہے۔ اور وہ امریکی اور اسرائیلی خارجہ پالیسی کے محض ڈھنڈورچی بن کررہ گئے ہیں۔ پتہ نہیں ان کو اس وفاداری کی قیمت ملتی ہے یا وہ مسلم دشمنی میں ان کے دشمن کو دوست مان کر یہ کام کرتے ہیں یا محض فیشن پرستی میں اقتدار وقت سے اپنی قربت دکھا کر بااثر بننے کی کوشش کررہے ہیں۔ آخر ان کی معلومات اور دماغ وقلم انہیں سے تو مستعار ہیں۔ ان کے پاس نہ آزادانہ ذرائع ہیں اور نہ سوچ۔ اگر کچھ ہے بھی تو ان کی کوشش دکھانے سے زیادہ چھپانے کی ہوتی ہے اور وہ چیزوں کو بہت ہی Distorted شکل میں پیش کرتے ہیں۔

ہندوستان کے جو میڈیا مالکان، مشیر، پالیسی ساز، ایڈیٹر، رپورٹر، اور مبصر ہیں ان کی فہم وعلم جس انداز کی ہے۔ انہیں جو تربیت ملی ہے، ان کا ذہنی سانچہ جیسا بنایا گیا ہے اور ان کے سیاسی، معاشی اور تجارتی مفاد جس انداز کے ہیں اس لحاظ سے مسلم دشمنی اور ان کی شبیہہ بگاڑ کر پیش کرنے کا عمل ایک نفع بخش کاروبار ہے۔ لہٰذا وہ پوری فنی مہارت کے ساتھ اس کام کو اس خوبی کے ساتھ انجام دیتے ہیں کہ مسلمانوں کی مظلومیت پر لوگوں کو ہمدردی کے بجائے ان پر غصہ آتا ہے اور وہ نفرت کے جذبات سے بھر جاتے ہیں۔ جمہوریت میں اگر اکثریت ایک مخصوص گروہ کے خلاف نفرت کے جذبات سے پُر ہو تو کوئی حکومت اپنا پاپولر سپورٹ گنوا کر اس کی بھلائی کے لیے کوئی قدم کیسے اٹھائے گی؟ جبکہ ملک میں ایسی پارٹیاں بھی ہیں جو مسلمانوں کو بھیک دینے پر بھی معترض ہوتی ہیں اور مسلم اپیزمنٹ کا ہوّا کھڑا کردیتی ہیں۔

امریکہ اوراس کے حلیفوں نے ساری دنیا کے مسلمان ملکوں پر قبضہ کرنے کی جومہم چھیڑرکھی ہے،قتل وغارت گری اورلوٹ کھسوٹ کا بازارگرم کررکھاہے وہاں کی حکومتیں امریکہ کی باج گزار ہیں۔عوام کی آزادی اورعزت پر ہرروز حملے ہورہے ہیں۔اس صورت حال کے خلاف کسی حکومت میں امریکی استعمار کا مقابلہ کرنے کا دم خم نہیں ہے۔حالت مایوسی میں کچھ اسپلنٹر گروپ نے اپنے ملک عوام اوروسائل کو بچانے کے لیے عسکری جدوجہد کا راستہ اختیار کررکھاہے جسے امریکہ دہشت گردی کا نام دیتاہے۔ یہ دراصل مغربی اورامریکی استعمار کے خلاف ردعمل اور جوابی کارروائی ہے۔لہٰذااسےان ملکوں کی عوامی جدوجہد کہاجاسکتاہے چونکہ یہ کارروائی ردعمل کےطور پر ہوتی ہے اس لیے Soft target کونشانہ بنایا جاتاہے۔جس میں بےقصورلوگ بھی مارے جاتے ہیں ۔ہم کسی ایسی کاروائی کی حمایت نہیں کرتے اور بےقصور عورتوں، بچوں اور عام عوام اور مسافروں کی ہلاکت کی مذمت کرتے ہیں۔اس کو جہاد کا نام دینا بھی غلط ہے۔ یہ کارروائی امریکی استعمار کے نتیجے میں بےقصورعورتوں، بچوں اور عام عوام کی ہلاکت کے ردعمل کےطور پر ہوتاہے جواتناہی قابل مذمت ہے جتنااسپلنٹر گروپ کی کارروائیاں، مگراس کوکوئی بھی امریکی دہشت گردی نہیں کہتاہے۔یہ دونوں ہی دہشت گردانہ کاروائی ہیں۔ اوران دونوں کی یکساں مذمت کی جانی چاہیے۔

چونکہ یہ گروپ مسلمان ہے اس لیے وہ اپنے مزاحمتی تحریک کو ایندھن فراہم کرنے کے لیےقومی اوراسلامی اصطلاحات کا سہارالیتاہے تاکہ عام عوام کی حمایت حاصل کی جاسکے۔ یہ بات مسلمان کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ ہرملک اور ہرقوم کےلوگ جب کوئی مزاحمتی تحریک چلاتے ہیں تواپنے قومی اورمذہبی روایات و اصطلاحات کا سہارالیتے ہیں۔ عیسائی، یہودی، ہندو، بودھ اوردیگر مذاہب واقوام میں یہ بات عام ہے۔ ہندوستان کی جنگ آزدی کے دوران ہندوقومی روایات واصطلاحات کازبردست سہارا لیا گیا۔مگریہی چیز پرتشدد کاروائی پر منتج ہوتی ہےتو بحث کودوطرح سے دیکھنا چاہیے، اولاً یہ کارروائی کتنی مفید یا کتنی نقصاندہ ہے۔دوم یہ کس گروہ اورکس گروپ کی جانب سے ہے۔عراق ،ایران ،عرب ممالک اورافغانستان، پاکستان

اور دنیا کے دوسرے مما لک میں جو پرتشدد کارروائی ہورہی ہے اگر وہ دہشت گردی کی تعریف میں آتی ہے تو اس کو عراقی ،افغانی ،عربی اور پاکستانی دہشت گردی کہا جاسکتا ہے یا پھرالقائدہ اورطالبان دہشت گردی کا نام دیا جاسکتا ہے،اورشاید اس پر کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔مگر اس کو مسلم دہشت گردی اوراس سے بڑھ کر اسلامی دہشت گردی کا نام دینا قابل اعتراض ،قابل مذمت اورقابل نفرت ہے۔ اس میں میڈیا کا رول مسلمان دشمن اوراسلام دشمن نظر آتا ہے۔ کیونکہ ان اصطلاحات کی زد میں سارے مسلمان اوردین اسلام آتے ہیں جو اپنے اندر برابری، اتحاد، بھائی چارہ،امن اورانصاف کے تمام عناصر رکھتے ہیں۔

حال کے دنوں میں دہشت گردانہ کارروائی میں کچھ ہندوؤں اور ہندو تنظیموں کے افراد کے پکڑے جانے کے بعد میڈیا میں اس کو ہندو آتنک اور بھگوا آتنک واد کہہ کر پکارا گیا تو لوگوں نے یہ کہنا شروع کردیا کہ آتنک واد کا کوئی دھرم اوررنگ نہیں ہوتا۔ اور ہندو آتنک واد کہنے یا بھگوا آتنک وادی کہنے سے ہندوؤں کے جذبات کو ٹھیس پہنچتی ہے ۔مگر جولوگ مسلم آتنک واد اوراسلامی آتنک واد کی بات کرتے نہیں تھکتے تھے جب ان پرضرب پڑنے لگی تو بلبلانے لگے ۔کیا جذبات صرف ہندوؤں ،عیسائیوں اور یہودیوں کے پاس ہیں جن کو ٹھیس لگتی ہے؟ کیا مسلمانوں اوراسلام دھرم کے ماننے والوں کے جذبات نہیں ہوتے جن کا احترام کیا جانا چاہیے؟ دراصل اس کے ذریعہ پوری مسلم قوم کو کٹگھرے میں کھڑا کرکے مجرم ثابت کرنا مقصود ہے تاکہ ان کے خلاف کی جانے والی کسی بھی کارروائی پران کو لوگوں کی ہمدردیاں حاصل نہ ہوں۔ اگران کے خلاف کچھ ہوتا ہے تو لوگ یہ سمجھ لیں کہ یہ ہوتے ہی ایسے ہیں۔اس لیے ان کے خلاف جو ہورہا ہے سب ٹھیک ہے ۔انگریزی میں ایک کہاوت ہے کہ give the dog a bad name and kill him. ایک کتے کو پاگل قرار دے دیجئے پھراس کو گولی مار دیجئے ۔لوگ کہیں گے کہ آپ نے بہت اچھا کام کیا ورنہ یہ پاگل کتا نہ جانے کس کس کو کاٹ لیتا۔اورکتنوں کی ہلاکت کا باعث ہوتا۔میڈیا کے ذریعہ مسلمانوں کی ایسی شبیہ بنانا کتنا غلط اور کتنا خطرناک ہے اوراس سے مسلم قوم کی نفسیات پر کتنا مہلک اثر پڑتا ہے اس کا اندازہ ان

لوگوں کونہیں ہوسکتا جواس قوم سے کوئی قربت اور ہمدردی نہیں رکھتے ہیں۔ ہندوستان میں ۱۷۔۱۸ کروڑ مسلم آبادی ہے۔ ہر قوم کی طرح اس میں بھی اچھے اور برے لوگ ہیں۔ مسلمانوں میں ایک گروہ ایسا ہے جومحدود ذہن رکھتا ہے۔ جس کے اندر وقت، حالات اور زمانے کی سمجھ نہیں ہے۔ بند خول میں رہنے اور جینے کے عادی ہیں۔ ان کے اندر نہ حکمت و دانائی ہے اور نہ لوچ لچک ہے۔ یہ آنکھوں پر پٹی باندھ کر چلنے والا گروہ ہے، مگر یہ بہت ہی چھوٹا گروہ ہے۔ دوسری طرف ایک دوسرا گروہ ہے جوشرابی کبابی، بدچلن اور بدکردار ہے جوخود کو پڑھالکھا، سیکولر، لبرل، روشن خیال اورترقی پسند کہتا ہے۔ اس کا صرف نام مسلمان ہے جبکہ اسلام اورمسلمانوں کی ہر چیز سے اس کونفرت ہے اوروہ اس کوتوڑ پھوڑ کراور بدل کررکھ دیناچاہتا ہے۔

میڈیا کے لوگ اکثر ان دوطبقات کو ہی مسلمانوں کے نمائندہ کے طور پر سامنے لاتے ہیں اور ان کے اقوال وکردار کی بنیاد پر پوری کمیونیٹی کی تصویر کشی کرتے ہیں۔ جبکہ یہ مسلم سوسائٹی کا بہت ہی چھوٹا حصہ ہے۔ مسلمان سماج میں خرابیاں ہیں۔ جن کی اصلاح کی ضرورت ہے۔ ہم ان خرابیوں کو چھپانا یاان پر پردہ ڈالنا نہیں چاہتے ہیں۔ انہیں اجاگر کیا جانا چاہیے مگر نیت اورطریقہ اصلاح کرنے والا ہو نہ کہ بدنام کرنے والا۔

مسلمان سماج میں ہزاروں اچھے کام ہوتے ہیں یہاں جوخلوص، للّٰہیت، تقویٰ اور پرہیز گاری کے نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں کسی اورسماج میں اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ آج بھی مسلمان سماج میں کرپشن بہت کم ہے۔ بہت کم اخلاقی گندگی پائی جاتی ہے۔ آپسی محبت، بھائی چارہ، خدمت کے جذبات، کمزوروں اورمجبوروں کا خیال یہاں جتنا رکھا جاتا ہے کسی اورسماج میں اس کے کم نمونے ملیں گے۔ مگر میڈیا کے لوگ ان باتوں پردھیان نہیں دیتے کیوں کہ اس سے ان کی ٹی آر پی نہیں بڑھے گی۔ ان کی ٹی آر پی تو نفرت، تشدد اورمنفی تصویر دکھانے سے بڑھتی ہے۔

کہیں کوئی فتویٰ مل گیا یا کسی نے الٹی سیدھی بات کہہ دی پھر دیکھئے میڈیا کس طرح

نمک مرچ لگا کر اس کا پرسار پرچار کرتا ہے۔مسلمان سماج میں عورتوں کی حالت قابل اصلاح ہے۔ان کو صحیح ڈھنگ سے امپاور کرنے کی ضرورت ہے اس کے باوجود عورت مسلمان سماج میں جتنی محفوظ ہے اور اس کو عزت واحترام اور آزادی حاصل ہے اور جو سماجی ومعاشی حقوق ملے ہوئے ہیں ابھی تک کوئی دوسرا سماج اس مقام تک نہیں پہنچا ہے۔ جہالت اور غربت نے اس سماج کی ساری خوبصورتی چھین لی ہے۔ورنہ یہ سماج کسی بھی پروگریسیو سماج سے بہتر ہے۔

میں نے میڈیا کے رول پر اتنی تفصیل سے اس لیے بحث کیا ہے کیونکہ میڈیا اس وقت ترسیل افکار کا سب سے طاقتور ذریعہ ہے۔میڈیا کی غلط تصویر کشی کی وجہ سے عام لوگوں کی مسلم سماج سے ہمدردی کم ہورہی ہے بلکہ ختم ہورہی ہے جس کی وجہ سے مسلمانوں کے ساتھ ہونے والی ظلم وناانصافی کے خلاف نہ صرف لوگوں کے اندر کوئی ردعمل پیدا نہیں ہوتا ہے بلکہ لوگ خاموش تماشائی بنے رہتے ہیں اور کچھ لوگ خوش ہوتے ہیں اور کچھ لوگ یہ سمجھتے مانتے اور کہتے ہیں کہ یہ لوگ ہیں ہی اس برتاؤ کے لائق۔ جب یہ صورت حال پیدا ہوجائے تو بتایئے مظلوموں اور کمزوروں کی داد رسی کیسے ہو سکے گی ؟ میڈیا نے جو عوامی رجحان بنایا ہے اور ایک چھپی نفرت اور (Indifference) یا عدم تعلق کی کیفیت پیدا کی ہے اس کی وجہ سے بھی سیاسی جماعتیں اور انصاف پسند مبصرین بھی ان کے حق میں کچھ کہنے یا کرنے سے گھبراتے ہیں کیونکہ میں اور وہ کے اس فرق نے اقلیت اور اکثریت کے درمیان ایسی دوری پیدا کردی ہے کہ گویا ایک کا حق دوسرے کا حق مارے بغیر نہیں دیا جاسکتا ہے۔ یقیناً کچھ میڈیا کا کردار اچھا بھی ہے، جس نے مسلمانوں کی حمایت میں لمبی دوری طے کی ہے۔ گجرات فساد میں میڈیا نے اپنا رول نہیں ادا کیا ہوتا تو مظلوموں کی آواز کب کی دبادی گئی ہوتی۔مگر صرف اتنے سے کام نہیں چلے گا، میڈیا کو proactive رول ادا کرنا ہوگا۔

مسلمان سماج کی خامیوں کو اجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی اچھائیاں بھی سامنے لانی ہوں گی، اور ان کے ساتھ انصاف کا رویہ اختیار کرتے ہوئے انسانوں کی طرح برتاؤ کرنا ہوگا۔تبھی عام عوام میں ان کے بارے میں ایک مثبت اور ہمدردانہ رویہ پیدا ہوگا، اس لیے

میں مسلمانوں کے مسائل میں میڈیا کے رول کوایک بڑا مسئلہ مانتاہوں جس پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

سیاسی پارٹیوں کا کردار

(۵) ہندوستان میں کثیر جماعتی دستوری جمہوریت قائم ہے۔ ملک کے تمام شہریوں کو بلالحاظ مذہب وملت، رنگ ونسل، علاقہ، زبان وجنس یکساں شہری حقوق حاصل ہیں اور بالغ رائے دہندگی کی بنیاد پر ہر کسی کوووٹ کا اختیار ہے جس کے ذریعہ وہ اپنی مرضی کی پارٹی یافردکوووٹ دے سکتاہے اوراپنی پسند کی سرکار بناسکتاہے۔آزاداور جدید ہندوستان کا تمام ترکمیوں کے باوجود یہی وہ حسن وطاقت ہے جس نے پوری دنیامیں اس کوممتاز ومحترم بنارکھاہے اور عالمی برادری میں ہندوستان کی آواز ایک جدیدترقی پذیرملک کےطور پرتوجہ سے سنی جاتی ہے۔

ہندوستان میں ہندو اپنی تمام تر عقائد و افکار، تہذیبی، تمدنی، سماجی فرق وتفاوت، لونی، لسانی اورعلاقائی اختلافات کے باوجود مذہباً اورنسلاً ملک کی کل آبادی کا82% ہیں۔ ہندو قوم جن افراد سے معنون ہے وہ اسی خطہ ارض میں رہتی ہے، اورآبادی کے اعتبار سے دنیا کی چوتھی بڑی قوم شمار کی جاتی ہے۔اس ملک میں اقلیتوں کی کل آبادی 18% ہے، جس میں مسلم سکھ، عیسائی، بودھ، جین، زرتشت ، یہودی ، بہائی، اور کچھ دیگر اقلیتیں ہیں۔ان اقلیتوں میں مسلمان سب سے بڑی آبادی یعنی 14% ہیں۔ ملک میں 130 کروڑ سے زائد آبادی میں مسلمان کم وبیش 20-18 کروڑ ہیں جودنیامیں کسی ملک میں بسنے والےمسلمانوں سے زیادہ ہیں۔کچھ لوگ انڈونیشامیں زیادہ مسلمان بتاتے ہیں، مگر میری رائے اس سے مختلف ہے۔ باقی تمام اقلیتیں 4-5% ہیں۔

ہندوستان اسلام کا دوسرا سب سے بڑا گھر ہے۔جس کی ڈیڑھ ہزار سال کی تاریخ و تہذیب ہے۔اس نے جہاں شاندار روایتوں کی بنیاد ڈالی ہے۔وہیں تصادم اورٹکراؤ بھی

رہا ہے۔ حالیہ دنوں میں آزادی کی جنگ کے دوران دونوں قوموں کا ٹکراؤ ابھر کر سامنے آیا جس کے نتیجہ میں ملک آزاد تو ہوا مگر اس کا بٹوارہ ہو گیا۔ اس واقعہ نے ملک کی نفسیات، سماج اور سیاست پر ایسا گہرا زخم لگایا ہے کہ سات دہائیوں کے بعد بھی آج اس میں ٹیس اٹھتی ہے۔ ان سات دہائیوں میں وقت نے بہت سے لیل ونہار دیکھے ہیں۔ گنگا اور ستلج میں بہت سا پانی بہ گیا ہے مگر دونوں قوموں کے ذہنوں اور دلوں کی دوریاں کم نہیں ہوئی ہیں۔ اس کا اندازہ اس ملک کی سیاست، سیاسی جماعتوں کے کردار اور ہمارے اجتماعی اداروں کے رویوں، فیصلوں اور کارکردگیوں سے ہوتا ہے۔

یہ سچ ہے کہ مسلمانوں کو شہری اور سیاسی حقوق پوری طرح حاصل ہیں مگر یہ صرف دستور اور قانون کی کتابوں میں درج ہیں۔ عملاً صورتحال یہ ہے کہ ملک کے مسلمان سیاسی جماعتوں کے لیے محض ووٹ بینک اور دوسرے درجے کے شہری ہیں۔ یہ بات سیاسی جماعتوں کے رویہ سے صاف ظاہر ہے۔ آزاد ہندوستان کی ستر سالہ تاریخ اس کی منہ بولتی تصویر ہے۔

ہندو جغرافیائی اعتبار سے ایک قوم ہونے کے باوجود نسل، ذات، علاقہ، تہذیب، زبان اور رنگ کے لحاظ سے ایک دوسرے سے بالکل مختلف بلکہ متضاد ہیں جن کے درمیان مفادات کا زبردست ٹکراؤ دیکھنے کو ملتا ہے۔ آزادی سے قبل اقتدار کی کشمکش جو کبھی بیرونی اور اندرونی قوتوں کے درمیان ہوتی تھی اب یہ ساری کش مکش اندرونی قوتوں اور ان کے مختلف دھڑوں کے درمیان ہونے لگی جس میں ان کے اگڑے، پچھڑے اور دلت اقتدار پر قابض ہونے کے لیے نئے حلیفوں کی تلاش میں نکل پڑے تاکہ ایک دوسرے پر عددی برتری حاصل کر کے قتدار پر قابض ہو سکیں۔ اس عمل میں مسلمان آسانی سے دستیاب ہونے والا گروہ تھا۔ جو بلا کسی شرط کے ان کے باج گذار اور حلیف ہو سکتے تھے۔

دراصل آزادی کے بعد ملک میں فرقہ وارانہ نفرت اور تشدد کا جو ماحول پیدا ہوا اس نے مسلمانوں کو نفسیاتی طور پر اتنا زور کا دھکا دیا کہ ان کی جڑیں اس ملک سے اکھڑنے لگیں۔ اس صورت میں کوئی بھی موہوم سہارا جس سے ٹیک لگا کر اکھڑتی سانسوں کو جمع کیا جا سکے، وقت

کی سب سے بڑی ضرورت تھی۔ لہٰذا اس ماحول میں جس نے بھی ہمدردی کے دو بول بول دیئے وہ وقت کا مسیحا محافظ اور رہنما ہو گیا اور مسلمان روم کے اس بانسری والے کی آواز پر یہ جانے بغیر چوہوں کی طرح غول در غول اس کے پیچھے ہو گئے کہ یہ سریلی آواز اس کو دریا برد کرنے والی ہے۔ یا دریا پار لے جانے والی ہے۔

کہتے ہیں قیادت بحران میں پیدا ہوتی ہے مگر مسلمانوں کے ساتھ بالکل الٹا ہوتا گیا۔ حالات جتنے خراب ہوتے گئے مسلم قیادت اتنی ہی ناپید ہوتی چلی گئی۔ مسلمان عوام بے گلہ بان کی ریوڑ رہوتے چلے گئے لہٰذا جس نے جہاں چاہا انہیں اچک لیا۔

ڈاکٹر امبیڈکر نے دستور ہند کی تکمیل کے موقع پر دستور ساز اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ محض دستور بنا دینے سے مسائل حل نہیں ہوں گے۔ اگر دستور کو نافذ کرنے والے لوگ ایماندار اور انصاف پسند نہیں ہیں تو اچھا سے اچھا دستور بھی لوگوں کو ظلم و ناانصافی سے محفوظ نہیں رکھ سکتا ہے۔ خاص طور سے کمزور طبقات کو ظلم و ناانصافی سے بچانے کے لیے اس کا ایماندارانہ نفاذ ضروری ہے۔ غالباً ڈاکٹر امبیڈکر کو آنے والے ہندوستان کا کچھ اندازہ تھا اور انہیں اس بات کا ڈر تھا کہ کہیں ہندوستان کا دستور خوشنما الفاظ کا ایک پلندہ بن کر نہ رہ جائے۔ ڈاکٹر امبیڈکر کا یہ شبہ مسلمانان ہند کے بارے میں صد فیصد صحیح ثابت ہوا۔ تمام تر دستوری اور خصوصی ضمانتوں کے باوجود ایک طرف مسلمانوں کے جان و مال پر مستقل اور مسلسل حملے ہو رہے ہیں تو دوسری طرف مسلمانوں کی زبان، شریعت، تعلیمی اور تمدنی ادارے یہاں تک کہ مساجد و مدارس و خانقاہیں، قبرستان اور اوقاف اور ہر اس چیز پر حملے ہونے لگے ہیں جس کا دور و نزدیک سے بھی اسلام اور مسلمانوں سے کوئی تعلق ہے۔ اس طرح چوطرفہ حملہ ہو رہا ہے اور سمجھ میں نہیں آتا کہ کھاؤں کہاں کی چوٹ بچاؤں کہاں کی چوٹ۔

اس مادی اور نفسیاتی عدم استحکام کے ماحول میں ترقی کرنا اور آگے بڑھنا تو دور کی بات ہے جبکہ جان کے لالے پڑے ہوئے ہیں۔

یہ تو مسلمان قوم تھی کہ اتنا ہونے کے باوجود ٹوٹی اور بکھری نہیں بلکہ تنکا تنکا جوڑ کر پھر

سے نیا آشیانہ کھڑا کرنے میں جٹ گئی۔ جب کہ ۱۹۸۴ء میں اندرا گاندھی کے قتل کے بعد جب سکھ مخالف فسادات شروع ہوئے تو پہلی بار اس قوم کو اقلیت ہونے کا درد محسوس ہوا اور اس کے اوسان خطا ہوگئے۔ اس صورتحال میں جب کہ مسلمانوں کے اندر اپنی قیادت مفقود ہے مسلمانوں نے ہر اس پارٹی اور لیڈر کو اپنا قائد مان لیا جس نے ان کے تئیں تھوڑا سا بھی نرم رویہ اختیا کیا۔

آزادی کے قبل سے ہی ملک میں نظریاتی اعتبار سے تین طرح کی پارٹیاں تھیں۔ ایک دایاں محاذ تھا تو دوسرا بایاں محاذ اور ان دونوں کے درمیان ایک سینٹرسٹ پارٹی تھی۔ دایاں محاذ میں اس وقت ہندومہا سبھا، آریہ سماج اور آر ایس ایس جیسی پارٹیاں تھی جو مسلمانوں کی کھلے عام مخالفت کرتی تھیں اور ان کو کوئی رعایت دینے کے حق میں نہیں تھی۔ وہ مسلمانوں کا یا تو شدھی کرن کرنا چاہتی تھیں یا پھر اس ملک سے نکال باہر کرنے کے درپے تھیں۔

بایاں محاذ میں سوشلسٹ اور کمیونسٹ فکر کے لوگ تھے۔ یہ لوگ مذہبی کشمکش اور فرقہ واریت میں یقین نہیں رکھتے تھے بلکہ اس کے مخالف تھے۔ ان کا مقصد بلا لحاظ مذہب وملت طبقاتی کش مکش کے ذریعہ ایک سیکولر اور غیر خدا پرست ترقی پسند ریاست کا قیام تھا جس کو وہ سائنٹفک سوشلزم کہتے تھے۔ تیسری پارٹی کانگریس تھی جو سینٹرسٹ پارٹی تھی۔ وہ ان دونوں انتہا پسند نظریات سے دور قوم پرستی بغیر فرقہ پرستی اور سیکولرزم بغیر انکار خدا کے نظریہ کے تحت تمام شہریوں کے درمیان مساوی حقوق واختیار کی بنیاد پر ملک کا انتظام چلانا چاہتی تھی۔

کانگریس آزادی کی جنگ میں سب سے آگے تھی لہٰذا آزادی کے بعد فطری طور پر ملک کا اقتدار اس کے ہاتھ میں آیا۔ ۱۹۶۷ء تک کانگریس بلا شرکت غیرے ملک پر حکمراں رہی۔ کانگریس کی سب سے بڑی ناکامی یہ رہی کہ اپنے تمام تر بلند بانگ دعوؤں کے باوجود ملک کی مسلمان اقلیت کو تحفظ اور انصاف دلانے میں ناکام رہی۔ بالآخر کانگریس سے مسلمانوں کا موہ بھنگ ہونے لگا۔ لہذ ابدلتے ہوئے سیاسی حالات کے تحت مسلمانوں نے بایاں محاذ اور دیگر علاقائی پارٹیاں جو خود کو سیکولر اور غیر فرقہ پرست کہتی تھیں ان کی حمایت شروع کی۔ انہوں

نے بھی مسلمانوں کوخوب سبز باغ دکھائے ۔ایسالگا جیسے وہ کانگریسی عہد کی بے ایمانی اور منافقت کو دور کر کے مسلمانوں کے ساتھ انصاف کا معاملہ کریں گی۔ ایک طرف ہندو جارح فرقہ پرست تنظیمیں تھیں جوروز بروز شیر بنتی جارہی تھیں۔ بجائے اس کے کہ ان کا مقابلہ کیا جاتا اور مسلمانوں کو واقعتاً امپاور کیا جاتا محض ان کا خوف دلا کر مسلمانوں کی حمایت حاصل کرنے کی کوشش کی گئی۔

سب سے افسوس ناک رویہ بایاں محاذ کا رہا۔ بایاں محاذ خود کو الٹرا سیکولر کہتی تھی اور جس کا اصول ہی کمزوروں اور مظلوموں کی حمایت تھا اسے جب اقتدار حاصل ہوا تو وہ بھی خود کو قومی عصبیت سے اوپر نہیں اٹھا سکی ہے۔اس کے سب سے اچھی مثال مغربی بنگال ہے جہاں کم وبیش ۳۵ سال تک بایاں محاذ کی حکومت رہی۔ مغربی بنگال میں مسلمان کل آبادی کا 30% ہیں۔ سوائے فساد پر قابو پانے کے بایاں محاذ نے کچھ نہیں کیا۔ بنگالی مسلمان آج بھی ملک کی سب سے پسماندہ آبادی ہیں جہاں جہالت اور غربت کا راج ہے ۔سرکاری اداروں میں آج بھی ان کی نمائندگی بہت کم ہے حالیہ انتخاب میں جیسے ہی بایاں محاذ سے مسلمانوں نے اپنی حمایت واپس لی ان کا اقتدار دھرام سے زمین پر آ گرا۔

بہار میں لالو یادو کی پارٹی آر.جے.ڈی.کو لوگوں نے ۱۵ سالوں تک اپنے کاندھے پر ڈھویا پھر مایوس ہوکر اس کو بھی پٹخ دیا۔ یہی حال یو پی میں ملائم سنگھ اور مایاوتی کا ہے اور کم وبیش یہی حال دیگر ریاستوں میں اور پارٹیوں کا ہے ۔سیکولر پارٹیوں کی ناکامی کی وجہ سے ہی دایاں محاذ کی جارح فرقہ پرست پارٹیاں جس کی قیادت مرکز اور ریاست میں بی جے پی ،شیوسینا، اکالی دل۔ آسام گن پریشد جیسی پارٹیاں کرتی ہیں کوعروج و اقتدار حاصل ہوا۔ ان پارٹیوں کا مسلمانوں کے تئیں جو رویہ ہے اس پر کسی تبصرہ کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ سبھی پارٹیاں جارح قوم پرستی اور جارح فرقہ پرستی میں یقین رکھتی ہیں۔ اقلیتوں کے خلاف ان کے دلوں میں ہٹلر کی طرح نفرت اور تشدد کے جذبات موجزن ہیں۔ یہ اپنی سوچ اور عمل میں فاشسٹ ہیں ۔مسئلہ یہ ہے کہ کل تک جس بات سے ڈرا کر مسلمانوں سے ووٹ لیا جاتا تھا آج وہ ڈر حقیقت میں

تبدیل ہوگیا ہے اوراقتداران طاقتوں کے ہاتھوں منتقل ہورہا ہے۔ ملک کا سماج اوراس کی سیاست تیزی سے فرقہ وارانہ رنگ میں رنگتی جارہی ہے اور ملک کثیر قومی جمہوریت کے بجائے یک قومی جمہوریت بنتا جارہا ہے۔ کیونکہ اکثریت کواس طرح مجتمع کرنے کی کوشش ہورہی ہے جس سے اقلیت ایک توان کے خلاف ووٹ کرنے کی ہمت نہ کرے اوراگر کرے بھی تو اس کی حمایت اورمخالفت کا انتخابی نتائج پرکوئی اثر نہ ہو۔ گجرات میں یہ تجربہ بہت کامیاب رہا ہے۔اور اب اس موڈل کودوسری ریاستوں اور پورے ملک میں لاگو کرنے کی کوشش ہورہی ہے۔اس کو (Tyranny of majority یا Dictatorship of majority) کا نام دیا جاسکتا ہے۔ مسلمان اس وقت سخت مخمصے کے شکار ہیں۔ایک طرف دانا دشمن ہے تو دوسری طرف بے ایمان دوست۔آگے کھائی ہے تو پیچھے کنواں۔مسلمان بحیثیت مجموعی دانا دشمن بے ایمان دوست اور کمزور اندرونی قیادت کے درمیان پس رہے ہیں۔

مسلمانوں کی موجودہ صورتحال کی بڑی وجہ ان کے تیئں سیاسی پارٹیوں کا منافقانہ رویہ ہے۔ملک کی تمام سیاسی پارٹیوں کو یہ جاننا چاہیے کہ یہ چیز ملک کے سماجی امن ،انصاف اور سلامتی کے لیے خطرناک ہے ۔ بھارت کبھی اس طرح کی نیتیوں سے آگے نہیں بڑھ سکتا ہے ترقی نہیں کرسکتا ہے اور دنیا کے ملکوں میں عزت حاصل نہیں کرسکتا ہے۔مسلمان اس ملک میں رفیوجی نہیں ہیں کہ آپ ان کے ساتھ چاہے جوسلوک کریں وہ سب کچھ سہنے پر مجبور ہوں گے۔

لوگ مسلمانوں کے گھیٹو مینٹیلٹی کی شکایت کرتے ہیں۔اس کا ذمہ دار کون ہے؟ جواہر لعل نے کہا تھا اکثریت کی فرقہ پرستی ،اقلیت کی فرقہ پرستی سے زیادہ خطرناک ہے ۔کیونکہ اقلیت کی فرقہ پرستی دفاعی ہوتی ہے جبکہ اکثریت کی فرقہ پرستی جارح ہوتی ہے لہذا مسلمانوں کو جرائم پیشہ دہشت گرد ہونے سے بچانا ہے اورایک پرامن ترقی پسند بھارت بنانا ہے تو ملک کے تمام طبقات کوساتھ لے کر چلنا ہوگا اوران کو برابر کا حق دینا ہوگا۔

مسلمانوں کے لیے کوئی پارٹی اور جماعت اچھوت نہیں ہے لیکن ملک میں اقتدار چاہنے والی پارٹیوں کواپنے رخ، رویہ، پالیسی اور ذہنیت میں تبدیلی لانی ہوگی۔

مسلمانوں کی حقیقی اور زمینی قیادت کو اوپر اٹھنے کا موقع دیا جانا چاہیے۔ان کو جذباتی مسائل سے قطع نظر ان کے حقیقی اور روزمرہ کے مسائل پر دھیان دینا چاہیے۔ان کو جان و مال اور شناخت کے مسائل میں الجھانے کے بجائے ان کو پورا تحفظ ملنا چاہیے اور آگے بڑھنے کے پورے مواقع حاصل ہونے چاہیے۔

یہ کام ملک کی سیاسی پارٹیاں ہی کر سکتی ہیں لہٰذا سیاسی پارٹیوں کو تنگ نظریوں اور ذاتی وگروہی اقتدار کی ہوس سے اوپر اٹھ کر پورے ملک، پورے سماج اور اس کی ہر اکائی کے ساتھ برابری اور انصاف کی پالیسی اپنانی چاہیے اور پورے تاریخی شعور کے ساتھ اپنی ذمہ داری نبھانی چاہیے۔

مسلمانوں کے ساتھ ہونے والی ناانصافی اس ملک کے سیاسی عمل اور سیاسی Establishment کی ناکامی کی دلیل ہے۔اس سے صرف مسلمانوں کو نہیں پورے ملک کو نقصان ہوگا۔لہٰذا میں مسلمانوں کے مسائل کی ایک بڑی وجہ ہندوستان کی سیاسی جماعتوں کی فکری اور عملی ناکامی مانتا ہوں۔اس لیے سیاسی جماعتوں کو اپنا رخ، رویہ، نیتی اور نیت بدلنی ہوگی ورنہ صرف مسلمان ہی نہیں یہ ملک بھی تباہ ہوجائے گا۔یہ مسلمانوں کے وہ مسائل ہیں جنہیں خارجی مسائل کہا جا سکتا ہے یہاں (Affirmative action) کی ضرورت ہے۔

اس وقت کے حالات کا سب سے افسوس ناک اور خطرناک پہلو یہ ہے کہ ملک کی بہت بڑی آبادی جو جارح فرقہ پرستی میں یقین نہیں رکھتی اور بظاہر وہ مسلمانوں سے پرخاش نہیں رکھتی ہے بلکہ پرامن بقائے باہم کو ملک اور انسانیت کے لیے ضروری سمجھتی ہے اور اب تک وہ انصاف کی روش پر قائم ہے اس نے حالیہ دنوں میں اپنا سیاسی فیصلہ لیتے وقت اس بات پر کوئی دھیان نہیں دیا کہ اس فیصلے سے مسلمان اقلیت کے مفاد اور تشخص پر کیا ضرب پڑے گی؟ اس طرح ملک کی بڑی اکثریت کا مسلمانوں کی جانب سے عدم توجہی اور بے پروائی ایک خطرناک مسئلہ بن کر ابھرا ہے جو سیاسی پارٹیوں کی ناکامی اور میڈیا کی چیرہ دستی کی مظہر ہے۔

داخلی مسائل

(۱) مسلمانوں کی غربت و جہالت کا فائدہ صرف ان کی مخالف اور متحارب قوت ہی نہیں اٹھاتی ہے بلکہ خود مسلمانوں کے اندر ایک گروہ ایسا ہے جو ان کو غریب اور جاہل رکھنا چاہتا ہے اور ان کی پسماندگی کے بل پر اپنی چودھراہٹ قائم رکھنا چاہتا ہے۔ مسلمانوں میں اونچا اور دانشور طبقہ ہے تو بہت چھوٹا مگر مسلمان کے نام پر سارے فائدے خود حاصل کرنا چاہتا ہے جبکہ مسلمان عوام سے اس کا دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس طبقہ نے مسلمانوں کے نام پر ملنے والے سارے مراعات خود حاصل کر لیے اور مسلمان عوام منہ تکتے رہ گئے۔ یہ عناصر ہر پارٹی اور ہر گروہ میں موجود ہیں۔ان کی پہچان یہ ہے ان کے اندر سچی سوچ اور ایماندارانہ عمل کا فقدان ہے جو ان کی گفتگو اور طرز عمل سے با آسانی سمجھی جا سکتی ہے۔

(۲) ایک جاہل اور کمزور اقلیت ایک کمزور دیوار کی طرح ہوتی ہے۔ جس کی ساخت پہلے سے ہی کمزور ہے اس کے ساتھ اگر دیوار کی اینٹیں باہم پیوست نہ ہوں اور ان کے درمیان مضبوط جوڑ نہ ہو تو اس دیوار کو ایک معمولی دھکے سے توڑا اور گرایا جا سکتا ہے مسلمان اس ملک کی سب سے بڑی اقلیت، بلکہ دوسری بڑی اکثریت ہیں۔ دنیا میں کسی ایک ملک اور خطہ میں موجود سب سے بڑی آبادی ہیں۔ آبادی کے لحاظ سے یہ دنیا کے کسی ملک کے مقابلے چھٹی بڑی آبادی ہے۔ مگر ہندوستان میں یہ کل آبادی کا 15% ہے یعنی لگ بھگ ایک سو پچیس کروڑ کے ملک میں ۲۰ کروڑ سے زائد ہیں لہٰذا ملک کی کل آبادی میں اس کا تناسب بہت کم ہے۔ اس لیے ایک چھوٹی ریاست جموں کشمیر کو چھوڑ کر باقی پورے ملک میں چند اضلاع کے علاوہ یہ اقلیت میں ہیں۔ مگر یہ پوری قوم ذات، برادری، نسل اور طبقات میں اس قدر تقسیم ہے کہ وحدت کلمہ اور وحدت قبلہ بھی ان کو جوڑنے میں ناکام ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ یہ ۷۲ فرقوں اور

۳۷ جماعتوں میں بٹی ہے۔اس کو مزید توڑنے اور بانٹنے کا عمل پورے اخلاص نیت کے ساتھ جاری ہے۔غازیان نفاق وانتشار پورے ایمانی جذبے کے ساتھ سرگرم ہیں۔نت نئی مصنوعی تقسیم نے ملت کو اَدھ مَرا اور نڈھال بنادیا ہے ملت کی زبوں حالی پر آٹھ آٹھ آنسو بہانے والے اپنی حرکتوں سے باز آنے کو تیار نہیں ہیں۔ملت جائے چولہے بھاڑ میں ان کا حلوہ مانڈا اوران کا حلقہ عقیدت سلامت رہنا چاہئے۔یہ کھلے طور پر مسلمان علماء، سماجی اورتمدنی لیڈرشپ کی وہ ناکامی ہے جوملت کی گرتی دیوار کو تیزی سے گرانے میں مدد کررہی ہے۔ جب تک ملت اپنے اندرونی انتشار وافتراق پر قابو نہیں پاتی ہے اس کی کمزوری، پسماندگی اور بے وقعتی کا کوئی علاج ممکن نہیں ہے۔دین اور سیاست باہم جوڑنے اور مضبوطی پیدا کرنے میں معاون ہوتے ہیں مگر ایک زوال پذیر ملت کے لیے جہاں شخصی اورگروہی امنگیں جماعتی اورملی امنگوں پر حاوی ہوجاتی ہے۔مذہب اور سیاست باہمی افتراق وانتشار کا شاہ دروازہ بن جاتی ہیں۔مشہور برٹش تاریخ داں ٹوئن بی نے اپنی کتاب ''تہذیبوں کی تاریخ'' میں ایک اہم حقیقت پر سے پردہ اٹھایا ہے، اس نے لکھا ہے کہ ''تہذیبوں کا قتل نہیں ہوتا بلکہ تہذیبیں خودکشی کرتی ہیں'' اس کا مطلب یہ ہوا کہ خارجی عوامل اور باہری دشمن کسی تہذیب کو ختم نہیں کرسکتے۔ تہذیبیں داخلی عوامل اور اندرونی دشمنوں کے ہاتھوں ختم ہوتی ہیں۔ ہندوستانی مسلمانوں کے سلسلے میں ہم ان حقیقتوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں۔لہٰذا ہمارے عروج وزوال میں ہمارے فکروعمل کو فیصلہ کن درجہ حاصل ہے۔خود قرآن نے یہ بات واضح کردی ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی قوم کی حالت اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک خود وہ قوم اپنی حالت بدلنے کے لیے آمادہ نہیں ہے۔ لہٰذا اپنی کمزوری کی بڑی وجہ ہم خود ہیں اور ہمارے ہاتھ میں اپنی تقدیر بنانے کی ذمہ داری ہے۔

(۳) مسلمانوں کے داخلی مسائل میں خودغرضی اورانتشار فکروعمل کے ساتھ ایک سب سے

بڑا مسئلہ قیادت کا فقدان ہے۔ پوری ملت اس ٹرین کی طرح ہے جوانجن کی عدم موجودگی میں اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہیں ہوسکتی ہے۔مسلمانوں میں کہنے کے لیے توبہت سے لیڈر ہیں مگر کوئی بھی ایسا نہیں ہے جس کو پوری قوم کا اعتماد حاصل ہے۔ ہمارے یہاں بالعموم دوطرح کے لوگ ہیں جو لیڈر ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ایک وہ لوگ ہیں جومختلف سیاسی پارٹیوں میں ہیں۔ان کی لیڈرشپ ملت کے اعتماد کے ایندھن سے نہیں چلتی ہے بلکہ پارٹی قیادت کے اعتماد کے سہارے چلتی ہے۔ پارٹی قیادت اپنے مفاد میں جس شخص کو مسلمانوں کے لیڈر کے طور پر پروجیکٹ کرنا چاہتی ہے اسے کوئی عہدہ منصب دے کر لیڈر کے طور پر پروجکٹ کرتی ہے اور وہ راتوں رات لیڈر بن جاتا ہے۔ جیسے ہی پارٹی قیادت کی نگاہ کرم اس سے ہٹتی ہے وہ ہیرو سے زیرو بن جاتے ہیں۔لہٰذا ایسے لوگوں کی کوشش ہوتی ہے کہ پارٹی قیادت کو ہر طرح خوش رکھا جائے ۔وہ پارٹی میں ملت کی نمائندگی کرنے کے بجائے ملت میں پارٹی کی نمائندگی کرنے پر مامور ہوتے ہیں اوران کا پہلا کام ملت میں پارٹی کی حمایت اور ہمدردی کے دائرے کو بڑھانا ہے تاکہ الیکشن کے وقت ان کی پارٹی کو مسلمانوں کا ووٹ ملے۔اگر وہ اس میں کامیاب ہوتے ہیں تو پارٹی میں ان کا رتبہ بلند ہوتا ہے، ان کی کرسی سلامت رہتی ہے ورنہ ان کو دودھ کی مکھی کی طرح نکال پھینکا جاتا ہے اور پھر کسی دوسرے تیسرے کو پروجیکٹ کیا جاتا ہے۔

مسلمانوں میں دوسری قیادت ان علماء کرام کی ہے جو سیاست میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ یہ بھی کسی نہ کسی پارٹی کے ڈھنڈورچی ہوتے ہیں، جس میں ان کا ذاتی مفادان کے ملی مفاد پر حاوی ہوتا ہے۔ ہماری مذہبی قیادت کی اندرونی بناوٹ کچھ ایسی ہے کہ وہ کبھی بھی پوری ملت اور پورے ملک کے رہنما نہیں ہوسکتے ہیں۔ ہماری قیادت ذات، فرقہ، مسلک، برادری اور مختلف قسم کی دینی گروہ بندی میں اتنی منقسم ہے کہ دیوبندی کسی بریلوی کو، اہلِ حدیث کسی دیوبندی کو،شیعہ کسی سنی کو،سنی کسی شیعہ کو اپنا

قائدنہیں مان سکتے ہیں۔ وہ اپنے دائرے اورگروہ کے لیے بہت اہم ہیں مگر دوسرے مسلک اور جماعت کے لوگ ان کا اعتراف و تعاون تو دور ان کا قد چھوٹا کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ جب ایک آدمی پورے مسلمانوں کا اعتماد حاصل نہیں کرسکتا ہے تو وہ پورے ملک کی قیادت کیا کرسکتا ہے؟ یہی وجہ ہے کہ نام نہاد سیکولر لوگ دینی اور مذہبی قائدین کی تنگ نظری اورفکری جمود کے باعث ملت اورملک میں زیادہ بااثر نظر آتے ہیں۔ قیادت کے بغیر کوئی قوم فالج زدہ شخص کی طرح ہوتی ہے۔لہٰذا قیادت کی کمی نے قوم کوعضوِ معطل بنا کرر کھ دیا ہے۔ ہماری انفعالیت اورکمزوری کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے۔

(۴) داخلی وجوہات میں ملت کی زبوں حالی کی چوتھی وجہ ہمارے انسانی وسائل کا زیاں ہے،ملت کے پاس اپنے بچوں،نوجوانوں اورخواتین کے سلسلے میں کوئی واضح پالیسی نہیں ہے،نتیجہ یہ ہے کہ ہماری75% آبادی یاتو غیر استعمال شدہ (Unutilised ہے یا اس کا غلط استعمال ہورہا(Misutilised) ہے۔

بچےقوم کےمستقبل ہوتے ہیں،جوان قوم کا حال ہوتے ہیں اورعورتیں قوم کی ریڑھ ہوتی ہیں۔ریڑھ کی ہڈی ٹیڑھی کمزوراورمرض میں مبتلا ہو، بچے اورنوجوان بےسمتی کے شکار ہوں، ان کی تعلیم تہذیب،صحت مند نشونما کی فکر سے قوم خالی ہو،تعمیری ترقیاتی اورمسابقتی رجحان کا فقدان ہو،قوم کے بڑےتن بہ تقدیراورقوم کے چھوٹے جدوجہد سے دور ہوں تو بھلا اس قوم کا مستقبل کیا ہوگا؟ ہمیں اپنے بچوں نوجوانوں اورعورتوں کے سلسلے میں اپنی فکراوراپنا طرزِعمل بدلنا ہوگااوراپنے انسانی وسائل کے بہتراستعمال کے لیےایک حرکی اورعصری نقطۂ نظراختیارکرنا ہوگاتبھی کوئی بات بن سکتی ہے۔

(۵) مسلمانوں کی ذلت اورزبوں حالی کی بہت بڑی وجہ ان کی تعلیمی پسماندگی ہے۔اس علمی انفجار کے دور میں جب دنیا کی تمام قومیں تعلیم کے میدان میں ایک دوسرے

پر سبقت لے جانے کی دوڑ میں ہیں، بھارت میں مسلمان تعلیم کے معاملے میں شہری اور دیہاتی دونوں آبادیوں میں بہت پیچھے ہیں۔۲۰۰۱ء کی مردم شماری کے مطابق مسلمانوں میں مجموعی طور پر 59.1% شرح خواندگی ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ ابھی بھی 41.9% مسلمان بالکل ناخواندہ ان پڑھ اور جاہل ہیں۔شہری آبادی میں مسلمانوں کی خواندگی کی شرح 70.1% ہے تو دیہاتی آبادی میں 52.% ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ 30% شہری مسلمان اور 48% دیہاتی مسلمان تعلیم سے بے بہرہ ہیں۔خواتین میں خواندگی کی شرح اور بھی کم ہے محض 50% خواتین خواندہ ہیں، گویا 50% بالکل ان پڑھ اور جاہل ہیں۔مسلمانوں کو تعلیم کے معاملے دوہرا نقصان جھیلنا پڑ رہا ہے۔ ایک طرف ان کے یہاں تعلیم کا تناسب کم ہے اور دوسری طرف معیار تعلیم بہت گھٹیا ہے اور جیسے جیسے ان کی سطح تعلیم میں اضافہ ہوتا جاتا ہے ان کی محرومی وپسماندگی اورابھر کر سامنے آتی ہے۔مسلمانوں میں 14-6 سال کے تقریباً 25% بچے یا تو کبھی اسکول نہیں جاتے یا بہت جلد اسکول چھوڑ دیتے ہیں۔ صرف 17% مسلمان بچے میٹرک تک تعلیم مکمل کر پاتے ہیں۔ جب کہ گریجویٹ اورڈپلوما ہولڈر مسلمان جن کی عمر 20 سال اوراس سے زیادہ ہے 4 فیصد سے کم ہیں 18 سال یا اس سے اوپر کی عمر میں تکنیکی تعلیم حاصل کرنے والوں کا تناسب ایک فیصد سے بھی کم ہے۔

۲۰۰۱ کی مردم شماری کے مطابق ۲۰ سال اور اس سے زائد عمر کے ۳۸ ملین مرد و خواتین گریجویٹ میں مسلمان صرف 4 ملین ہیں یعنی 3.6% جب کہ تکنیکی تعلیم میں مسلمانوں کا تناسب بہت معمولی محض 0,4% ہے ۔سچر کمیٹی کی رپورٹ جس وقت مرتب ہوئی اس وقت IIT's میں کل 27,161 طلبا انرولڈ تھے جس میں صرف 894 مسلمان تھے،انڈر گریجویٹ کورسز میں مسلمان طلبا کا تناسب 1.7% تھا جب کہ پوسٹ گریجویٹ کورسز میں تھوڑا بہتر 4% تھا پی ایچ ڈی میں داخلہ لینے والوں کا تناسب تھوڑا بہتر ہے ملک کے مشہور تعلیمی اداروں میں انڈر

گریجویٹ میں 25 میں ایک طالب علم مسلمان ہے اور پوسٹ گریجویٹ میں 50 میں ایک کا تناسب ہے۔IIM میں مسلمان طلباء کے داخلے کا تناسب 14% ہے اچھے اور بڑے میڈیکل کالجز میں تمام کورسز میں مسلمانوں کا تناسب کچھ بہتر یعنی 4% ہے۔آئی اے ایس اور اپلائیڈ سروسز اکزام میں بالعموم کامیاب مسلمان طلبا کا تناسب 2.1% سے 2.5% تک رہتا ہے۔ مدارس اسلامی میں 4% طلباء زیر تعلیم ہیں۔پورے ملک میں مسلمانوں نے پرائمری سطح سے لے کر اعلی اور پروفیشنل تعلیم کے سینکڑوں اقلیتی تعلیمی ادارے کھول رکھے ہیں۔ چند مستثنیات کو چھوڑ کر کسی کا معیار تعلیم اچھا نہیں ہے۔لہذ اکمیت اور کیفیت دونوں اعتبار سے مسلمان تعلیمی پسماندگی کے شکار ہیں جس کا اثر ان کی معاشی ،سماجی اور ثقافتی پسماندگی پر پڑتا ہے اور اتنی بڑی تعداد میں ہونے کے باوجود وہ ہندوستان کی قومی زندگی میں حاشیہ پر ہیں جو فیصلے کے ہر عمل سے دور ہیں یا دور رکھے جاتے ہیں۔۲۰۱۱ کی مردم شماری کے ابتدائی اعداد وشمار منظر عام پر آ گئے ہیں اس سے مجموعی اعتبار سے کچھ بیداری اور بہتری کا اندازہ ہوتا ہے۔ ریاستی اور مرکزی سرکار کی مختلف اسکیموں اور پروگراموں کی وجہ سے کچھ بہتری ضرور آئی ہے مگر ان کے نفاذ میں در آمد خامیوں کی وجہ سے اس کا خاطر خواہ فائدہ مسلم کمیونیٹی کو نہیں مل رہا ہے۔لہٰذا تناسب کے اعتبار سے حالات میں کوئی خاص فرق نہیں آیا ہے اورمسلمانوں میں تعلیمی پسماندگی جوں کی توں برقرار ہے۔

اگر مسلمانوں کے مسائل کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لیا جائے تو ایک پوری کتاب مرتب ہو جائے گی۔ یہاں ہم نے صرف بعض ابھرے ہوئے مسائل کا تذکرہ کیا ہے جو میرے خیال میں مسلمانوں کی پسماندگی اور زبوں حالی کے ذمہ دار ہیں۔اگر ان پر قابو پا لیا جائے تو مسائل کے حل کی راہ ہموار ہو سکتی ہے اور ہم موجودہ پستی سے باہر آ سکتے ہیں۔

کیا مسلمانوں کے مسائل کا کوئی حل ہے؟

میں ہمیشہ مثبت سوچ اور فکر کا حامل رہا ہوں۔ اس لیے مجھے پورا یقین ہے کہ ان

مسائل کا حل ہے تاہم دو باتیں ضروری ہیں۔ ان مسائل کے حل آسان نہیں ہیں کہ جادو کی چھڑی گھمائی اور مسائل حل ہو گئے اور نہ ان مسائل کا کوئی شارٹ کٹ حل ہے، بلکہ یہ دیر طلب ہے اور مشکلوں بھری راہ سے گذر کر ہی ہم ان مسائل کا حل ڈھونڈ سکتے ہیں۔ اس کے لیے جہاں مسلمانوں کے اندر صحیح سوچ اور مضبوط قوت ارادی نیز صبر وحکمت اور بلند حوصلگی جذبہ قربانی اور اتحاد وتعاون کی ضرورت ہے وہیں اکثریت سے بہتر سماجی معاشی ثقافتی اور سیاسی رابطے کے ذریعہ ان سے قریب ہونے اور ان کو قریب لانے کی ضرورت ہے۔ ہم اس ملک میں بند سماج میں ایک الگ جزیرہ بنا کر نہیں رہ سکتے ہیں، ہمیں اپنے دل کے دروازے کھولنے ہوں گے۔ اور ذہن و بازوؤں کو پھیلا کر اپنی طرف سے پہل کرنی ہوگی۔ یہ ملک ہمارا ہے، اس ملک کے لوگ ہمارے لوگ ہیں ان کا دکھ سکھ ہمارا دکھ سکھ ہے۔ جب تک عام لوگوں کے درمیان Emotional integration پیدا نہیں ہوگا دوریاں باقی رہیں گی، ہم اس کے نقصانات سے بچ نہیں سکتے ہیں۔ ہندوستان کی عظیم ترین اکثریت غیر فرقہ پرست اور انسانیت دوست ہے۔ کچھ لوگ ہیں جو ان کو گمراہ کر رہے ہیں۔ ہم اکثریت سے الگ رہ کر گویا ایسے لوگوں کو موقع دے رہے ہیں کہ عام عوام کے ذہنوں کو مسموم کریں۔ اس کی روک کے لیے ہماری جانب سے جوابی پیش رفت ہونی چاہیے، اور انفرادی اور اجتماعی ہر سطح پر اس موقع کا استعمال کرنا چاہیے جس سے دوریوں کو کم کرنے میں مدد مل سکتی ہے۔ ہمارے مسائل کے حل کی پہلی کوشش وسیع تر ہندوستانی سماج سے انسلاک ہے اور ہندوستانی سماج و سیاست کو Decommunalise کرنا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ آج ہم نے یہ کوشش شروع کی اور کل حالات بدل جائیں گے۔ یہ برسوں کا زنگ ہے جو ایک دو دن میں نہیں برسوں میں جائے گا۔ اس لیے ہمیں بہت سوچ سمجھ کر اس صبر آزما عمل کی شروعات کرنی ہے۔ ایک اور بات اچھی طرح جان لینی ہے کہ ہم یہ کوشش ہوا میں نہیں کر رہے ہیں۔ وہ لوگ جو نفرت کی کھیتی کرتے آئیں ہیں وہ خاموش بیٹھ جائیں گے اور اپنی کوشش ترک کر دیں گے۔ ایسی توقع رکھنی بے وقوفی ہوگی بلکہ وہ دونوں طرف ایسی چالیں چل سکتے ہیں تاکہ آپ ملت میں بھی بدنام ہو جائیں اور اکثریت بھی بدگمان ہو۔

لہٰذا اس معاملے میں صبر وحکمت اورحوصلہ مندی بہت ضروری ہے۔سماجی عمل کے ساتھ ساتھ ہمیں سیاسی عمل میں بھی حصہ داری کرنی ہوگی اور ملک کی سیاسی جماعتوں کواپنا سیاسی وزن بتانا ہوگا۔ سیاسی جماعتوں کی پالیسی پروگرام اوران کے لیڈران پراثر انداز ہونے کے لیے الگ سے ڈائیلاگ شروع کرنا ہوگا۔اس کے لیےضروری ہے کہ ہمیں اپنے علاقائی اورملکی مسائل کا شعور ہواوراپنے مسائل سے ان کو Integrate کرنے کا ہنرمعلوم ہوتا کہ ہم ان مسائل کو عام لوگوں کے مسائل کی طرح پیش کرسکیں۔جس میں ہماری اجتماعی قوت کے ساتھ ساتھ عام لوگوں کا تعاون بھی حاصل ہو سکے۔اس حکمت عملی سے ہماری بات کا وزن بڑھ جائے گا اور اگر یہ چیز انتخابی نتائج پراثر انداز ہونے کی صلاحیت رکھتی ہےتوسیاسی جماعتوں کو جو اقتدار کی خواہاں ہیں ان کواپنی بات منوانا اوراس کے مطابق پالیسی طے کرانا اور پھر اس کونافذ کرانا آسان ہوجائے گا۔ بہرحال ہمیں دوطرفہ کوشش کرنی ہوگی۔ ایک طرف ملت کواعتماد میں لینا ہوگااوردوسری طرف اکثریت کوساتھ لانے کی کوشش کرنی ہوگی۔ اور ان کومشترکہ مسائل کا حصہ بنانا ہوگاتبھی شاید حل کی راہ ہموار ہوگی۔ مثلاً غربت، جہالت، بھوک، بیماری، بیکاری، سڑک،بجلی، پانی، گھر ،اسکول، صفائی، صحت اور دوا علاج، سماجی امن، جرائم کی روک تھام، لاء اینڈ آڈر کے مسائل صرف مسلمانوں کے مسائل نہیں ہیں اور نہ یہ صرف ہندوؤں کے مسائل ہیں۔ بلکہ یہ ملک کے تمام طبقات، حصے، خطے،آبادی اورگروہ کے مسائل ہیں۔کسی کے کم کسی کے زیادہ۔ لہٰذا ان مسائل کے حل کے لیےمشترکہ جدوجہد کا آغاز کیاجاسکتا ہے۔ان مسائل کے حل میں مذہب، برادری، رنگ، نسل جنس وزبان اورثقافت کا اختلاف رکاوٹ نہں بن سکتے ہیں۔ یہ مشترکہ مسائل ہیں لہٰذا ایسی کسی بھی جدوجہد میں مسلمانوں کوبھرپورطریقے سے شریک ہونا چاہیے۔اورخود ان مسائل کے حل کے لیے آگے آنا چاہیے۔ کیاضروری ہے کہ محلے میں گندگی اور بیماری کودور کرنے یا بجلی پانی کے لیے غیرمسلم افراداورتنظیمیں ہی دھرنے پربیٹھیں، پھران میں اکادکا مسلمان محض دکھانے کے لیے پچھلی صف میں نظر آئیں! کیوں نہ! مسلمان علماء دانشور سیاسی سماجی کارکنان مسلمانوں کی دینی ملی تنظیمیں ان مسائل پرآگے آئیں اور دھرنا

دیں یا د داشتیں پیش کریں، مظاہرے کریں، جلوس نکالیں اور عام لوگوں کو بھی اس میں شامل کرنے کی کوشش کریں اور لوگوں کو یہ بتائیں کہ ہم تمہارے دکھ درد میں نہ صرف تمہارے ساتھ ہیں بلکہ دو قدم آگے بڑھ کر اس کی قیادت کرنے کو تیار ہیں۔ چونکہ ابھی تک ہم نے ایسا کچھ نہیں کیا ہے۔ اس لیے شروع میں کچھ عجیب سا لگے گا، کچھ لوگ مذاق اڑائیں گے اور کچھ لوگ یہ سوچیں گے کہ ارے اب تک یہ لوگ اردو، مسجد، مدرسہ، قبرستان اور اوقاف کے بارے میں سوچتے اور بولتے تھے، ان کی دنیا مسجد سے قبرستان یا مدرسہ سے خانقاہ تک محدود تھی آخر یہ کیسے زندہ قوموں میں شامل ہو گئے اور زندوں کی طرح عمل کرنے لگے۔ پھبتیاں، مذاق اور مخالفت سب ہوگی، مگر میرے خیال سے راستہ یہی ہے اور اسی راستے سے آگے بڑھنا ہے۔ سماج سے جڑو اور سماج کو جوڑ و مسائل کے حل کی راہ یہیں سے نکلے گی۔

ہندوستان میں اب تک جو سیاست رہی ہے اس میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو دو الگ الگ گروپوں میں بانٹنے اور ایک دوسرے سے الگ رکھنے کی سیاست رہی ہے جن کو آسانی سے کسی بھی چھوٹے بڑے معاملے پر لڑایا اور الگ کیا جا سکتا ہے۔ اس کے لیے مستقل نئے مدے اور معاملے تلاش کئے جاتے ہیں تا کہ یہ کھائی اور چوڑی اور گہری کی جا سکے اور کچھ لوگ اس کام کو بے پناہ قومی جذبے کے تحت کرتے ہیں گویا مادر وطن کی عظمت میں چار چاند لگانے کا اس سے بہتر طریقہ نہیں ہے۔ اس طرح وہ وطن سے اپنی وفاداری کا ثبوت دیتے ہیں اور یہ ان کی راشٹر بھگتی کی واضح علامت ہے۔ جو لوگ ان کے ان نیک کاموں میں شریک نہیں ہوتے انہیں وہ غدار اور غیر وفادار مانتے ہیں۔ انہوں نے وطن پرستی کی بعض علامتیں وضع کر لی ہیں۔ اگر کوئی ان علامتوں کی ان کے انداز میں احترام نہیں کرتا اور ان کے جیسے اعمال و افعال کو ضروری نہیں سمجھتا تو گویا وہ اس ملک کا وفادار نہیں ہے۔ اس طرح وہ سادہ لوح عوام پر ایک طرف اپنی دیش بھگتی ثابت کرتے ہیں اور دوسری طرف دوسروں کو وطن دشمن بلکہ غدار بنا کر پیش کرتے ہیں اور ان کے خلاف نفرت کا ماحول پیدا کرتے ہیں۔

ملک کی سیاسی جماعتوں کے پاس چونکہ مثبت پالیسیوں کا فقدان ہے اور ان کے اندر

بھی فکر وعمل کی ایمانداری نہیں پائی جاتی ہے اس لیے وہ چس بورڈ پر اقتدار کی خاطر شاہ اور مات کا کھیل کھیلتے رہتے ہیں۔لہٰذا وہ اس صورتحال کا تدارک نہیں کرتے بلکہ اس کو اس طرح ہوا دیتے ہیں کہ مسلمان ان جارح قوم پرستوں کے ڈر سے محض ان کی زبانی حمایت پر ان سے چپک جائیں اور وہ ان کا استحصال کریں۔اس ماحول میں یہ طے کرنا بہت مشکل ہے کہ کون فرقہ پرست ہے اور کون فرقہ پرست نہیں ہے۔کیا واقعی نام نہاد سیکولر لوگ فرقہ پرستی سے لڑنا چاہتے ہیں؟ بہت قبل میں نے اپنے ایک مضمون میں لکھا تھا کہ ملک کا کونسا طبقہ فرقہ پرست ہے۔ میرے خیال میں ہمارے سیاست داں اور ہماری سیاسی پارٹیاں سب سے زیادہ فرقہ پرست ہیں جو فرقہ پرستی سے لڑنے کے بجائے اس کو Direct ' Indirect بڑھاوا دینے میں لگی ہیں۔ غیر سیکولر پارٹیوں کو تو ہم اچھی طرح پہنچانتے ہیں لیکن سیکولر پارٹیوں کا کردار سب سے زیادہ مشکوک ہے۔اور یہ سیکولر پارٹیاں ہی ہیں جنھوں نے مسلمانوں کو محض ووٹ بینک بنا رکھا ہے۔ اور مسلمانوں کی ذلت وزوال پس ماندگی اور بیچارگی کا سارا الزام انہیں کے سر آتا ہے۔

دوسرا گروہ ہماری بیور کریسی اور پولیس ہے جس میں فرقہ پرستی نے بہت اندر تک جڑ جمالی ہے۔ہر چھوٹے بڑے واقعہ پر پولیس اور انتظامیہ کی فرقہ پرستی کھل کر سامنے آتی ہے۔ ہماری یونیورسیٹیاں، دانشور حضرات، سماجی اور ثقافتی ادارے، پریس یہاں تک کہ ہماری جوڈیشری اور سول سوسائٹی کے لوگ بھی ان جراثیم سے خالی نہیں ہے۔ایسی صورت میں حق اور انصاف کی بات کرنا محروم اور کمزور لوگوں کو حق وانصاف دلانا ایک بہت مشکل کام ہے۔یہ وقت کسی ڈون کیوزوٹ کی طرح ناک کی سیدھ میں چلنے اور کسی دیوار سے ٹکرا کر اپنی ناک توڑ لینے کا نہیں ہے بلکہ صبر وحکمت کے ساتھ لوگوں کے دلوں کو جیتنے کا ہے۔ہندوستان میں ہندو غالب اکثریت میں ہیں۔لہٰذا کوئی سیاسی جماعت یا حکومت اکثریت کو ناراض کر کے اقلیت کی حمایت نہیں کرے گی۔کیونکہ اکثریت کو ناراض کر کے کوئی پارٹی محض اقلیت کے ووٹ سے اقتدار میں نہیں آسکتی ہے ہمیں اس سچائی کو سمجھنا چاہیے۔جمہوریت ایک آئڈیل طرز حکومت ہے مگر وہاں جہاں یک قومی ملک ہے، جن ملکوں میں کئی قومیں بستی ہیں ان میں اقلیت اور

اکثریت کے بیچ سہی تال میل بٹھانا اور اکثریت کو پابند انصاف بنانا ایک مشکل کام ہے۔
اس کے لیے اقلیت کو واقعیت پسند ہونے کے علاوہ اہل اور Assertive ہونا ہوگا اور آگے بڑھ کر خدمت محبت اور لگاؤ کی ایسی رن نیتی بنانی ہوگی تا کہ ہم فرقہ واریت کے زہر کو ان کے دانتوں سے نکال کر اس کی جگہ امرت کا لیپ لگا سکیں۔ لہٰذا مسلمانوں کے مسائل کے حل کے سلسلے میں سب سے پہلی پہل جو مسلمانوں کو کرنی ہے وہ ہندوستان کے سماج اور سیاست کو Decommunalise کرنے کی کوشش کرنی ہے۔ میں نے پہلے عرض کیا ہے کہ ہندوستان کی غالب اکثریت کمیونل نہیں ہے۔ بلکہ وہ پُر امن بقائے باہم کے ساتھ جینا اور رہنا چاہتی ہے۔ مسلمانوں کو پہلی کوشش یہ کرنی ہے کہ ان کی صفوں میں جو انتہا پسند اور فرقہ پرست عناصر ہیں جو بظاہر دین وملت کی ہمدردی کا لبادہ اوڑھ کر ہمارے سامنے آتے ہیں ان کو اپنے سماج سے الگ کرنا ہے۔ دوسرے جو ملت فروش، ضمیر فروش، منافق صفت، جرائم پیشہ اور بکاؤ عناصر ہیں جنہوں نے ملت کا بیڑا غرق کر رکھا ہے ان سے الگ ہونا ہے اور ان کو الگ تھلگ کرنا ہے۔ ایسی قیادت جو اسلام اور ملک کی وفادار ہے جو ملت اور انسانیت سے سچی ہمدردی رکھتی ہے ہر حال میں انصاف کی بات کرتی ہے اور جمہوری دستوری اور انسانی قدروں میں یقین رکھتی ہے اس کو ایک ہمہ گیر منصوبے کے ساتھ ملک کے سامنے آنا چاہیے اور صرف مسلمانوں کے لیے ہی نہیں پورے ملک کے لیے سوچنا چاہیے۔
ظلم جہاں بھی ہو اور جس کے خلاف بھی ہو اس کے خلاف اٹھنے والی پہلی آواز مسلمان کی ہونی چاہیے اور پہلا قدم مسلمانوں کو ہی اٹھانا چاہیے۔ جب تک یہ عزم وحوصلہ ہم پیدا نہیں کریں گے تب تک نہ ہم اپنے مسائل حل کر سکتے ہیں اور نہ ملک کے مسائل حل کر سکتے ہیں۔ اس لیے ہمیں اپنے Mindset میں بنیادی تبدیلی لانے کی ضرورت ہے۔ جب ہم بدلیں گے تبھی دیش بدلے گا۔ دیش کے بدلنے تک محض ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھنا عقلمندی نہیں خودکشی ہے اور ہم نہیں سمجھتے کہ پوری مسلمان قوم مایوسی کے اس مقام پر پہنچ چکی ہے جہاں خودکشی کے سوا کوئی راستہ نہیں ہے۔ لہٰذا پہلی چیز اپنی فکر کو بدلنا ہے اور دوسری چیز Bold and

assertive بننا ہے۔ تیسری چیز ہندوستانی معاشرہ سے خود کو Integrate کرنا ہے۔ چوتھی چیز اپنے اندر کے Communal and Disruptive Element کو Purge out کرنا ہے۔ پانچویں چیز Society and Polity کو Decommunalise کرنے کی مہم چھیڑنی ہے۔ ان امور کو مسلمانوں کا قومی اور ملی ایجنڈا بنانا ہے یہیں سے نئے بھارت کی نئی تعمیر کی راہ ہموار ہوگی۔ ایسی کسی پہل سے پہلے آپ کی کوئی کوشش کامیاب ہونے کے بجائے Counter Productive ثابت ہوسکتی ہے۔ زمانے کی قیامت بھری چال کو روکنے کا یہی نسخہ کیمیا ہے۔

ان اصولی اور نظری باتوں کے بعد اب آیئے ان Policy Resolution کی طرف جو میرے خیال میں مسلمانوں کے موجودہ مسائل کے حل میں مددگار ثابت ہوسکتے ہیں۔ ذیل میں نکات وار ان کو پیش کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ میرے خیال میں اس وقت دو دائرے ہیں جس پر پوری توجہ مرکوز کرنے کی ضرورت ہے۔ ایک تعلیم اور دوسرا ریزرویشن ہے ہم یہاں ان دونوں امور پر قدرے تفصیل سے روشنی ڈالیں گے تاکہ ہمارا مطمح نظر پوری طرح واضح ہوجائے۔

(ا) تعلیمی ادارے اور تعلیمی انقلاب

میرے خیال میں تمام تر محرومیوں، پسماندگیوں اور کمزوریوں سے باہر نکلنے کی واحد راہ تعلیم ہے۔ تعلیم طاقت اور ترقی کی شاہِ کلید ہے۔ تعلیم کے ذریعہ ہی ہم آگے بڑھ سکتے ہیں اور اپنا صحیح مقام پاسکتے ہیں۔ اس لیے اس وقت سب سے اہم ضرورت یہ ہے کہ مسلمان اپنے تمام انفرادی اور اجتماعی وسائل کو مجتمع کر کے ملت میں ایک نئی تعلیمی بیداری اور تعلیمی انقلاب کا آغاز کریں۔ اکیسویں صدی میں کسی فرد اور قوم کا جاہل رہنا نہ صرف شرمناک ہے بلکہ کسی زلزلے اور سنامی سے بھی زیادہ تباہ کن ہے۔ کسی آبادی پر ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم سے حملہ کیا جائے اس سے اتنی تباہی نہیں آئے گی جتنی تباہی جہالت کے نتیجے میں آتی ہے ۔کسی آفت ناگہانی سے کسی فرد یا قوم کو وقتی نقصان ہوتا ہے مگر جہالت سے کسی فرد اور قوم کی

دائمی تباہی ہوتی ہے۔ اگر آج مسلمانوں کی زبوں حالی کی کوئی ایک وجہ ہوسکتی ہے تو وہ تعلیمی پسماندگی اور جہالت ہے۔

مجھے تعجب اس بات کا ہے کہ اسلام جو اپنے آپ میں ایک تعلیمی تحریک اور تعلیمی انقلاب کا داعی رہا ہے اس کے ماننے والے ساری دنیا میں تعلیم سے محروم ہیں۔ دنیا میں مجموعی اعتبار سے کوئی قوم اگر سب سے زیادہ تعلیمی پسماندگی کی شکار ہے تو وہ مسلمان ہے ۔ جب میں اسلام کو دیکھتا ہوں اور مسلمانوں کو دیکھتا ہوں تو میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ جس قوم کو سو فیصد تعلیم یافتہ ہونا چاہیے وہ قوم اس قدر ناخواندہ او رغیر تعلیم یافتہ کیسے ہے؟ یہاں پر مجھے مسلمان علماء اور حکمراں دونوں سے شکایت ہوتی ہے کہ انہوں نے اپنی ملی ، دینی اور انسانی ذمہ داری پوری کرنے میں کوتاہی برتی اور قوم وملت کو اپنے شخصی ، ذاتی اور گروہی مفاد کی خاطر جہالت کے قعر مذلت میں گرنے دیا۔ آج بھی ان کی کوتاہی کسی نہ کسی درجے میں جاری ہے جس کا اظہار دینی اور دنیوی تعلیم کی غیر ضروری بحث، لڑکیوں کی تعلیم کے باب میں پائی جانے والی بعض تحفظات اور زبان کی تعلیم کے سلسلے میں بعض زبانوں کو پڑھنے اور نہ پڑھنے کی بحث سے ہوتا ہے ۔ملت کی دینی شناخت قائم رکھنے اور ملک وملت کی آزادی کی جدو جہد میں مدارس اسلامیہ کی تاریخی خدمات کا اعتراف نہ کرنا بڑی ناسپاسی ہوگی مگر دوسری طرف فروعات کا چور دروازہ کھول کر ملت کو غیر ضروری امور میں الجھا کر رکھنا بھی ایک حقیقت ہے جس سے صرف نظر نہیں کیا جاسکتا ہے ۔ بہر حال ماضی کی خامیوں کو اجاگر کر کے حال اور مستقبل کی راہ کھوٹی کرنا عقلمندی نہیں ہے۔

اس وقت ملت میں ایک نئی تعلیمی بیداری اور نئے تعلیمی انقلاب کی ضرورت ہے۔ یہ ایک خوش آئند بات ہے کہ ملت میں بالعموم تعلیم کی اہمیت اور ضرورت کا احساس ہر خاص وعام میں پایا جارہا ہے۔ اور تمام پلیٹ فارم سے تعلیم کو فروغ دینے کی بات کی جانے لگی ہے ۔ملت میں بہت سے افراد نے انفرادی طور پر اور قریب قریب تمام تنظیموں اور اداروں نے اپنے اپنے تنظیمی حلقے کے تحت ہر طرح کے تعلیمی ادارے کھولے ہیں۔ ان میں بچوں کی ابتدائی اسکول

سے لے کر ہائر سکنڈری اسکول تک نیز آرٹس، سائنس اور کامرس کے کالج کے علاوہ میڈیکل کالج، انجینئرنگ کالج، پولی ٹیکنک، آئی ٹی آئی، بی ایڈ اور مینجمنٹ اور پروفیشنل کالجز اور ادارے شامل ہیں۔ ان میں سے کچھ ادارے تو بہت اچھے ہیں اور معیاری تعلیم دے رہے ہیں۔ جہاں سے طلباء ہر مسابقتی امتحانات میں امتیاز کے ساتھ کامیابی حاصل کررہے ہیں، اور اونچے مقامات پر فائز ہیں مگر بیشتر کا تعلیمی معیار اچھا نہیں ہے۔ جس میں کچھ مسئلہ وسائل اور اہل مردان کار کی کمی کا ہے اور کچھ مسئلہ انتظامیہ کی نااہلی یا پھر ان میں پائی جانے والی بدعنوانی اور اقربا پروری کا ہے۔ ادارے کی اندرونی گندی سیاست نے بھی اس کے معیار اور کلچر کو نقصان پہنچایا ہے۔ جس کا خمیازہ بالعموم ملت کی نئی نسل کو بھگتنا پڑتا ہے۔ ان اداروں کے ذمہ داران اور کارکنان سے ہماری اپیل ہے کہ ملت موجودہ حالات میں نااہلی اور منفی سیاست کی عیاشی کی متحمل نہیں ہوسکتی ہے۔ لہٰذا آپ نوشتہ دیوار دیکھیں اور اپنے ذہن اور کام کرنے کے طریقہ میں اصلاح لائیں ورنہ آپ کے ادارے کو قصۂ پارینہ بننے سے کوئی روک نہیں سکتا ہے۔ ہمارے یہاں جتنے بھی اقلیتی ادارے ہیں وہ نہ تو مائنوریٹی کلاز کا صحیح ڈھنگ سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ اور نہ اپنے ادارے کو ملت کے ثقافتی اور ملی ضرورتوں اور امنگوں کے مطابق چلا رہے ہیں۔ وہ محض تعلیم کی دکان بن گئے ہیں جہاں ان کے ذمہ داروں یا کارکنوں کو فائدہ ہو رہا ہے۔ ملت کا مجموعی اعتبار سے خسارہ ہوتا ہے۔ یہ صورتحال بدلنی چاہیے۔ اس ملک میں عیسائی یا پھر آریہ سماج، برہمو سماج، رام کرشن مشن، سکھوں اور پارسیوں کے جو ادارے چل رہے ہیں وہ قومی معیار سے اونچے ہیں اور وہ ادارے Center of Excellence میں شمار ہوتے ہیں۔ جو ہر کسی کے لیے Center of Attraction ہیں۔ جب کہ مسلمان سب سے بڑی اقلیت ہونے کے باوجود اپنے زیر انتظام شاید ہی کوئی ایسا ادارہ چلا رہے ہیں جو Center of Excellence کے زمرے میں آتے ہیں۔ یہ دور مسابقت کا ہے، Survival of the fittest کا ہے اس میں جو چیز بہتر ہوگی وہی باقی رہے گی اور آگے بڑھے گی ورنہ فنا اس کا مقدر ہے۔ ہم دستور کے مائنوریٹی دفعات کا سہارا لے کر کب تک قومی خودکشی کا ناعاقبت اندیشہ عمل جاری رکھیں گے؟

اس لیے میں ان اداروں کے چلانے والوں سے مؤدبانہ اپیل کرتا ہوں کہ خدارا اپنے اداروں کو معیارِ مطلوب تک لانے کی ایماندارانہ کوشش کریں تا کہ آپ کے ادارے کا وقار بلند ہو اور وہاں سے نکلنے والے طلباء کا مستقبل روشن ہو سکے۔ صحیح سوچ کے ساتھ اگر ایماندارانہ کوشش کی جائے تو حالات بہتر ہو سکتے ہیں۔ یہ ہماری پہلی ضرورت ہے۔

سچر کمیٹی کی رپورٹ نے بتایا کہ اس وقت کم وبیش چار فیصد طلباء مدارس اسلامیہ میں زیرِ تعلیم ہیں۔ مدارس اسلامیہ صرف تعلیمی مرکز ہی نہیں ہیں بلکہ اسلام کے قلعے ہیں۔ لہٰذا ان کا وجود اسلام کی ترویج وحفاظت کی ضمانت ہے یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کا ان اداروں سے جذباتی لگاؤ ہے۔ اور جب کبھی ان پر کسی جانب سے حملے ہوتے ہیں تو مسلمان ان کے خلاف سینہ سپر ہو جاتے ہیں۔ حال کے دنوں میں مدارس اسلامیہ کو بدنام کرنے اور ان کو سرکاری کنٹرول میں لینے کی بہت طرح کی سازشیں رچی گئیں ہیں۔ یہ سلسلہ بند تو نہیں ہوا ہے تاہم ادھر اس کی شدت میں کمی آئی ہے۔ مسلمانوں کو ضروری امور سے الگ رکھ کر اضافی مسائل میں الجھا کر رکھنے کی سازش چل رہی ہے۔ یہ بھی اس اسٹریٹجی کا پارٹ ہے۔ کہا گیا کہ مدارس مسلمانوں کو مین اسٹریم میں لانے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں اور یہ دہشت گردی کی نرسری ہیں۔ یہ مسلمانوں کو رجعت پسند اور دقیانوس بنائے رکھنے میں مددگار ہیں۔ مدارس کے موڈرنائزیشن کے نام پر اس کے نصاب اور مزاج میں تبدیلی سے لے کر اس کو سرکاری تحویل میں لانے کی مسلسل کوشش جاری ہے۔ ان تمام امور پر یہاں تبصرہ کرنے کا موقع نہیں ہے۔ یہ ایک مستقل موضوع ہے۔ جس پر الگ سے بھرپور تبصرہ کرنے اور ایک واضح لائحۂ عمل طے کرنے کی ضرورت ہے۔ میں یہاں جس پہلو پر توجہ دینا چاہتا ہوں وہ مدارس اسلامیہ کا تعلیمی معیار ہے۔ میرے خیال میں موجودہ مدارس اسلامیہ کی دو بڑی خامیاں ہیں پہلی یہ کہ ان مدارس میں دین، مبادیاتِ دین، قرآن وسنت کی تعلیم سے زیادہ مسلکی تعلیم دی جاتی ہے جس میں مسلکی اختلافات کو اس شدت سے اجاگر کیا جاتا ہے کہ وہاں سے نکلنے والے فارغین بالعموم اپنی مسلک کے علاوہ کسی دوسرے مسلک والے کو پورا اور صحیح العقیدہ مسلمان ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتے

ہیں نتیجتاً مسلمانوں میں اختلاف امت کا بڑا سبب یہ مسلکی اختلافات بنتے ہیں جس کی آبیاری ان مدارس کے ذریعہ ہوتی ہے ۔ان مدارس کے ذمہ داروں سے میری ایک درخواست یہ ہے کہ دین اور پورے دین کی تعلیم کا اہتمام کریں جس میں قرآن وسنت کی بھرپور تعلیم دی جائے اور مسلکی اور فقہی تعلیم میں اس بات کا اہتمام کریں کہ فقہی اختلافات کے باوجود ملت کی وحدت پارہ پارہ نہ ہواور ایک دوسرے کو برداشت کرنے کا احساس ابھرے۔ دوسری بات یہ ہے کہ چند بڑے مدارس کو چھوڑ کر بالعموم ہمارے مدارس کا عمومی معیار بہت گھٹیا ہے۔ وہاں کے فارغین میں علم اور تفقہ کی کمی ہوتی ہے۔ نیز اپنے مسلک کا بھی اچھا علم نہیں ہوتا اور اخلاقی اعتبار سے بھی وہ اچھے نہیں ہوتے ۔اکثر معاملات میں ان کی جانب سے ایسا سقم دیکھنے کو ملتا ہے جس کی وجہ سے عام طور پر علماء اور دیندار لوگوں کے بارے میں وہ لوگ جو عالم نہیں ہیں اور کوئی دینی معلومات بھی نہیں رکھتے ہیں اچھی رائے نہیں رکھتے ہیں۔ جس کی وجہ سے علماء کی عوامی ساکھ متاثر ہوتی ہے۔

علماء کرام کو سماج میں صرف دین دار لوگوں کے طور پر ہی نہیں دیکھا جاتا بلکہ لوگ ان کو اپنے دینی، روحانی رہنما کے طور پر دیکھتے ہیں اور سماجی، ثقافتی، سیاسی اور دیگر امور میں ان کی طرف رہنمائی حاصل کرنے کے لیے رجوع کرتے ہیں۔ سماج میں ایک عام گریجویٹ اور پوسٹ گریجویٹ یہاں تک کے ڈاکٹر، پروفیسر، وکیل صحافی اور دیگر شعبہ کے لوگوں کی وہ عزت نہیں ہے جو ایک مدرسہ سے فارغ عالم دین کی ہے۔ لیکن جب عالم دین تنگ نظر اور کم فہم ہونگے تو ظاہر سی بات ہے کہ قوم کا کیا ہوگا؟ اس وقت پورے ملک میں ہزاروں کی تعداد میں مدارس اسلامیہ ہیں جن میں لاکھوں طلباء زیر تعلیم ہیں۔ آزادی سے قبل تعلیم جب بڑے لوگوں کی جاگیر ہوا کرتی تھی اعلیٰ خاندانوں کے بچے ان اداروں میں تعلیم پاتے تھے۔اب صورتحال بالکل بدل چکی ہے۔ بڑے اور اعلیٰ خاندان کے بہت کم بچے مدارس اسلامیہ کی طرف رخ کرتے ہیں۔ مسلمانوں کی اکثریت اسکول کالج، پروفیشنل اور ٹیکنیکل اداروں میں جاتی ہیں مدارس میں اس وقت زیادہ تر غریب اور پسماندہ گھرانوں اور برادریوں کے بچے زیر تعلیم ہیں۔

مولانا سید سلیمان ندوی نے ایک بار مسلمانوں کو متنبہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ مدارس اسلامیہ کی بے جا تنقید سے بچا جائے کیونکہ ان میں پڑھنے والے بیشتر طلباء پسماندہ اور غریب خاندانوں اور برادریوں سے آتے ہیں جو اپنے خاندان کے پہلے فرد ہیں جو تعلیم پا رہے ہیں۔انہوں نے کہا کہ تھوڑی شد بد کے بعد ان کی بول چال لباس و پوشاک نشست و برخاست کھانے پینے کے انداز سب بدل جاتے ہیں۔اور مہذب لوگوں میں شمار ہوتے ہیں۔یہ بھی دیکھنے کو ملتا ہے کہ ایک میٹرک پاس یا گریجویٹ جو فارغ ہو کر کہیں ٹیچر یا کلرک ہو جاتا ہے اور ایک عالم دین جو عالم فاضل کر کے کسی مسجد یا مدرسہ میں امام اور معلم ہو جاتا ہے دونوں کے لباس و پوشاک بول چال اور نشست و برخاست میں ایک واضح فرق دیکھنے کو ملتا ہے۔ باوجود اس کے کہ ایک عالم اور امام کی تنخواہ کم ہوتی ہے وہ اسکول ٹیچر اور کلرک کے مقابلے زیادہ صاف ستھرا لباس پہنتا ہے اور زیادہ اچھی گفتگو کرتا ہے۔اس طرح اس کی دوسری نسل اس سے زیادہ بہتر ہوگی اور وہ ترقی کے مدارج آسانی سے طے کر سکتی ہے۔اس لحاظ سے میں مدارس اسلامیہ کی دل سے قدر کرتا ہوں۔مدارس اسلامیہ کا نصاب اور نظام کیا ہونا چاہیے میں ان امور کو ان کے ذمہ داروں اور ماہرین پر چھوڑتا ہوں۔میری درخواست ہے کہ مدارس کے معیار تعلیم کو بلند کرنے کی ایماندارانہ کوشش کی جائے۔ہمیں صرف مدارس اور امام ہی نہیں چاہیے بلکہ اعلیٰ درجہ کے علماء کی بھی ضرورت ہے۔مدرس میں تخصیص اور تحقیق کی حوصلہ افزائی کی جانی چاہیے اور محققانہ اور مجتہدانہ صلاحیتوں کے حامل علماء پیدا کرنے پر زور دینا چاہیے جو اسلامی علوم کے ماہرین ہونے کے علاوہ عصری مسائل اور ماحول پر گہری نظر رکھتے ہیں اور قوم وملت کی صحیح دینی رہنمائی کرنے کا داعیہ رکھتے ہیں۔ہمیں ایک کروڑ جاہل لوگوں سے اتنا نقصان نہیں ہوسکتا جتنا غیر ثقہ علماء سے ہوسکتا ہے۔لہٰذا ملت میں تعلیمی بیداری اور انقلاب میں مدارس اسلامیہ کی اندرونی اصلاح اور اس کی بھرپور حصہ داری متحقق کئے بغیر یہ مقصد حاصل نہیں ہوسکتا ہے۔ ہر بڑے مدرسہ میں باضابطہ تحقیق اور تخصیص کا شعبہ ہونا چاہیے، جہاں اعلیٰ دینی تعلیم کا نظم ہو اور جہاں کے فارغین قوم کی مجتہدانہ انداز سے رہنمائی کے اہل ہوں۔یہ کام ٹکنیکل اور پروفیشنل کالج کھولنے سے کم

اہم کام نہیں ہے۔ اس کے لیے قوم کو اپنے وسائل کا ایک حصہ ضرور لگانا چاہیے تا کہ ملک میں اعلی معیار کے عالم دین پیدا ہو سکیں جن کے علم وتقویٰ، فہم وادراک، تحقیق اور اجتہاد پر قوم کا اعتماد ہو۔ دینی امور میں کھلی بحث کا سلسلہ اور اس کے ساتھ علمی تنقید اور تبصرہ کی ہمت افزائی کی جانی چاہیے۔ علمی تنقید سے ہی کسی علم کا فروغ ہوتا ہے۔ ہر چیز کو کفر واسلام کے پیمانے سے دیکھنا، ہر بات پر فتویٰ جاری کر دینا، صحتمند علمی عمل نہیں ہے۔ علم کے لیے ایک کھلا ماحول درکار ہے۔ کسی کی رائے سے بھی اختلاف کیا جا سکتا ہے کسی پر بھی تنقید کی جا سکتی ہے۔ اس سے کسی کی عزت پر ضرب نہیں پڑے گی۔ اس سے اس کی عظمت اور علو متاثر نہیں ہوگی۔ مدارس میں جب تک ہم اس طرح کا ماحول پیدا نہیں کریں گے طلباء کو تنقید وتبصرے کی کھلی اجازت نہیں دیں گے۔ ان کو اپنے خیالات کے اظہار کے لیے مناسب ماحول اور پلیٹ فارم فراہم نہیں کریں گے، کھلے علمی مسابقت کا ماحول نہیں پیدا کریں گے حضرت جی سے احترام کے ساتھ اختلاف کی اجازت نہیں دیں گے، اس وقت تک صحیح علمی ماحول پیدا نہیں ہو سکتا ہے۔ پھر ان اداروں میں مجتہد نہیں بلکہ مقلد مطلق ہی پیدا ہوں گے۔ پھر شکایت کا کیا موقع ہے اب ہمارے اداروں سے امام ابوحنیفہ، شاہ ولی اللہ، امام غزالی، امام شافعی، امام مالک، امام حنبل، قاسم نانوتوی، مولانا اشرف علی، مولانا احمد رضا خاں، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا ابوالحسن علی ندوی اور ابواعلیٰ مودودی جیسے لوگ نہیں پیدا ہو رہے ہیں۔ ان تمام لوگوں کو آزادانہ علم وتحقیق کا ماحول ملا تھا۔ یہ سب صرف نصابی کتابوں تک محدود نہیں تھے۔ بلکہ انہوں نے قرآن وسنت میں گہری بصیرت حاصل کی اور فقہ وفلسفہ اور علم کلام کی بلندیوں کو چھوا تبھی آسمان اسلام پر چاند سورج بن کر چمکے ہیں۔ ان بزرگوں کی روایات کو قائم رکھتے ہوئے مدارس اسلامیہ کے طلباء کو ایک اچھا اور صحتمند ماحول عطا کیا جائے تو کیا خبر کل انہیں میں سے کوئی وقت کا غزالی اور رومی بن کر ابھرے اور ملت کے نشاۃ ثانیہ کا ہراول دستہ بن جائے۔ لہٰذا مدارس اسلامیہ کے ذمہ داروں اور اساتذہ کرام سے ہماری مؤدبانہ گذارش ہے کہ ان گزارشوں پر سنجیدگی سے غور کیا کریں، اور اگر لگے کہ اس رائے میں کوئی وزن ہے تو اپنے حلقے میں اس پر ضرور مشورہ کریں اور ایک نئی شروعات کی جائے۔

خوب اچھی طرح جان لیجئے۔ جدید جاہلیت بہت پڑھی لکھی، ذہین و زیرک ہے جس کا مقابلہ ہم ساتویں اور آٹھویں صدی کی فقہ سے نہیں کرسکتے، اکیسویں صدی میں ہمیں اجتہاد کا بند دروازہ کھولنا ہوگا جس کے لیے پختہ ایمان، سالم عقیدہ، مضبوط تعلق باللہ اور آخرت کی جوابدہی کے زندہ احساس کے ساتھ ساتھ اعلی علم وفہم، دور رس نگاہ، وسیع مطالعہ، کھلا ذہن اور بہتر علمی ماحول درکار ہے۔ لہٰذا اکیسویں صدی میں دین وملت کی وکالت، دین حق کی شہادت اور اقامت اور انسانیت عظمیٰ تک دین کو پہنچانے اور حجت تمام کرنے کے لیے ایسے ہی علماء کرام کی ضرورت ہے لہٰذا دین وملت میں کسی انقلابی تبدیلی کی راہ مدارس اسلامیہ ہی سے ہوکر نکلے گی، ورنہ کہیں کوئی مصطفیٰ کمال کی طرح ترک ناداں اپنی جہالت اور بیوقوفی میں مرد بیمار کی صحت کے لیے ایسی دوا نہ تجویز کردے جو اس کی زندگی نہیں بلکہ موت کا باعث ہوجائے۔

خوب جان لیجئے علماء انبیاء کے وارث ہیں۔ اللہ کے رسول ﷺ کی حدیث ہے کہ دو گروہ ہیں، اگر وہ ٹھیک ہیں تو پوری قوم ٹھیک رہے گی اور اگر وہ بگڑ گئے تو پوری قوم بگڑ جائے گی۔ ایک علماء ہیں اور دوسرے حکمراں۔ قوم کی اساس وامامت انہیں دوگروہوں کے ہاتھ میں ہے۔ ایک بار حضرت امام ابوحنیفہ ایک جگہ سے گذر رہے تھے۔ بارش کی وجہ سے راستے میں پھسلن پیدا ہوگئی تھی۔ ایک نوجوان تیزی سے دوڑ کر جارہا تھا۔ آپ نے فہمائش کی بیٹے! سنبھل کر چلو پھسل جاؤ گے۔ اس نوجوان نے پلٹ کر ادب سے جواب دیا سنبھل کر چلیں آپ میں پھسلوں گا تو صرف مجھے چوٹ لگے گی، اگر آپ پھسل گئے تو پوری قوم پھسل جائے گی۔ یہ ہے ہمارے علماء اور مجتہدین کی ذمہ داری۔ اگر علماء کرام برا نہ مانیں تو یہ بات ادب کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ مسلمانوں کی موجودہ زبوں حالی میں علماء کی کوتاہی بھی ایک بڑی وجہ ہے۔

بہرحال میری گذارش ہے کہ دینی مدارس کے نصاب تعلیم اور نظام تعلیم میں وسعت لانے کی ضرورت ہے ہندوستان میں کم سے کم دس ایسے اعلیٰ معیار کے مدارس کھولے جائیں، جہاں قرآن وحدیث اور فقہ کی اعلیٰ اور اچھی تعلیم کے ساتھ ساتھ معاشیات، سیاسیات، سماجیات، تاریخ وثقافت، مذاہب کا تقابلی مطالعہ اور قانون وغیرہ کی اعلیٰ تعلیم کا نظم ہو اور جہاں

عربی زبان وادب کے ساتھ ساتھ اردو ہندی اورانگریزی کی اعلیٰ معیاری تعلیم دی جائے ،کمپیوٹر اور انٹرنیٹ اورجدید ذرائع علم کے استعمال کی ہمت افزائی کی جائے،مدارس کے طلبا عام یونیورسٹیوں میں اورعام یونیورسیٹوں کے طلباءاور فارغین کثرت سے ایک جگہ سے دوسری جگہ آئیں اوردونوں کے درمیان قریبی تعلق ہو۔ بلکہ اگر یونیورسیٹی اور مدرسہ کے درمیان رابطے کی کوئی صورت بنے اور joint academic project کی شروعات کی جا سکے تو اس پر بھی غور کرنا چاہیے۔

وقت آ گیا ہے کہ ہم اپنے فہم وفکر میں تبدیلی لائیں اوروقت کوروک کر کھڑے ہونے کی حماقت کرنے کے بجائے وقت کے ساتھ اپنی سمت ورفتار طے کریں تا کہ زمانہ ہم کو دقیانوسی قرار دے کر رد نہ کردے۔ اصلاح احوال کی میری رائے میں یہ ایک ضروری کڑی ہے جس پر میں تمام علماء کرام اورزعمائے عظام کوتوجہ دینے اورسوچنے کی دعوت دیتا ہوں ۔

غربت اور جہالت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ جہاں غربت ہے وہیں جہالت و پسماندگی ہے اور جہاں جہاں پسماندگی ہے وہیں غربت ہے۔ مسلمانوں کاایک اجتماعی جرم یہ ہے کہ جس رسول ﷺ پر وہ ایمان لاتے ہیں اور جس کا کلمہ پڑھتے ہیں، اس رسول ﷺ کا یہ فرمان وہ بھول گئے کہ علم حاصل کرنا تمام مسلمانوں پرفرض ہے۔اس حکم کی تعمیل کے لیے انہوں نے کبھی بھرپور ایماندارانہ کوشش نہیں کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے ایک محدود طبقہ کے علاوہ قوم کی غالب اکثریت جہالت کے اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتی رہی۔ اسلام جوانصاف و رواداری کا دین تھا جس نے غریبوں کو مالداروں کے مال میں حقدار بنایا تھا اوران کے ساتھ انفاق واحترام کا سبق سکھایا تھا لوگ اس کوبھول گئے اورمسلمان زمیندار، جاگیردار، سرمایہ دار، صنعت کار، تاجر، علماء، حکمراں اورمنصب دار اور قوموں کے اعلیٰ طبقہ کی طرح ظلم واستحصال کرتے رہے اوراسلامی اخوت ومساوات کے تمام تر اصولوں کو بالائے طاق رکھ دیا۔مسلمان سماج کی موجودہ ابتری ہمارے اسی تاریخی جرم کا نتیجہ ہے۔آج کا مسلم سماج اپنے پاور ہاؤس سے کٹ کر بےنور اور بدرنگ ہوگیا ہے۔

اب حالات نے نئی کروٹ لی ہے ۔ایک نئے عوامی دور کا آغاز ہو چکا ہے۔ جمہوریت کے برکات کے تحت انسانی شرف ومساوات کا جو تصور قرآن کی آیتوں میں موجود ہے اس کو قانونی اور دستوری حق کے طور پر تسلیم کرلیا گیا ہے اور اس کی بازآوری کی جد وجہد جاری ہے۔ جمہوریت نے Adult suffrage کی بنیاد پر ایک فرد ایک ووٹ کا حق تسلیم کیا ہے اور غریب ان پڑھ اور کمزور ترین فرد اور طبقے کو بھی جمہوری اور سیاسی عمل میں حصہ دار بنا کر اس کو با اختیار بنادیا ہے تا کہ وہ اپنے مسائل اور ضرورتوں کا اظہار کر سکے اور اپنی پسند کے مطابق اپنی حق رائے دہندگی کا استعمال کر سکے۔ ہمارے ملک میں ملٹی پارٹی جمہوریت قائم ہے اور ہر پانچ سال پر انتخاب ہوتے ہیں۔ تمام تر بدعنوانی اور کرپشن کے باجود سیاسی مسابقت کی وجہ سے عوامی فلاح کے منصوبے بنائے جا رہے ہیں اور غریبوں اور کمزور طبقات کو خاص رعایتیں اور سہولیات دی جارہی ہیں۔ یہ ذمہ داری کمیونٹی لیڈر شپ کی ہے کہ وہ ان اسکیموں اور سہولیات سے کس طرح فائدہ اٹھاتے ہیں۔

اس وقت رائٹ ٹو فوڈ کے تحت بی پی ایل خاندانوں کو 3 روپے کے در سے 25 کیلو چاول اور دو روپے کی شرح سے 35 کیلو گیہوں دیا جا رہا ہے۔ اس طرح بھوک مری کے مسئلے پر بڑی حد تک قابو پانے کی کوشش جاری ہے۔ اسی طرح ملک میں رائٹ ٹو ایجوکیشن کا قانون نافذ ہے۔ اس کے تحت بچوں کو مفت کتابیں۔ پوشاک، مڈڈے میل دی جارہی ہے۔ بچیوں کو سائیکل فراہم کی جاتی ہے اور پڑھنے والے کامیاب طلبا کو وظائف اور انعامات سے نوازا جارہا ہے۔ مدارس میں پہلے سے ہی یہ ساری سہولتیں مہیا ہیں۔ جس کا خرچ کمیونٹی برداشت کرتی ہے۔ چھوٹے بچوں کو کام پر نہ لگانے کا قانون پاس کر دیا گیا ہے ۔خاص طور سے ایسے کام پر لگانا جوان کی صحت کے لیے خطرناک ہے ایک قابل تعزیر جرم ہے۔ ہر کمیونٹی کو ابتدائی تعلیم سے لے کر ثانوی تعلیم کا نظم خود کرنے کی اجازت ہے جہاں وہ اپنے عقائد، زبان اور تہذیبی روایات کے ساتھ بچوں کو عصری تعلیم دے سکتے ہیں۔ دستور کی بنیادی حقوق کی دفعہ 29,28, 30 کے تحت اقلیتوں کو تمام طرح کے تعلیمی ادارے کھولنے اور چلانے کی اجازت ہے۔ اس کی

کچھ شرطیں اور دقتیں بھی ہیں مگر لوگ ان تمام تر مشکلات کے باوجود کام کررہے ہیں۔تعلیم کا عمومی ماحول بنا ہے۔اقوام متحدہ کی یونیسکو سے لے کر مرکزی اور ریاستی حکومتوں کے علاوہ بہت سے این جی اوز اور رضا کار ادارے، تنظیمیں، افراد اور ادارے تعلیمی بیداری، تعلیمی بہتری اور تعلیم کے فروغ کا کام کررہے ہیں۔

ایسے ماحول میں کسی قوم کے بچوں کا جاہل اور تعلیم سے محروم رہنا بڑی بدنصیبی اور بہت بڑی محرومی ہوگی۔ہمیں ہر مسلمان والدین کو بتانا ہے کہ روٹی اور تعلیم ایک بچے کا بنیادی حق ہے۔اس حق کو پورا کرنے کی سب سے پہلی ذمہ داری ماں باپ کی ہے۔سماج اور سرکار کی ذمہ داری اس کے بعد ہے۔اگر کوئی ماں باپ اپنی اس ذمہ داری کو پوری نہیں کرتا تو اسے قابل تعزیر جرم ماننا چاہیے۔اور اب جب کہ رائٹ ٹو فوڈ کے تحت کھانے کا انتظام کر دیا گیا ہے تو رائٹ ٹو ایجوکیشن کے قانون کی خلاف ورزی کرنے پر سزا دینا واجب ہے۔مسلمان والدین کو یہ بتانا ہوگا کہ بچوں کو پیدا کرنا ہی کافی نہیں ہے بلکہ اس کو پڑھانا بھی ہوگا۔مسلمان سماج میں اس نعرہ کو عام کرنے کی ضرورت ہے''آدھی روٹی کھائیں گے،بچوں کو پڑھائیں گے'' آج کل ایک کیلومیٹر کی دوری پر پرائمری اسکول دو کیلومیٹر کی دوری پر ایک سکنڈری اسکول اور چار سے پندرہ کیلومیٹر کے فاصلہ پر کوئی نہ کوئی کالج ضرور ہے۔اس کے علاوہ مدرسہ اور سنسکرت پاٹھ شالہ ہیں۔بچوں کو کتابیں، مڈڈے میل اور سائیکل دی جارہی ہے۔اس لیے ایسی کوئی واجبی مجبوری نہیں ہے کہ بچے اب اسکول نہ جائیں۔پہلے اسکول کی بلڈنگ نہیں تھی، بنچ ڈسک نہیں تھا۔ ٹوائلٹ اور پینے کے پانی کا انتظام نہیں تھا جس کی وجہ سے بچوں خاص کر لڑکیوں کو دقت ہوتی تھی۔مگر اب یہ سہولتیں کسی حد تک مل رہی ہیں اور اس میں مزید سدھار کی کوشش جاری ہے۔ اس وقت سرکاری اسکولوں میں ناتجربہ کار اساتذہ کی بڑے پیمانے پر کنٹریکٹ پر بحالی کی گئی ہے۔اس کے علاوہ ان سے تعلیم کے علاوہ بہت سے غیر تدریسی کام لیے جارہے ہیں۔ٹیچرس کی بڑی تعداد اسکولوں سے غیر حاضر رہتی ہے۔شعبہ تعلیم میں پھیلے ہوئے کرپشن کی وجہ سے یہ سارے انتظامات ہاتھی کے دانت کی طرح ہیں۔لہٰذا بچے برسوں ان اسکولوں میں پڑھنے کے

باوجود کچھ بھی پڑھ او رسیکھ نہیں پاتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ نجی اسکولوں کی باڑھ سی آئی ہوئی ہے۔ہرگلی چوک چوراہے پرنجی اسکول کھلے ہوئے ہیں۔جہاں بیکار،کم تعلیم یافتہ اورغیر تربیت یافتہ لڑکے لڑکیاں بہت تھوڑے پیسے پر پڑھاتے ہیں۔گرچہ ان کی صلاحیتیں بھی واجبی ہوتی ہیں تاہم نجی ہاتھوں میں ہونے کی وجہ سے کمرشیل انٹریسٹ ہوتا ہے۔لہٰذا وہاں کا سسٹم سرکاری اسکولوں سے کچھ بہتر ہے اور باہمی مسابقت کی وجہ سے کچھ بہتر تعلیمی ماحول پایا جاتا ہے۔ان دنوں مدارس اسلامیہ کی تعداد میں بھی اضافہ ہوا ہے۔مگر ان کا بھی تعلیمی معیار بہت گھٹیا ہے۔ ان تمام اداروں میں کوئی تعلیمی ماحول ہے ہی نہیں۔جولوگ صاحب وسائل ہیں ان کا مسئلہ اور مطالبہ دوسرا ہے۔میں یہاں ان کے مسائل پر بحث نہیں کروں گا۔ہمیں یہاں اسی ماحول میں اپنے وسائل کے تحت اپنے بچوں کی تعلیم کا نظم کرنا ہے۔ان دنوں سماج کے کمزور اور پسماندہ ترین طبقے میں بھی تعلیم کا شوق پیدا ہوا ہے۔اور دوسری کمیونیٹی کے غریب سے غریب لوگ بھی اپنے بچوں کو پڑھا رہے ہیں۔ایک دن میں ایک رکشہ پرسوار ہوا،رکشہ والے سے اس کے بچوں کے بارے میں پوچھا۔اس نے بتایا کہ اس کے تین بچے ہیں دولڑکا ایک لڑکی۔وہ ان تینوں بچوں کو ایک پرائیویٹ اسکول میں پڑھاتا ہے گاؤں کا اسکول ہے جوفی بچہ ۱۵۰ روپے ماہانہ فیس لیتا ہے۔گویا وہ رکشہ پولر ۴۵۰روپے ہر ماہ بچوں کی فیس دیتا ہے پھر ان کے یونیفارم اور کتابوں کا نظم کرتا ہے وہ رکشہ پولر ہندو پسماندہ برادری سے تعلق رکھتا تھا ہمیں یہی جذبہ اور احساس مسلمان گارجین میں پیدا کرنا ہے۔

میرے مکان میں ایک مزدور کام کرتا تھا اس کے بھی دو بچے تھے۔اسے یومیہ ۱۵۰/ روپے مزدوری ملتی تھی۔اپنی آمدنی کو بڑھانے کے لیے اس نے گائے پال رکھا تھا اور مدھومکھی پالتا تھا دیکھنے سے وہ بہت محنتی لگتا تھا۔جب اس سے پوچھا کہ تم اتنی محنت کیوں کرتے ہو تو اس نے کہا کہ میں اپنے بچوں کو اپنی طرح مزدور نہیں بنانا چاہتا ہوں۔اس لیے ان کو پڑھا رہا ہوں۔ ان کی پڑھائی کا خرچ پورا کرنے کے لیے میں دن رات محنت کرتا ہوں تاکہ ہماری آمدنی بڑھے اور ہم اپنے بچوں کو اچھی تعلیم دے سکیں۔اس کا تعلق بھی ہندو بیک وارڈ ذات سے تھا جس کو یہ

شکایت تھی کہ اس کے گاؤں کے فورورڈ لوگ ان لوگوں کو بہت تنگ کرتے ہیں لہٰذا ذلت کی اس زندگی سے بچنے کے لیےتعلیم ہی واحد راستہ ہے۔علم اور جانکاری ایک طاقت ہے جس کے ذریعہ آدمی اپنا حق جان سکتا ہے۔اور مانگ سکتا ہے اور کون کس طرح ان کا حق چھین رہا ہے اس کو پہچان سکتا ہے۔ پھر اس کو کیسے پایا جائے اس کی لڑائی لڑسکتا ہے۔جب تک یہ جذبہ اور یہ داعیہ مسلمان والدین میں پیدا نہیں ہوگا ہم ملت کی زبوں حالی دور نہیں کر سکتے ہیں۔

کسی قوم کی سب سے بڑی قوت اس کے انسانی وسائل ہیں۔آج ہم ہندوستان میں خود کو ۲۰ ر کروڑ بتاتے ہیں، ملک کی سب سے بڑی اقلیت بلکہ دوسری بڑی اکثریت کہتے ہیں۔ اس بنیاد پر اپنا حق اور حصہ مانگتے ہیں۔مگر یہ تعداد ہماری طاقت بننے کے بجائے ہماری کمزوری بن گئی ہے۔کیونکہ ہماری غالب اکثریت غیر تعلیم یافتہ غیر ہنر مند ہے۔جو کہ ایک بوجھ ہے لہٰذا جب تک ہماری آبادی میں کوالیٹی Improvement نہیں ہوگا، ہم کمزور اور پسماندہ رہیں گے اور لوگ ہمارا آسانی سے استحصال کرتے رہیں گے۔اس صورتحال سے نکلنے کا واحد راستہ تعلیم ہے ۔اس لیے ایک Vision اور ایک Mission کے تحت قوم کو یہ عہد کرنا چاہیے کہ 2030 تک ہم اپنی قوم کو خواندہ بنائیں گے نیز پانچ سال سے چودہ سال تک کا کوئی بچہ خواہ لڑکا ہو یا لڑکی شہری ہو یا دیہاتی امیر ہو یا غریب کسی برادری رنگ ونسل علاقے عقیدے اور مسلک سے تعلق رکھتا ہے اس کو تعلیم سے آراستہ کریں گے۔اس پوری گفتگو کا ماحصل یہ ہے کہ جو ذرائع اور وسائل میسر ہیں اور ہو سکتے ہیں اس کا بھر پور استعمال کر کے خواندگی کے مہم اور مشن کو کامیاب کیا جائے۔اور اپنے سماج کے کسی بھی شخص کو ان پڑھ نہ رہنے دیا جائے۔

تعلیم ایک ایسا موضوع ہے جس پر ایک مبسوط مقالہ کیا، ایک ضخیم کتاب لکھی جاسکتی ہے۔لہٰذا اس گفتگو کو نظری رخ دینے کے بجائے میں یہاں کچھ عملی پالیسی پروگرام کی نشاندہی کرنا چاہتا ہوں جس کے بارے میں میرا خیال ہے کہ اگر ان اسکیموں پر لوگ بحث کریں اور اس کی روشنی میں کوئی عملی منصوبہ بنا کر اپنے اپنے مقام پر کوشش کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ 2030 تک اور قوموں کی طرح ہندوستانی مسلمانوں کو بھی صد فی صد خواندہ اور تعلیم یافتہ نہیں بنایا

جاسکتا ہے۔

(۱) مسلمانوں کی ہر جماعت، تنظیم اورادارہ تعلیمی بے داری کواپنا خصوصی ایجنڈا بنائے اوراپنے اپنے حلقہ اثر میں تعلیمی بیداری کی خصوصی مہم چلائے بلکہ تعلیمی بیداری مہم کے ذریعہ عوام میں نفوذ حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ اس سے تعلیم کوفروغ بھی حاصل ہوگا اوران کی عوامی پہنچ میں بھی اضافہ ہوگا جو دونوں کے لیے فائدہ مند ہے۔

(۲) ائمہ مساجد اور علماء کرام جمعہ کے خطبوں، میلاد کی مجلسوں، سیرت اور دیگر دینی جلسوں میں تعلیم پر زور دیں اور مسلمان والدین کو اپنے بچوں کی تعلیم کے لیے خصوصی ترغیب دیں۔

(۳) ہر محلے اور گاؤں میں نوجوانوں کی ایک ٹیم تشکیل دی جائے جو گھر گھر جاکر اس کا جائزہ لے کہ کوئی بچہ اسکول جانے سے محروم نہ رہے اور اگر کوئی ہے تو اس کی وجہ معلوم کرکے اس کو دور کرے۔ یہ مہم خاص طور پر تعلیمی سال کے شروعات میں چلائی جانی چاہیے۔ اس سے داخلے کے تناسب میں اضافہ ہوگا۔

(۴) اس وقت تمام جماعتوں کے پاس طلباء اورنوجوانوں کا ونگ ہے۔ جیسے جماعت اسلامی کی طلبہ ونگ ایس آئی او ہے اسی طرح تبلیغی جماعت سے ہزاروں نوجوان وابستہ ہیں۔ ان نوجوانوں اورطلباء تنظیموں کو آمادہ کیا جائے کہ وہ اپنے کام اور پروگرام میں خواندگی مشن کو لازمی بنائیں۔ اور جس طرح نماز اور دیگر دینی کاموں کی تلقین وتبلیغ کی جاتی ہے اسی طرح تعلیم کی ترویج واشاعت کے لیے خصوصی مہم چلائیں۔ نیز طلباء کو تعلیمی امداد، وظائف، کیریر گائیڈنس اور دیگر سہولیات فراہم کرنے میں مددگار ہوں۔ اس سے طلباء اور نوجوانوں کو بھی فائدہ ہوگا۔ اوران تنظیموں کو بھی استحکام وترقی حاصل ہوگی۔

(۵) Talent کسی خاص فرد، خاندان اورفرقہ کی میراث نہیں ہے۔ ایسے ہزاروں بچے ہیں، جو بہت ذہین وزیرک ہیں انہیں خداداد صلاحیت حاصل ہے۔ مگر مناسب

ماحول اور موقع نہیں ملنے کی وجہ سے،ان کی ساری صلاحتیں ماند پڑ جاتی ہیں۔ اور ختم ہو جاتی ہیں۔ یہ قومی اور ملی نقصان ہے۔ لہٰذا ملت کو اس نقصان سے بچانے اور اس کی نئی پود میں جو ٹیلنٹ ہے اس کو اجاگر کرنے کے لیے خصوصی منصوبہ بنانا چاہیے۔ اس کے لیے ملت کو دو سطحوں پر Talent search پروگرام کا آغاز کرنا چاہیے۔ ہر ضلع میں پہلے درجہ سے لے کر آٹھویں درجے کے بچوں کا ایک ٹیلنٹ ٹسٹ لیا جائے اور دوسرا نویں کلاس سے بارہویں کلاس کے بچوں کا ٹسٹ ہو۔ ہر ضلع سے ایسے دس بچوں کو منتخب کیا جائے ،جو پورے ضلع میں نمایاں مقام حاصل کریں۔ اوران کو آگے کی تعلیم کے لیے خصوصی تعاون دیا جائے تاکہ وہ زندگی میں کامیاب بنیں اور اپنا اور اپنے ملک کا نام روشن کریں۔ جیسے بہار میں اس وقت 38 اضلاع ہیں تو بہار میں 380 بچے درجہ اول سے درجہ آٹھ تک کے ہوں گے اور اتنے ہی بچے نویں سے بارہویں تک کے ہوں گے ۔یعنی سالانہ کل 760 بچوں کو اس طرح ہر سال چنا جائے ،اوران کی بھر پور تعلیمی مدد کی جائے تو ملت کی کایا پلٹ سکتی ہے۔ بہار میں جماعت اسلامی ،امارات شرعیہ ،ادارہ شرعیہ اور جمعیت اہل حدیث اوراسی طرح کی دیگر دینی اور سماجی اداروں کو یہ کام اپنے ہاتھ میں لینا چاہیے ۔اس طرح کی کوششیں اگر ہندوستان کی تمام ریاستوں اوراس کے تمام اضلاع میں شروع کیا جائے تو چند سالوں میں ہمارے پاس باصلاحیت نوجوانون کی ایک بڑی ٹیم مہیا ہوسکتی ہے۔ جو قوم کے چہرے سے ذلت و پسماندگی کا داغ دھونے میں بہت مددگار ہوگی ۔

(٦) ہمارے پاس ایسی رضا کار تنظیمیں ہونی چاہیے، جو سرکار کی اُن پالیسی اور پروگراموں نیز رعایتوں اور سہولتوں پر نظر رکھے، جو اقلیتوں بالخصوص مسلمانوں کے لیے بنائی گئیں ہیں۔ تاکہ ان کے نفاذ میں ڈنڈی ماری نہ ہو ۔اور بچولیے ان فائدوں کو ہڑپ نہ لیں، اوران اسکیموں کا پورا پورا فائدہ مسلمان ملت کے نوجوانوں کو حاصل ہو۔اس وقت سرکار نے مسلمانوں کی تعلیمی بہتری کے لیے مختلف سطحوں پر مختلف قسم

کے وظائف دینے کا اعلان کیا ہے۔ نیز عام طلباء کی طرح مسلمان پسماندہ اور بیک ورڈ طلباء کو بھی تعلیم کی سہولت مہیا کی جارہی ہے۔ اس کے علاوہ تعلیمی قرضوں کا بھی نظام قائم ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ان فائدوں کے حصول میں پریشانیاں ہوتی ہیں اور قدم قدم پر رکاوٹوں کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے۔ لہٰذا ہمارے پاس ایسے ایجنسی، ادارے اور لوگ ہونے چاہئیں جو ان کاموں میں طلبا کی مدد کریں اور ضرورت کے وقت طلباء ان سے رجوع کریں۔ مسلمان تنظیمیں اپنے یہاں اس طرح کے شعبے قائم کر کے طلباء کو صحیح معلومات اور صحیح رہنمائی فراہم کر سکتے ہیں۔ نیز اپنے اثرات کا استعمال کر کے ان کی ان امور میں مدد بھی کر سکتے ہیں۔

(۷) مسلمان معاشرہ میں ایسے لاکھوں افراد ہیں جو خوش حال ہیں مگر ان کی اولادیں نہیں ہیں۔ بہت سے لوگ اپنے خاندان کے یا کسی اور کے بچے کو گود لیتے ہیں۔ اسلام میں اس کی کوئی شرعی حیثیت نہیں ہے اور وہ شرعی طور پر ایسے گارجین کے وارث نہیں ہوتے ہیں۔ تاہم ایسے لوگ چاہیں تو اپنی جائداد کا ایک تہائی حصہ بطور وصیت عطا کر سکتے ہیں۔ ایسے خوش حال مسلمان افراد کو میرا مشورہ ہے کہ وہ غریب مگر ذہین بچوں کو تعلیمی گود لیں اور ان کی تعلیمی کفالت کریں تو یہ چیز ان کے لیے صدقہ جاریہ ہوسکتی ہے اور ان کے وسائل کا ایک بہت ہی بہتر اور مفید استعمال ہوسکتا ہے یہ کام وہ بطور فرد بھی کر سکتے ہیں یا کوئی ادارہ اور ٹرسٹ بنا کر بھی کر سکتے ہیں۔ اس سے بہت سے بے اولاد لوگوں کو ترغیب ہوگی۔ اور ملت کی بڑی ضرورت پوری ہوسکتی ہے۔ غریب اور یتیم بچے جن کا کوئی سہارا نہیں ہے اس ذریعہ سے باوقار کفالت حاصل کر پائیں گے اور بڑے اور کامیاب ہو کر ایسے اصحاب کا نام روشن کریں گے۔ ان کی یہ معنوی اولاد ان کے لیے صدقہ جاریہ ہوگی۔

(۸) ہمارے یہاں آج بھی ایسی سیکڑوں خانقاہیں، گدی اور مزارات ہیں جہاں سالانہ کروڑوں روپیوں کے نذرانے آتے ہیں۔ ساتھ میں کچھ خانقاہوں نے ان پیسوں

سے بڑے بڑے ٹیکنکل ادارے قائم کئے ہیں۔اس روایت کوآگے بڑھانا چاہیے۔
اوراجمیر شریف اوراس طرح کے بڑے مزارات جہاں سالانہ لاکھوں زائرین جاتے ہیں اورجن کے نذرانے کی رقوم کروڑوں میں ہوتی ہے ان کوملت کے عمومی فلاح میں استعمال کرنے پرغور کرنا چاہیےاوراس سے بڑے ہسپتال، مدارس، بڑے اسکول، کالج ،انجینئرنگ اورمیڈیکل کالج کھولنا چاہیے ۔ایسی کوششوں سے ان مزارات کی معنویت میں بھی اضافہ ہوگااوران کی آمدنی واقعی طور پرملی اورملکی فلاح میں خرچ ہوگی، جواُن بزرگان دین کا مقصد حیات رہاہے۔بہار میں کشور کنال سابق آئی پی اس افسرنے مہاویر مندر میں چڑھاوے سے حاصل شدہ رقم سے بڑے بڑے تعلیمی ادارے اورہسپتال قائم کئے ہیں۔پٹنہ میں مہاویر کینسر ہسپتال مشرق ہند کاسب سے بڑا ہسپتال ہے۔جب یہ کام غیرمسلم لوگ کرسکتے ہیں تو مسلمان کیوں نہیں کرسکتے ہیں؟ ہمیں مثبت طور پران باتوں پرغور کرنا چاہیے۔

(۹) ملت کے پاس پورے ملک میں اربوں کی اوقاف ہے، جو بدانتظامی اور بدعنوانی کی وجہ سے برباد ہورہی ہے اوراس کا غلط استعمال ہورہاہے۔لاکھوں ایکڑ زمین بیکار پڑی ہوئی ہےجس کا کوئی استعمال نہیں ہے ہروقت اس بات کا خطرہ بنا رہتا ہے کہ کب کوئی اس پرناجائز قبضہ جمالے یاسرکاراس کوتلف کردے ۔پورے ہندوستان میں مرکزی اورریاستی حکومتیں وقف جائیداد کی سب سے بڑی غاصب ہیں۔اوراس سے جوبچتاہے اس کومتولی اوروقف بورڈ مل کرتہس نہس کررہے ہیں۔سرکار نے قانون بنایا ہےمگر اس کاٹھیک ڈھنگ سے نفاذ نہیں ہورہاہے۔وزارت اوقاف، وزارت اقلیتی امور،وقف بورڈ،سب ہاتھی کے دانت ہیں۔بہرحال میرا مشورہ یہ ہے کہ وقف کی ان جائدادوں کی حفاظت اوربہتر استعال کاایک اچھااور بڑاذریعہ یہ ہے کہ افتادہ زمینوں پرسی.بی.ایس.سی اسکول، بی ایڈکالج، پولی ٹیکنک، انجینئرنگ اورمیڈیکل کالج ،اسی طرح کی دیگر تعلیمی ادارے کھولے جائیں،تاکہ ان زمینوں کا

بہتر استعمال ہو سکے، چونکہ یہ وقف بالعموم غریبوں کے فائدے کے لیے ہیں۔لہٰذا ان اداروں میں 25% فیصد داخلہ غریبوں کا ہونا چاہیے،اس سے وقف کا مقصد بھی پورا ہوگا۔اوران جائدادوں کے بہتر استعمال کے ساتھ ساتھ اس کی حفاظت بھی ہو سکے گی۔

(۱۰) ہمیں اچھے علماء اچھے انجینئر،اچھے ڈاکٹر،اچھے اساتذہ،اچھے ایڈمنسٹر،اچھے سائنٹسٹ اورتمام شعبوں کے اچھے ماہرفن چاہئیں، اس کے لیے اچھی کوچنگ ،اچھی ٹریننگ اوراچھی کنسلٹنسی کی ضرورت ہے ۔لہٰذا ہمیں اعلی اداروں جیسے آئی آئی ٹی، آئی آئی ایم، آئی آئی ایس سی، یو پی ایس سی،آئی اے ایس اورالائیڈ سروسز میں کامیابی کے لیے اعلیٰ درجے کے کوچنگ سینٹرز کھولنے چاہیے جہاں طلباء کی اچھی اورمعیاری تیاری کرائی جاتی ہے اور ہرطرح کی سہولت بہم پہنچا کر ان کو کامیاب بنانے کا جتن کرنا چاہیے۔ کچھ جگہوں پر یہ کوششیں ہورہی ہیں اورجگہوں پربھی ان کو کھولنے کا اہتمام کرنا چاہیے۔ساتھ ہی ان کے معیار کولگاتار بڑھانے پر خاص توجہ دینی چاہیے طلباء کی کامیابی کی شرح سے ان اداروں کے معیار کا اندازہ ہوگا۔اس کے لیے نامور علماء، اساتذہ اورایڈمنسٹریٹر کوسامنے آنا چاہیے اورملت کوبھی دل کھول کران کوششوں میں مالی امداد کرنی چاہیے۔

(۱۱) ہمارے یہاں جوبھی اقلیتی تعلیمی ادارے ہیں ان میں بعض کوچھوڑ کر کوئی بھی ایسا نہیں ہے ، جواپنے ثقافتی مقاصد کوصحیح ڈھنگ سے پورا کررہا ہوجس کی وجہ سے ان اداروں کی بڑی بدنامی ہوتی ہے اوران کی سماجی ساکھ گرتی جارہی ہے۔ان اداروں کا فائدہ یاتو اس کی انتظامیہ کوہوتا ہے یا پھران لوگوں کوجوان اداروں میں کام کرتے ہیں۔گھٹیا معیارتعلیم کی وجہ سے طلباء کا نقصان بھی ہوتا ہے۔ اس لیے میں ان اداروں کے ذمہ داروں اوراساتذہ سے اپیل کروں گا کہ خدارا آپ اپنی ذمہ داریوں کوپہچانیں اورملت کی اس امانت کی حفاظت کریں۔ان اداروں کے تعلیمی

معیار کو بہتر بنانے اور اسے اپنے علاقہ میں Institution of choice بنانے کی ایماندارانہ کوشش کریں۔ ورنہ جس دن آپ ملت کی حمایت کھودیں گے دستور میں ملی اقلیتی حقوق کی چھتری سر سے اڑ جائے گی، اور آپ کھلی دھوپ میں آ جائیں گے۔ اس لیے نوشتہ دیوار پڑھئے اور اپنے میں سدھار لانے کی کوشش کیجئے۔ یہ وقت کا تقاضہ بھی ہے اور ملت کی ضرورت بھی۔

(۱۲) اس وقت پورے ملک میں جب اقلیت کا نام آتا ہے۔ تو اس سے مسلمان ہی سمجھے جاتے ہیں۔ جب کہ دستور میں ملے اقلیتی حقوق بالخصوص تعلیم کے باب میں ملے حقوق کا زیادہ تر فائدہ عیسائیوں نے اٹھایا ہے یا پھر جین اور پارسیوں نے۔ ہندوؤں کے ایسے بہت سے گروہ ہیں جو اقلیت کی تعریف میں نہیں آتے ہیں مگر انہوں نے اقلیتی حقوق سے فائدہ اٹھانے کے لیے خود کو اقلیتی ادارے کے طور پر رجسٹرڈ کرایا ہے۔ جیسے آریہ سماج، برہمو سماج، رام کرشن مشن وغیرہ۔ ان لوگوں نے پورے ملک میں بڑے بڑے ادارے قائم کر رکھے ہیں۔ ہندو نشاۃ ثانیہ میں ان اداروں کا اہم رول ہے مسلمانوں نے جو ادارے کھولے ہیں ان کا حال میں اوپر بیان کر چکا ہوں۔ تاہم مسلمانوں کی جانب سے ایسے اداروں کا جال بچھانا چاہیے۔ اس لیے میرا مشورہ ہے کہ ہر ضلع میں مسلمان کم از کم ایک جنرل اور ایک پروفیشنل کالج کھولیں اور ہر ریاست میں ایک اقلیتی یونیورسٹی کا قیام عمل میں آئے۔ اس تجویز پر ملت کے صاحب ثروت اور سمجھدار لوگوں کو توجہ دینی چاہیے۔ یہ ادارے مسلمانوں کے زیر انتظام تو ہوں گے مگر اس میں تمام قوموں کے طلباء کے لیے گنجائش ہوگی۔ یہ ادارے ملی اور ملکی ضرورتوں سے ہم آہنگ ہوں گے۔ ان اداروں کے قیام سے قومی یکجہتی کو بڑھاوا ملے گا، جو سماجی امن اور ملکی ترقی کے لیے ضروری ہے۔

(۱۳) یہ خوش آئند بات ہے کہ علی گڑھ مسلم یونیورسیٹی نے اپنی ملی ذمہ داری محسوس کرتے ہوئے، مرکزی حکومت کی ایما پر ملک کے چار حصوں میں اپنا آؤٹ کیمپس کھولنے

کا فیصلہ کیا ہے۔ بہار میں اس کا کیمپس کشن گنج میں کھولا ہے۔ ملی اور سیاسی تنظیموں کو مل کر یہ کوشش کرنی چاہیے کہ یہ ادارہ جلد سے جلد قائم ہوجائے پورے مشرقی ہند میں تعلیم کے پھیلاؤ میں اس سے بہت مدد ملے گی۔

(۱۴) مسلمان ملت کی ایک بڑی خامی یہ ہے کہ لڑکیوں اور عورتوں کے سلسلہ میں ان کا ذہن صاف نہیں ہے۔ ایک زمانہ تک یہ بات دھڑلے سے کہی جاتی تھی کہ عورتیں ناقص العقل ہوتی ہیں اور آج بھی کچھ ناقص العقل لوگ یہ بات دہراتے سنے جاتے ہیں۔ جب کہ قرآن وسنت کے مطالعہ سے بالکل دوسری تصویر ابھرتی ہے۔ قرآن کی رو سے عورت ومرد دونوں شرف خلافت سے برابری کے ساتھ نوازے گئے ہیں۔ خدا کے سامنے دونوں یکساں جواب دہ ہیں۔ کچھ معاملات میں مردوں کو برتری حاصل ہے تو کچھ معاملات میں عورتوں کو برتری حاصل ہے۔ عورت اور مرد مل کر ہی خاندان اور سماج بناتے ہیں۔ کل تک عورتوں کو تعلیم سے محروم رکھا جاتا تھا۔ اور انہیں گھر کی چہار دیواری میں قید رکھا جاتا تھا۔ اس لیے ان کی ذہنی اور علمی صلاحیتوں کا کوئی اندازہ نہیں ہوتا تھا۔ اور عام طور پر انہیں کم عقل خیال کیا جاتا تھا۔ مگر ماضی بعید اور ماضی قریب میں جن عورتوں کو پڑھنے لکھنے کا موقع ملا اور جنہیں اپنی صلاحیتوں کو باہر لانے کی اجازت دی گئی تو انہوں نے محیر العقول کارنامے انجام دیئے۔ مگر اس کے بعد بھی لوگ اس حقیقت کو نہیں سمجھ پائے۔

مسلمانوں کی زبوں حالی کی بڑی وجہوں میں ایک وجہ یہ ہے کہ مسلمان ملت نے اپنی آدھی آبادی کو مفلوج بنا رکھا ہے۔ یعنی پوری قوم محض ایک ٹانگ پر چل رہی ہے۔ ظاہر ہے ایک ٹانگ سے چلنے والی قوم کیسے دونوں پیروں سے چلنے والی قوم کا مقابلہ کرسکتی ہے۔ اب جب کہ عورتوں کو پڑھنے کا موقع مل رہا ہے۔ تو ہم دیکھتے ہیں کہ چاہے وہ بورڈ کے امتحانات ہوں یا پروفیشنل کورسز یا پھر اعلیٰ سطحی مسابقت کے امتحانات اکثر لڑکیاں لڑکوں پر بازی مار جاتی ہیں جو ان کی اعلیٰ ذہنی صلاحیت کی غماز ہے۔ آج کل کے اباحیت پسندانہ ماحول میں عصمت وعفت کی

حفاظت ایک بڑا چیلنج ہے۔لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم اپنی بچیوں کو جاہل رکھیں۔ جہالت کے ذریعہ ہم اس مسئلہ کو حل نہیں کرسکتے۔ بلکہ ہم جہالت کے نتیجے میں اپنی بچیوں کو بھوکے شیروں کے حوالے کرنے والے ہوں گے۔ ایک پڑھی لکھی لڑکی جتنی ہوشیاراور سمجھدار ہوتی ہے،مسائل اورحالات کا جس سمجھداری اور بہادری سے مقابلہ کرسکتی ہے،اپنے حقوق اور عصمت کی حفاظت کے لیے جس طرح لڑسکتی ہے ایک جاہل لڑکی نہیں کرسکتی۔ لہٰذا ماحول کی خرابی کے ڈر سے بچیوں کو جاہل رکھنا گویا ان کو دوہری کمزوری اور مصیبت میں مبتلا کرنا ہے۔قوم تبھی مضبوط ہوگی۔ جب لڑکے اورلڑکیاں دونوں تعلیم یافتہ ہوں گے۔اس لیے مسلمانوں کو اپنا نقطہ نظر بدلنا چاہیے۔اورملت کے تمام سمجھدار لوگوں کواس کے لیے مناسب ماحول پیدا کرنا چاہیے تا کہ ہماری صد فیصد بچیاں تعلیم سے آراستہ ہوسکیں۔

ملت نے اس معاملے میں قدم آگے بڑھادیا ہے۔اورمسلمان والدین اپنے بچیوں کو پڑھانے پرخصوصی توجہ دینے لگے ہیں۔مگرابھی بھی پسماندہ برادریوں اورروایت پسند گھرانوں میں تھوڑا تردد پایا جاتا ہے۔نیزلڑکیوں کے معیارتعلیم پرکم توجہ دی جاتی ہےاوران کی ذات پرکم سے کم خرچ کیا جاتا ہے۔ہمیں بچیوں کی تعلیم کے لیےاپنے ادارے کھولنے چاہیے تاکہ ہم دینی تہذیبی ماحول میں اعلیٰ اور معیاری تعلیم کا انتظام کرسکیں اوراگر ایسا کرنے میں کامیاب نہ ہوں تو عام اداروں میں بھی داخلہ دینے سے گریزنہیں کرنا چاہیے۔

خوب اچھی طرح جان لیجیے کہ باہر کا ماحول بہت خراب ہے۔مگرآپ ضرورت کے تحت باہرتو نکلتے ہی ہیں۔تعلیم بھی ایک ضرورت ہے۔اوراس کے لیے باہرنکلنا جائز ہے۔رہا عصمت وعفت کی حفاظت توانہیں گھرمیں بند کرکے جاہل رکھ کر، یاپھر برقع اورحجاب پہنا کر نہیں کیا جاسکتا ہے۔اس کے لیے بچیوں کی خصوصی تربیت کی ضرورت ہے۔گھر کے ماحول کو کھلا رکھنے کےساتھ ساتھ پاکیزہ رکھنے کی ضرورت ہے۔گارجین اوربچوں کے درمیان کھلےاور آزادانہ ماحول میں تبادلہ خیال کی ضرورت ہے۔ اس معاملہ میں ماں کارول بہت اہم ہوتا ہے۔ ماں کی سوچ اخلاق اور پاکیزگی کا اثر بچیوں پر بہت ہوتا ہے۔ بہر حال عصمت وعفت کی

حفاظت ایک الگ مسئلہ ہے اور تعلیم دلانا الگ ہے۔ تعلیم سے فائدہ ہوگا نقصان نہیں۔ اس لیے ملت کو اس معاملے میں مثبت سوچ سے کام لینا چاہیے۔ اور علماء کرام ائمہ مساجد، نیز دانشوروں اور سماجی وسیاسی رہنماؤں کو اس سلسلہ میں خصوصی مہم چلانی چاہئے، تاکہ کوئی مسلمان بچہ خواہ وہ لڑکا ہو یا لڑکی تعلیم سے محروم نہ رہے۔ تبھی حضور کی اس حدیث کا مفہوم پورا ہوگا کہ تعلیم تمام مسلمان مرد وعورت پر فرض ہے۔ لڑکیوں کے بارے میں حضور ﷺ نے بشارت دی ہے کہ جن کو اللہ نے دو یا تین بیٹیاں دیں، اور راوی کے بقول اگر ایک کے بارے میں بھی آپ سے پوچھا جاتا تو آپ اس کے بارے میں بھی یہی کہتے، اور اس نے اس کی اچھی تربیت اور اچھی پرورش وپرداخت کی اور سن بلوغ کے پہنچنے پر مناسب رشتہ دیکھ کر اس کی شادی کر دی، تو وہ اور میں یعنی حضور ﷺ جنت میں ایک دوسرے کے پڑوسی ہوں گے، ایک صاحب ایمان کے لیے اس سے بڑی سعادت اور کیا ہو سکتی ہے کہ اسے حضور ﷺ کا قرب حاصل ہو۔ اس کام کے لیے صحابہ اپنی جان تک قربان کر دیتے تھے، تو کیا آپ اپنی بچیوں کی اچھی تعلیم وتربیت نہیں دے سکتے ہیں؟ حضور ﷺ نے یہ بھی فرمایا ایک مسلمان والدین کے لیے اولاد کے حق میں سب سے اچھا تحفہ اس کی اچھی تعلیم اور اچھا اخلاق سکھانا ہے۔ اس کے بعد بھی مسلمانوں کو کسی اور ترغیب کی ضرورت ہے؟

اوپر جتنی باتیں کہی گئی ہیں اس میں ایک بات واضح ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی جتنی بڑی آبادی ہے اور جس طرح یہ پورے ملک میں پھیلے ہوئے ہیں ان کے مسائل کو حل کرنا ایک باضابطہ منظّم حکومت کے لیے بھی مشکل ہے۔ کجا کہ مسلمان اقلیت اس کام کو خود کرے۔ اس کے لیے بہت بڑی رقم چاہیے، پوری اسٹیٹ مشنری چاہیے۔ بین الاقوامی ایجنسیوں کی مدد چاہیے۔ ظاہر ہے یہ کام ایک کمزور بکھری ہوئی پسماندہ اقلیت اپنے وسائل سے نہیں کر سکتی ہے۔ اس لیے اس کام کو کرنے کے لیے حکومت کو بڑے پیمانے پر مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے کام کو اپنے ہاتھ میں لینا ہوگا۔ ورنہ ہندوستان کبھی بھی صد فیصد خواندگی کے نشانہ کو پورا نہیں کر سکتا ہے اور دنیا کی قوموں میں باوقار انداز سے سر اٹھا کر نہیں چل سکتا ہے۔ کوئی

حکومت کتنی عوام دوست اور حساس ہے اس بات کا اندازہ اس بات سے لگانا چاہیے کہ وہ اپنے کمزور طبقات اور اقلیتوں کے ساتھ کیا سلوک کرتی ہے۔ مسلمان اقلیت کو پچھلے ستر سال میں یہ شکایت رہی ہے کہ حکومت نے ان کا واجبی حصہ نہیں دیا ہے، اور فرقہ پرست عناصر کے ڈر سے ان کو آگے بڑھانے میں کوتاہی برتی ہے۔ یہ الزام تمام سیکولر اور غیر سیکولر جماعتوں پر ہے جنہیں اس ملک میں اب تک حکومت کرنے کا موقع ملا ہے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ حکومت اس ظلم و ناانصافی کو ختم کرنے کی ایماندارانہ کوشش کرے۔

میں نے اوپر جن امور کی نشاندہی کی ہے۔ وہ ایک سپلیمنٹ ہے۔ یعنی میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مسلمان جب تک خود بیدار نہیں ہوں گے اور اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اپنی طرف سے بھرپور کوشش نہیں کریں گے اس وقت تک جہالت کو ختم نہیں کیا جا سکتا ہے۔ Community initiative سرکاری پالیسیوں کے صحیح نفاذ میں معاون ہوگی۔ لیکن جب تک سرکار پہل نہیں کرے گی، مسلمان بھی تعلیم کے معاملے میں آگے نہیں بڑھ سکتے۔ لہٰذا دونوں کو باہمی اشتراک وتعاون کے ساتھ کام کرنا ہوگا اور جو ادارے اور مواقع موجود ہیں، ان کا بہتر استعمال ہونا چاہیے۔ ضرورت کے تحت اور ادارے کھولے جائیں ملت کی پہل کو سرکاری حمایت حاصل ہو اور حکومت کی کوششوں میں ملت تعاون کرے، دونوں جانب اگر ذمہ دارانہ تال میل اور تعاون کی فضا بنتی ہے، تبھی تعلیمی بیداری اور ایک نئے تعلیمی انقلاب کا خواب شرمندۂ تعبیر ہو سکے گا۔

میں جس تعلیمی بیداری اور تعلیمی انقلاب کی بات کر رہا ہوں۔ اس کا مطلب اور مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کو موجودہ جہالت کے اندھیرے سے نکال کر تعلیم کی روشنی میں لایا جائے۔ اور انہیں ملت جہل (Community of Ignorants) سے نکال کر امت العلم (Community of knowledge) بنا دیا جائے۔ اس کے لیے سماجی سرمایہ اور عوامی سرمایہ دونوں کو بروئے کار لانا ہوگا۔ سماجی سرمایہ کا مطلب خاندان یا ہر فرد ملت کی وہ صلاحیت ہے جو ملت کے دوسرے افراد کو تعاون دے کر ان کو آگے بڑھانے میں مددگار ہو سکے۔ عوامی سرمایہ

سے مراد حکومت اور اجتماعی اداروں کی وہ صلاحیت ہے جو پورے سماج یا اس کے کسی خاص طبقے کی ترقی اور بہتری میں معاون ہو۔اس وقت ہمیں ان دونوں سرمایوں کی ضرورت ہے۔ ہر دوجانب اشتراک وتعاون کے بغیر اتنا بڑا چیلنجنگ مقصد پورا نہیں ہوسکتا ہے۔

تعلیم کا مقصد نہ صرف خواندگی ہے اور نہ کچھ چھوٹے موٹے ہنر کی تعلیم ہے۔ یہ پوری قوم کی سوچ، منہاج اور مزاج بدلنے کا عمل ہے جس میں وسعت و ہمہ گیری ہے۔لہٰذا میں جس تعلیمی انقلاب کی بات کررہا ہوں اس کے مندرجہ ذیل نکات ہیں۔

(الف) بہتر انسانی وسائل کی آبیاری۔

(ب) باہمت، باحوصلہ اور بے خوف نسل کو پروان چڑھانا۔

(ج) معاون، تعلیم پسند، اختراع پذیر، مردان کار پیدا کرنا جس میں عام انسانوں اور فطرت کے درمیان بہتر ہم آہنگی پیدا کرنے کی صلاحیت ہو۔

(د) ایسے اچھے شہری بنانا جو موجودہ جمہوری اور تکثیری سماج میں نہ صرف اختلاف وتنوع کو برداشت کرنے والے ہوں بلکہ دوسرے کی رائے اور عقائد کا احترام کریں اور ایک پرامن فضاء میں عزت اور آزادی کے ساتھ جئیں اور دوسروں کو جینے دینے کا جذبہ پیدا کریں۔

(ہ) تنقیدی اور منطقی شعور جو تخلیقی سوچ پیدا کرنے میں معاون ہو۔

(و) بہتر رابطہ کا ہنر پیدا ہو۔

مقاصد تعلیم کی یہ کوئی مکمل فہرست نہیں ہے۔اس میں کچھ اور چیزیں بھی جوڑی جاسکتی ہے۔ میں صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ میرے سامنے تعلیمی بیداری اور تعلیمی انقلاب کا کوئی محدود تصور نہیں ہے بلکہ ایک جامع تصور ہے جس میں اضافہ اور وسعت کی گنجائش موجود ہے۔ جب تک ہم کسی ہمہ گیر تصور کے ساتھ کام نہیں کریں گے ہماری کوششیں محدود اور مقامی ہوں گی۔ جب کہ ہمارے مسائل بڑے اور ملک گیر ہیں۔ایک زندہ ملت کو وسعت فکر ونظر کے ساتھ اپنے مسائل اور ماحول کو دیکھنا چاہیے اور مثبت سوچ کے ساتھ آگے بڑھنا چاہیے۔اگر ہم

نے تعلیم کے محاذ پر کامیابی حاصل کر لی تو یقین جانئے ہم اپنی ملت کے آدھے مسائل پر قابو پالیں گے۔ پھر ہمیں بڑھنے کے لیے ٹھوس زمین فراہم ہوگی۔ اس لیے میں تعلیم کو ملی نشاۃ ثانیہ میں میل کا پتھر ہی نہیں بلکہ Be all and end all مانتا ہوں۔

ریزرویشن

تعلیم کے بعد تحفظ ملت، تعمیر ملت، توقیر ملت، ترقی ملت، اور تقویت ملت کا دوسرا ایجنڈا ریزرویشن ہے۔ مسلمان ملت بحیثیت مجموعی سماجی، معاشی اور ثقافتی پسماندگی کے جس نچلے پائدان پر دھکیل دی گئی ہے اس کو اوپر اٹھانے کے لیے Strong Affirmatve Action کی ضرورت ہے اور یہ مضبوط مثبت قدم ریزروشن کے سوا کچھ نہیں ہوسکتا ہے۔ لہٰذا بغیر لیت ولعل کے مسلمانوں کو تین متعین امور میں ریزورویشن دیا جانا چاہیے۔

(۱) تعلیم (۲) نوکری اور (۳) نچلی سطح سے لے کر اعلیٰ سطح کے تمام منتخب اداروں کمیٹیوں، کمیشنوں، یونیورسیٹیوں اور دیگر عوامی اداروں میں واضح متعین نمائندگی۔

آزادی کے بعد ہندوستان کی دو تاریخ ابھر کر سامنے آئی ہے۔ ایک طرف ہندوستان تیزی سے ترقی کر رہا ہے۔ اور اکثریت کے تمام طبقات اعلیٰ درمیانی اور ادنیٰ سب اوپر اٹھ رہے ہیں دوسری طرف مسلمان بحیثیت مجموعی اعلیٰ، درمیانی اور ادنی نیچے جا رہے ہیں۔ مسلمانوں کی بھلائی کے لیے اب تک جو دکھاوٹی اقدامات کئے گئے ہیں وہ اونٹ کے منہ میں زیرے جیسا ہے۔ ستر سالہ ظلم وناانصافی اب ناقابل برداشت ہوتی جارہی ہے۔ مسلمانوں کی نئی نسل اب اس دوہرے معیار کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ اس سے قبل کہ صبر کا بند ٹوٹ جائے حکومت اور ملت کے زعماء کو کچھ ٹھوس مثبت اقدام کرنا ہوگا۔

سچر کمیٹی کی رپورٹ نے مسلم پسماندگی کا جوزائچہ پیش کیا ہے۔ وہ نہ صرف چشم کشا ہے بلکہ ظلم وناانصافی اور ڈنڈی ماری کی ایسی داستان پیش کرتی ہے جس کے بعد ارباب حل و عقد کے پاس واجبی مطالبہ کو تسلیم کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں رہ جاتا ہے۔ ریزرویشن کے

خلاف جو قانونی داؤ پیچ اور سیاسی پینترا بازی کی جاتی ہے اب اس کا جواز ختم ہوگیا ہے۔ لہٰذا پوری قوت سے ریزرویشن کا مطالبہ پیش کیا جانا چاہیے۔ اوراس کے حصول کے لیے تمام تر جمہوری اور قانونی ذرائع بروئے کار لانے چاہئے۔

مسلمانوں کے ریزرویشن کی بات بہت پرانی ہے۔ ملک کی تقسیم اور آزادی کے بعد جب ملک کا دستور وضع کیا جارہا تھا اس وقت یہ مسئلہ بہت شدومد کے ساتھ اٹھا۔ آزادی کے فوراً بعد ملک میں جس طرح کا ماحول تھا، ملک میں مسلم لیڈرشپ بالکل بکھر چکی تھی اور مسلمان خوف اور بے یقینی کے حالات سے گذر رہے تھے۔ اس وقت ریزرویشن یا اس طرح کا مطالبہ کرنا ایک مشکل کام تھا تاہم دستور ساز اسمبلی اور پارلیامنٹ میں مسلمانوں کی نمائندگی متحقق کرنے کے لیے مسلم رہنماؤں نے جداگانہ انتخاب اور متناسب نمائندگی کی تجویز رکھی، مگر ان تجاویز کو یہ کہہ کر رد کر دیا گیا کہ اس سے علیحدگی پسندانہ رجحانات کو تقویت ملے گی۔ جو بدلے ہوئے سماجی اور سیاسی ماحول میں کسی طرح مناسب نہیں ہے۔ مگر مسلمانوں کی نمائندگی متحقق ہونی چاہیے۔ اس پر سب کا اتفاق تھا چنانچہ یہ کہا گیا کہ مسلمان مشترکہ انتخاب کے تحت حصہ لیں اور ان کو اسمبلی اور پارلیمنٹ میں محفوظ نشستیں فراہم کی جائیں گی، چنانچہ ۸/ اگست ۱۹۴۷ء کو اقلیتی مشاورتی کمیٹی نے یہ تجویز منظور کی کہ دس برسوں کے لیے مسلمانوں، عیسائیوں اور شیڈول کاسٹ کو مشترکہ انتخاب کے تحت حصہ لینے کی صورت میں اسمبلی اور پارلیامنٹ میں نشستیں محفوظ کی جائیں گی۔ پنڈت نہرو نے اس تجویز کی حمایت کی۔ ان کی رائے میں اگر اقلیتوں کو تحفظ نہیں دیا گیا تو وہ اس بات سے مطمئن نہیں ہیں کہ لوگ ان کے ساتھ کیا برتاؤ کریں گے؟ پنڈت نہرو اپنے اندیشے میں حق بجانب تھے جیسا کہ بعد کے حالات سے واضح ہوتا ہے۔ مگر سردار پٹیل کی رائے اس سے مختلف تھی۔ وہ ایسی کسی تجویز کو ملک کے سیکولر نظام کے قیام، ہندو مسلم رشتوں میں خیر سگالی، خود اعتمادی اور اکثریت پر اعتماد کی بحالی میں رکاوٹ پیدا کرنے والا عمل مانتے تھے۔ لہٰذا ان کی رائے اس تجویز کو رد کرنے کے حق میں تھی۔ دستور ساز اسمبلی کے مسلمان زعماء نے ان کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے ایسی کسی تجویز کو رد کرنے کی سفارش کی چنانچہ ۱۱/ مئی

۱۹۴۹ء کومشاورتی کمیٹی برائے اقلیات نے تجویز پاس کر کے شیڈ ڈول کاسٹ کے علاوہ اقلیتوں کے ریز رویشن کی تجویز کورد کر دیا۔

سردار پٹیل نے اقلیت اور اکثریت دونوں سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا کہ اقلیت کا مستقبل، کسی بھی اقلیت کا اکثریت پر اعتماد ہے۔ گویا وہ کہہ رہے تھے کہ آپ اکثریت پر اعتماد کریں اور آپ کے ساتھ ناانصافی نہیں ہوگی۔ دوسری طرف انہوں نے اکثریت سے کہا ''یہ اس ملک کی بدقسمتی ہوگی اگر اکثریت کو اپنی ذمہ داری کا احساس نہیں ہوتا۔'' انہوں نے دستور ساز اسمبلی کے مسلم ممبران کو یقین دہانی کراتے ہوئے کہا کہ آپ ہم پر اعتماد کریں اور دیکھیں کیا ہوتا ہے۔ ان کے اپنے الفاظ میں Trust us and see what Happens ۔

اب اگر See what Happens پر غور کیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ پنڈت نہرو کا اندیشہ صحیح تھا۔ اور سردار پٹیل کا وعدہ ایک فریب محض۔ ہندوستان کی مابعد آزادی کی تاریخ میں مسلمانون کا سیاسی، معاشی اور سماجی طور پر جو Marginalisation ہوا ہے اب وقت آ گیا ہے کہ اس کا نئے سرے سے جائزہ لیا جائے اور الفاظ کے گورکھ دھندوں اور پھول بھلیوں سے باہر نکل کر ٹھوس پہل کی جائے۔

آزادی کے بعد اگر ہندوستان کی تاریخ وسیاست کا جائزہ لیا جائے تو اس سے واضح ہوتا ہے کہ جان بوجھ کر مسلمانوں کو کمزور کرنے، منتشر کرنے اور تمام اجتماعی اداروں سے دور رکھنے کی شعوری پالیسی اپنائی گئی۔ جس کے نتیجے میں مسلمان دن گذرنے کے ساتھ ساتھ پسماندہ اور حاشیہ بردار ہوتے چلے گئے اس معاملہ میں سیکرلر، لبرل، پروگریسو اور کمیونل تمام طرح کے سیاست دانوں کی فکر ایک جیسی رہی ہے۔

۱۹۴۷ء سے لے کر ۱۹۶۷ء تک ملک کے طول وعرض پر مرکز سے لے کر تمام ریاستوں تک میں کانگریس کی مضبوط حکومت رہی۔ کانگریس اپنے اصول ونظریہ کے اعتبار سے سیکرلر پارٹی ہے جو پورے ہندوستان اور اس کی تمام تر اکائی کی نمائندگی کی دم بھرتی ہے۔ یہ سماجی انصاف اور Inclusive growth کی سرخیل رہی ہے۔ کانگریس نے اپنی روایت اور

دعویٰ کے الٹ مسلمانوں کے ساتھ سوتیلا برتاؤ کیا اور انہیں بڑی حد تک نہ صرف بے رحم حالات کے حوالے رکھا بلکہ در پردہ ان کو زک پہنچانے اور کمزور کرنے کی سازش کی۔ کانگریس میں ایسے بہت سے لیڈران تھے جو سیکولر لباس میں خالص کمیونل تھے اور جنہوں نے مسلمانوں کو خفیہ اور اعلانیہ اس قدر نقصان پہنچایا کہ مسلمان عدم تحفظ اور پسماندگی کی ایسی کھائی میں گرے جہاں سے نکلنا ان کے لیے مشکل ہو گیا ہے۔

۱۹۶۷ء کے بعد ملک کی سیاست نے نئی کروٹ لی اور نئی نئی علاقائی پارٹیوں کے عروج کے ساتھ ساتھ سوشلسٹوں، کمیونسٹوں، پسماندہ برادریوں اور دلتوں کے عروج کا دور شروع ہوا، نارتھ اور ساؤتھ انڈیا کا پورا سیاسی منظر نامہ بدل گیا کانگریس کا بڑا اووٹ بینک کھسک کر ان پارٹیوں کی طرف چلا گیا جس نے نہ صرف کانگریس کو زبردست چنوتی دی بلکہ ملک کے پسماندہ طبقات کے امپاورمنٹ میں اہم رول ادا کیا۔ مسلمانوں نے اس امید پر کہ ان کے ساتھ انصاف ہوگا اوران کو بھی برابری کے ماحول میں Equal Opportunity حاصل ہوگی اور انہیں بھی اپنی بگڑی سنوارنے کا موقع ملے گا ان کا ساتھ دیا مگر اس تبدیلی سے بھی ان کا کوئی بھلا نہیں ہوا اور بالآخر ان کے حصہ میں مایوسی اور محرومی ہی آئی۔

سب سے مضبوط حکومت بنگال میں سی پی آئی ایم کی جیوتی بسو کی قیادت میں قائم ہوئی جو ۳۵ برس تک لگاتار قائم رہی جس میں تمام تر بایاں محاذ کی پارٹیاں شامل تھیں۔ بنگال میں مسلمان کل آبادی کا 30% ہیں۔ اتنے لمبے عرصے تک ایک پروگیریسو سیکولر اور لبرل حکومت میں رہنے کے باوجود بنگال کے مسلمان، تعلیم، روزگار، اور زندگی کے تمام شعبوں میں حاشیہ پر رہے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ کمیونسٹ اور مارکسسٹ ہونے کے باوجود بنگال کے ترقی پسند حکمراں قومی اور مذہبی تعصّبات سے اوپر نہیں اٹھ سکے، اور ان کی حکومت مسلمانوں کو ان کا واجبی حق دینے میں ناکام رہی۔

اسی طرح بہار میں لالو یادو کی قیادت میں پندرہ سال تک ایک سیکولر حکومت قائم رہی جس کو قائم کرنے اور قائم رکھنے میں مسلمانوں کا اہم رول رہا۔ وہ حکومت خود لالو یادو کے دعویٰ

کے مطابق ایم۔وائی حکومت یعنی مسلمانوں اور یادو کی حکومت تھی تاہم مسلمانوں کو جان و مال کے تحفظ کے علاوہ Tokenism کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوا۔ یو پی میں ملائم سنگھ اور مایاوتی دونوں مسلمانوں کے ووٹ کے بل پر کئی بار اقتدار سے ہمکنار ہوئے۔انہوں نے اپنی اور اپنی برادری کا خوب بھلا کیااور ہندوؤں کی دیگر پسماندہ برادریوں نے ان سے اپنی حمایت اور وفاداری کی بھرپور قیمت وصول کی۔لیکن ان کی حکومتوں میں بھی مسلمانوں کے حصے میں محرومی ہی آئی۔

اس وقت بنگال میں ممتا بنرجی کی سرکار ہے جومسلمانوں کی حمایت کی بدولت برسر اقتدار آئی ہے۔ بہار میں جے ڈی یو کی سرکار ہے جس کو بنانے اور قائم رکھنے میں مسلمانوں نے اہم رول ادا کیا ہے۔ اس طرح یو پی میں سماجوادی سرکار ہے۔جس کو مسلمانوں نے واضح اکثریت دلانے میں بھرپور حمایت کی ہے۔ دوسری طرف تامل ناڈو، کرناٹک، تلنگانہ، آندھرا، کیرالہ،آسام،وغیرہ ریاستوں میں جو حکومتیں قائم ہیں ان کو قائم کرنے میں مسلمانوں کی حمایت فیصلہ کن ثابت ہوئی ہے۔لیکن ان تمام ریاستوں میں مسلمانوں کے تحفظ،ترقی اور استحکام میں وہاں کی حکومتوں نے سنجیدگی اور ایمانداری کا ثبوت نہیں دیا ہے۔خاص طور سے اس وقت یو پی کی صورتحال دھماکہ خیز بنی ہوئی ہے اور اکھلیش یادو کی سماج وادی سرکار نہ صرف ان کی واجبی حصہ داری دینے میں ناکام ہے بلکہ ان کو بنیادی تحفظ فراہم کرنے میں بھی ناکام ہے۔ یو پی میں اس وقت سنگھ پریوار اور بی جے پی کے لوگ جس طرح فضا کو مسموم کررہے ہیں اور مسلمانوں کے خلاف جارحیت کا مظاہرہ کررہے ہیں سماج وادی حکومت اس کو کنٹرول کرنے میں پوری طرح ناکام ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ خود ان کے Administration اور Rank and file میں ایسے لوگ ہیں جو ان چیزوں کو ہوا دے رہے ہیں۔ان حالات میں اور اب تک کہ ان کے طرز عمل سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ یہ تمام پارٹیاں سیوڈو سیکولر ہیں۔اور مسلمانوں کی ترقی واستحکام میں ان کی کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ وہ مسلمانوں کو ڈرا کر دبا کر کمزور کرکے اور اپنا دست نگر بنا کر رکھنا چاہتی ہیں کیوں کہ ملک میں ایک ایسی قوت کارفرما ہے

جو واضح طور پر مسلمانوں کی مخالف ہے۔لہذا مسلمانوں کے پاس Choice اور Alternative بہت محدود ہیں جسکا فائدہ یہ پارٹیاں اٹھانا چاہتی ہیں اوراٹھارہی ہیں۔

جب سے بی جے پی مرکز میں برسر اقتدار آئی ہے اور شمالی ہند بالخصوص کاؤبلٹ میں اس نے مرکز سے لے کرریاست تک اپنی پکڑ مضبوط کرلی ہے۔کانگریس سمیت تمام نام نہاد سیکولر پارٹیوں کے وجود پر خطرہ منڈلا رہاہے۔اور ان کے پاؤں تلے سے زمین کھسک رہی ہے۔لہٰذا سیکولر پارٹیوں کی وجود وبقاء کے لیے مسلمانوں کی حمایت کورامن کی طرح ہے جوان کونئی زندگی اورتازگی دے سکتی ہے۔یہی وقت ہے کہ مسلمان قیادت اورعوام کوآر پار کی لڑائی کے لیے تیار ہونا چاہیے اور مسلم عوام اور قیادت کوکھل کر یہ مانگ کرنی چاہیے کہ جو پارٹی مسلمانوں کوریزرویشن دے گی مسلمان اسی کوووٹ دیں گے اور جو ریزرویشن نہیں دے گی ان کو مسلمانوں کا ووٹ نہیں ملے گا۔

ظاہر بات ہے کہ یہ جنگ آسان نہیں ہے۔پہلی بات تو یہ ہے کہ وہ تمام منافق صفت پارٹیاں جودھوکے کی ٹٹی کھڑی کرکے اب تک مسلمانوں کو بے وقوف بنا کر اپنا الو سیدھا کرنے کی سیاست کرتی آرہی ہیں وہ بیک لیش کا خوف دلا کر مسلمانوں کواس سے باز رکھنے کی کوشش کریں گی کیونکہ ان کے چہرے سے ملمع سازی کے پردے اتر جانے کا خطرہ ہوگا اوراس طرح کی صورت واضح ہوکر سامنے آجائے گی۔اس طرح درپردہ سازشوں کاایک نیا دورشروع ہوگا کیونکہ یہ کبھی بھی دل سے مسلمانوں کے ساتھ انصاف اوررواداری نہیں چاہتی ہیں۔

دوسری چیز یہ ہوگی کہ خود مسلمانوں میں ایسے انتشار پسند گروہوں اورافراد کوکھڑا کرنے اوران کے اندر افتراق وکش مکش پیدا کرنے کی کوشش ہوگی تاکہ مسلمانوں کی آواز بے وزن ہوجائے اورخود جوتیوں میں دال بانٹنے لگیں۔جب بھی مسلمانوں کے ریزرویشن کی بات اٹھی ہے ایک طبقہ اشراف اوراجلاف کے خود ساختہ اورمصنوعی تقسیم کا شاخسانہ کھڑا کرکے اس آواز کوکمزور کرنے کی کوشش کرتا ہے۔وہ ہندوؤں کی طرح مسلمانوں میں ورن مالا کا قائل ہے اور سمجھتا ہے کہ جیسے ہندوؤں میں ذات پات ہے اونچ نیچ ہے ویسے ہی مسلمانوں میں بھی ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ مسلمان معاشرے میں جہالت اور عصبیت کی وجہ سے ذات پات کی تفریق پائی جاتی ہے اور مسلمانوں کی اصلاحی تحریکیں اور دینی جماعتیں اس تفاوت اور تصادم کو روکنے میں ناکام ہیں، تاہم مسلمانوں میں ذات پات کی نوعیت کبھی اس طرح نہیں رہی جیسی ہندوؤں میں ہے۔ ہندوؤں میں اٹھی بہت سی اصلاحی اور سیاسی تحریکوں نے اور مختلف قانونی اصلاحات نے اس صورتحال کو بالکل بدل دیا ہے اور ذات پات کی موجودگی کے باوجود ہندو قوم متحد اور مستحکم ہوکر ابھر رہی ہے۔ اب ہندوؤں میں ریزرویشن صرف شیڈول کاسٹ اور شیڈول ٹرائبس تک محدود نہیں ہے جس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ چونکہ ہندو دیومالائی تصورات اور پانچ ہزار سالہ ورن آشرم کے تعصّبات کی وجہ سے ستائے ہوئے لوگ ہیں اس لیے ان کے مخصوص حالات کو دیکھتے ہوئے یہ سہولت انہیں دی گئی ہے۔ بلکہ اب تو ریزرویشن کے دائرے کو بڑھا کر پہلے او. بی. سی. پھر ای. بی. سی. کو دیا گیا اور ان خانوں میں روز نئی ذاتوں کا اضافہ ہو رہا ہے اور اب یہ مطالبہ بھی عام ہے کہ اپر کاسٹ کے وہ تمام لوگ جو معاشی طور پر پسماندہ ہیں انہیں بھی ریزرویشن کی سہولت دی جانی چاہیے۔ حکومت ہند نے 14 جنوری 2019 کو دستور میں 24 ویں ترمیم کے ذریعہ معاشی طور پر بیک وارڈ جنرل کیٹگری کے لوگوں کے لیے جو اپر کاسٹ سے تعلق رکھتے ہیں جن کی سالانہ آمدنی 8 لاکھ سے کم ہے یا جو پانچ ایکڑ سے کم زمین رکھتے ہیں یا جن کے پاس شہر میں ایک ہزار فٹ میں مکان ہے ان تمام لوگوں کو جو برہمن، راجپوت، بھومیہار اور اسی قبیل سے تعلق رکھتے ہیں تعلیم اور دیگر شعبوں میں 10 فیصد ریزرویشن دیا ہے اور یہ سابقہ پچاس فیصد کی حد سے زائد ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ پہلے جن بنیادوں پر مسلمانوں کے ریزرویشن کی مخالفت کی جاتی تھی حکومت نے اس کو ختم کر دیا ہے اس لیے اب مسلمانوں کو متعین ریزرویشن دینے میں کوئی دستوری اور قانونی روکاوٹ باقی نہیں رہی۔ اب یہ محض سیاسی قوت ارادی کا مسئلہ رہ گیا ہے اور انصاف و دیانت کا سوال ہے اس کے لیے کئی ریاستوں میں پہل ہوچکی ہے، اور کئی دیگر ریاستوں میں مطالعاتی ٹیم برائے سفارش بنائی گئی ہے۔ لہٰذا اب جبکہ ریزرویشن کا دائرہ تمام سماجی، تعلیمی، ثقافتی، معاشی، پیمانوں

کو سامنے رکھ کر متعین کئے جا رہے ہیں مسلمانوں میں یہ شاخسانہ کھڑا کرنا اوراس کے ذریعہ اندرونی انتشار پیدا کرنا صحیح نہیں ہوگا۔ تاہم مسلمانوں کی آواز کم کرنے اوراس مطالبہ پر پانی ڈالنے کے لیے یہ شاخسانہ کھڑا کیا جائے گا اس کا اندیشہ ہے۔

ادھر حالیہ دنوں میں نئی معاشی پالیسی کے تحت سرکاری سکٹر سکڑ تا جا رہا ہے اور غیر سرکاری اور نجی سیکٹر کا دائرہ بڑھتا جا رہا ہے۔ لہٰذا لوگ یہ کہیں گے کہ اب جبکہ سرکاری سیکٹر میں نوکری کے امکانات کم ہیں تو ریزرویشن کا مطالبہ بے معنی ہے۔ ریزرویشن کا مطالبہ صرف سرکاری نوکریوں میں نہیں ہے بلکہ ریزرویشن کا یہ مطالبہ تعلیمی اداروں اور تمام منتخب اداروں میں بھی ہے۔ اس لیے اس کی معنویت ہمیشہ باقی رہے گی۔ اس وقت ہماری سماج و سیاست میں جیسی فرقہ واریت اور تعصب دیکھنے کو مل رہی ہے اور جس طرح گول بندی (Polarisation) کا کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ اگر سماج کو جارحانہ فرقہ پرستی سے بچانا ہے تو ریزرویشن کی پالیسی اس کی واحد راہ ہے، جس کے نتیجے میں سماجی برابری کو بڑھاوا ملے گا اور ووٹ لینے اور دینے والے دونوں کو ایک دوسرے سے جڑ کر رہنا ہوگا۔

بھارت نے زندگی کے ہر میدان میں بہت ترقی کی ہے۔ تعلیم اور معاش میں بہتری آئی ہے۔ ہم بہت سے معاملوں میں موڈرن ہو گئے ہیں مگر اتنی ترقی اور سمجھداری کے باوجود عصبیت میں کوئی کمی نہیں آئی ہے۔ اگر آج شیڈول کاسٹ کا ریزورویشن ختم کر دیا جائے تو پورے پارلیمنٹ میں مشکل سے دس ایم پی بھی ان طبقات سے جیت کر نہیں آ سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جو اصول محض دس سال کے لیے نافذ کیا گیا تھا مسلسل بڑھایا جا رہا ہے۔ اور نہیں معلوم کتنے دنوں تک اس کی ضرورت باقی رہے گی۔

مسلمانوں کے ریزرویشن کے خلاف جو سب سے زبردست دلیل دی جاتی ہے وہ دو ہے۔ پہلی دلیل یہ ہے کہ دستور ہند کی رو سے مذہب کی بنیاد پر ریزرویشن کی کوئی گنجائش نہیں ہے، اور دوسری دلیل یہ دی جاتی ہے کہ اس سے علیٰحدگی پسندانہ رجحان کو تقویت ملے گی۔ ایک

بار ملک کا بٹوارہ ہو چکا ہے اب دوبارہ وہ غلطی نہیں دہرائی جائے گی۔ یہ دونوں دلیلیں اتنی بھونڈی ہیں کہ اس کے جواب کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔لیکن عام لوگوں کے لیے اس کی وضاحت ضروری ہے۔

پہلی بات یہ ہے کہ کس بے وقوف مسلمان نے یہ کہا کہ چونکہ ہم اسلام دھرم کے ماننے والے ہیں اور ہمیں اپنے دھرم کی رکچھا کرنی ہے اس لیے ہمیں ریزرویشن دیا جائے۔ ہم دھرم کے نام پر یہ مطالبہ تو نہیں کررہے ہیں کہ دھرم کی آڑ لے کر اس مطالبہ کو رد کیا جا رہا ہے۔ ہندوستان میں اب تک مسلمانوں کی معاشی، سماجی، ثقافتی، اور تعلیمی امور کا سرکاری اور غیر سرکاری اداروں کی طرف سے جو مطالعات پیش کئے گئے اور جو رپورٹ سامنے آئی ہے ان سب سے واضح ہوتا ہے کہ مسلمان سماجی، معاشی، تعلیمی اور دیگر امور کی بنیاد پر ملک کی سب سے پسماندہ ترین اکائی ہیں۔جس کا اعتراف کانگریس پارٹی کو بھی ہے اور دیگر سیاسی پارٹیوں کو بھی ہے۔خود بی جے پی نے اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے ان تمام لوگوں کا بھانڈہ پھوڑا ہے کہ جو نام نہاد مسلم دوست پارٹیاں کہی جاتی ہیں اور ان کو آئینہ دکھایا ہے کہ آزادی کے بعد انہوں نے ان کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے؟ ایک مسلمان بھوکا ہے، بیمار ہے، بے گھر ہے، مظلوم ہے تو اس کو اس لیے روٹی نہیں دی جائے گی کیونکہ وہ اسلام دھرم کا ماننے والا ہے؟ اس کو دوا علاج کی سہولت نہیں دی جائے گی کیونکہ وہ مسلمان ہے؟ اس کو سر چھپانے کے لیے چھت فراہم نہیں کی جائے گی، اس کی دادرسی نہیں کی جائے گی کیونکہ وہ اسلام دھرم کا ماننے والا ہے؟ مسلمان ہے؟ آپ خود بتائیں یہ رویہ انصاف کے ہم معنی ہے یا صریحاً ظلم ہے۔ پھر جن لوگوں کو ہندوستان میں ریزرویشن حاصل ہے کیا وہ سب کے سب ادھرمی ہیں؟ کیا ان کا کوئی دھرم نہیں ہے؟ ان کا کوئی عقیدہ نہیں؟ ان کا کوئی سماج نہیں ہے؟ ان کی کوئی سیاست نہیں ہے؟ ہم جانتے ہیں کہ جن افراد اور طبقات کو ہندوستان میں ریزریشن دیا گیا ہے وہ سب کسی نہ کسی دھرم کے ماننے والے ہیں اور کسی نہ کسی تہذیب وثقافت کی نمائندگی کرتے ہیں اگر ان کا عقیدہ اور مذہب ان کو ریزرویشن دینے میں مانع نہیں ہے تو صرف مسلمانوں کے ساتھ یہ ناانصافی کیوں؟ کیا آپ یہ

کہنا چاہتے ہیں کہ جب تک تم مسلمان ہو اس وقت تک تمہیں ریزرویشن نہیں دیا جاسکتا ہے؟ یا جس دن تم اسلام چھوڑ دو گے تم کو ریزرویشن دیا جاسکتا ہے؟ اگر ایسا ہے تو یہ سوچ ملک کے دستور کے خلاف ہے کیونکہ دستور مذہب کی بنیاد پر کسی فرق و امتیاز کا قائل نہیں ہے۔ لہٰذا مسلمانوں کا ریزرویشن کا مطالبہ انصاف اور دستور ہند کی روح کے عین مطابق ہے۔

مسلمانوں کے ریزرویشن کے خلاف جو دوسری دلیل دی جاتی ہے کہ اس سے مسلمانوں میں علیٰحدگی پسندانہ رجحان کو تقویت ملے گی۔ آج کی تاریخ میں اس سے زیادہ بھونڈی، بے تکی اور مضحکہ خیز بات کوئی اور نہیں ہوسکتی ہے۔ یہ دراصل آزادی سے قبل کی سیاست کی بازگشت ہے جس کے نتیجہ میں ملک تقسیم ہوا۔ اب حالات بدل چکے ہیں لہٰذا اس دور کو یاد کر کے اور آج کے حالات پر چسپاں کرنے کی کوشش ایک معنی میں حد درجہ چالاکی ہے جس کا مقصد اکثریتی عناصر کو برانگیختہ کرنا ہے اور بھولی بھالی عوام کو گمراہ کرنا ہے۔ آج کی تاریخ میں ریزرویشن توڑنے والی نہیں بلکہ جوڑنے والی چیز ہوگی۔ آج صورتحال یہ ہے کہ مسلمان حکومت اور اس کے Establishment کی Antipathy اور Apathy کی وجہ سے Alienation کے شکار ہوتے جارہے ہیں اور حد درجہ Marginalised ہوگئے ہیں۔ اگر یہ چیز ملک کی سیاست، سماج اور حکومت کو Suit کرتی ہے تب تو کوئی بات نہیں ہے ورنہ یہ تشویش کی بات ہے، میرا خیال ہے کہ ریزرویشن سے علیحدگی پسندی کے احساسات پر روک لگے گی اور مسلمانوں میں Sense of belonging اور Sense of integration مضبوط ہوگا اور ان کو محسوس ہوگا کہ لوگ ان کے بھلے برے میں شریک ہیں اور ملک کی ترقی میں ان کا بھی متعین حصہ ہے جو ان کو مل کر رہے گا۔

لہٰذا ریزرویشن ملک اور مسلمان دونوں کے مفاد میں ہے۔ سوال یہ ہے کہ آزادی کی لگ بھگ سات دہائیوں کے بعد ریزرویشن کا مطالبہ اس شدومد سے کیوں کیا جارہا ہے؟ اس کا پہلا جواب یہ ہے کہ آزادی کی ان سات دہائیوں میں جو تجربات ابھر کر سامنے آئے ہیں وہ انتہائی بھیانک ہیں۔ ملک میں فرقہ واریت، تعصب، کرپشن اور ظلم و ناانصافی اتنی جڑ پکڑ چکی

ہے کہ جب تک مسلمانوں کوان کا واجبی حصہ متعین نہیں کر دیا جاتا ہے وہ ہمیشہ محروم و پسماندہ رہیں گے۔ یہ محض ایک خوف، خیال یا حددرجہ حساسیت نہیں ہے بلکہ امر واقعہ ہے۔ مسلمان آج ملک کی سب سے پسماندہ ترین آبادی ہیں اور زندگی کے تمام شعبوں میں پچھڑے ہیں اور ہر جگہ ان کی نمائندگی گھٹتی ہی جارہی ہے۔ اس لیے یہ مطالبہ حق بجانب ہے۔

مسلمانوں کو ریزرویشن دینے سے فرقہ وارانہ منافرت اور بے اعتمادی میں کمی آئے گی اور ملک کے عام طبقات کی طرح مسلمان بھی اس ملک کی تعمیر اور ترقی میں احساس ذمہ داری کے ساتھ شریک ہوکر اپنی خدمات سے ملک کو محفوظ اور مضبوط بنانے میں اپنا کردار ادا کرسکیں گے۔ ریزرویشن دینے سے مختلف شعبوں میں مسلمانوں کی جو عدم نمائندگی ہے یا کم نمائندگی ہے وہ ختم ہوگی۔ اگر کوئی حکومت ملک کے سوا سو کروڑ لوگوں کے بارے میں سوچتی ہے تو ان سوا سو کروڑ لوگوں میں مسلمان بھی ہیں جب یہ ہماری Stated policy ہے تو اور اس کو عملی جامہ پہنا دیا جائے تو اس کی عملیت متحقق ہوجائے گی ورنہ یہ محض پروپگنڈہ مانا جائے گا۔

ریزرویشن لیول پلیئنگ فیلڈ فراہم کرتی ہے اور ان طبقات کے لیے امکانات کے مواقع کھولتی ہے جو کسی وجہ سے پیچھے رہ گئے ہیں۔ لہٰذا یہ انصاف اور انسانیت دونوں کا تقاضہ ہے کہ انصاف اور فراخ دلی کا ثبوت دیتے ہوئے ریزرویشن پالیسی کو مسلمانوں تک پھیلایا جائے تا کہ مسلمان National mainstream کا حصہ بن سکیں اور برابری کے ساتھ اپنی ذمہ داری ادا کرسکیں۔

دستور ہند کے Preamble یعنی ابتدائیہ میں انصاف یعنی Justice میں سماجی، معاشی اور سیاسی انصاف کا واضح الفاظ میں ذکر کیا گیا ہے اور مساوات یعنی Equality جس میں مقام (Status) اور مواقع (Opportunity) دونوں میں برابری کی بات کہی گئی ہے۔ لہٰذا یہ مطالبے انصاف اور مواقع کو متحقق کرنے کے لیے ہی کئے جارہے ہیں اس لیے یہ دستور کے روح کے عین مطابق ہے۔ دستور نے اپنی روح کو تجسیم فراہم کرنے کے لیے مختلف دفعات میں اس کی کھل کر وضاحت کی ہے۔ دستور ہند کے باب بنیادی حقوق جو دستور ہند کا

نا قابل تنسیخ حصہ ہے اور جس کے نفاذ کے لیے عدالتیں حکومت کو مجبور کرسکتی ہیں کہ دفعہ (4)16 میں واضح الفاظ میں اس کی وضاحت کی گئی ہے۔

"Nothing in this article shall prevent the state from making any provision for the reservation of appointments or posts in favour of any backward class of citizens which, in opinion of the state, is not adequately represented in the services under the state"(Article 16(4)

یہ دفعہ واضح الفاظ میں کہتا ہے کہ اس دفعہ میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو ریاست کو شہریوں کے کسی ایسے طبقے کے حق میں جو پچھڑے ہیں بحالی یا بعض عہدوں میں ریزرویشن دینے سے روکے جو ریاست کی نظر میں پسماندہ ہے۔ ریاست کی ملازمتوں میں اس کی معقول نمائندگی نہیں ہے یہ دفعہ اپنے مفہوم میں اتنی واضح ہے کہ شاید اس کے مزید وضاحت کی کوئی ضرورت نہ ہوتا ہم ہم اس کو سمجھنے کی غرض سے تھوڑی سی وضاحت کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ پہلی بات یہ ہے کہ مواقع کی یکسانیت کے تحت یعنی اس کو متحقق اور فراہم کرنے کے لیے دستور ملازمتوں اور عہدوں میں ریزرویشن کی اجازت دیتا ہے۔ اس کی پہلی شرط یہ ہے کہ وہ طبقہ حکومت کی نظر میں پسماندہ یعنی بیک وارڈ ہے۔ سوال یہ ہے کہ بیک وارڈ کس کو کہتے ہیں۔ New oxford Advance Learner's Dictionary میں Backward لفظ کے تین متعین مفہوم بتائے گئے ہیں۔

1۔ Directed or moving towards the back یعنی پیچھے کی طرف جانا یا اس کی طرف رخ کرنا۔

2۔ Moving in a Direction that means that no progress is being made اس جانب جانا جس سے پتہ چلے کہ کوئی ترقی نہیں ہوئی ہے یعنی اپنے سابقہ مقام سے نیچے آنا ہے۔

4۔ Having made less progress than normal; developing slowly
یعنی معمول سے کم ترقی کرنا، دھیمی رفتار سے بڑھنا، ہندوستانی مسلمان بالعموم ان تمام مفہومات میں پسماندہ ہیں۔ اس سلسلے کی دوسری شرط یہ ہے کہ ریاستی نوکریوں میں ان کی مناسب نمائندگی نہیں ہے۔ سرکار نے اب تک جتنے کمیشن اور کمیٹیاں بنائی ہیں اور سب سے آخر میں سچر کمیٹی کی جو رپورٹ آئی ہے اس نے تمام تر سرکاری ذرائع سے حاصل شدہ اعداد وشمار کی روشنی میں یہ واضح کردیا ہے کہ تمام ریاستوں میں بالعموم تمام سیکٹرس میں اور تمام طرح کی نوکریوں میں مسلمانوں کی نمائندگی سب سے کم ہے، تو کیا ان واضح ثبوتوں اور شہادتوں کے باوجود اس میں کوئی شک رہ جاتا ہے کہ مسلمان پسماندہ نہیں ہیں اور ان کی نمائندگی کم نہیں ہے؟ اگر یہ بات پائے ثبوت کو پہنچ چکی ہے تو کیا دستور ہند کی رو سے ان کو ریزرویشن نہیں ملنا چاہیے اور کیا یہ مطالبہ غلط ہے؟ اگر یہ مطالبہ حکومت کی جانب سے تسلیم نہیں کیا جاتا ہے تو اس کو دستور کے روح کے منافی بلکہ اس کی خلاف ورزی نہیں مانا جائے گا؟ اس انکار کی وجہ تعصب اور نافراخدلی (Niggardliness) کے علاوہ اور کیا ہوسکتا ہے؟ کیا یہ مسلمانوں کو معاشی اور تعلیمی طور پر پسماندہ اور کمزور رکھنے کی سوچی سمجھی سازش نہیں ہے؟

دستور ہند کے رہنما خطوط برائے ریاست جس کو Directive Principles of state policy کہا جاتا ہے، کی دفعہ ۴۶ میں ریاست سے یہ توقع کی گئی کہ کمزور طبقات کے معاشی اور تعلیمی مفاد کے پیش نظر ریاست ان کا خاص خیال رکھے گی، دستور کے الفاظ یہ ہیں۔

> "the state shall promote with special care the educational and economic interest of weaker sections of the people, and in particular , of the scheduled castes and the scheduled tribes, and shall protect them from social injustice and all forms of ex ploitation" (article 64)

اس کا مفہوم یہ ہے کہ ریاست کمزور طبقات کے لوگوں کے معاشی اور تعلیمی مفاد کا خاص خیال رکھے گی خاص طور سے درج فہرست ذاتوں اور قبائل کا، ان کا ہر طرح کے سماجی ظلم اور ناانصافی سے حفاظت کرے گی۔ اس دفعہ میں پہلا رہنما اصول یہ ہے کہ کمزور طبقات کے تعلیمی اور معاشی مفاد کو محفوظ اور بڑھانے کے لیے خصوصی اہتمام کیا جانا چاہیے اور ریاست کی ذمہ داری ہے کہ وہ خصوصی اہتمام کرے۔ دوسرا اصول یہ ہے کہ تمام کمزور طبقات بشمول شیڈول کاسٹ شیڈول ٹرائبس ان کی ہر طرح کے ظلم واستحصال سے محافظت کی جائے۔ سوال یہ ہے کہ کمزور کس کو کہتے ہیں اور کمزر طبقات میں کون کون لوگ آتے ہیں۔

کمزور تو اس کو کہتے ہیں کہ جو جسمانی طور پر کمزور ہوتا ہے۔ جو چیز آسانی سے ٹوٹ یا مڑ جاتی ہے اسے بھی کمزور کہتے ہیں۔ جو غریب اور بیمار اور بے اقتدار ہیں اس کو بھی کمزور کہتے ہیں۔ جو از خود اپنی دفاع نہ کر سکے یا جس کو کسی سہارے کی ضرورت ہے ان تمام لوگوں کو کمزور کہتے ہیں۔ اس دفعہ کی رو سے شیڈول کاسٹ اور شیڈول ٹرائبس بالعموم اور بلا کسی اختصاص کے کمزور تسلیم کر لیے گئے ہیں۔ اس کے ساتھ یہ دفعہ کچھ اور افراد اور گروہوں کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے جو کمزور طبقات میں آتے ہیں۔ اس ضمن میں جدید معاشی، سماجی اور سیاسی لیٹریچر کا جائزہ لیا جائے تو عورتوں، بچوں بوڑھوں اور معذوروں کو کمزور طبقات کی فہرست میں شمار کیا جاتا ہے اور ان کو مراعات کے ساتھ ساتھ ریزرویشن دینے کی بات شدومد سے ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر اس وقت عورتوں کی نمائندگی متعین طور پر بڑھانے کے لیے مقنّنہ کے تمام منتخب اداروں میں ان کو ریزرویشن دینے پر قریب قریب تمام پارٹیوں کا اتفاق ہے۔ اختلاف صرف اس بات پر ہے کہ بعض پارٹیاں بغیر اس بات کا ذکر کئے ہوئے کہ کس طبقہ کی عورت کو کتنی حصہ داری دی جائے گی، اصولی طور پر عورتوں کے ریزرویشن کی بات کرتی ہیں جب کہ دوسری پارٹیاں اس تجویز میں پسماندہ برادریوں بشمول اقلیتوں کے واضح اور متعین حصہ داری کی مانگ کر رہی ہیں۔ بہر حال یہ تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ ہندوستانی عورت آزاد ہندوستانی سماج میں پسماندہ مانی جاتی ہے مذہبی اکائیوں میں مسلمان تعلیمی، سماجی اور معاشی اعتبار سے کمزور ہیں اور

ان بنیادوں پران کا بھی شمار کمزور طبقات میں ہوتا ہے۔لہٰذا ان کو Special care یعنی خصوصی توجہ کی ضرورت ہے۔

ظلم واستحصال قابل تعزیر جرم ہے جس کو Crime against humanity یعنی انسانیت کے خلاف جرم مانا گیا ہے۔کسی فرد یا طبقہ کو اس کا نشانہ بنایا جاتا ہے تو ریاست کی ذمہ داری بنتی ہے کہ ان لوگوں کو اس سے بچائے اور جو لوگ اس کے مرتکب ہیں ان کو از روئے قانون سزا دے،لیکن جب ریاست ظلم واستحصال پرآمادہ ہوجائے اور وہ اپنی نظرعنایت پھیر لے یا بے رخی کا مظاہرہ کرے تو اس سے کیسے بچا جاسکتا ہے؟

آزاد ہندوستان میں وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی مایوسی اورمحرومی میں اضافہ ہوتا چلا گیا ہے اوران کے خلاف ظلم واستحصال عام ہے۔اس کے باوجود حکومت اور ریاست کی دیگر ایجنسیاں اپنی مجوزہ ذمہ داری کی ادائیگی سے گریز کرتی ہیں اوران کے جائز مطالبے کونظرانداز کررہی ہیں۔

دستور کی روح پکار پکار کرانصاف اوررواداری کا مطالبہ کرتی ہے مگر دستور کا حلف لے کرحکومت کرنے والے لوگ اس کا گلا گھونٹنے سے باز نہیں آتے ہیں یہ بات بلاخوف تردید کہی جائے گی کہ ہندوستانی مسلمانوں کی عظیم ترین اکثریت عرب،ایران اورافغانستان سے نہیں آئی ہے بلکہ خالصاً ہندوستانی نسل کے لوگ ہیں جومختلف ادوار میں اسلام قبول کرکے اسلام کے دائرۂ عاطفت میں آئے ہیں۔اوراپنی یہ حیثیت انہیں دنیا کی ہر چیز سے زیادہ پسندیدہ اورقیمتی ہے جس سے وہ کسی حال میں دست بردار نہیں ہوسکتے چاہے کوئی ان کے سامنے ہفت اقلیم کی دولت لاکر ان کے قدموں میں رکھ دے یا انہیں محروم ومحتاج چھوڑ دے۔دین خریدنے اور بیچنے والی چیز نہیں ہوتی جس کوکسی مراعات کے عوض چھوڑا یا اختیار کیا جاسکتا ہے۔

ہندوستان میں شیڈول کاسٹ کواس وقت ریزرویشن دیا گیا جب انگریزوں نے ۱۹۳۰ء میں آئینی اصلاحات کے تحت Separate electorate کے ذریعہ ہریجنوں کو

ہندوؤں سے الگ ایک قوم تسلیم کرنے کا اعلان کیا۔اس فیصلے کے خلاف گاندھی جی نے مرن برت رکھا جس کے نتیجے میں ڈاکٹر امبیڈکر اور گاندھی جی کے درمیان پونا پیکٹ ۱۹۳۲ء میں ہوا جس میں ہریجنوں کو تعلیم ،نوکری اور قانون سازیہ میں متعین نمائندگی دینے کی بات مانی گئی تاکہ ہریجنوں کو ہندوقوم کا حصہ بنائے رکھا جائے اوران کے اندر مسلمان عیسائی یا بدھ دھرم قبول کرنے کا جو رجحان پیدا ہورہا ہے اس کو روکا جائے۔ہریجنوں نے تبدیلیٔ مذہب کو اپنی دباؤ کی پالیسی کا حصہ بنادیا تاکہ ہندوؤں سے زیادہ سے زیادہ مراعات حاصل کرسکیں اوراس حکمت عملی میں بھی وہ بہت حد تک کامیاب رہے۔ بہر حال ریزرویشن تبدیلیٔ مذہب کو روکنے میں ایک موثر حربہ ثابت ہوا۔لیکن جیسا کہ اوپرعرض کیا گیاہے کہ ہندوستان میں پچھلی کئی صدیوں میں ایسے لاکھوں مسلمان ہیں جو اچھوت برادریوں سے نکل کر اسلام قبول کر چکے ہیں او ر ان میں سے بیشتر وہ ہیں جو اپنے روایتی پیشہ سے جڑے ہوئے ہیں۔دستور کی دفعہ ۳۴۱ جس کے تحت کوئی آبادی یا گروہ شیڈول کاسٹ کا درجہ حاصل کرتا ہے جس میں صدر جمہوریہ یا پارلیمنٹ کو یہ اختیار حاصل ہے کہ کسی گروہ کو اس میں شامل کرے یا کسی گروہ کو اس سے خارج کردے ۱۰/اگست ۱۹۵۰ء کو ایک صدارتی نوٹیفکیشن کے ذریعہ مسلمانوں کی ان برادریوں کو جو شیڈول کاسٹ سے آئے تھے اورآج بھی اپنی پرانی شناخت اور پیشے سے جڑے ہوئے ہیں یہ کہتے ہوئے ان کو اس دائرے سے خارج کردیا کہ چونکہ وہ ہندو نہیں ہیں اس لیے جو افراد ہندو دھرم کے علاوہ کسی اوردھرم کو مانتے ہیں وہ شیڈول کاسٹ کے دائرے میں نہیں آئیں گے۔ اس طرح مذہب تبدیل کرنے سے ان کی سابقہ حیثیت بدل گئی ہے لہٰذا ان طبقات کو دفعہ ۳۴۱ کے تحت جو مراعات اورتحفظات حاصل ہیں مسلمانوں کے ان طبقات کو نہیں ملے گا۔ حالانکہ اس بات پر ہریجن رائے عامہ اوران کی لیڈرشپ کو کوئی اختلاف نہیں ہے۔ یہ اپر کاسٹ کے لوگ ہیں جو اس کی مخالفت کرر ہے ہیں۔جبکہ شیڈول کاسٹ کمیشن نے دیگر مذاہب کے لوگوں کو اس شرط کے ساتھ درجہ فہرست ذاتوں میں شامل کرنے کی منظور دی ہے کہ شیڈول کاسٹ کے موجودہ کوٹے میں نسبتاً اضافہ کردیا جائے۔

اس نوٹی فکیشن کے دو مقاصد بہت واضح ہیں:

(۱) تبدیلی مذہب کے رجحان کی ہمت شکنی کرنا اور

(۲) ہریجنوں کے اندر Cross community alliance کے تحت ان کی سیاسی طاقت کو کم کرنا۔

اس لیے اگر اس شق کے ذریعہ دیگر اقوام کی دلت برادریوں کو شامل کرنے کی اجازت دے دی جاتی تو ہریجنوں کی عددی طاقت اور اثر میں اضافہ ہو جاتا۔ اس طرح اس نوٹی فکیشن سے ایک تیر سے دو شکار کرنے کی کوشش کی گئی۔ بعد میں اس شق کو تھوڑا اکھولتے ہوئے سکھ اور بودھ دھرم کے دلت طبقات کو اس میں شامل کرنے کی اجازت دی گئی لیکن مسلمان اور عیسائی دلتوں کے لیے ابھی تک دفعہ ۳۴۱ کے دروازے بند ہیں۔

پچھلی سات دہائیوں میں ہندوستان میں جمہوریت اور جمہوری ادارے بہت مضبوط ہوئے ہیں اور ان کی جڑیں بڑی گہری پیوست ہوگئی ہیں۔ ملک کے تمام طبقات میں بیداری آئی ہے اور ان کے سنگٹھن مضبوط ہوئے ہیں۔ ہندو قوم میں جو نئی بیداری اور خود اعتمادی آئی ہے۔ اس نے اس قوم کے تمام طبقات میں نئی قوت اور نیا حوصلہ دیا ہے۔ ہریجن ماضی میں چاہے جتنے ستائے ہوئے اور ہندو قوم سے دور الگ تھلگ چھوا چھوت کا شکار رہے ہوں آج وہ ہندو قوم کا اٹوٹ حصہ بن چکے ہیں اور ان کے اندر جس درجہ کا سنسکرتی کرن (Sanskritisation) ہو چکا ہے۔ وہ خود کو کسی طرح کاسٹ ہندو سے کم نہیں سمجھتے ہیں۔ اور آج کا ہریجن ایک نئے برہمن (Neo- Brahman) کے طور پر ابھر رہا ہے دوسری طرف مسلمان اپنی پسماندگی کے سبب سماج کے جس نچلے پائدان پر پہنچ گئے ہیں اس لحاظ سے ہریجنوں کی مسلم کمیونیٹی کی طرف موبی لیٹی قریب قریب ناممکن ہے۔ آج کی تاریخ میں انہیں ہندو بنے رہنے میں جو فائدہ ہے وہ مسلمان بن کر حاصل نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے اب ہندو قوم یا ہندو قوم کے کسی حصہ کا Enmass اسلام یا عیسائیت قبول کرنا قریب قریب ناممکن ہے اکا دکا لوگ ذاتی وجوہات سے تمام تر دباؤ کے باوجود ہندو سے مسلمان اور مسلمان

سے ہندو بنتے رہیں گے اس کو کوئی روک نہیں سکتا ہے۔

لہٰذا انصاف کا تقاضہ ہے کہ دستور میں انصاف اور برابری کی جو بات کہی گئی ہے اس کے اسپرٹ کو دھیان میں رکھتے ہوئے مساوی سماجی اکائیوں کو مساوی حقوق دئے جائیں تا کہ دیگر مذہبی اکائیوں کے محروم طبقات بھی ان دفعات کی برکتوں اور فائدوں سے مستفید ہو سکیں۔ یہ چیز ملک اور سماج کو مضبوط کرے گی اور ملک میں ایک روپتا اور سمرستا کو بڑھانے میں مددگار ہوگی۔ جو لوگ یونیفورم سول کوڈ کی بات کرتے نہیں تھکتے وہ Uniform benefit کی بات میں چپ کیوں ہو جاتے ہیں اور اس کی مخالفت کیوں کرتے ہیں؟ مذہبی اور لسانی اقلیتوں کے لیے کمیشن کو عرف عام میں جسٹس رنگ ناتھ مشرا کمیشن کہا جاتا ہے نے اپنی رپورٹ میں اس امر کی زوردار سفارش کی ہے کہ شیڈول کاسٹ آئینی آرڈر ۱۹۵۰ء کے پیرا (3) کو مکمل طور پر حذف کر کے شیڈول کاسٹ گریڈ کو مذہب سے منقطع کر دیا جائے اور اس کے فائدے کو مذہبی زاویہ سے غیر جانبدار بنا دیا جائے۔

''مہاراجا جیواجی راؤ سندھیا بہادر مادھوراؤ بنام حکومت ہند (۱۹۷۱ء) میں سپریم کورٹ نے فیصلہ کیا کہ ۱۹۵۰ء کے حکم نامہ کا پیرا (3) ایک لعنت (Anathema) ہے۔ جس نے ہندوستان کے تحریری آئین کی خوبصورتی کو مسمار کر دیا ہے۔ کیشو آنند بھارتی کے مشہور کیس میں سپریم کورٹ نے کہا کہ صدر جمہوریہ کو پیرا (3) شامل کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ کیونکہ وہ دفعہ (۲) ۱۶، (۲) ۲۹ کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ اور دستور کے بنیادی ڈھانچہ پر ضرب لگاتا ہے۔ دفعہ ۳۴۱ کے تحت بھی صدر کو اختیار نہیں ہے کہ وہ کسی شہری کو اس کا پسندیدہ مذہب اختیار کرنے کے لیے ہمت شکنی کریں۔ لیکن پیرا (3) کے تحت صدر عوام الناس کو خصوصا شیڈ ڈول کاسٹ کو ہدایت دے رہے ہیں کہ وہ تین پسندیدہ مذاہب کی تری مورتی ہندو، سکھ، بودھ کے علاوہ اور کوئی مذہب اختیار نہ کریں۔ دفعہ ۳۴۱ ر کے تحت صدر کو ذات کی شناخت کرنے کا اختیار دیا گیا ہے، نہ مذہب کے شناخت کرنے کا۔ لہذا ۱۹۵۰ء کا آرڈر صدارتی حکم نامہ کے بھیس میں بیجا طرف داری پر مبنی قانون ہے۔''

اندرا ساہنی بنام مرکزی حکومت میں سپریم کورٹ کے فیصلہ کی رو سے ۱۹۵۰ء کے آرڈر کے پیرا (3) کو کالعدم (Null and void) قرار دے کر منسوخ کر دینا چاہیے۔ کیونکہ عدالت عظمیٰ اس نتیجہ پر پہنچی ہے کہ ذات کا تعلق کسی خاص مذہب سے نہیں ہے بلکہ ہندوستان کے سماج میں اس کا پھیلاؤ تمام مذاہب کو اپنے دائرے میں لیے ہوئے ہے۔ ۱۹۵۰ء کے آڈر کے ذریعہ مسلمانوں کو محروم کر دیا گیا ہے۔ لیکن او بی سی کے زمرے میں وہی مسلمان شامل ہیں۔ اس تضاد کی بنیاد پر جسٹس مشرا کمیشن نے کہا کہ ۱۹۵۰ء کا آرڈر نچلے طبقے کے مسلمانوں، نائی، چمار، دھوبی مہتر وغیرہ کے خلاف جارحانہ تفریق (Hostile discrmination) کرتا ہے۔ ظاہر ہے ایسی کوئی چیز انصاف کے منافی ہوگی۔

ریزرویشن کے سلسلے میں دو باتیں اور قابل ذکر ہیں۔ پہلی یہ کہ دنیا بھر میں جہاں کہیں بھی ریزویشن یا اس قبیل کی کوئی پالیسی اپنائی گئی ہے اس کا بنیادی مقصد ان طبقات کو جن کی عددی قوت کم ہے ان کو تحفظ فراہم کرنا ہے یعنی جو گروہ، برادری یا طبقہ اقلیت میں ہے اس کو ریزرویشن کے ذریعہ تعصب اور ناانصافی سے بچانا ہے تاکہ سرکاری نوکری اور فیصلے کے عمل میں اس کی شرکت متحقق کی جاسکے۔ صرف ہندوستان میں اس عام روش کے خلاف ریزرویشن صرف اکثریتی فرقہ کی مختلف ذاتوں اور برادریوں تک مختلف ذاتوں اور برادریوں تک مختص کر دی گئی ہیں اور اقلیتوں بالخصوص مسلمانوں کو بڑی حد تک اس سے محروم رکھا گیا۔

لہٰذا مسلمانوں کی عمومی پسماندگی کے باعث ان کو ریزرویشن کی سہولت فراہم کرنا عام مروجہ عالمی ضابطے کی رو سے عین قرین انصاف ہے۔ اس کے برعکس جو بھی پالیسی اپنائی جائے گی اس کا مطلب لازمی طور پر اس جارحانہ تفریق کو قائم رکھنا ہے جو ایک ظلم ہے۔

کچھ لوگوں کی رائے میں چونکہ موجودہ دور میں سرکاری نوکریوں اور پبلک سیکٹر کا دائرہ سکڑتا جا رہا ہے اس لیے اب ریزرویشن کی وہ اہمیت نہیں رہ گئی جو پہلے تھی۔ یہ صحیح ہے کہ اس وقت سرکاری سیکٹر کا دائرہ سکڑتا جا رہا ہے تاہم ابھی بھی یہ پرائیوٹ سیکٹر سے بڑا ہے۔ اس لیے اس کی حیثیت کو کم کر کے دیکھنا صحیح نہیں ہے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ ریزرویشن کا یہ مطالبہ

صرف نوکریوں تک محدود نہیں ہے بلکہ تعلیم تمام سرکاری اور نیم سرکاری اداروں اور رفاہی اسکیموں تک پھیلا ہوا ہے۔ لہٰذا یہ پالیسی عمومی ملی ترقی کا حصہ ہے۔ سرکاری نوکریوں میں متعین حصہ نہ صرف معاشی امپاورمنٹ میں مددگار ہوگا بلکہ یہ سوشل، پالیٹیکل اور لیگل امپاورمنٹ کا ذریعہ بنے گا۔ لہٰذا اس کو عمومی اور تقویت کے نقطۂ نظر سے دیکھنا چاہیے۔

دوسری بات یہ ہے کہ ریزرویشن کا یہ مطالبہ ہمیشہ کے لیے نہیں ہے بلکہ ابتداء صرف پندرہ سالوں کے لیے ہے اس کے بعد یہ جائزہ لیا جائے گا کہ آئندہ اس پالیسی کو جاری رکھنا ہے یا ترک کر دینا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اگر اس پالیسی کا ایماندارانہ نفاذ کیا جائے تو شائد مستقبل میں اس کے توسیع کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ یہ ایک طرح کا Course Correction اور Gap Arrangement ہوگا جو برابری کی فضا بنانے میں مددگار ہوگا۔

یہاں یہ بات قابل لحاظ ہے کہ ہم پوری مسلم ملت کے ریزرویشن کے حق میں نہیں ہیں بلکہ سپریم کورٹ کے فیصلے کی رو سے جو لوگ کریمی لیئر میں ہیں ان کو چھانٹ کر کے ان تمام لوگوں کو جو کریمی لیئر میں نہیں ہیں ان کو ریزرویشن کی سہولت دی جانی چاہیے۔ میری رائے میں بنیادی طور پر ذات اور مذہب کے بجائے سماجی اور معاشی پسماندگی کو ریزرویشن کی بنیاد بنانا چاہیے۔

پہلے یہ بات شدومد سے کہی جاتی تھی کہ مذہب کی بنیاد پر ریزرویشن نہیں دیا جاسکتا ہے۔ اس دلیل کے پیچھے جو معاندانہ ذہنیت کارفرما ہے اس کا جائزہ اوپر کے صفحات میں تفصیل سے لیا گیا ہے اور یہ واضح کیا گیا ہے کہ یہ اپنے آپ میں انتہائی غیر منطقی دلیل ہے۔ جس کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔

پچھلے کئی سالوں میں کیرالہ، تمل ناڈو، تلنگانہ، مغربی بنگال وغیرہ ریاستوں نے مسلمانوں کو روزگار اور تعلیم میں ریزرویشن کی سہولت دی ہے۔ آندھرا پردیش نے 2004 میں مسلمانوں کو چار فیصد ریزرویشن دیا تھا جس کو 2010 کے ایک عبوری فیصلہ میں سپرم کورٹ نے صحیح قرار دیا تاہم اس پورے مسئلے پر غور کرنے کے لیے اس نے ایک آئینی بنچ تشکیل دیا

ہے جو اس کا از سرِ نو جائزہ لے گی۔ پورے ملک کو عدالت عظمیٰ کے فیصلے کا انتظار ہے۔

بہر حال مسلمانوں کے ریزرویشن کی بحث اب اس مقام پر پہنچ چکی ہے کہ اس کو ایک سیاسی ایشو بنایا جا سکتا ہے۔ مسلمانوں نے ایک موہوم امید پر مختلف پارٹیوں کو ووٹ دیا کہ شاید وہ ان کا بھلا کریں۔ مگر پچھلے ستر سالہ تجربات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ کم و بیش تمام پارٹیوں کی پالیسی اور ذہنیت تھوڑے سے فرق کے ساتھ ایک جیسی ہے۔

ہم ریزرویشن کی مانگ کیوں کر رہے ہیں اس لیے نہیں کہ ہم واقعی کمزور ہیں یا مسابقت سے ڈرتے ہیں بلکہ سسٹم میں در آئی تعصب اور بے ایمانی کی وجہ سے چونکہ مسلمانوں کو ان کا واجبی دستوری حق نہیں مل پا رہا ہے اس لیے ریزرویشن کی مانگ کی جا رہی ہے۔ اس وقت ذات اور مذہب کی عصبیت (Caste and Religious prejudice) ایک ادارہ جاتی شکل (Institutionalised) اختیار کر چکی ہے اور تعصب و امتیاز (& Prejudice Discrimination) ایک معمول بہ (Normal) عمل بن چکا ہے اس لیے مسلمانوں کا واجبی حصہ متعین کئے بغیر موجودہ حالات میں ان کا حق اور حصہ ملنا ناممکن ہے لہٰذا اس تاریخی، سیاسی، معاشی اور سماجی غلطی کو صحیح کرنے کے لیے صرف ریزرویشن ہی صحیح پالیسی (Right policy) ہے۔ اس لیے بلا تاخیر اس کی جدو جہد شروع ہونی چاہیے۔

ظاہر سی بات ہے جو عناصر اب تک اس کی مخالفت کرتے آئے ہیں وہ بات چاہے کتنی معقول اور مبنی برحق ہو اس کو آسانی سے مان کر نہیں دیں گے۔ لہٰذا اس کے لیے ہمیں کئی محاذوں پر ایک ساتھ کام کرنا ہوگا۔

(ا) سب سے پہلا علمی اور تحقیقی محاذ ہے۔ ہمیں ٹھوس دلائل اور مختلف شعبہ اور ادارے میں موجود واضح اعداد و شمار کی روشنی میں اس کی ضرورت اور اہمیت کو اجاگر کرنا ہوگا اور ٹھوس حقائق کی بنیاد پر اپنا دعویٰ پیش کرنا ہوگا۔

(۲) دوسرا سماجی محاذ ہے۔ ایک طرف مسلمان ملت کو اس مسئلہ پر متحد اور بیدار کرنے کی ضرورت ہے، دوسری طرف سماج کے تمام طبقات کو ہم نوا بنانے کے لیے عوامی مہم

چھیڑنے کی ضرورت ہوگی۔ جمہوریت میں کوئی کام عوام کی تائید کے بغیر نہیں ہوسکتا ہے۔ لہٰذا عام عوام کو اس کے لیے ہموار کرنا ہماری پہلی حکمت عملی ہونی چاہیے۔

(۳) تیسرا محاذ سیاسی ہے۔ جب تک اس ایشو کو سیاسی مدا نہیں بنائیں گے اور اس کو ووٹ سے جوڑ کر اس مہم کو آگے نہیں بڑھائیں گے اس وقت تک ہم کو اس معاملے میں کوئی کامیابی نہیں مل سکتی ہے۔ لہٰذا مسلمانوں کو صاف صاف یہ اعلان کرنا چاہیے کہ ہمارا ووٹ صرف ان پارٹیوں کو ملے گا جو مسلمانوں کے ریزرویشن کی حمایت کریں گے جو لیڈر یا پارٹی مسلمانوں کو ریزرویشن دینے کی بات نہیں کریں گے مسلمان اس کی حمایت نہیں کریں گے چاہے وہ بظاہر سیکولر ہو یا غیر سیکولر۔ جمہوریت میں لابنگ کی بہت اہمیت ہوتی ہے۔ لہٰذا ہمیں اپنا ایک Advocacy group تشکیل دینا چاہیے جو تمام پارٹیوں اور ان کے لیڈران سے ملے اور ان سے اس ایشو پر کھل کر بات کرے اور ان کو اپنے دلائل اور حقائق سے ہم نوا بنانے کی کوشش کرے۔ ملک اس جائز اور مبنی برحق وانصاف مطالبہ کو نظر انداز نہیں کرسکتا ہے۔ صرف اس کے لیے حکمت اور مداومت کی ضرورت ہے۔

(۴) چوتھا محاذ آئینی ہے۔ عام طور پر تمام متنازعہ مسائل کا حل عدلیہ سے ہوتا ہے لہٰذا ہمیں پوری آئینی تیاری کے ساتھ عدالت میں بھی اس مسئلہ کو پیش کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ عدلیہ آخری چارہ کار ہے اس لیے اول الذکر کوششوں کے ساتھ ساتھ اس طرف بھی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ یہ مسئلہ فی الوقت سپریم کورٹ کی آئینی بنچ کے سامنے زیر غور ہے۔ ہمیں وکیلوں کی اچھی ٹیم تیار کر کے تمام حقائق اور دلائل کے ساتھ اس مقدمہ کو لڑنا چاہیے مجھے امید ہے کہ مسلمانوں کو جن تاریخی اور سیاسی وجوہات سے پسماندگی کے غار میں دھکیل دیا گیا ہے۔ عدالت عظمٰی اس سے ان کو باہر نکالنے میں ضرور مدد کرے گی۔

مسلمانوں کے مسائل کے حل کے باب میں اب تک کی گئی پوری بحث کا خلاصہ کلام یہ ہے کہ

(۱) مسلمان اپنے اندر خدا اعتمادی اور خود اعتمادی پیدا کریں۔

(۲) اپنی صفوں میں اتحاد و اجتماعیت قائم کریں۔

(۳) تعلیم کو تمام جدید تقاضوں کے ساتھ ملی بہتری کا ذریعہ بنائیں اور

(۴) اپنے سیاسی اور معاشی حقوق کی بازیابی کے لیے پرزور مہم کا آغاز کریں اور مسلمانوں کے ریزرویشن کو ایک ایسی، سماجی اور قانونی ایشو بنا کر اس کے حصول کی پرزور جدوجہد کریں۔

مجھے قوی امید ہے کہ مسلمانوں کی بہتری کی راہ اسی طرح کے جہد وعمل سے ہموار ہوگی اور اس کالی رات کا سویرا ضرور ہوگا۔ ہمیں اتحاد، ہمت، حکمت اور صبر کو زادراہ بناتے ہوئے آگے بڑھنا ہے۔

ہندوستان میں ریزرویشن کی تاریخ
عوامل ومحرکات اور مختلف رائج ماڈل

ہندوستان کا معاشرتی مطالعہ

معاشرتی مطالعات (Socialogical studies) عہد قدیم سے لے کر اب تک اس بات پر متفق ہیں کہ ہمارے تمام تر مذہبی اور معاشرتی گروہوں میں کئی سطحیں موجود ہیں، جن کے درمیان اندرونی موبیلٹی نہیں ہے جس کی وجہ سے ان کے اندر ایک (Structural Regimentation) پایا جاتا ہے۔ اس کی وجہ سے تمام تر مذہبی گروہوں میں مختلف طبقات پائے جاتے ہیں جو اپنی بعض خصوصیات کی وجہ سے پہچانے جاتے ہیں۔ عام طور پر ایک چھوٹا سا گروہ ہوتا ہے جو زراعت، معیشت، سیاست اور دیگر تمدنی اداروں پر اپنی اجارہ داری رکھتا ہے اور باقی ماندہ آبادی درمیانی، نچلے درمیانی طبقے اور حد درجہ پسماندہ آبادی پر مشتمل ہوتی ہے جس کی زراعت معیشت اور دیگر امور میں بہت کم حصہ داری ہوتی ہے۔

ہندو دیومالائی نظام کے تحت ہندو قوم چار مستقل گروہوں میں منقسم ہے (۱) برہمن (۲) چھتری (۳) ویشیہ اور (۴) شودر۔ برہمن، چھتری اور ویشیہ ورن ذاتیں ہیں اور شودر

اورن اور اچھوت مانے جاتے ہیں۔ ان تمام ذاتوں میں بہت سی ذیلی ذاتیں ہیں۔ آج کی جدید اصطلاح میں ہندوؤں کی بڑی ذاتوں جس میں برہمن، چھتری اور کچھ اور ذاتیں آتی ہیں وہ سب سورن اور اونچی ذاتیں مانی جاتی ہیں۔ ویشیہ میں بہت سی ذاتیں ہیں جو درمیانہ یا پچھڑی ذاتیں مانی جاتی ہیں جن کو آج کی اصطلاح میں او. بی. سی. اور ای. بی. سی کے خانوں میں بانٹا گیا ہے شودر کو پہلے ہریجن اور اب دلت کے نام سے پکارا جاتا ہے نیز ان کو شیڈول کاسٹ یعنی درج فہرست ذاتیں یا انوسوچیت ذاتیں کہا جاتا ہے۔ ایک اور گروہ ہے جس کو آدی باسی یعنی شیڈول ٹرائبس یا جن جاتیاں کہا جاتا ہے۔

ہریجنوں کو ہندو ہونے کے باوجود ہندو سماج سے الگ تھلگ رکھا جاتا تھا اور ان کو عام کنویں یا تالاب سے پانی لینے یا عام مندروں میں جانے کی اجازت نہیں تھی۔ لوگ ان کے سائے سے بھی دور رہتے تھے۔ انسانی سماج میں رہتے ہوئے بھی ان کی حالت جانوروں سے بھی بدتر تھی۔

ہندوستان ایک ایسا ملک ہے جہاں ہر مذہب اور عقیدے کے ماننے والے لوگ موجود ہیں، ان میں سے بہت کم لوگ باہر سے آئے ہیں۔ تمام مذاہب کے ماننے والوں کی غالب اکثریت خالص ہندوستانی النسل ہے۔ اس لیے تمام مذہبی گروہوں میں عقیدے کے اختلافات کے باوجود معاشرتی طور پر بہت ساری یکسانیت پائی جاتی ہیں مثال کے طور پر اسلام، عیسائت بودھ دھرم اور سکھ مت میں ذات پات کا تصور نہیں ہے بلکہ یہ تمام عقیدے انسانوں کے درمیان وحدت اور مساوات کے تصور کو اپنا بنیادی اصول مانتے ہیں۔ مگر ہندوستان میں ان کی ہیئت بدل چکی ہے اور ان کے یہاں بھی ذات پات اور اونچ نیچ کا تصور کم وبیش اسی طرح پایا جاتا ہے جس طرح ہندو قوم میں ہے۔ بلاشبہ یہاں اس طرح کی شدت نہیں پائی جاتی ہے تاہم شادی بیاہ اور دیگر تمدنی اداروں میں یہ فرق وامتیاز واضح طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔ اس لیے تبدیلیٔ مذہب سے ان کے معاشرتی اور تمدنی خط وخال اور ضابطے میں کوئی خاص فرق نہیں آیا ہے۔ اس لیے سبھی مذہبی گروہ کم وبیش ایک جیسی بناوٹ رکھتے ہیں اور ان کے

درمیان ایک جیسا (Social Stratification) دیکھنے کو ملتا ہے۔

ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت پورے ملک اور اس وقت کی حکمراں قوت کے لیے قہر الٰہی بن کر ٹوٹی۔ مگر اس شر میں خیر کا ایک پہلو یہ تھا کہ یہ حکومت ملک کے پسماندہ طبقات بالخصوص ہریجنوں اور آدی باسیوں کے لیے حیات نو کا پیغام لے کر آئی اور پہلی بار ان کے انسانی حقوق کو تسلیم کرنے کا داعیہ پیدا ہوا۔ خود ان کے اندر اور باہر کئی اصلاحی تحریکیں اٹھیں۔ ان کے اندر تعلیم آئی، ایک نئی قیادت ابھری اور پہلی بار ان کے حقوق تسلیم کئے گئے۔

اس طرح انگریزی عہد کئی معنوں میں ہندوستان کے سیاسی اور تمدنی تاریخ میں اہم موڑ (Watershed) ثابت ہوا۔ آج ہم جس جدید، لبرل اور پروگریسو ہندوستان میں جی رہے ہیں اس کی داغ بیل انگریزی عہد میں ہی پڑی تھی۔ اس لیے اس عہد میں سب کچھ برا ہوا یہ کہنا زیادتی ہوگی۔ اس پس منظر میں ہندوستان کے پسماندہ طبقات کو ملنے والی مراعات کا مطالعہ کریں تو ہم اس عہد کے ہندوستانی سماج کے نمود وارتقا کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔

Backward Communities انگریزی عہد میں پہلی بار ہندوستان کے تناظر میں ۱۸۸۰ میں پچھڑا طبقہ کی اصطلاح مستعمل ہوئی تھی مگر اس وقت اس کی کوئی متعین تعریف نہیں دی گئی تھی۔ عام طور پر پچھڑا طبقہ سے مراد وہ گروہ تھا جو غیر تعلیم یافتہ اور محروم طبقات پر مشتمل تھا اور جن کو پرائمری اسکولوں میں تعلیم کے لیے خصوصی رعائت دی جاتی تھی۔ انگریزی عہد میں اس طبقہ میں محروم طبقات (Deprived Communitees) اور پسماندہ (Marginalised) ذاتوں، برادریوں اور آدی باسیوں کو رکھا گیا تھا۔

آزادی سے قبل 1882 اور 1891 کے درمیان برٹش انڈیا کے مختلف علاقوں میں کچھ مخصوص ذاتوں اور برادریوں کے لیے مثبت امتیاز (Positive Discrimination) کی مانگ کی گئی تھی۔ کولہا پور ریاست کے حکمراں ساہو مہاراج نے 1902 میں غیر برہمنوں کے لیے ریزرویشن کی شروعات کی تھی۔ انہوں نے مفت تعلیم اور سبھی تعلیم یافتہ لوگوں کے لیے مناسب روزگار کا انتظام کیا تھا۔ انہوں نے غیر طبقاتی سماج بنانے کی اپیل کی تھی چھوا چھوت کو

ختم کیا تھا اور 1902 میں پچھڑی برادریوں کو نوکریوں میں پچاس فیصد ریزرویشن دیا تھا۔
انگریزی حکومت نے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1909 کے ذریعہ ریزرویشن پالیسی کی شروعات کی 1932 میں برٹش وزیراعظم رام سے میکڈونل نے راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں کمیونل ایوارڈ کا اعلان کیا جس کے تحت مسلمان، سکھ، ہندوستانی عیسائی، اینگلو انڈین، یورپین اور پسماندہ برادریوں کو علیحدہ نمائندگی دینے کی بات کی گئی تھی۔ بالخصوص پسماندہ برادریوں کو اپنے نمائندہ خود چننے کا اختیار دیا گیا تھا جس کے خلاف گاندھی جی نے مرن برت رکھا جو بالآخر گاندھی امبیڈکر کے درمیان پونا پیکٹ پر منتج ہوا۔ جس کے بعد ہی دلتوں کو تعلیم روزگار اور ریاستی ومرکزی مقنّنہ میں ریزرویشن کی سہولت عطا کی گئی۔
بھارت 1947 میں آزاد ہوا اور 26 جنوری 1950 میں ملک کا دستور نافذ ہوا۔ اس دستور کی رو سے آدی باسی، درج فہرست ذاتوں اور پسماندہ برادریوں کے لیے کئی اہم اقدامات کئے گئے جس میں ان طبقات کے خلاف چھوا چھوت اور امتیازات کا خاتمہ سب سے اہم ہے۔
1950 میں بھارت میں Affirmative Action کی شروعات کی گئی جو غالباً دنیا میں سب سے پرانی اور پہلی کوشش ہے۔ یو۔این۔او اور دنیا کے دیگر ملکوں نے اس کو بعد میں اپنایا۔
دنیا کے مختلف ملکوں میں الگ الگ ناموں سے ریزرویشن پالیسی نافذ کی گئی ہے مثلاً امریکہ میں اسے مثبت اقدام (Affirmative Action) کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ تو یو.کے میں مثبت عمل (Positve Action) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ کیناڈا اور ساؤتھ افریقہ میں روزگار برابری (Employment equity) کے نام سے پکارا جاتا ہے۔
ان تمام پالیسی کا مقصد روزگار اور اجرت میں نابرابری کو پاٹنا، تعلیم کے مواقع میں اضافہ کرنا، تنوع کو فروغ دینا، ماضی کی غلطیوں اور رکاوٹوں کا ازالہ کرنا اور مواقع کی یکسانیت کو متحقق کرنا ہے تاکہ ملک کے تمام طبقات کو انصاف اور برابری کے ساتھ آگے بڑھنے کا موقع

میسر آئے۔

آزادی کے بعد دستور ساز اسمبلی میں اس مسئلہ پر گرما گرم بحث ہوئی مگر کن طبقات کو اس میں شامل کیا جائے اور کس کو کتنی رعائت دی جائے اس پر اتفاق رائے نہیں ہوسکا۔ اس وقت جو بحث ہوئی اس میں دو رائیں آئیں۔ایک ایسے سبھی گروہ جنہیں ترجیحی سلوک (Preferential treatment) کی ضرورت تھی اس میں اوبی سی کے ساتھ شودر اور آدی باسیوں کو شامل کیا گیا۔اور دوسرے جو شودر اور اچھوت سے اوپر تھے مگر محروم تھے ان کو دوسرے خانے یعنی دیگر پسماندہ برادریاں'' یعنی اوبی سی میں رکھا گیا۔اسی وقت سے OBC کی اصطلاح سامنے آئی۔ ابتداء میں اس اصطلاح کا استعمال صرف ہندودھرم سے جڑی پسماندہ برادریوں کے لیے کیا جاتا تھا۔ بحث کے دوران مدراس کے ممبر جناب محمد اسماعیل صاحب نے دستور ساز اسمبلی سے وضاحت طلب کی کہ کیا اس اصطلاح میں اقلیتوں میں موجود پچھڑے طبقات بھی شامل ہیں؟ بالآخر دستو کی دفعہ(۴) ۱۵ اور(۴) ۱۶ میں پچھڑا طبقہ کی اصطلاح کا استعمال کیا گیا۔ یہ دفعات ریاست کو یہ اختیار دیتے ہیں کہ وہ تعلیمی اور سماجی طور پر پچھڑے طبقات کو خصوصی مراعات دے سکتی ہے۔

ریزرویشن کے لیے کمیشن کی تشکیل

دستور کی دفعہ ۳۴۰ ریاست کو یہ اختیار دیتی ہے کہ وہ سماجی اور تعلیمی اعتبار سے پسماندہ گروہوں کی حالت جاننے کے لیے تحقیقاتی کمیشن بناسکتی ہے۔حکومت ہند نے اسی دفعہ کے تحت اب تک دوکمیشن بنائے ہیں۔

(۱) کاکا کالیکر کمیشن جس نے ۱۹۵۵ء میں اپنی رپورٹ سرکار کو پیش کردی تھی اور دوسرا بی پی منڈل کمیشن جو ۱۹۷۸ء میں بنائی گئی اور جس نے اپنی رپورٹ ۱۹۸۰ء میں پیش کی۔

ان دونوں کمیشنوں نے ہندوستانی سماج کا بہت گہرائی سے جائزہ لیا اور ان طبقات کی نشاندہی کی جو ان کے خیال میں خصوصی رعائت کی مستحق تھیں۔کاکا کالیکر کمیشن نے ۲۳۹۹

پچھڑی ذاتوں کی نشاندہی کی تھی جس میں ۳۷۸ حد درجہ پچھڑی ذاتیں تھیں۔اس طرح پس ماندہ برادریوں کو پہلی بار پچھڑی ذاتوں اور حد درجہ پچھڑی ذاتوں یعنی دو خانوں میں تقسیم کیا گیا۔اس کمیشن کی خاص بات یہ تھی کہ اس نے پچھڑی ذاتوں کی فہرست میں ہندوؤں کے ساتھ ساتھ غیر ہندو پچھڑی ذاتوں کو بھی ریزرویشن کی فہرست میں شامل کیا تھا۔اس طرح پہلی بار مسلم، عیسائی اور دیگر اقلیتی برادریوں کی کچھ ذاتوں کو باضابطہ طور پر پچھڑی ذاتوں کی حیثیت سے تسلیم کیا گیا۔لیکن مسلمانوں کو ذات کی بنا پر ریزرویشن کا مطالبہ خود کاکا کالیکر نے جو اس کمیشن کے صدر تھے نہیں مانا۔ان کی رائے میں مسلمان اور عیسائی برادریوں پر اس کا برا اثر پڑے گا جو ان گروہوں کے لیے خطرناک ہوسکتا ہے مرکزی حکومت نے اس کمیشن کی سفارشات کو یہ کہہ کر ماننے سے انکار کر دیا کہ اس میں ذات کے بجائے معاشی حالت کو پس ماندگی کا پیمانہ بنایا گیا ہے۔گویا مرکزی حکومت معاشی پسماندگی کو پچھڑا پن کی وجہ نہیں مانتی تھی بلکہ ذات کو ہی پچھڑا پن کی علامت مانتی تھی۔

(۲) ۱۹۸۰ء میں منڈل کمیشن نے اپنی رپورٹ پیش کی۔منڈل کمیشن نے گیارہ نکات پر مشتمل ایک ایسا اشاریہ (Index) تیار کیا جس سے ذات اور طبقوں کے جوڑ سے بچھڑے گروہوں کی پہچان کی جاسکے۔کمیشن کی رائے میں ہندوسماج میں ذات اینٹ کے مانند ہے اور الگ الگ اینٹوں کے جوڑ سے ہی ہندوسماج بنا ہے۔تاہم تمام تر دستوری آزادیوں کے باوجود مساوات پر مبنی غیر طبقاتی سماج کی تشکیل نہیں کی جاسکی ہے۔ہندوستان میں سماجی تقسیم و تفاوت ایک بدیہی حقیقت ہے۔

کمیشن نے جو اشاریہ بنایا اس کے مطابق اس نے ایسی ۳۷۴۳ ذاتوں کی شناخت کی جسے وہ پچھڑی ذاتیں مانتی تھی۔کمیشن کی رائے میں ذات اور ذات سے متعلق خصوصیات صرف ہندوسماج تک محدود نہیں ہے بلکہ یہ غیر ہندو گروہوں مثلاً عیسائیوں، مسلمانوں، سکھوں وغیرہ میں بھی ہیں۔بھارت میں ۱۹۳۱ء سے قبل جو مردم شماری ہوتی تھی اس میں ذات کا ذکر ہوتا تھا۔۱۹۳۱ء کے بعد کی مردم شماری میں ذات کا کالم ختم کر دیا گیا۔لہذا کمیشن نے ۱۹۳۱ء کی

مردم شماری کو اپنی بنیاد بنایا۔ اس کے علاوہ اس نے ازخود بھی سروے کیا اور اس بنیاد پر مسلمانوں کی ۸۲ ایسی ذاتوں کی نشاندہی کی جو کمیشن کی رائے میں دیگر پسماندہ برادریوں کے زمرے میں آتی ہیں۔ کمیشن نے غیر ہندو گروہوں میں ذات کو پچھڑا پن کی بنیاد ماننے میں تھوڑا تامل کیا کیونکہ اس کی رائے میں اسلام اور عیسائیت مساوات پر مبنی سماج کے دعویدار ہیں۔ لہٰذا محض ذات پسماندگی کی علامت نہیں ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح کمیشن نے غریبی کو بھی واحد وجہ پسماندگی نہیں مانا۔

گویا کمیشن کو غیر ہندو گروہوں کے درمیان پسماندگی کا معیار طے کرنے میں تھوڑی زحمت ہوئی۔ دراصل ہندو دھرم اور سماج اور اسلامی اور عیسائی مذاہب اور سماج کی بناوٹ میں جو بنیادی فرق تھا وہ اس تذبذب کا باعث بنا مگر چونکہ ان دونوں مذاہب کے لوگ ہندوستانی سماج کا حصہ ہیں اس لیے ان کی سماجی بناوٹ میں ہندوستانی سماج کی ساری خصوصیات موجود تھیں۔ لہٰذا کمیشن نے مسلمانوں میں پسماندہ گروہوں کی نشاندہی کے لیے دو بنیادیں طے کیں۔

(۱) وہ تمام اچھوت لوگ جو ہندودھرم سے اسلام میں آئے جنہیں ارذال کہا جاتا ہے۔

(۲) ایسے پیشہ ور گروہ (Occupational group) جو اپنے پیشہ سے جانے جاتے ہیں اور ان کے ہم پلہ ہندو برادریوں کو OBC میں رکھا گیا ہے۔ مسلمان سماج میں جو اجلاف کے نام سے جانے جاتے ہیں۔

اس طرح مسلمانوں میں ارذل اور اجلاف کو ملا کر او بی سی کے طور پر تسلیم کیا گیا اور انہیں ریزرویشن دینے کی سفارش کی۔ کمیشن نے ارذل اور اجلاف کے اندرونی تضاد و تفاوت کو نظرانداز کر کے دونوں کو ایک ہی سطح پر رکھا جو غلط ہے۔ ارذال کی سماجی اور معاشی حالت لازمی طور پر اجلاف سے نیچے ہے۔ لہٰذا ارذال کو درج فہرست طبقات میں شامل کرنا چاہیے۔ بصورت دیگر او بی سی اور ای بی سی میں تو ضرور رکھنا چاہیے تھا۔

یہ تو رہا کمیشنوں کا جائزہ۔ منڈل کمیشن کی سفارشات جب سے منظور ہوئی ہیں اس نے بھارت کے سماج اور سیاست پر گہرا اثر ڈالا ہے اور او بی سی اور ای بی سی میں زبردست عروج دیکھنے کو مل رہا ہے۔ منڈل کمیشن کی سفارشات میں اگر چہ مسلمانوں کے کچھ گروہوں کو شامل کیا گیا ہے لیکن چونکہ ان کا کوئی سب کوٹہ متعین نہیں ہے اس لیے ان طبقات کو بھی ریزرویشن کا کماحقہٗ فائدہ نہیں مل رہا ہے۔ جب تک مسلمانوں کا سب کوٹہ متعین نہیں ہوتا یہ ہاتھی کے دانت کی طرح ہے جو دکھانے کے اور ہیں اور کھانے کے اور۔

ہندوستان دو بڑے جغرافیائی خطوں میں بانٹا جاتا ہے۔ ایک نارتھ انڈیا جس کو ہندی بلٹ یا کاؤ بلٹ بھی کہتے ہیں اور دوسرا ساوتھ انڈیا ہے جو غیر ہندی ریاستوں پر مشتمل ہے۔ برٹش عہد سے ہی جنوبی ہند کی ریاستیں زیادہ لبرل اور ترقی پزیر رہی ہیں، ان کے اندر وسعت قلبی رہی ہے اور بہت سی اصلاحی تحریکوں کا ان ریاستوں نے بڑھ چڑھ کو استقبال کیا ہے اور اپنے سماج اور سیاست میں اس کو جگہ دی ہے۔ ریزرویشن کے باب میں بھی جنوب کی ریاستوں مثلاً کیرالہ، تامل ناڈو، کرناٹک وغیرہ کا ٹریک رکارڈ کافی اچھا ہے۔ اگر ان ریاستوں کے ماڈل کو اپنایا جائے تو ریزرویشن کے سلسلے میں بہت سے مسائل آسانی سے حل ہو سکتے ہیں اور اس معاملہ میں عام اتفاق رائے پیدا کیا جا سکتا ہے۔ ہم ذیل میں ان ریاستوں کے تجربات کا مختصر جائزہ لیں گے۔

کیرالہ ماڈل:

موجودہ کیرالہ ٹراونکور، کوچین اور مالابار کی دیسی ریاستوں کو جوڑ کر بنا ہے۔ کیرالہ میں ریزویشن کی تاریخ کافی پرانی ہے۔ برٹش عہد میں ہی ایسے سماجی گروہ جن کی سرکاری نوکریوں میں نمائندگی کم تھی ان کو مالابار ریاست میں ۱۹۲۱ء میں اور ٹراونکور اور کوچین کی ریاستوں میں ۱۹۳۶ء میں ہی ریزرویشن کی سہولت فراہم کی گئی تھی اور یہ سہولت صرف ہندو ذاتوں اور برادریوں تک محدود نہیں تھی بلکہ اس میں دیگر مذہبی اقلیتوں جیسے مسلمانوں اور عیسائیوں کا بھی

کوٹہ متعین تھا۔ ۱۹۵۲ء میں کیرالہ میں ریزرویشن کی زیادہ سے زیادہ حد 45% تھی جو ۱۹۵۶ء میں اس ریاست کی لسانی بنیاد پر تنظیم نو کے بعد 40% کردی گئی۔ ریاست کیرالہ کی ریزوریشن پالیسی کی خاص بات یہ ہے کہ اولاً تو اس نے سب سے پہلے مسلم ریزرویشن کی ضرورت کو تسلیم کیا اور دوسرے اس ریاست میں پوری مسلم آبادی کو ریزرویشن کے دائرے میں رکھا گیا جو اپنے آپ میں ایک انوکھی پہل ہے۔ ریاست میں جو لوگ کریمی لیئر کے دائرے میں آتے ہیں ان کو چھوڑ کر باقی تمام مسلم آبادی کو پسماندہ آبادی قرار دیا گیا اور پسماندہ آبادی کی جو وسیع تر تقسیم تھی ان سبھوں میں مسلمانوں کو بانٹ کر ریزرویشن کی سہولت دی گئی۔ موجودہ 40% مین اِجھاوا کمیونیٹی کو 14% مسلمانوں کو 12% لیٹن کیتھولک کو 4% نائر کو 2% شیڈول کاسٹ کے عیسائی مذہب اختیار کرنے والوں کو 1% ،تھیور کو 1% ، دیگر پس ماندہ گروہوں کو 3%، وش کرما کو 3% اور شیڈول کاسٹ / شیڈول ٹرائبس کو 10% ریزرویشن کی سہولت حاصل ہے۔ اس طرح ریاست کے تمام سماجی گروہوں کو ریزرویشن کی سہولت دی گئی ہے۔

اس پالیسی کا فائدہ یہ ہوا کہ سماجی اشاریہ (Social index) مثلاً تعلیم، صحت، عورت مرد کا تناسب، لڑکیوں کی تعلیم، نوکریوں میں حصہ داری، فی کس آمدنی وغیرہ کے معاملے میں ریاست کیرالہ ملک کی دیگر ریاست سے بہتر ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ تمام سماجی اور مذہبی گروہوں کو ترقی کے یکساں مواقع حاصل ہیں جس کی وجہ سے وہاں خطِ غربت سے نیچے پائے جانے والے افراد کی تعداد پورے ملک میں سب سے کم ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ یہ ریاست فرقہ وارانہ امن کے معاملے میں بھی دیگر ریاستوں سے بہتر ہے اور سبھی مذہبی گروہوں کے درمیان خوشگوار رشتے استوار ہیں۔ لہٰذا جو لوگ ریزرویشن کی وجہ سے سماجی کش مکش میں اضافہ کی بات کرتے ہیں وہ سماجی، معاشی اور مذہبی وجوہات سے نہیں ہے بلکہ اس کے پیچھے اوچھی سیاست ہے اور کچھ لوگ جو اپنے حق سے زیادہ لے کر بیٹھے ہیں اور سیاست ومعیشت پر اپنی اجارہ داری قائم کئے ہوئے ہیں ان کو اپنی حیثیت کے کم ہو جانے کا خطرہ ہے جس کی وجہ سے وہ ریزرویشن کی مخالفت کررہے ہیں۔ ہمارے سامنے دوسرا ماڈل کرناٹک ہے۔

کرناٹک ماڈل:

اگر تاریخی اعتبار سے دیکھا جائے تو کرناٹک جو ریاست میسور کہا جاتا تھا وہاں انیسویں صدی کی آخری چوتھائی میں ریزرویشن کی پالیسی اپنائی گئی تھی تاریخی حوالوں سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۸۷۴ء میں اس ریاست میسور کی راج شاہی سرکار نے ایک فرمان کے تحت محکمہ پولیس میں 80% غیر برہمنوں اور ہندوستانی عیسائیوں کے لیے مختص کر دیئے تھے۔

آزادی کے بعد ریاست کی تشکیل نو ہوئی اور اس کا نام میسور سے بدل کر زبان کی بنیاد پر کرناٹک کر دیا گیا تاہم ریاست کی تشکیل نو کے بعد سبھی غیر برہمن ہندو ذاتوں اور غیر ہندو اقلیتی برادریوں مثلاً مسلمان اور عیسائیوں کو پسماندہ طبقہ قرار دے کر ریزرویشن کی سہولت جاری رکھی گئی۔ ۱۹۶۰ء میں ناگن گوڑ اکمیشن کی سفارش پر پسماندہ طبقات کو دو خانوں پسماندہ طبقہ (28%) اور حد درجہ پسماندہ طبقہ (22%) میں تقسیم کیا گیا۔ اور اس سی اس ٹی کو ملا کر مجموعی ریزرویشن 68% تک کر دی گئی تھی۔ لیکن سپریم کورٹ نے ریزرویشن کی حد 50% تک محدود کر دی۔ تاہم ریاست کرناٹک نے پوری مسلم کمیونٹی کو پچھڑا طبقہ مان کر ریزورویشن کی سہولت جاری رکھا۔ ۱۹۷۲ء میں ہاونور کمیشن نے اپنی رپورٹ سرکار کو دی، اس نے سفارش کی کہ سبھی اقلیتی گروہوں کا ایک الگ خانہ بنایا جائے اور ان کو زیادہ سے زیادہ 6% تک ریزرویشن دیا جائے۔ اس کے بعد ریاست نے پچھڑا طبقہ کو تین حصوں میں منقسم کر دیا (۱) حد درجہ پسماندہ طبقہ (۲) زیادہ پسماندہ طبقہ (۳) پس ماندہ طبقہ۔ سبھی مسلم خاندانوں کو جن کی سالانہ آمدنی دو لاکھ روپے سے کم تھی ان کو پس ماندہ طبقہ تسلیم کیا گیا اور ان سبھی خاندانوں کو حد درجہ پس ماندہ گروہ میں شامل کر کے 4% ریزرویشن کی سہولت دی گئی۔

اس پالیسی کی وجہ سے حکومت کے سبھی شعبوں اور خدمات میں مسلمانوں کی حصہ داری کافی بڑھی ہے۔

ریاست کرناٹک کی ریزرویشن پالیسی کی خاص بات یہ ہے کہ:

(۱) اس ریاست میں ریزرویشن کی تاریخ سب سے قدیم ہے۔

(۲) مسلمانوں کو ریزرویشن دینے میں معاشی اشارات خصوصاً آمدنی کو پیمانہ بنایا گیا ہے۔

(۴) اس ریزرویشن پالیسی کا فائدہ یہ ہے کہ تمام طبقات کو آگے بڑھنے کے مواقع مل رہے ہیں۔

(۵) ریاست کرناٹک ملک کی ترقی یافتہ ریاستوں میں شمار ہوتی ہے۔

(٦) انسانی ترقیاتی اشاریہ (Human Developmant Index) کے اعتبار سے یہ شمال کی بہت سی ریاستوں سے بہتر ہے۔اس ریاست میں تعلیم کی اوسط سطح کافی اونچی ہے جو ریزرویشن پالیسی کا سیدھا نتیجہ ہے۔

(۷) اگر حال کے دوچار واقعات کو چھوڑ دیا جائے تو نسبتاً ریاست میں فرقہ وارانہ امن کا ماحول رہا ہے اور مسلمانوں ہندوؤں اور عیسائیوں اور دیگر برادریوں اور طبقات کے درمیان سماجی کش مکش بہت کم ہے۔

لہٰذا ریزرویشن ہر اعتبار سے ایک مثبت قدم ہے جو سماج اور ریاست کی ترقی میں معاون ہوتا ہے۔

تامل ناڈوماڈل:

کیرالہ اور کرناٹک کی طرح ریاست تامل ناڈو میں ریزرویشن کی تاریخ کافی پرانی ہے اور یہ برٹش عہد سے ہی شروع ہوتی ہے۔دوسری خاص بات یہ ہے کہ اس ریاست میں اول دن سے مسلمانوں کو ریزرویشن کی سہولت دی گئی ہے۔تاریخی حوالوں سے پتہ چلتا ہے کہ ۲۹؍جولائی ۱۸۷۲ء کو ایک سرکاری حکم نامہ کے ذریعہ تعلیمی اعتبار سے مسلمانوں کے پچھڑے طبقات کو ریزرویشن کی سہولت دی گئی تھی۔اس طرح یہ حکم نامہ ہندوستان میں مسلم ریزرویشن کی شروعات مانا جاسکتا ہے۔

بعد میں آدی باسیوں اور نچلی ہندو ذاتوں کو بھی اس دائرے میں لایا گیا۔گویا ان

ذاتوں کو بعد میں ریزرویشن دیا گیا۔ ۱۹۲۷ء میں اونچی تنخواہ والی نوکریوں میں برہمنوں کی سب سے زیادہ نمائندگی دیکھتے ہوئے ایک سرکاری حکمنامہ کے ذریعے خانہ وار (Compartmental) ریزرویشن کا طریقہ لاگو کیا گیا اور اس پالیسی کے ذریعہ غیر برہمن کے لیے 42% اور مسلمانوں کے لیے 17% ریزرویشن کی سہولت دی گئی۔

آزادی کے بعد ریزرویشن کی پالیسی میں کافی تبدیلی کی گئی۔ پہلی تبدیلی یہ تھی کہ دستور ہند میں جن طبقات کو محروم طبقات میں شمار کیا گیا تھا جیسے اس سی / اس ٹی اور پچھڑہ طبقہ ان کو ریزرویشن کی سہولت دی گئی دوسرے مسلمانوں کا جو الگ کوٹہ تھا اس کو ختم کر دیا گیا۔ تاہم ریاست میں مسلمانوں کے مختلف گروہوں کو پچھڑا طبقہ میں شامل کر کے ان کو ریزورویشن کی سہولت دی گئی۔ اس طرح مسلمانوں کی پسماندگی کی بنیاد پر کم و بیش 95% مسلم آبادی کو ریزرویشن کی سہولت حاصل ہے۔

اس وقت ریاست میں کل 69% ریزرویشن دیا جاتا ہے جو سپریم کورٹ کے طے شدہ ضابطہ سے بہت زیادہ ہے اور اس کو دستور کے ۷۶ ویں ترمیم کے ذریعہ یک گونہ سند جواز حاصل ہے۔

تامل ناڈو میں بھی ریزرویشن کی وجہ سے تمام طبقات بالخصوص پسماندہ برادریوں اور مسلمانوں کی نمائندگی اچھی ہے۔ تعلیمی سماجی اور معاشی حالات بہتر ہیں۔ روزگار کے بہتر مواقع حاصل ہیں۔ ریاست ہندوستان کی ترقی یافتہ ریاستوں میں سے ایک ہے سماجی امن اور فرقہ وارانہ خیر سگالی کا ماحول پایا جاتا ہے۔ مجموعی طور پر ریزرویشن نے ریاست کے سماجی، معاشی، تعلیمی اور سیاسی حالت پر اچھا اثر ڈالا ہے جو اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ ریزرویشن میں ایمانداری اور فراخ دلی کا مظاہرہ کیا جائے تو یہ سب کے لیے فائدہ کی چیز ہے جو معاشی اور سیاسی استحکام نیز سماجی ترقی میں معاون ہوتا ہے۔

بہار ماڈل:

ریزرویشن کی بحث میں بہار ماڈل کا ذکر نہ کیا جائے تو یہ بحث ادھوری رہے گی۔

کیونکہ نارتھ انڈیا میں جس ریزرویشن پالیسی نے دوررس سیاسی اورسماجی تبدیلیاں لائی ہیں اس کا مرکز بہار ہی رہا ہے۔ بی پی منڈل جن کے نام سے منڈل کمیشن مشہور ہے بہار کے مشہور سماج وادی رہنما اور بہار کے سابق چیف منسٹر تھے۔ بہا رلوہیا وادیوں اور سوشلسٹ تحریک کا مرکز رہا ہے۔ سوشلسٹوں نے پچھڑی ذاتوں کو جوڑ کر جو سیاسی سماجی تحریک شروع کی تھی اس کا دومشہور نعرہ تھا ''ووٹ ہمارا، راج تمہارا، نہیں چلے گا نہیں چلے گا۔'' اور دوسرا نعرہ تھا پچھڑا مانگے سو میں ساٹھ۔ یعنی چونکہ ریاست میں پچھڑی ذاتوں کی آبادی زیادہ ہے اس لیے ان کی نمائندگی اوراختیار بھی انہیں کے ہاتھ میں ہونا چاہئے۔ بہار کے سابق چیف منسٹر کرپوری ٹھاکر اس فکر کے سب سے بڑے رہنما تھے۔ اس لیے بہا رماڈل بنیادی طور پر کرپوری ماڈل ہی کہا جاتا ہے۔ اس کی تاریخ یہ ہے کہ بہار میں پچھڑے طبقات کے حالات اور مسائل کے مطالعے کے لیے سب سے پہلے ۱۹۷۱ء میں مونگیری لال کمیشن بنایا گیا جس نے ۱۹۷۵ء میں اپنی رپورٹ پیش کی۔ اس رپوررٹ میں اس نے پچھڑے طبقات کو دوحصوں او بی سی اورایم بی سی میں تقسیم کیا او بی سی میں ۲۸/اورام بی سی میں ۹۳/ذاتوں کوشامل کیا۔ کرپوری ٹھاکر کی سرکار نے ۱۹۷۸ء میں اس رپورٹ کو منظور کیا۔ اسی مناسبت سے اسے کرپوری فورمولہ کہا جاتا ہے۔

اس فورمولہ کی رو سے جھارکھنڈ بننے کے بعد موجودہ ترمیم شدہ صورتحال ہے کہ سرکاری خدمات میں نوکریوں کے مقصد سے او بی سی کو 13%، ایم بی سی کو 18%، اس سی کو 15%، اس ٹی کو 1% اورپچھڑی ذات کی عورتوں کو 3% ریزرویشن کی سہولت حاصل ہے۔

مسلمانوں میں ان کی پسماندگی کی بنیاد پر کچھ ذاتوں کو او بی سی اور کچھ کو ایم بی سی میں رکھا گیا۔ ۹/مسلم ذاتوں کو او بی سی اور ۲۷ ذاتوں کو ام بی سی کے تحت رکھ کر ان کو ریزرویشن کی سہولت دی گئی ہے۔ اس طرح زیادہ تر مسلم ذاتیں ایم بی سی کے دائرے میں آتی ہیں۔

اس فورمولہ میں مسلمانوں کی سماجی اور معاشی پسماندگی کو ریزرویشن کی بنیاد بنایا گیا ہے۔ لیکن اگر کیرالہ تامل ناڈو، کرناٹک وغیرہ سے اس فورمولہ کا موازنہ کیا جائے تو یہ فورمولہ کئی اعتبار سے ناقص ہے۔

(۱) یہ غیر سائنسی اور ناقص فورمولہ ہے۔ پسماندگی صرف ذات سے نہیں ناپی جاسکتی ہے۔ اس کے لیے بڑا پیمانہ چاہیے تعلیم، معاش، روزگار اور دیگر عوامل کی بنیاد پر پسماندگی کا جائزہ لینا زیادہ حقیقت پسندانہ اور سائنسی ہوگا۔

(۲) اس فورمولہ میں اوبی سی اور ایم بی سی میں مسلمانون کو شامل تو کیا گیا مگران کا کوئی سب کوٹہ متعین نہیں ہے اس لیے ہندو اوبی سی اورام بی سی سے بچے گا تبھی ان طبقات کو کچھ مل سکتا ہے۔ لہٰذا مسلم اوبی سی اور ایم بی سی کو ریز رویشن کا کما حقہ فائدہ نہیں مل رہا ہے۔ لہٰذاان کا سب کوٹہ متعین ہونا چاہیے۔ خواتین ریز رویشن معاملہ میں اصولی اتفاق رکھنے کے باوجود سوشلسٹ فکر کی تمام پارٹیاں سب کوٹے پر اصرار کررہی ہیں جس کی وجہ سے یہ بل پاس نہیں ہورہا ہے۔ لہٰذا جہاں ان پارٹیوں کی سرکار ہے انہیں اپنے دائرے اوراختیار میں اس کونافذ کرنا چاہیے۔

اس طرح ہندوستان میں ریز رویشن کی تاریخ اورمختلف ریاستی ماڈل کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ تمام رپورٹوں نے اورمختلف ریاستوں نے مسلمانوں کے ریزویشن کی ضرورت کومحسوس کیا ہے۔ ریاست کیرالہ اور کرناٹک میں سوفیصد مسلم آبادی کو ریزرویشن کے دائرے میں رکھا ہے اورتامل ناڈو میں95% مسلم آبادی کو ریزوریشن دیا ہے ساتھ ہی ذات کے ساتھ معاشی حالات اورآمدنی کو اس کی بنیاد بنایا ہے اور کریمی لیئر کو چھوڑ کر تمام مسلمان ذاتوں ،طبقات اور برادریوں کو ریزرویشن دیا ہے۔ ہمارے خیال سے یہ سہی پالیسی ہےاوراسی کی بنیاد پر پورے ملک میں مسلمانوں کو ریزرویشن دیا جانا چاہیے۔

واضح ہو کہ کہ اسلام اورعیسائیت کے طرز پر سکھ اور بودھ مذہب بھی ذات کونہیں مانتے ہیں لیکن صدر نے سکھ اور بودھ مذہب کی طرف داری کی اور اسلام اورعیسائیت کے خلاف تعصب کیا، جوصریحاً خلاف منطق، نامعقول اور غیر منصفانہ رویہ ہے لہٰذا جسٹس رنگ ناتھ مشرا کمیشن نے سفارش کی ہے کہ ۱۹۵۰ء کے صدارتی حکم نامہ میں سے پیرا(3) کوحذف کردیا جائے، اس نے یہ بھی سفارش کی کہ مسلمانوں اورعیسائیوں میں ان تمام گروپوں اور

کلاسوں کو جن کے ہم منصب ہندو، سکھ اور بودھ مرکزی اور صوبائی شیڈول کاسٹ فہرست میں شامل ہیں۔ انہیں بھی شیڈول کاسٹ کے زمرے میں شامل کیا جائے ۔جسٹس سچر نے بھی کہا ہے کہ مسلمانوں کو ذات کا استعمال ریزرویشن لینے کے لیے کرنا چاہیے۔

اس کے علاوہ کئی ماہرین کا ماننا ہے کہ صدر کا شیڈول کاسٹ حکم نامہ ۱۹۵۰ء دستور کے دفعہ ۱۴، ۱۵، ۱۶ اور ۲۵ کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ اسی لیے مسلمانوں میں موجود دلتوں کو درج فہرست ذات کا درجہ دے کر انہیں بھی ریزرویشن دینا چاہیے۔ سچر کمیٹی نے سفارش کی ہے کہ اگر ایسا کرنا ممکن نہ ہو تو انہیں حد درجہ پسماندہ طبقہ قرار دے کر ان کو الگ سے ریزرویشن دینا چاہیے۔

لہٰذا اب وقت آ گیا ہے کہ ہندوستان کے Political establishment کو فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے آرٹیکل ۳۴۱ کے دروازے مسلمانوں عیسائیوں اور دیگر مذاہب کے اسی طرح کی تمام برادریوں کے لیے کھول دینے چاہئیں اور اس دائرے میں ریزرویشن کا فائدہ ہر طبقہ اور ہر فرد کو اٹھانے کا موقع دینا چاہیے۔ لہٰذا ہمارا مطالبہ ہے کہ آرٹیکل ۳۴۱ کو Religious neutral بنایا جائے تبھی یہ مانا جائے گا کہ ہمارا ملک مذہبی اور دستوری اعتبار سے دھرم نرپیکچھ اور بی جے پی کی اصطلاح کے مطابق پینتھ نرپیکچھ ہے ورنہ یہ سمجھا جائے گا کہ ہمارے یہاں انصاف کے دو پیمانے ہیں جو اصول انصاف کے منافی ہے۔ لہٰذا پوری مسلم ملت اور تمام انصاف پسند لوگوں کو ان محروم طبقات کو انکا واجبی حق دلانے کے لیے متحدہ اور مشترکہ طور پر پرزور مہم چلانی چاہیے۔

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے ریزرویشن کا مسئلہ کافی دنوں سے چلا آ رہا ہے اور دستور ساز اسمبلی میں اس پر گرما گرم بحث ہو چکی ہے اس وقت مسلمانوں کو جھوٹے وعدے کر کے اس مدے کو ٹھنڈے بستے میں ڈال دیا گیا، نتیجہ کے طور پر مسلمانوں کے حالات سدھرنے کے بجائے بدتر ہوتے چلے گئے اور مسلمان دن بدن پچھڑتے چلے گئے۔

مسلمانوں کے خلاف جو تعصب اور تنگ نظری پائی جاتی ہے اس کا مرکز شمالی ہند ہے جس میں یوپی، بہار، دہلی، مدھیہ پردیش اور راجستھان سب سے زیادہ متاثر علاقے ہیں یہاں کا Political establishment اور intellectuals بالعموم مسلمانوں کو شک کی نظر سے دیکھتے ہیں اور ان کو دبا کر رکھنا چاہتے ہیں اور ان کو کوئی موقع اور چھوٹ دینا نہیں چاہتے ہیں۔ اس کے مقابل جنوبی ہند میں حالات تھوڑے بہتر ہیں حالانکہ اب وہاں بھی تیزی سے شمال کا کمیونل وائرس پھیلتا جا رہا ہے۔ پھر بھی ابھی اس کے اثرات کم ہیں۔

جنوب کی مختلف ریاستوں نے اپنے Secular اور Welfare charater کے تحت جو بہت سے Progressive legislation بنائے اور جو اسکیمیں رائج کیں اس میں انہوں نے مسلمانوں کے محروم طبقات کو بھی حصہ داری دی ہے۔ یہ سب کو معلوم ہے کہ نارتھ کے مقابلے ساؤتھ انڈیا میں مسلمانوں کی تعداد کم ہے۔ اس لیے ملک گیر سطح پر اس کا فائدہ اس طرح ابھر کر سامنے نہیں آیا جتنا آنا چاہیے تھا۔ اس لیے یہ کہنا کہ مسلمانوں کو ریزرویشن دستور کے منافی ہے ایک جھوٹ اور فریب محض ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کو ریزرویشن دستور کی روح کو بالیدہ کرنے والا عمل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ساؤتھ کی ریاستی حکومتوں نے مسلمانوں کو ریزرویشن دینے کی پالیسی کافی دنوں سے اپنا رکھی ہے۔ جس کا فائدہ یہ ہوا ہے کہ ساؤتھ کے مسلمان تعلیمی، معاشی، سماجی اور سیاسی اعتبار سے نارتھ کے مسلمانوں سے بہتر ہیں اور ان کا اپنے سماج سے رابطہ Social integration زیادہ مضبوط ہے۔

اس پوری بحث کو معروضی انداز سے سمجھنے کے لیے بھارت میں ریزرویشن کی پوری تاریخ اور مختلف ریاستوں میں اب تک اٹھائے گئے اقدام پر ایک طائرانہ نظر ڈالنا بہتر ہوگا۔

اس وقت ملک کی مختلف ریاستوں میں جو ریزرویشن کی شرح موجود ہے اس کا مختصر جائزہ یہ ہے۔

ریاست تامل ناڈو نے اوبی سی ریزرویشن کی حد %23 سے بڑھا کر %30 کردی اور اس میں اس نے مسلمانوں اور عیسائیوں کو %3.5 ریزرویشن کی سہولت دی ہے۔

ریاست کرناٹک میں ۱۹۹۵ء سے مسلمانوں کونوکری اور تعلیم میں 4% ریزرویشن کی سہولت حاصل ہے۔ریاست کیرالہ میں کیرالہ پبلک سروس کمیشن میں مسلمانوں کو 12% ریزرویشن دیا گیا ہے اور تعلیمی اداروں میں 10% ریزرویشن فراہم ہے۔

حال کے دنوں میں حکومت مغربی بنگال نے مسلمانوں کے معاشی اورسماجی پسماندہ طبقات کو 10% ریزرویشن دیا ہے۔

حکومت آندھرا پردیش نے پچھلے سال مسلمانوں کو چار فیصد ریزرویشن دینے کا جو فیصلہ کیا تھا اس کو آندھرا پردیش کے ہائی کورٹ میں چیلنج کیا گیا۔ ہائی کورٹ نے اس نوٹیفکیشن کو رد کرتے ہوئے یہ نہیں کہا کہ دستوری طور پر فیصلہ غلط ہے بلکہ اس نے حکومت کو پھٹکار لگاتے ہوئے یہ کہا کہ یہ اعلامیہ جلد بازی میں بغیر ہوم ورک کئے جاری کیا گیا ہے جس میں بہت سی خامیاں ہیں۔لہٰذا اس کو پھر سے تمام خامیوں کو دور کرکے جاری کیا جائے۔ بعد میں سپریم کورٹ نے اس نوٹی فی کیشن کو uphold کیا اور اس پر مزید غور کرنے کے لیے ایک آئینی بینچ تشکیل دی ہے جس کے فیصلے کا انتظار ہے۔

اس سے یہ ظاہر ہے کہ ریزرویشن کا مطالبہ ملک کے دستور کے خلاف نہیں ہے بلکہ دستور کی روح کے عین مطابق ہے۔ اورانصاف کے تقاضے کے تحت ہے۔ اس کو نہیں ماننا موجودہ حالات میں جب کہ حکومتی اداروں میں مسلمانوں کے خلاف Bias واضح طور پر دیکھنے کو ملتا ہے اور ہر قدم پر فرقہ واریت اور کرپشن کا دور دورہ ہے، ظلم و ناانصافی ہے۔

دستور ہند کی بنیادی حقوق کی دفعہ (1) 15 اور (4) 15 جس میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ

> " the Sate Shall not Discriminate against any citizen on grounds only of religion, race , caste, sex place of birth or any of them.

یعنی ریاست شہریوں کے درمیان صرف مذہب، نسل، ذات جنس، جائے پیدائش

یا ان میں سے کسی بھی بنیاد پر کوئی تفریق نہیں کرے گی۔

15(1) "Nothing in this atricle or in clause (2) of article 29 shall Prevent the state from making any special provision for the advancement of any socially and educationally back ward classes of citizens or for the scheduled casts and the sheduled tribes 15(4)

یعنی اس دفعہ میں یا دفعہ 29 کے شق (2) میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو سماجی اور تعلیمی اعتبار سے شہریوں کے پس ماندہ طبقات کو یا درج فہرست ذاتوں اور درج فہرست قبائل کو اونچا اٹھانے کے لیے کوئی خصوصی انتظام کرنے سے روکتی ہے۔

لہٰذا دستور کا تقاضہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ پولٹیکل اسٹیبلسمنٹ اور ایگزیکٹیو کی طرف سے جو امتیازی سلوک کیا جاتا ہے اس سے اس کو بچانے اور تحفظ فراہم کرنے کے لیے ان کو قانونی طور پر تحفظ دیا جائے اور اس کا ایک طریقہ یہ ہے کہ ان کا واجبی حصہ (Due share) متعین کر کے ان کو فراہم کیا جائے۔

مختلف ریاستوں کی نظیروں اور بھارت کی عدالت عظمیٰ کے سابق چیف جسٹس پنڈت رنگ ناتھ مشرا کی قیادت میں ۱۹/۱کتوبر ۲۰۰۴ء کو جو کمیشن بحال ہوا تھا اور جس نے ۲۱ رمئی ۲۰۰۷ء کو اپنی رپورٹ حکومت ہند کو سونپ دی تھی۔ جس میں اس نے تمام اقلیتوں کو پندرہ فیصد ریزرویشن دینے کی سفارش کی تھی۔ جس میں 10% ریزرویشن مسلمانوں کو اور 5% دیگر اقلیتوں کو دینے کی سفارش کی تھی۔ اس کے علاوہ او بی سی کے 27% کوٹہ میں 8.4% اقلیتوں کے لیے مخصوص کرنے کی بات کہی تھی۔ اور جو دلت دھرم پر یورتن کر چکے ہیں ان کو دفعہ ۳۴۱ کا فائدہ دینے کی سفارش کی تھی۔ اس رپورٹ کو نافذ کیا جانا چاہیے۔

واضح ہو کہ رنگ ناتھ مشرا نہ صرف ماہر قانون داں تھے۔ بلکہ ملک کی سب سے بڑی عدالت کے چیف جسٹس رہ چکے تھے۔ لہٰذا ان کی قانون دانی اور دستور کی سمجھ پر سوال نہیں اٹھایا جاسکتا ہے۔ اس لیے انصاف کا تقاضہ یہ ہے کہ تمام لیت ولعل کو ترک کرتے ہوئے حکومت ہند

اور ملک کی تمام دیگر ریاستوں کوتامل ناڈو، کیرالہ، کرناٹک اور مغربی بنگال کی حکومتوں کے اقدامات کوسراہتے ہوئے پورے ملک میں اور اپنی اپنی ریاستوں میں مسلمانوں کو ریزرویشن دینے کا جرأت مندانہ فیصلہ لینا چاہیے۔ کیونکہ یہ مسلمانوں کا حق ہے اور قانون اور انصاف کے عین مطابق ہے۔

ہندوستان میں ریزرویشن کا مطلب اور مقصد کیا ہے؟ اس کی وضاحت کرتے ہوئے رنگ ناتھ مشرا کمیشن نے مندرجہ ذیل رائے دی ہے۔

> "reservation in India means a process of setting aside a certain percentage of seats in government institutions for members of bakward and under- represented communities.

یعنی ہندوستان میں ریزرویشن کا مفہوم سرکاری اداروں میں پسماندہ اور جن برادریوں کی نمائندگی کم ہے ان کے لیے ایک مخصوص تعداد یا تناسب میں سیٹوں کی تخصیص ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ریزرویشن کا مقصد پسماندہ اور غیر نمائندہ برادریوں کی نمائندگی شرکت اور شمولیت کو بڑھانا ہے۔ دستوری اور قانونی زبان میں اس کو امتیازی تحفظ (Protective discrimination) کہتے ہیں۔

اس اصول کی مزید وضاحت کرتے ہوئے کمیشن نے مندرجہ ذیل رائے دی ہے۔

> "It is form of affirmative action. Reservation is governed by constitutional laws, statutory laws and local rules or regulation. Scheduled caste, scheduled tribes, OBC's are primary becneficiaries of reservation policies under the constitution with the objective of ensuring level playing field."

یعنی یہ مثبت اقدام کے قسم کی چیز ہے۔ ریزرویشن دستوری قوانین اسٹیچوٹری قوانین مقامی قوانین اور ضابطوں کے ذریعہ نافذ ہوتا ہے۔ درج فہرست ذاتیں

قبائل دیگر پسماندہ برادریاں ریزرویشن پالیسی کی بنیادی طور پر فائدہ اٹھانے والے گروہ ہیں۔ دستور کے مطابق ریزریشن کا مقصد تمام لوگوں کے لیے برابری کے مواقع یا یکساں مواقع فراہم کرنا ہے۔یعنی جن کوLevel playng field حاصل نہیں ہے۔یعنی برابری کے مواقع حاصل نہیں ہیں۔ ان کو یہ موقع دینا ہے اور چونکہ یہ کمزورطبقات ہوتے ہیں جن کے ساتھ تعصب اورناانصافی عام ہے۔اس لیے ان کی نمائندگی بڑھانے کے لیے ان کے لیے کچھ سیٹوں کا اختصاص ضروری ہے۔

ریزرویشن کے سلسلہ میں اب تک جو پالیسی اپنائی گئی ہے ۔اورخاص طور سے مسلمانوں کو ریزورویشن دینے کی جس بنیاد پر مخالفت کی جاتی ہے۔اس کے دو پہلو ہیں۔

(ا) ریزروشن پر پہلا اعتراض یہ ہے کہ یہ میرٹ پر مبنی نظام کی ہمت شکنی کرتا ہے۔اس لیے کہ ریزروشن کے ذریعہ ایسے لوگوں کا انتخاب ہوتا ہے جو اہلیت میں کمتر ہوتے ہیں جب کہ زیادہ اہلیت کے باصلاحیت افراد کو چھوڑ دیا جاتا ہے۔جس سے سسٹم کی کارکردگی متاثر ہوتی ہے اوراس کے نتیجہ میں عام لوگوں بالخصوص باصلاحیت لوگوں میں غم وغصہ پیدا ہوتا ہے۔جس سے سماجی انتشار میں اضافہ ہوتا ہے۔اس کا بہت ہی اچھا اور معقول جواب خود منڈل کمیشن نے اپنی رپورٹ میں دیا ہے اس کے مطابق

> "To treat Unequal as equals is to perpetuate inequality. When We allow weak and strong to Compete on an equal footing. We are loading the dice in favour of the strong and holding only a mock competition in which the weaker partner is destined to failure right from start"
> Mandal Commission Report, 1980.

یعنی غیر مساوی کے ساتھ مساوی برتاؤ کرنا نابرابری کو دوام عطا کرتا ہے۔ جب ہم کمزور اور مضبوط دونوں کو مساوی سمجھتے ہیں تو گویا ہم مضبوط کی حمایت کررہے ہیں اوراس طرح یہ ایک نقلی مقابلہ ہوگا جس میں ابتدا سے ہی کمزور

کی ہاریقینی ہے'' اس طرح گویاان کی کمزوری کی رعائت کرتے ہوئے ان کو کچھ چھوٹ اور سہولت دینا تقاضہ انصاف ہے۔ پھر جب ان کی نسلیں بھی اس لائق ہوجائیں گی کہ برابری کے ساتھ مقابلہ کرسکیں اس وقت اگر ان سے یہ سہولت واپس لے لی جائے تو کوئی حرج نہیں ہے مگر ابتدا میں ایسا کرنا انصاف کے منافی ہوگا۔

(۲) ریزرویشن پر دوسرا اعتراض یہ ہے کہ اس کا بنیادی مقصد ووٹ بینک کی سیاست کو بڑھاوا دینا ہے۔ یہ اعتراض وہ لوگ کرتے ہیں جو انصاف کے تقاضوں کو نظر انداز کر کے ظلم کی روایت کو قائم رکھنا چاہتے ہیں اور دوسرے تمام طبقات کو دوسرے درجہ کا شہری بنا کر رکھنا چاہتے ہیں۔ جس طرح درج فہرست ذاتوں اور قبائل کو ریزرویشن دینے پر سب کا اتفاق ہے، اسی طرح اقلیتوں کو ریزرویشن دینے پر سب کا اتفاق ہوجائے تو ووٹ بینک کی سیاست کا الزام خود بخود ختم ہوجائے گا۔ ووٹ بینک کی سیاست کی بات تب ہوتی ہے۔ جب ایک پارٹی یا گروہ اس کی حمایت کرے اور دوسرا اس کی مخالفت کرے۔ اگر یہ مطالبہ مبنی برحق اور مبنی بر انصاف ہے۔ تو سبھی جماعتوں اور تنظیموں کو اس کی حمایت کرنی چاہیے۔

چند تجاویز:

اس بحث کے اخیر میں مسلمانوں کو ریزرویشن کے سلسلہ میں قومی بحث ومباحثہ اور غور خوض کے لیے مندرجہ ذیل تجاویز رکھنا چاہتا ہوں۔

(۱) اس وقت مسلمان جس قسم کے عدم تحفظ کے شکار ہیں جس نفسیاتی عدم استحکام کی کیفیت سے گزر رہے ہیں اور ان کے اندر جیسی پس ماندگی پائی جاتی ہے اور انہیں جس طرح کے تعصّبات کا سامنا ہے پوری مسلم قوم کو پسماندہ قرار دے کر ان کو ریزرویشن کی سہولت فراہم کی جائے۔ اس میں سپریم کورٹ کے فیصلے کے مطابق جو

افراد کریمی لیئر کے دائرے میں آتے ہیں ان کو اس دائرے سے باہر رکھا جا سکتا ہے۔ غیر مسلموں کے علاوہ تمام مسلمانوں کو پسماندہ قرار دے کر پوری مسلم آبادی کو ریزرویشن کی مخالفت،مسلمان پسماندہ برادریاں بھی کرتی ہیں۔ اس سے ان کی رائے میں ان کی حق تلفی ہوگی اور شاید ریزرویشن کا پورا فائدہ ان کو نہیں مل سکے گا۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اصولی طور پر ایسا کوئی مطالبہ قابل قبول نہیں ہوگا کیونکہ پورے ایک مذہبی گروہ کو ریزرویشن دینا دستور کے خلاف ہے۔ اس سلسلے کی پہلی بات یہ ہے کہ رنگ ناتھ مشرا کمیشن نے پوری مسلم قوم کو ریزرویشن دینے کی وکالت کی ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ ریاست کیرالہ اور کرناٹک میں سو فیصد مسلم آبادی کو ریزرویشن حاصل ہے۔ اس طرح اصولی اور عملی مثال سے یہ واضح ہے کہ یہ غیر دستوری نہیں ہے اور ممکن العمل بھی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ان کو اپنی حق تلفی کا خوف ہے۔

ہمارے فورمولہ کے تحت پس ماندہ برادریوں کے لیے 6% ریزرویشن مختص ہونی چاہیے جن کو ریزرویشن کی سہولت عام پسماندہ برادیوں کو ملنے والی سہولت کے طرز پر ہی دی جانی چاہیے۔ چونکہ او بی سی اور ای بی سی کوٹہ میں مسلم پس ماندہ برادریوں کا کوئی سب کوٹہ متعین نہیں ہے اس لیے ان کو ریزرویشن کا فائدہ اس تناسب میں نہیں ملتا جتنا ان کی آبادی ہے۔ ابھی تک کسی شعبہ میں ان کو متعین طور پر 6% ریزرویشن نہیں ملتا ہے۔ اس اصول کے نافذ ہونے سے ان کو ملنے والے ریزویشن کی مقدار لازماً زیادہ ہوگی۔ اور اس طرح وہ اس سے زیادہ فائدہ اٹھا سکیں گے۔ اس فورمولہ کے تحت ان کی کوئی حق تلفی نہیں ہوگی۔

بقیہ مسلم آبادی کو جس 4% ریزرویشن کی وکالت کی جارہی ہے اس کی کچھ شرطیں ہیں۔ پہلی شرط یہ ہے کہ سپریم کورٹ کے فیصلے کے مطابق یہ سہولت کریمی لئر کو چھانٹ کر دی جائے گی۔ اس لیے وہ طبقہ جو معاشی اعتبار سے بہتر ہے اس دائرے سے باہر رہے گا دوسری شرط یہ ہے کہ مسلم پس ماندہ برادریوں کو چھوڑ کر

مسلمانوں کے دیگر طبقات کو میرٹ میں کوئی چھوٹ نہیں دی جائے گی بلکہ یہ ریزرویشن پوری طرح میرٹ پر مبنی ہو۔ چونکہ سسٹم میں تعصب، تنگ نظری، فرقہ پرستی ظلم اورطرف داری عام ہے اس لیے میرٹ میں آنے کے باوجود مسلمانوں کو ان کا واجبی حق نہیں مل پاتا ہے۔ لیکن ریزرویشن کے تحت جب یہ طے ہوجائے گا کہ 4% میرٹ کوٹہ میں مسلمانوں کی جگہ لازمی طور پر محفوظ ہوگی تو ان کے خلاف ناانصافی رکے گی اور مختلف سرکاری شعبوں میں جس کا رونا خود ہندوستان کے پہلے وزیراعظم پنڈت جواہرلال نہرو روتے تھے کہ مختلف شعبہ جات میں یا تو مسلمانوں کی نمائندگی صفر ہے یا محض دو چند اس پر روک لگے گی۔

اس لیے کسی کی حق تلفی کے بغیر اگر پوری مسلم آبادی کو ان کی تعلیمی اور معاشی پسماندگی کی وجہ سے ریزرویشن دیا جاتا ہے تو جن لوگوں کو کسی درجہ میں ریزرویشن کی سہولت حاصل ہے ان کو اس پر معترض ہونے کا کوئی جواز نہیں ہے۔

(۲) رنگ ناتھ مشرا کی سفارش کے مطابق مسلمانوں کو 10% دی جانے والی ریزرویشن میں 6% مسلم پسماندہ طبقات کو اور 4% دیگر مسلم طبقات کو ریزرویشن دیا جائے۔

(۳) مسلمانوں میں او بی سی اور ایم بی سی طبقات کو اسی طرح ریزرویشن دیا جائے جیسے دیگر او بی اسی اور ایم بی سی کو دیا گیا ہے۔ مگر 4% ریزرویشن جو دیگر مسلمان برادریوں کو دینے کی بات کی جارہی ہے ان کو میرٹ میں کوئی چھوٹ نہ دی جائے۔ لہٰذا ہم میرٹ سسٹم کے قائل ہیں۔ مساوی درجہ دینے کا مطلب میرٹ کی اَن دیکھی نہیں ہے۔ لہٰذا ہم مسلمانوں کو میرٹ میں کوئی رعایت دینے کے قائل نہیں ہیں۔ ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ ان کے لیے 6+4% جگہیں مختص کردی جائیں جو صرف انہیں ہی ملیں گی۔ مگر اس میں انتخاب ان لوگوں کا ہی ہوگا، جو اس معیار پر پورے اتریں گے۔ اس طرح ریزرویشن کے جو منفی اثرات ہیں اس سے بڑی حد تک سماج اور معیشت محفوظ ہوگی۔

(۴) ریزرویشن کے دائرے کوسرکاری اداروں سے بڑھا کرنجی اداروں تک پھیلایا جائے اور جوادارے سماجی انصاف کے نظریہ کے مطابق ملک کے تمام طبقات کواپنے یہاں نمائندگی دیتے ہیں،ان کی ہمت افزائی کے لیے ٹیکسوں اوردیگر چیزوں میں چھوٹ دی جائے تاکہ انصاف کے ساتھ ترقی کی راہ ہموار اور مضبوط ہو۔

مسلمانوں کے ریزرویشن کا مطالبہ دووجہوں سے خاص طور پر کیا جارہا ہے۔پہلی وجہ تو ان کی حقیقی پسماندگی ہے جوتمام رپورٹوں اورمطالعات سے واضح ہیں۔اوردوسری وجہ ان کے ساتھ برتا جانے والا تعصب،امتیاز،فرقہ واریت اور ناانصافی ہے جس کی وجہ سے خود پنڈت نہرو کے الفاظ میں سرکاری نوکریوں میں ان کی نمائندگی لگاتار گھٹتی جارہی ہے۔ ۱۹۵۳ء میں ہی پنڈت نہرو نے مسلمانوں کے روزگار پرایک نوٹ لکھا تھا جس کے الفاظ تھے۔

> "In Services, generally Speaking the representation of the minority Communitise is lessening in some cases it is very poor indeed........ Loking through centre secretariate figures, as well as some others. I am distressed to find that the position is very disad- vantageous to them, chiefly to the Muslims and sometimes to others also in our defence services there are hardly any Muslim left in the vast central secretatiat in Delhi, there are very few Muslims" Jawahar Lal Nehru (a note on the Muslim's employment, 1953)

> ''یعنی اگرعمومی طور پرکہا جائے تو نوکریوں میں اقلیتی برادریوں کی نمائندگی گھٹ رہی ہے۔کچھ معاملات میں تو یہ بہت خراب ہے اگرسنٹرسکریٹریٹ کے اعداوشمار کودیکھا جائے اور کچھ دیگر اداروں پرنظر ڈالی جائے تو مجھے یہ دیکھ کر بہت تکلیف ہوتی ہے کہ بالخصوص مسلمانوں اور کچھ دوسرے لوگوں کے لیے حالات بالکل ناموافق ہیں۔ہمارے دفاعی خدمات میں شاید ہی کوئی مسلمان بچاہے۔اتنے بڑے سنٹرل سکڑیٹرٹ میں بہت کم مسلمان ہیں۔''

یہ ملک کے وزیراعظم کا مشاہدہ اوراحساس ہے۔اس کے بعد لوگوں کواور کیا ثبوت اورشہادت چاہیے جس سے وہ کہہ سکیں کہ مسلمانوں کے ساتھ ناانصافی نہیں ہوتی ہے یا وہ محروم گروہ (Disadvantageous group) نہیں ہیں۔ اب کیا جب تک مختلف اداروں میں دوچار مسلمان نظرآتے رہیں گے لوگ اس ظلم اور ناانصافی سے انکار کرتے رہیں گے۔ ہم ریزورشن کا مطالبہ اس ظلم و ناانصافی کوختم کرنے کے لیے کررہے ہیں جب تک ہمارا کوٹہ طے نہیں ہوگا ہماری نمائندگی نہیں بڑھے گی۔ یہاں یہ واضح کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پنڈت نہرو نے یہ نوٹ 1953 میں لکھا تھا سات دہائیاں گذر جانے کے بعد بھی صورت حال میں کوئی واضح تبدیلی نظر نہیں آئی ہے۔

وقت آ گیا ہے کہ اب اس ظلم وناانصافی کو ایک لمحے کے لیے بھی برداشت نہ کیا جائے اور پوری مسلم کمیونٹی متحد ہوکر پوری قوت سے ریزرویشن کے حق میں آواز اٹھائے اور اس کو اپنا قومی وملی ایجنڈا بنائے اوراس کے لیے جو قیمت دینی پڑے دے ہمیں پورے جمہوری اور دستوری تقاضوں کوملحوظ رکھتے ہوئے یہ لڑائی لڑنی ہے اوراس جنگ میں جو ہماری حمایت کرے گا فطری طور پر ہمارا ووٹ اس کو ملے گا۔موجودہ حالات میں ہمیں دوامور پر توجہ دینی ہے ایک تعلیم اوراسکل ڈیولپمنٹ اوردوسرا ریزرویشن۔ یہی وہ دوراستہ ہے جس کے ذریعہ ہم آزاد ہندوستان میں عزت وآزادی اوروقاروقوت کے ساتھ جی سکتے ہیں اورآگے بڑھ سکتے ہیں۔

یہ چندتجاویز اور گذارشات ہیں جن پر ہمدردانہ غور کرنے اورمثبت فیصلہ کرنے کی ضرورت ہے۔ اپنے جائزحق کی بازیابی کے لیے مسلمانوں کوتمام انصاف پسند عناصر کوساتھ لے کر بھرپور جدوجہد کرنی چاہیے۔تاکہ وہ ظلم وناانصافی کی موجودہ صورتحال سے باہر نکلیں اور اکیسویں صدی میں ملک وملت کی تعمیر میں اپنا بھرپور کردار پیش کرسکیں۔مسلمانوں کوریزرویشن نہ صرف مسلمانوں کے لیے بلکہ پورے ملک کی اتحاد وسلامتی نیز استحکام وترقی کے لیے فال نیک ثابت ہوگا۔

آزادی کے بعد ہندوستان کا سیاسی منظر نامہ اور مسلمان

آزادی کے بعد ہندوستان کی سیاست کا اجمالی جائزہ

یہ ایک حقیقت ہے کہ ہندوستان آبادی کے اعتبار سے ہندو اکثریت کا ملک ہے کیونکہ ہندو (تمام ورنوں اور ذاتوں سمیت) اس ملک کی کل آبادی کا 82% ہیں۔ ہندو قوم کے درمیان بے شمار اندرونی تضاد و اختلاف، تفاوت و تصادم پائے جاتے ہیں اور عقائد سے لے کر زبان و تہذیب میں اس قدر فرق ہے کہ انہیں ایک لڑی میں پرو کر ایک قوم کا نام دینا مشکل ہے تاہم یہ ایک حقیقت ہے کہ ہندوستان کے شمال و جنوب اور مشرق و مغرب میں جو لوگ رہتے ہیں وہ جذباتی اور نفسیاتی طور پر ہندو قوم کا حصہ ہیں۔ لہٰذا وہ ہندو ہیں اور ہندو کہلانا پسند کرتے ہیں۔

جنگ آزادی کے دوران جہاں ایک طرف ملک کو انگریزوں کی غلامی سے نجات دلانے کی جدو جہد شروع ہوئی۔ وہیں ملک کو جذباتی، نفسیاتی، قومی، سماجی، ثقافتی، سیاسی اور معاشی وحدت میں پرونے کا عمل بھی شروع ہوا اور اس طرح بھارت کی نئی یافت (Rediscovery of India) کا آغاز ہوا اور بھارت ۱۵ راگست ۱۹۴۷ کو ایک جدید آزاد، سیکولر، جمہوری ریاست کے طور پر عالمی نقشہ پر ظہور پذیر ہوا۔

بھارت کی کمان اس وقت کانگریس کے ہاتھ میں تھی۔ کانگریس سیکولر اور (Inclusive)

ہونے کے باوجود ہندو Supremacy کی قائل تھی۔اس لیے اس نے ملک کو تقسیم کرنا گوارہ کرلیا لیکن اپنے اقتدار میں کوئی Dilution پسند نہیں کیا۔کانگریس نے ویسٹ منسٹر طرز کی جمہوریت کی حمایت اس وجہ سے کی کہ اس کے ذریعہ بغیر کسی تیرو تفنگ کے اقتدار ہندوؤں کے ہاتھوں میں آجائے گا کیونکہ اس طرز جمہوریت میں اکثریت کی حکمرانی کا تصور تسلیم کیا گیا ہے۔

بھارت کی آزادی کے بعد اپنی سیاسی بالغ نظری کا ثبوت دیتے ہوئے بھارت کو دستوری طور پر ایک سیکولر سوشلسٹ،عوامی جمہوریہ ڈکلیر کیا گیا جس میں ملک کے تمام شہریوں کو فرداً فرداً بلا کسی فرق و امتیاز کے مساوی حقوق دیئے گئے نیز ملک کی سبھی چھوٹی بڑی، مذہبی،لسانی اور ثقافتی اقلیتوں کو ان کے عقائد،نظام عبادات،زبان اور اداروں کو بنیادی حقوق کے تحت تحفظ کی ضمانت دی گئی۔ بھارت کا یہ دستور بھارت کی سبھی مذہبی اور دیگر اقلیتوں کے تحفظ اور شمولیت کی اہم دستاویز ہے اور اکثریت کے درمیان اقلیت کے تحفظ وبقا کا ایک اہم اعلامیہ ہے جس کی وجہ سے عالمی برادری میں ہندوستان کو بہ نظر تحسین دیکھا جاتا ہے۔

دستور ہند کی رو سے ریاست سیکولر ہے یعنی ملک میں قانون سازی کسی مذہب کی بنیاد پر نہیں ہوگی۔ریاست نہ تو کسی مذہب کی طرفدار ہوگی اور نہ کسی مذہب کی مخالف بلکہ ریاست مذہب کے معاملے میں غیر جانب دار یعنی نیوٹرل ہوگی۔

دستور کے نفاذ کے وقت دستور کی ڈرافٹنگ کمیٹی کے چیئر مین ڈاکٹر امبیڈکر نے انتباہ دیتے ہوئے کہا تھا کہ دستور کے الفاظ بے معنی اور غیر اہم ہیں۔اصل اہمیت اس کو نافذ کرنے والی دست و ذہنیت کی ہے۔وہ اگر صحیح ہے تو ایک خراب دستور بھی سہی ڈھنگ سے نافذ ہوگا اور اگر وہ غلط ہے تو ایک اچھا دستور بھی اپنی معنویت اور افادیت کھودے گا۔

ہندو Resurgence کی جو لہر آزادی کے قبل شروع ہوئی تھی وقت کے ساتھ وہ Stabilise اور Institutionalise ہوتی چلی گئی اور آزادی کے بعد پوری قوم میں فاتحانہ برتری کے احساس نے جور جائیت اور خود اعتمادی پیدا کی اس نے ایک سیل رواں بن کر ہر اونچی نیچی پہاڑیوں کو عبور کر پورے ملک کو ایک مسطح میدان میں تبدیل کرنے کا جذبہ پیدا کیا۔یہی وجہ

ہے کہ ہندو سمبل (علامت) اور ہندو کسٹم (رسم ورواج) کو قومی کلچر قرار دے کر سیکولر ریاستی تصورات کے ساتھ ایسی پیوند کاری شروع ہوئی کہ ترنگا تو علامت رہا، ملک تیزی سے زعفرانی رنگ میں رنگنے لگا۔

اس کی ابتدا کانگریس کے عہد میں ہوچکی تھی۔ ہندو مائی تھولوجی کو پولٹیکل ڈسکورس میں لایا جانے لگا۔ قدیم دیومالائی اور تاریخی شخصیات کو بطور آئیڈیل پیش کیا گیا۔ رام راجیہ کو آدرش راج کے طور پر مشتہر کیا گیا۔ یہ سب پوری مہارت اور ہوشیاری سے کیا گیا تاکہ عوام اس سے مانوس اور ہم آہنگ ہو جائیں اور یہ چیزیں ان کے ذہن وجذبات میں اس طرح سرایت کر جائیں کہ وہ غیر محسوس طور پر ان کو اپنی فطری شناخت مان لیں اور اس رنگ میں پوری طرح رنگ جائیں۔

آزادی کی جدوجہد کے دوران، ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں میں بہت سی تنظیموں اور جماعتوں نے جنم لیا جو نظری اور فکری طور پر ایک دوسرے سے مختلف تھیں مگر قومی وقار وقوت کے معاملہ میں ان کا ہدف ایک تھا اور وہ تھا ہندوستان کی آزادی اور خود مختاری۔ فرق صرف طریق کار کا تھا۔ ایک نرم دل تھا تو دوسرا گرم دل۔ ایک جمہوری تھا تو دوسرا فسطائی۔

آزادی کے بعد کم وبیش بیس سال (67-1947) تک ملک کے طول وعرض پر بلاشرکت غیرے کانگریس کی حکومت رہی پھر دھیرے دھیرے کانگریس کے سیاسی زور واثر میں کمی آنے لگی۔ اس کا تنظیمی ڈھانچہ کمزور ہونے لگا۔ اس کے بہت سے عناصر ٹوٹ ٹوٹ کر ریاستوں اور مرکز میں الگ الگ دھرے بنا کر کھڑے ہوگئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ریاستوں اور مرکز میں مختلف علاقائی پارٹیوں اور چھوٹی پارٹیوں کا دور شروع ہوا۔ اور ان کی ملی جلی سرکار بن کر سامنے آنے لگی۔ سیاسی عدم استحکام کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ چونکہ ان پارٹیوں کا جنم کانگریس کی کوکھ سے ہوا تھا اس لیے ان کی ظاہری شکل تو مختلف تھی لیکن ان کی سوچ اور ان کا طرز عمل یعنی ان کا Political culture بالکل کانگریس کی طرح تھا۔ اس لیے طرز حکمرانی میں کوئی جوہری فرق واقع نہیں ہوا۔ یہ ساری پارٹیاں سیکولرزم کی حامی اور اس کی دعویدار تھیں اور

بڑی حد تک مشترکہ قومیت میں یقین رکھتی تھیں کیونکہ ایسا کرنے سے ہندو اکثریت کے غلبہ اور اقتدار میں کہیں سے کوئی آنچ نہیں آتی تھی۔

آزادی کی جدوجہد کے دوران کانگریس کے جو چوٹی کے قائدین تھے وہ زیادہ تر جدید تعلیم سے آراستہ اور ان میں سے بیشتر کی تعلیم انگلینڈ اور امریکہ کی نامور یونیورسیٹیوں میں ہوئی تھی۔ لہٰذا وہ عالمی خیالات اور رجحانات سے اچھی طرح واقف تھے۔ ان کے اندر عصری آگہی کا شعور بدرجہ اتم تھا اور ان کا تاریخی شعور بھی بہت بالیدہ تھا۔ اس لیے وہ آزاد ہندوستان کی تزئین نو کرنا چاہتے تھے تاکہ ایک طرف ان کی قومی عظمت برقرار رہے اور دوسری طرف عالمی برادری میں ان کو وقار و استناد بلند ہو اور وہ ایسا کرنے میں بڑی حد تک کامیاب رہے۔ گاندھی اور نہرو بیسویں صدی کے عظیم ترین لیڈروں میں شمار کئے جاتے ہیں جن کی عظمت و مقبولیت آج بھی قائم ہے۔

انگریزوں کا پورا عہد حکومت Divide at empera کے اصول پر قائم تھا۔ یعنی پھوٹ ڈالو اور راج کرو۔ انگریزوں نے دراصل ہندوستان کی حکومت مسلمانوں سے چھینی تھی۔ اس لیے مسلمانوں کو انگریزوں سے فطری نفرت و دشمنی تھی۔ اس کی کاٹ کے لیے انگریزوں نے ہندوؤں کی طرف داری شروع کی اور مسلمانوں کے متعلق تاریخ کے جھوٹے سچے واقعات کو نمک مرچ لگا کر اس طرح پیش کیا تاکہ ہندوؤں میں مسلمانوں کے خلاف نفرت اور بدلے کی آگ بھڑکے اور ہندو جو گنتی میں زیادہ تھے وہ انگریزوں سے لڑنے کے بجائے مسلمانوں سے لڑنے میں مشغول ہو جائیں۔ اس طرح دو چوہوں کی جنگ میں بلی کو فائدہ پہنچے۔ انگریز سوچ سمجھ کر پوری فنی مہارت کے ساتھ ایسے تاریخ داں اور ماہرین سیاسیات کو بطور اتھارٹی سامنے لائے جو بظاہر دو دھڑوں میں تقسیم تھے مگر در پردہ انگریزی اقتدار کو مستحکم کرنے میں مصروف رہے۔

اس فکر کا اثر یہ ہوا کہ ہندوؤں کا ایک طبقہ جنگ آزادی میں حصہ لینے کے بجائے مسلمانوں سے جنگ کرنے میں مصروف ہو گیا اور اس نے مسلم دشمنی کو آزادی پر ترجیح دی۔ اس

کی رائے میں بھارت کو ہندوراشٹر بنانے کے لیے مسلمانوں کو پوری طرح زیر کرنا ضروری تھا۔ آزادی سے قبل یہ طبقہ آریہ سماج، ہندومہا سبھا اور راشٹریہ سیوم سیوک سنگھ کے نام سے سرگرم تھا۔ وہ کانگریس کی نرم روی اورمشترکہ قومیت کے نظریہ کا مخالف تھا اور بھارت کو خالص ہندوراشٹر کے طور پر دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ مسلمانوں کا یا تو شدھی کرن کرنا چاہتا تھا یا ان کو ملک سے نکال باہر کرنا چاہتا تھا یا پھر بغیر کسی شہری حقوق کے رہنے دینے کا قائل تھا۔ یہ اپنے نظریہ میں اتنا متشدد تھا کہ اس نے گاندھی جی کی جان لے لی۔

آر۔ایس۔ ایس نے جنگ آزادی میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ اس کا سارا زور ایک طرف ہندوراشٹر کا فروغ، ہندوسماج کی ثقافتی بے داری، ہندواتحاد و تنظیم پر تھا تو دوسری طرف مسلمانوں کے خلاف نفرت اور تشدد کے ماحول کی آبیاری پر تھا۔ وہ اپنی پہلی اسکیم میں ایندھن مسلمانوں کے خلاف جارحانہ رویہ سے حاصل کرتا تھا۔ یہ وہ داعیہ تھا جو ہندوؤں کو باہم جوڑنے میں بہت کارگر تھا۔ لہٰذا جیسے جیسے اس کے دائرۂ اثر میں اضافہ ہوتا چلا گیا، اسی قدر مسلمانوں کے خلاف معاندانہ ماحول کی آبیاری بھی ہوتی چلی گئی۔

آزادی کے بعد جواہرلعل کی جو پہلی کیبنیٹ تھی وہ دراصل ایک قومی کیبنیٹ تھی جس میں وہ لوگ بھی شامل کئے گئے تھے جو براہ راست کانگریسی نہیں تھے تاہم اپنے اپنے میدان میں خاص اہلیت رکھتے تھے جس کی وجہ سے انہیں کابینہ میں شامل کیا گیا تھا۔ جیسے ڈاکٹر امبیڈکر کانگریسی نہیں تھے مگر وزیر قانون بنائے گئے۔ ڈاکٹر شیام پرشاد مکھرجی جو ہندومہا سبھا سے تعلق رکھتے تھے ان کو وزیر صنعت بنایا گیا۔ ڈاکٹر شیام پرشاد مکھرجی نے ہی 1951 میں جن سنگھ کی بنیاد رکھی تھی جو رائٹ ونگ ہندو پارٹی مانی جاتی تھی۔ آرایس ایس نے آگے بڑھ کر اس کو اپنا پولیٹیکل ونگ بنالیا اور اس طرح جن سنگھ میں اپنے قائدین اور کارکنان کو شامل کر کے عملاً اس کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی۔

جب تک کانگریس کی قیادت مضبوط ہاتھوں میں رہی، جن سنگھ اور دیگر پارٹیاں انتخابات میں کوئی خاص نہیں کر پائیں۔ جواہرلعل کے انتقال کے بعد ملک کا سیاسی منظر نامہ

پوری طرح تبدیل ہوگیا۔ چین اور پاکستان کی جنگ کے نتیجے میں ملک میں قومیت کی جوئی لہر شروع ہوئی اس کے کندھے پر سوار ہوکر آر ایس ایس، ملک کے الیکٹوریٹ کے درمیان کچھ جگہ بنانے میں کامیاب ہوئی۔ لال بہادر شاستری نے اس طبقہ کو بڑھاوا دیا اور اس کے وقار واثر میں اضافہ ہونے لگا۔ تھوڑے وقفے کے بعد اقتدار اندرا گاندھی کے ہاتھ آیا تو انہوں نے کانگریس کو نئی زندگی اور نئی توانائی عطا کی۔

بنگلہ دیش کی فتح کے بعد اندرا گاندی چنڈی اور درگا بن گئیں۔ وہ شروع سے مطلق العنان تھیں، اس فتح نے ان کو اور بھی مطلق العنان بنا دیا۔ جے پرکاش نارائن کی قیادت میں ان کے خلاف جو آندولن شروع ہوا اس کے نتیجہ میں 1975 میں ملک میں داخلی ایمرجنسی لگادی گئی۔ سبھی سیاسی جماعتوں کے چھوٹے بڑے تمام رہنما گرفتار کر لیے گئے۔ بہت سی سماجی، مذہبی اور ثقافتی جماعتوں پر پابندی لگادی گئی۔ ایمرجنسی کی کالی رات کل ۱۹ر مہینے تک قائم رہی۔ عالمی برادری میں ہندوستان کی بڑی بدنامی ہوئی۔ بالآخر اندرا گاندھی نے ایمرجنسی اٹھالیا اور آناً فاناً نئے انتخابات کا اعلان کردیا۔ تمام اپوزیشن پارٹیاں جس میں دایاں اور بایاں محاذ شامل تھیں نے جنتا پارٹی کے نام سے نیا سیاسی پلیٹ فارم بنالیا اور الیکشن میں کانگریس کے خلاف صف آرا ہوگئیں۔ کانگریس کو کراری ہار ہوئی اور مرارجی کی قیادت میں پہلی غیر کانگریسی سرکار بنی۔

جنتا پارٹی کی شکل میں نیا سیاسی گٹھ جوڑ کوئی نظریاتی ہم آہنگی پر مبنی اتحاد نہیں تھا بلکہ کانگریسزم کا ایک ردعمل تھا۔ بہت جلد ہی شخصی اور نظری بنیادوں پر اس گٹھ جوڑ میں دراڑ پیدا ہونے لگی اور ملک میں سیاسی عدم استحکام کا دور شروع ہوگیا۔ سیاسی عدم استحکام نے ایک طرف عوام کے بھرم کو توڑ دیا تو دوسری طرف اس کا سب سے زیادہ فائدہ سنگھ اور اس کی حلیف جماعتوں کو ہوا۔

گاندھی جی کے قتل کے بعد سنگھ ہندوستان میں سیاسی اچھوت کی طرح تھا، جس سے لوگ ہاتھ ملانا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ جئے پرکاش نارائن جو ایک لمبے سیاسی بن باس کے بعد سرگرم سیاست میں لوٹے تھے اور جو نوجوانوں کے دلوں کی دھڑکن بن گئے تھے ان کو اندازہ

تھا کہ جس عوامی سیلاب کے سہارے وہ ملک میں سیاسی تبدیلی کا بگل بجارہے ہیں اس کی حیثیت سمندر کے جھاگ کی طرح ہے۔جب تک ان کے آندولن کا تنظیمی ڈھانچہ مضبوط نہیں ہوگا اور ایک مضبوط کیڈر اس کو نہیں ملے گا یہ تحریک پھیل سکتی ہے اور نہ زیادہ دنوں تک چل سکتی ہے۔ اس لیے انہوں نے آر ایس ایس کو اس آندولن میں شامل ہونے کے لیے کہا۔ آر ایس ایس اپنے سیاسی،سماجی بن باس کو ختم کرنے کے لیے ایسے کسی لمحے کی منتظر تھی۔آر اس اس نے فورا بڑھ کر اس آمنتر ن کو قبول کرلیا اور اس طرح ہندوستانی سماج وسیاست میں اس کی پروقار واپسی کی راہ ہموار ہوگئی۔

جنتا پارٹی میں آر ایس ایس نے اپنا پوراوزن مرارجی کے پلڑے میں ڈال دیا۔ جنتا پارٹی میں لیڈر شپ کی جواندرونی کش مکش شروع ہوئی ،اس وقت چودھری چرن سنگھ دوسرے خیمے کے قد آور لیڈر بن کر ابھرے،انہوں نے آر ایس ایس کا زور واثر کم کرنے کی غرض سے دوہری رکنیت کا مدا اٹھایا یعنی جولوگ جنتا پارٹی میں ہیں وہ کسی دوسری تنظیم کے ممبر نہیں ہوسکتے ہیں۔یہ کش مکش جب تیز ہوئی تو سنگھ پری وار سے منسلک تمام لیڈران جوکبھی جن سنگھ کے ساتھ تھے جنتا پارٹی سے نکل گئے اور انہوں نے بھارتیہ جنتا پارٹی کے نام سے ایک نئی سیاسی پارٹی بنالی۔جس دوران جنتا پارٹی کے تمام لیڈران جوتیوں میں دال بانٹنے میں مصروف تھے جن سنگھ اور آر ایس ایس سے وابستہ لیڈران سرکار میں اندرونی پیٹھ بنانے ،بیروکریسی میں اپنے اثرات پھیلانے ،میڈیا کوخود سے قریب کرنے کے لیے ایک خوشگوار ماحول بنانے اور اپنی شخصی شبیہ کوبہتر بنا کر پیش کرنے میں مصروف تھے۔چنانچہ جیسے ہی انھوں نے بھارتیہ جنتا پارٹی کا اعلان کیا ان کے تمام نئے اور پرانے کیڈر ایک ساتھ ہوگئے۔اس کے ساتھ بہت سے دوسرے افراد بھی ان کے ساتھ آگئے۔چنانچہ اب یہ پارٹی پہلے سے زیادہ مضبوط اوروسیع ہوکر ابھری۔

عوام نے جنتا پارٹی کی آپسی چپقلش سے مایوس ہوکر پھر سے اندرا گاندھی کو چن لیا۔ لیکن اس دوران بی جے پی مضبوط اپوزیشن بن کر ابھری۔گولڈن ٹیمپل پر حملے کے بعد سکھوں

میں زبردست ناراضگی پیدا ہوئی جس کے ردعمل کے طور پر اندرا گاندھی کے باڈی گارڈز نے ان کو مار ڈالا۔ راجیو گاندھی جو سیاست میں بالکل نئے تھے کے ہاتھ میں کانگریس کی کمان آئی ان کو ۱۹۸۴ کے انتخابات میں زبردست ہمدردی کے ووٹ ملے اور دو تہائی سے زائد یعنی 402 سیٹیں کانگریس کو ملیں۔ بی جے پی دو پر سمٹ گئی۔

اس دوران منیاکشی پورم (تمل ناڈو) میں تبدیل مذہب کا معاملہ اور پھر شاہ بانو معاملے کے بعد سنگھ پری وار نے جو ردعمل کی تحریک شروع کی اس نے ہندوؤں کو گول بند کرنے میں مدد کیا۔ 1984 کے بعد آر اس اس اور اس کی ذیلی تنظیموں، وشو ہندو پریشد اور بجرنگ دل نے منصوبہ بند ڈھنگ سے ایودھیا میں رام مندر کا مسئلہ اٹھایا۔ پہلے اس کی مذہبی اور سماجی سطح پر تشہیر کی گئی۔ پھر اس کو قانونی طور پر ہموار کرنے کی مہم چلائی گئی اور جب ان دونوں نے اس کو ایک عوامی مدا بنا دیا تو پھر اس کو سیاسی ایجنڈا بنا کر ایک زبردست سیاسی تحریک شروع ہوئی۔ اڈوانی جی کی قیادت میں سومناتھ سے ایودھیا تک کی رتھ یاترا کے ذریعہ عوامی بیداری کی ایک زبردست مہم کا آغاز کیا گیا جس کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ آزادی کے بعد یہ ملک کی سب سے بڑی عوامی تحریک تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ آزادی کی تحریک میں ملک کے تمام مذاہب کے لوگ شریک تھے جبکہ یہ خالص ہندو تحریک تھی۔

رام مندر تحریک نے نہ صرف سنگھ کے تمام سابقہ گناہوں کو دھل دیا، بلکہ اس کی زبردست مورل بوسٹنگ کی۔ یہ تحریک نہ صرف سیاسی سطح پر بلکہ سماجی سطح پر بھی صد فی صد کامیاب رہی۔ اس تحریک نے پہلی بار ہندوؤں کے تمام ورنوں اور ذاتوں کو ایک کر دیا اور ملک کی سیاست کے پورے Narrative کو تبدیل کر دیا۔ اس نے حکومت، سیاست، بیوروکریسی، پریس اور عدلیہ کے چہرے پر سیکولرزم کا جو ماسک لگا تھا اس کو اتار کر رکھ دیا اور اس کا اصلی چہرہ کھل کر سامنے آ گیا۔ یہ بات پوری طرح واضح ہو کر سامنے آ گئی کہ سیکولرزم بھی مسلمان اقلیت کی طرح کمزور اور منتشر ہے جب کہ ہندوتوا اپنے نئے اوتار میں یعنی A way of life اور Cultural Nationslism کی شکل میں Ruling philosophy بن کر براجمان ہو چکی ہے

چنانچہ اب یہ راشٹریہ سمبل ہے جس سے الگ ہوکر سوچنا یا کچھ کرنا راشٹریہ وردھ یا راشٹریہ دورہ مانا جانے لگا۔

وی پی سنگھ کے زوال کے بعد جو الیکشن ہوا اس نے ایک طرف جہاں راجیو گاندھی کی جان لے لی وہیں دوسری طرف پی بی نرسمہا راؤ کے ہاتھ میں کانگریس کی قیادت آئی۔ راؤ کے خمیر میں سنگھی تصورات شامل تھے لہٰذا انہوں نے رام مندر تحریک کو در پردہ سپورٹ کیا اور تمام سرکاری انتظامات کی زیرنگرانی ۶ ردسمبر ۱۹۹۲ء کو بابری مسجد ڈھا دی گئی۔ اس نے بی جے پی اقتدار کا راستہ صاف کردیا۔ چنانچہ اس کے بعد کے انتخابات میں بی جے پی سب سے بڑی سیاسی پارٹی بن کر ابھری۔

واضح اکثریت نہیں ہونے کے باوجود شنکر دیال شرما نے اٹل بہاری واجپئی جی کو حکومت سازی کی دعوت دی۔ مگر ایوان میں حمایت نہ ملنے کی وجہ سے محض تیرہ دنوں بعد انہیں استعفیٰ دینا پڑا۔ دوبارہ انتخاب کے نتائج بھی غیر واضح تھے۔ اس بار بھی بی جے پی سب سے بڑی پارٹی بن کر ابھری۔ مجبوراً تمام پارٹیوں نے چند متنازعہ چیزوں کو چھوڑ کر جس میں یونیفارم سول کوڈ، آرٹیکل 370 اور رام مندر شامل تھا ایک کومن مینیم پروگرام پر واجپئی کی قیادت میں پہلی بی جے پی حکومت ہی میں شامل ہوکر براہ راست سنگھ کو حکومت کرنے کا موقع دیا۔

سنگھ نے ڈائرکٹ اور ان ڈائرکٹ اپنے ایجنڈے کو آگے بڑھانے کی بھرپور کوشش کی۔ یہاں تک کہ دستور کے بنیادی ڈھانچہ کو بدلنا چاہا مگر چونکہ اس وقت اس کو از خود واضح اکثریت نہیں تھی اور اس وقت کے صدر جمہوریہ کے آر نارائنن نے ایسی کسی کوشش کو کامیاب نہیں ہونے دیا لہٰذا سپریم کورٹ نے ملک کے موجودہ سیاسی نظام اور دستور کے بنیادی ڈھانچہ میں کسی تبدیلی کے عمل پر پوری طرح روک لگا دی۔ اس کے بعد واجپئی صاحب نے صاف کہا کہ چونکہ انہیں ایوان میں واضح اکثریت حاصل نہیں ہے اس لیے وہ اپنے خوابوں کا ہندوستان بنا سکنے میں کامیاب نہیں ہو رہے ہیں۔ تاہم انہوں نے سنگھ بی جے پی اور اس کی ذیلی تنظیموں کو جن مضبوط بنیادوں پر کھڑا کر دیا تھا۔ ان کو یقین تھا کہ آئندہ آنے والے دن ان

کے لیے بہتر ہوں گے۔

بھارت دیہی ملک ہے۔ ملک کی ستر فیصد آبادی گاؤں میں رہتی ہے۔ ان ڈی اے حکومت کی اولین ترجیح شہر تھا کیونکہ ان کے ووٹر کا بڑا طبقہ شہری آبادی پر مشتمل تھا۔ لہذا واجپی حکومت کی شائننگ انڈیا کیمپین گاؤں کے ووٹر کو لبھانے میں ناکام رہی۔ ۲۰۰۴ کے انتخابات میں این ڈی اے اکثریت حاصل کرنے میں ناکام رہی اور پھر کانگریس کی قیادت میں یو پی اے کی حکومت بن گئی۔ یو پی اے I اور II نے منموہن سنگھ کی قیادت میں دس سال حکومت کی۔ یو پی اے II اسکیم اور اسکنڈل کے ساتھ ساتھ مہنگائی اور بیروزگاری کے باعث عوام کی حمایت کھو چکی تھی اس لیے جیسے انتخابات کا اعلان ہوا یہ واضح ہو گیا تھا کہ اب تیسری بار اس کی واپسی نہیں ہوگی۔

رام مندر کی تحریک نے بھارت میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں بے اعتمادی، نفرت اور تشدد کی ایک ایسی فضا پیدا کی جس کی وجہ سے ملک کے مختلف حصوں میں فرقہ وارانہ فساد پھوٹ پڑا۔ وقت کے ساتھ یہ لہر تیز ہوتی چلی گئی۔ بی جے پی نے اس صورت حال کا شدومد سے فائدہ اٹھایا اور وہ اس آگ کو اپنے تمام ذیلی تنظیموں کے ذریعہ بھڑکانے میں مشغول ہو گئی جس سے ملک میں خانہ جنگی جیسی صورتحال پیدا کردی۔ حکومت کی پوری مشنری بالخصوص سول ایڈمنسٹریشن اور پولس نے کھل کر رام مندر تحریک کی حمایت کی اور اس کے مخالفین کو ہراساں کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔

ہندوستان میں فرقہ وارانہ فسادات ایک حقیقت ہیں جو وقفے وقفے سے ملک کے کسی نہ کسی حصہ میں رونما ہوتے رہے ہیں۔ اس میں پولس اور مقامی انتظامیہ کی ملی بھگت فسادات کی تفتیش کرنے والی متعدد کمیٹیوں کے رپورٹوں اور میڈیا رپوٹس سے ثابت ہوتی ہیں۔ ان فسادات میں ۲۰۰۲ کا گجرات دنگا بالکل منفرد تھا۔ یہ ملک کا پہلا فساد تھا جو State sponsored تھا۔ اس فساد کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ اس نے نریندر مودی کو جو اس وقت گجرات کے وزیرِ اعلیٰ تھے نہ صرف گجرات میں ان کو پوری طرح مستحکم کر دیا بلکہ پورے ملک میں ان کو ہندو

ہر دیہ سمراٹ بنادیا۔ نریندر مودی نے نہایت ہوشیاری سے اپنی مقبولیت کو دوام اور وسعت عطا کرنے کے لیے وکاس کا مدا اٹھایا اور ملک کے سرمایہ داروں کی مدد سے اپنی ایک ایسی شبیہ بنانے میں کامیابی حاصل کر لی گویا ملک کا بھلا انہیں کے ہاتھوں ہوسکتا ہے۔ نریندر مودی کی بڑھتی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے سنگھ پریوار نے اپنا پورا وزن ان کے پلڑے میں ڈال دیا اور اپنے تمام سینیر لیڈروں کو دھکا دے کر قیادت کے منصب سے ہٹادیا اور نریندر مودی کے ہاتھ میں پارٹی کی کمان سونپ دی اور انہیں بی جے پی کا چہرہ بنایا اور وزیر اعظم کا امیدوار بنادیا۔ ان کی یہ ٹرک کامیاب رہی اور پہلی بار بی جے پی کو۲۰۱۴ میں ایوان میں واضح اکثریت حاصل ہوئی۔ ملک میں بظاہر ابھی بھی ان ڈی اے کی سرکار ہے مگر یہ ان ڈی اے واجپئی کے دور کی این ڈی اے نہیں جس میں حامی پارٹیوں کا زور واثر تھا۔ اس این ڈی اے میں جو پارٹیاں شامل ہیں وہ بی جے پی کے رحم وکرم پر ہیں۔ لہذا محض مال غنیمت میں حصہ دار ہونے کے لیے اس قافلہ میں شامل ہیں۔ چونکہ راجیہ سبھا میں بی جے پی کو اکثریت نہیں ہے اس لیے وہ ان پارٹیوں کو کچھ جوٹھن پھینک کر اپنے ساتھ رکھے ہوئے ہے۔

ایک وقت تھا کہ اندرا گاندھی کے بارے میں کہا جاتا تھا اندرا از انڈیا اور انڈیا از اندرا۔ یعنی پورا ملک ایک لیڈر کی ذات میں سمٹ گیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک میں ایمرجنسی نافذ ہوئی اور ملک بدترین آمریت کے دور سے گذرا۔ یہ دوسرا وقت ہے کہ ایک لیڈر اور سنگھ کو پورا ملک مان لیا گیا ہے اور اس کی رائے سے اختلاف ملک دشمنی مانا جاتا ہے۔ اب ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قوم پرستی فسطائیت کا جامہ پہن کر پھر ایک بار ملک میں ڈکٹیٹر شپ کے نفاذ کی طرف بڑھ رہی ہے۔ غنیمت ہے کہ ملک کی چند ریاستوں میں غیر بی جے پی حکومتیں ہیں۔ راجیہ سبھا میں بی جے پی کو اکثریت حاصل نہیں ہے اور عدالت عظمیٰ اور پرنٹ اور الیکٹرونک میڈیا کے ایک دھڑے نے تمام جوکھم مول لے کر دستوری اور جمہوری قدروں کی پاسداری کا سلسلہ جاری رکھا ہے۔

بی جے پی اور نریندر مودی کے لیے اچھی بات یہ ہے کہ اپوزیشن میں کوئی قد آور

لیڈر نہیں ہے۔ اپوزیشن جماعتیں بہت کمزور ہیں۔ کمیونسٹ پارٹیاں اپنی نظریاتی اساس کھوچکی ہیں۔ علاقائی پارٹیوں کا دائرہ اثر اپنی ریاست سے باہر نہیں ہے۔ ان کے درمیان باہمی اتحاد نہیں ہے۔ ممتابنرجی، نتیش کماراور اروند کجریوال جونریندرمودی کوشخصی حیثیت میں چیلنج کرنے کا دم خم رکھتے ہیں ان کے پاس نہ تو مضبوط سنگھٹن ہے نہ اتنا پیسہ ہے اور نہ اتنا بڑا کیڈر ہے۔ نتیش کمار نے ہار مان کر بی جے پی سے مفاہمت کر لی ہے۔ راہل گاندھی نریندرمودی کا مقابلہ کرنے کی کوشش کرر ہے ہیں۔ اس پس منظر میں نریندر مودی کوواک اوور ملا ہوا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ نریندرمودی معاشی فرنٹ پر کیا کمال دکھاپاتے ہیں۔ انہوں نے جو بڑے بڑے دعویٰ اور خواب دکھائے تھے ان کو پورا کرنے میں ناکام ہیں۔ ممکن ہے آئندہ الیکشن میں عوام انڈیا شائننگ کی طرح ان کو بھی گھر کا راستہ دکھادے اور پھر یہ گجرات الٹے پاؤں واپس لوٹ جائیں۔[1] تاہم آزادی کے بعد ریاست کا جوکردار ابھر کر سامنے آیا ہے اور حالات جس رخ پر جارہے ہیں ملک کا خدو خال تو دستوری طور پر سیکولر اور جمہوری ہی رہے گا مگر عملاً Inclusive Democraey کی جگہ Majoritarian democrcy ہی ہوگی اور ریاست کا کردار فسطائی ہوگا۔

اکیسویں صدی میں ہندو دایاں محاذ کے انتہا پسند مفکرین نے سوسال پہلے جوخواب دیکھے تھے اور بھارت کی تعمیرنو اورنویافت کا جوتصور پیش کیا تھا۔ شاید ان کے خیال میں اب اس کے نفاذ کا مناسب وقت آ گیا ہے اور ہندوستان اسی جانب رواں دواں ہے۔

اوپر کے صفحات میں مَیں نے جامعیت کے ساتھ آزادی کے بعد ہندوستان کے بدلتے سیاسی منظر نامہ کا ایک مختصر جائزہ پیش کیا ہے، جس سے ایک چیز واضح ہے کہ آزادی کے بعد ہندوستان کی دریاؤں میں بہت سا پانی بہہ چکا ہے اور ملک کے سیاسی منظر نامے میں بڑی

(۱) یہ تحریر 2019 کے الیکشن سے پہلے کی ہے۔ 2019 کے الیکشن میں بی جے پی کی بہت مضبوط واپسی ہوئی ہے اس نے ملک کے سیاسی منظر نامے کو پوری طرح بدل دیا ہے۔ لہٰذا نئے سیاسی حالات پر پوری سنجیدگی کے ساتھ نئے سرے سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔

بڑی تبدیلیاں دیکھنے کو مل رہی ہیں لیکن مسلمان قوم جس مقام پر آزادی کے بعد 1947 میں کھڑی تھی اس میں 70 سال کے بعد بھی کوئی نمایاں تبدیلی رونما نہیں ہوئی ہے بلکہ اب تک کی گئی تمام تدابیر کسی نہ کسی طور پر بے سود ثابت ہوئی ہیں۔ سوچنا یہ ہے کہ کیا 21 ویں صدی بھی سابقہ صدیوں کی طرح محرومی اور ناکامی کی صدی بنی رہے گی یا ہم تقدیر کی گرہ کو تدبیر کے ناخن سے کھول پانے میں کامیاب ہوں گے؟

آگے بڑھنے سے قبل یہ جاننا ضروری ہے کہ ہمارے بڑے اور مہماتی مسائل کیا ہیں اور ہمارے قائدین اور اکابرین نے اس سلسلے میں کیا رہنمائی کی ہے۔؟ دوسرا آج ہم کہاں اور کس مقام پر کھڑے ہیں؟ تیسرا اور سب سے اہم سوال یہ ہے کہ ہمیں آگے کیا کرنا ہے؟

میرا خیال ہے کہ ہمیں پورے سماجی اور تاریخی شعور کے ساتھ حال اور مستقبل، وقتی اور طویل مدتی ہر دو زاویہ سے عصری سیاست کو معروضی انداز سے جاننے اور سمجھنے کی ضرورت ہے عہد اور ماحول کو اچھی طرح سمجھ کر ہی ہم اپنا لائحہ عمل طے کر سکتے ہیں۔ جوش بلا ہوش حد درجہ خطرناک ہوگا جس سے بچنے کی ضرورت ہے۔ ساتھ ہی موجودہ خوف کی نفسیات کو طلاق مغلظہ دے کر ہمیشہ کے لیے اپنے دل سے باہر نکال پھینکنا ہوگا کیونکہ جو ڈر گیا وہ مر گیا۔ جو ٹوٹ گیا وہ ٹوٹ گیا ٹوٹے کا مسیحا کوئی نہیں۔ انگریزی کی ایک مشہور کہاوت ہے دنیا ہمت ور لوگوں کی میراث ہے (World belongs to those who dare) اس لیے کٹتے بھی چلو بڑھتے بھی چلو، ہیں سر بھی بہت اور دھڑ بھی بہت۔ اس ملک میں ہماری تعداد اتنی ہے جتنی دنیا میں کہیں نہیں ہے، اس لیے کوئی ہمیں طبعی طور پر ختم Physically annihilate نہیں کر سکتا ہے۔ اس لیے بے جا خوف کی نفسیات سے باہر نکلنا اور پر اعتماد پیش قدمی کرنا اس کی پہلی شرط ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ شخصی اور مقامی طور پر ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا ہے یا ہم ایسے کسی واقعہ کی سنگینی کو کم کر کے دیکھتے ہیں یا لوگوں کے دکھوں اور تکلیفوں کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اس کا مطلب صرف اتنا ہے کہ سو اور ہزار لوگوں کو مار دینے سے پوری قوم نہیں مر جائے گی۔ اس لیے ڈر ڈر کر جینا چھوڑ دیں۔ ہمیں نہ Aggressive ہونے کی ضرورت ہے نہ Defensive

ہونے کی بلکہ ہمیں Assertive اور Pro-active ہوکر سماج اور سیاست میں اپنے نئے رول کو تلاش کرنا ہے۔

ہمارے اہم ترین مسائل

اس تمہید کے بعد آیئے ہم ان مسائل کو جاننے اور سمجھنے کی کوشش کریں جن کا سامنا ہم پچھلی سات دہائیوں سے کر رہے ہیں۔

(۱) ہمہ گیر خوف اور عدم تحفظ:

ہندوستان اسلام کا دوسرا گھر ہے۔ مسلمان اس ملک میں پہلی صدی ہجری سے رہتے آرہے ہیں۔ قریب ساڑھے چھ سو سالوں تک ہندوستان کے شمال اور جنوب، مغرب و مشرق میں مختلف مسلمان خاندانوں کی حکومتیں رہی ہیں جس میں اچھے حکمراں بھی ہوئے اور برے بھی۔ ابتداً عرب، ایران، ترکستان، افغانستان اور وسط ایشیا سے ہزاروں خاندان ہجرت کر کے ہندوستان آئے اور یہیں بس گئے مگر ہندوستانی مسلمانوں کی 99% فیصد آبادی مقامی نژاد لوگوں کی ہے جو اپنی جڑوں کے ساتھ خالص ہندوستانی ہیں فرق صرف اتنا ہے کہ انہوں نے اپنا آبائی عقیدہ چھوڑ کر اسلامی توحید کو اپنالیا۔ وہ اپنے لباس پوشاک، رنگ روپ، کھان پان، رسم و رواج رہن سہن اور دیگر تمام چیزوں میں خالص ہندوستانی ہیں۔ دنیا بھر کے مسلمان او ر ہندوستانی مسلمانوں میں توحید، رسالت، آخرت اور قرآن پر ایمان کے علاوہ باقی کسی چیز میں اشتراک نہیں ہے۔

اسلام عالمی دین ہے اور مسلمان دنیا کے تمام ملکوں میں پائے جاتے ہیں۔ کہیں یہ اکثریت میں ہیں اور کہیں اقلیت میں۔ خطہ عرب کے علاوہ جتنی مضبوط اسلامی روایتیں ہندوستان میں پائی جاتی ہیں او ر اسلامی تہذیب کے جتنے روشن نشانات ہندوستان میں موجود ہیں، دنیا کے کسی ملک میں نہیں ہیں۔ بلکہ بعض نام نہاد مسلم ملکوں میں بھی ایسی مضبوط روایات اور آثار نہیں پائے جاتے جتنا ہندوستان میں ہیں۔ مکہ، مدینہ اور بیت المقدس کے علاوہ

ہندوستان میں تقدس کی وہ تمام علامتیں موجود ہیں جو اس ملک کو ارض مقدس بناتا ہے۔ جس پر اسلامیان ہند کو بجا طور پر فخر ہے۔

آپ مسلم عہد حکومت بالخصوص مغلیہ سلطنت کی جتنی برائی کر لیں آپ ان کے اس احسان سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے کہ انہوں نے بڑی سرفروشی اور جانثاری نیز حکمت و تدبر اور بہادری سے کام لے کر پورے ملک کو جغرافیائی وحدت میں باندھے رکھا، جس کو انگریزوں نے اور مضبوط و مستحکم کیا۔ ملک سردار پٹیل کو ایک محسن اور مرد آہن مانتا ہے کیونکہ انہوں نے آزادی کے وقت 555 رجواڑوں جن کو برٹش سرکا نے یہ اوپشن دیا تھا کہ وہ چاہیں تو آزاد رہیں یا بھارت کے ساتھ الحاق کر لیں۔ سردار پٹیل نے یہ اوپشن ختم کر دیا اور تمام رجواڑوں کو ملک کی سیاسی وحدت میں ضم ہونے کی دعوت دی۔ جنہوں نے از خود الحاق گوارہ نہیں کیا ان کو پولس ایکشن کے ذریعہ الحاق کرایا گیا اس طرح ایک ملک کے اندر کئی ممالک کے امکان کو ختم کر دیا گیا۔

مسلمان جس ملک میں ہزار برس سے اوپر اس طرح رہتے بستے رہے ہوں کہ مسلمانوں کے بغیر ہندوستان کا کوئی تصور نہیں کیا جا سکتا ہے یکا یک وہ اس ملک میں اجنبی، پردیسی اور پرواسی سمجھے جائیں گے اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا ہے۔ دراصل 19 ویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے نصف کے درمیان ملک کی آزادی کی جو تحریک چلی وہ بہت جلد ہندو مسلم کش مکش میں تبدیل ہو گئی۔ انگریزوں نے دہلی، اودھ، بنگال اور دکن کی حکومت مسلمانوں سے چھینی تھی جبکہ مراٹھوارہ اور پنجاب کی حکومت مراٹھوں اور سکھوں سے چھینی تھی۔ 1757 سے لے کر 1857 تک انگریزوں کے خلاف جتنی بھی فوجی مہمات ہوئیں ان میں انگریز اپنی فوجی مہارت، تکنیکی برتری، بہتر وسائل اور بہتر انتظامی صلاحیت کے سبب تمام معرکوں میں کامیاب ہوئے اور وقت کے ساتھ ان کی حکومت مستحکم ہوتی چلی گئی۔ 1857 کی ناکام بغاوت نے یہ ثابت کر دیا کہ انگریزوں کو فوجی مہم میں مات نہیں دی جا سکتی ہے۔

1857 کے بعد لوگوں نے محسوس کیا کہ انگریزوں کو بھگانے کے لیے عوام کی شرکت ضروری ہے۔ لہٰذا ملک میں نئی تعلیم، سماجی اصلاح اور ملک کے تہذیبی اتحاد پر زور دیا گیا۔ وقت

کے ساتھ یہ تحریک جیسے جیسے مضبوط ہوتی گئی تعلیم یافتہ نوجوانوں کا ایک بڑا طبقہ ملک کی آزادی کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس میں ہندو، مسلمان، سکھ، پارسی اور عیسائی سبھی طبقہ کے لوگ تھے۔ اس وقت انگریزوں نے نہایت ہوشیاری سے پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو کی تکنیک اپنائی اور ہندو اور مسلمان لیڈروں کے درمیان ایک دوسرے کے خلاف منافرت اور بدگمانی کے بیج ڈالنے شروع کیے۔ ان کی یہ حکمت عملی کامیاب ثابت ہوئی۔ جیسے جیسے آزادی کی تحریک زور پکڑنے لگی ان کے درمیان آپسی نفرت اور عداوت بھی اسی درجہ بڑھنے لگی۔ یہاں تک کہ جب ملک میں آزادی کی تحریک کامیاب ہوئی تو یہ کھائی اتنی بڑھ چکی تھی کہ ان کو کسی طرح پاٹنا ممکن نہیں ہوا۔ ملک آزاد ہونے کے ساتھ دوحصوں میں بٹ گیا۔ مسلم اکثریتی علاقہ پاکستان کہلایا اور ہندو اکثریتی حصہ ہندوستان کے طور پر تسلیم کیا گیا۔ یہ بات طے پائی کہ جو جہاں ہے وہیں رہے گا۔ مگر بہت جلد بنگال اور پنجاب میں خون کی ہولی کھیلی جانے لگی۔ پاکستان سے ہندوؤں اور سکھوں کو اور ہندوستان سے مسلمانوں کو نکال باہر کرنے کی سازش رچی گئی۔ لاکھوں انسانوں کا خون بہا، کروڑوں لوگ بے گھر بار ہوگئے۔ یہ زخم اتنا گہرا تھا کہ ۷۰؍ برس کے بعد بھی پوری طرح نہیں بھرا ہے اور جب کبھی بھی کوئی ناآشنائے مزاج غم ٹھیس لگا دیتا ہے تو اس میں ٹیس اٹھتی ہے۔

آزادی کی سات دہائیاں بیت چکی ہیں۔ فرقہ وارانہ فسادات ہندوستانی مسلمانوں کا مقدر بن چکے ہیں۔ ہر تھوڑے تھوڑے وقفے پر ملک کے کسی نہ کسی حصہ میں کوئی بڑا فساد پھوٹ پڑتا ہے جو پوری قوم کے اندر خوف سرائت کر دیتا ہے اور پوری قوم خوف، عدم تحفظ اور نفسیاتی عدم استحکام میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ آزادی کے بعد پیدا شدہ حالات اور تسلسل کے ساتھ ہونے والے فرقہ ورانہ فسادات نے پوری قوم کو اندر تک ہلا دیا ہے۔ جیسے کوئی سیلاب بلا کسی تناور درخت کی جڑوں کی تمام مٹی بہالے گیا ہے اور پورا پیڑ اپنی جڑوں سمیت کچھ کمزور اور موہوم سہارے سے ٹیک لگا کر کھڑا ہے۔ یا پھر کسی زوردار زلزلہ نے ایک مضبوط پہاڑی چٹان کو دونیم کر دیا ہے جو کسی وقت بھی نیچے گر سکتا ہے۔

یہ خوف اور عدم تحفظ کا احساس صرف جان و مال کی زیاں تک محدود نہیں ہے بلکہ اس نے قوم کے اندر سے خوداعتمادی اور قوت ارادی بھی چھین لی ہے جوان کی تعلیمی اور معاشی پسماندگی کی بڑی وجہ ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ غربت و جہالت نے مسلمان بستیوں میں ڈیرہ ڈال دیا ہے۔ بچے آوارہ اور بیکار نوجوانوں کی بڑی فوج ہر جگہ نظر آتی ہے۔ بیماری، گندگی، افلاس منشیات اور جرائم قوم کی پہچان بن گئے ہیں۔ کہنے کو بیس کروڑ کی بڑی آبادی ہے مگر یہ حرماں نصیبوں کا قافلہ نظر آتا ہے جس کو رہبر و رہزن دنوں نے مل کر لوٹا ہے اور مزید شب خون مارنے کی تیاری چل رہی ہے۔ قوم کو صبح و شام مسلسل دہشت زدہ رکھنے کی سازش رچی جارہی ہے۔

بھارت کا دستور سیکولر ہے اور اس نے تمام شہریوں کو یکساں حقوق واختیارات دے رکھے ہیں۔ تمام لسانی مذہبی، ثقافتی اور نسلی اقلیتوں کو ان کی زبان، تہذیب، عقائد، تعلیمی و مذہبی ادارے کو پورا دستوری تحفظ حاصل ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ حکومت کسی مذہب اور مذہبی گروہ کی اندرونی آزادی پر قدغن نہیں لگائے گی، اس میں مداخلت نہیں کرے گی اور اس کو پورا تحفظ دے گی۔ کوئی اس پر حملہ کرے تو نہ صرف اس کا دفاع کرے گی بلکہ ایسے عناصر کی ازروئے قانون سرزنش بھی کرے گی تاکہ مذہبی اقلیتوں کی دینی، ثقافتی اور لسانی آزادی پر کوئی آنچ نہ آئے۔ لیکن جب حکومت ہی نت نئی سازشوں کے ذریعہ ان حقوق اور آزادیوں پر قدغن لگانے کے درپے ہو پھر ان کا تحفظ کیسے ہوسکتا ہے؟

دستور ہند کے سیکولر ہونے کے باوجود یہ افسوسناک حقیقت ہے کہ حکمراں، سیاسی پارٹیاں۔ بیوروکریسی، پریس، یہاں تک کہ امن وقانون اور انصاف قائم کرنے والے ادارے سیکولر نہیں ہیں بلکہ فرقہ پرستی، مسلمانوں کے خلاف تعصب وتنگ نظری ان کی رگوں میں خون بن کر گردش کررہی ہے۔ جیسے ہی کوئی موقع ہوتا ہے وہ اپنی کیچلی اتار کر سامنے آجاتے ہیں۔ پبلک لائف میں ایسے لوگ انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں جو اس کمیونل وائرس سے بچے ہوں۔

مسلمانوں میں عدم تحفظ کے احساس کو Institutionalise کرنے کے لیے نت

نئے شوشے چھوڑے جاتے ہیں اور مسلسل دباؤ میں رکھنے کی سیاست پوری فن کاری کے ساتھ کی جارہی ہے۔ آزادی کے فوراً بعد ذرا ٹھیک سے ابھی سنبھل بھی نہیں پائے تھے کہ اردو زبان کو مسلمانوں کی زبان قرار دے کر یوپی اور مدھیہ پردیش میں ابتدائی اور ثانوی درجات میں اسکولی نصاب سے خارج کر دیا گیا۔ سوال تھا کہ لوگ جان بچائیں کہ زبان بچائیں۔ لوگوں نے اس زخم کو بھی جیسے تیسے سہ لیا۔

ہندوستان میں مسلم باقیات میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ایک ایسا ادارہ ہے جس سے مسلمانوں کی گہری جذباتی وابستگی ہے۔ اسے 1875 میں سرسید نے مسلمانوں میں جدید تعلیم کو عام کرنے کی غرض سے کھولا تھا جس کو 1920 میں اس برٹش حکومت نے یونیورسٹی کا درجہ دیا اور تب سے یہ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس ادارے میں صرف مسلمانوں کی تعلیم نہیں ہوتی ہے بلکہ اس کے دروازے تمام قوموں اور برادریوں کے لیے کھلے ہوئے ہیں۔ اول دن سے وہاں تمام طبقات کے لوگ بلالحاظ مذہب وملت تعلیم حاصل کرتے آرہے ہیں۔ مگر یہ ادارہ بنیادی طور پر مسلمانوں کا اور مسلمانوں کے لیے کھولا گیا تھا جس کو مسلم اقلیتی ادارے کی حیثیت حاصل تھی۔ مگر 1966 میں اندرا گاندھی کی کانگریسی حکومت نے اس سے اس کا اقلیتی کردار چھین لیا۔ دلچسپ یہ ہے کہ سپریم کورٹ نے بھی اس پر مہر لگادی۔ آزادی کے فوراً بعد سے ہی ہندوفرقہ پرستوں کا ایک گروہ علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کو بند کرنے کے درپے تھا۔ اس کی رائے میں یہ ادارہ مسلم علیحدگی پسندی کا مرکز ہے اور ملک کی تقسیم کا ذمہ دار ہے۔ مسلم فرقہ پرستوں کا اڈہ ہے اس لیے اس کو یا تو بند کر دینا چاہیے یا اس کے اقلیتی کردار کو ختم کر کے ایک عام یونیورسٹی بنا دینی چاہیے۔ اس کی اسلامی اور ملی خصوصیات کو پوری طرح ختم کر دینا چاہیے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ایسے تمام موقعوں پر سیکولر اور فرقہ پرست ہم رنگ اور ہم زبان نظر آتے ہیں۔ صرف بات کرنے کا طریقہ اور دلائل ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ ملت نے یہ زخم بھی سہہ لیا اور دونوں مجروح عناصر کو اپنے ناتواں کندھوں پر اٹھالیا۔

ابھی چند قدم بھی نہیں چلے تھے کہ مسلم پرسنل لاء کو ختم کرنے کی مانگ اٹھنے لگی۔

جب 1870 میں انگریز حکومت کو دیوانی سونپی جارہی تھی اس وقت شاہ عالم ثانی اور کمپنی سرکار کے مابین یہ معاہدہ ہوا کہ مسلمانوں کے عائلی معاملات ان کے پرسنل لاء کے مطابق حل ہوں گے جس کے تحت 1937 میں شریعت ایکٹ پاس ہوا اور اسی ایکٹ کے تحت مسلمانوں کے عائلی معاملات کے فیصلے عدالتوں کے ذریعے ہوتے تھے۔ آزاد بھارت کا جب دستور بنا تو اس میں شہریوں کو جو بنیادی حقوق دیئے گئے اس میں عقیدہ، مذہب، عبادت اور نجی اور عائلی معاملات میں اپنے مذہبی روایات کی اجازت دی گئی اور حکومت نے اس کے تحفظ کا ذمہ بھی لیا۔ عائلی قانون کے تحت نکاح، طلاق، وصیت، وراثت اور وقف کے متعلق معاملات آتے ہیں۔ اس میں دو رائے نہیں ہے کہ انگریزوں کے ذریعہ پاس کردہ شریعت ایکٹ میں کئی خامیاں تھیں۔ مسلمانوں میں پھیلی بعض غلط سماجی رسموں کی وجہ سے بھی کئی مسائل پیدا ہوگئے ہیں جن کی اصلاح شریعت کی صحیح تفہیم اور نفاذ کے ذریعہ ہوسکتی ہے۔ مگر اس کی بنیاد پر پوری شریعت کو یعنی مسلم پرسنل لاء کو ختم کرنا گویا ہندوستان میں مسلمانوں کی عملی مذہبی آزادی اور شناخت کو ختم کرنا ہے۔ مسلمان اس کی سختی سے مخالفت کررہے ہیں۔ مگر ان پر مسلسل دباؤ بنایا جارہا ہے۔ مسئلہ اس وقت پیچیدہ اور سنگین ہوجاتا ہے جب عدالتیں براہ راست یا بالواسطہ مداخلت کے ذریعہ شریعت کو کالعدم کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ اس صورت حال نے مسلمانوں کو اپنے مذہبی تحفظات کے تئیں سخت تشویش میں مبتلا کررکھا ہے اور وہ اس کو جان ومال سے زیادہ بڑا خطرہ محسوس کرتے ہیں۔

دراصل بات یہ ہے کہ رہنما اصول کی دفعہ 44 میں یکساں سول کوڈ کی بات کہی گئی ہے جو ایک مشاورتی کلوز ہے۔ جس کو بنیادی حقوق کے علی الرغم جبراً مسلط نہیں کیا جاسکتا ہے۔ بات یہ ہے کہ جب 1956 میں ہندوؤں کے عائلی قوانین میں ترمیم اور تبدیلی کرکے ہندو کوڈ بل پاس ہوا اس وقت ہندوؤں کے ایک گروہ نے یہ کہنا شروع کیا کہ جب ہندوؤں کے عائلی قوانین میں تبدیلی کی جاسکتی ہے تو مسلمانوں کے عائلی قوانین میں کیوں نہیں؟ جبکہ یہ مسئلہ ہندو اور مسلمان کا نہیں تھا۔ کسی مسلمان نے یہ مطالبہ نہیں کیا تھا کہ ہندوؤں کا عائلی قانون بدل دیا

جائے۔ ہندوؤں نے اپنی آزادانہ مرضی سے یہ فیصلہ کیا تھا۔ لہٰذا اس کو ہندو مسلم مسئلہ بنانے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ ادھر طلاق، وراثت کفالت، اور شہادت کے سلسلے میں کئی معاملات سامنے آئے ہیں جس میں عام رائے یہ بنی ہے کہ مسلمان عورتوں کے ساتھ ظلم ہو رہا ہے لہٰذا جنسی انصاف کے نقطۂ نظر سے اس میں اصلاح ہونی چاہیے، بیشتر معاملات میں یہ واقعات اسلامی شریعت سے ناواقفیت یا غلط نفاذ کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں۔ مسلم سماج میں بعض غلط رسوم رائج ہیں جو اسلامی شریعت سے متغائر ہیں جن کی وجہ سے بظاہر ناانصافی کا امکان پیدا ہوتا ہے جن کی اصلاح کی ضرورت ہے۔ مگر کسی کی انگلی میں زخم ہو تو اس سے چھٹکارے کے لیے ہاتھ کاٹنے کی صلاح نہیں دی جاسکتی ہے۔

حال کے دنوں میں یہ مانگ زوروں سے اٹھائی جارہی ہے کہ پورے ملک میں یکساں سول کوڈ نافذ کر دیا جائے۔ اس کے لیے لاء کمیشن نے سوال نامہ تیار کیا ہے اور اندرون خانہ سنگھ پریوار کی مدد سے ایک مسودہ بھی تیار کیا جارہا ہے۔ 21 ویں لاء کمیشن نے جو جسٹس بی ایس چوہان کی قیادت میں بنایا گیا تھا اپنے مدت کار کے آخری دن 185 صفحہ پر مشتمل اپنی رپورٹ میں واضح الفاظ میں کہا ہے کہ یکساں سول کوڈ موجودہ حالات میں نہ پسندیدہ ہے اور نہ لازمی۔ ظاہر سی بات ہے یہ عمل دستور میں دی گئی مذہبی آزادی کے خلاف ہے اور اگر اس کو تسلیم کر لیا گیا تو مسلمانوں کی علیحدہ مذہبی، ثقافتی شناخت ختم ہو جائے گی۔ پھر ہندوستان اور چین میں زیادہ فرق نہیں رہ جائے گا جہاں عقیدے کی آزادی تو ہے مگر اس پر عمل کی آزادی نہیں ہے وہاں آپ نہ حلال چیزوں کا استعمال کر سکتے ہیں اور نہ حرام چیزوں سے بچ سکتے ہیں۔ اس طرح در پردہ یہ بھارت میں اسلامی شناخت کو ختم کرنے کی سازش ہے۔ لہٰذا مسلمان اس کو کبھی قبول نہیں کر سکتے ہیں۔ پرسنل لاء پر حملہ نے مسلمانوں کو اندر سے ہلا دیا ہے اور اب ان کو یہ نظر آرہا ہے کہ واقعی اسلام خطرے میں ہے۔ یہ تیسرا بڑا زخم ہے جو ہندوستان میں مسلمانوں کے وجود میں اندر تک پھیل کر ان کی ناگہانی موت کا انتباہ دے رہا ہے۔

ابھی مسلمان اپنے تیسرے زخم سے بہتے خون کو چاٹ کر اس کے درد کو کم کرنا چاہتے

تھے کہ ہندوجنونیوں کا ایک گروہ اٹھا اوراس نے تمام سرکاری انتظامات کی جلو میں چار سو سال پرانی مسجد کو متنازعہ بنا کر ڈھادیا اور وہ اس جگہ پر رام مندر بنانے کا منصوبہ بنارہے ہیں۔ ملک کی پارلیمنٹ اور عدالت نہ صرف خاموش ہے بلکہ خاموشی سے اس کی حمائت کررہی ہے۔ لوگ تین ہزار مساجد اور مقابر کی فہرست لے کر گھوم رہے ہیں جن کو ڈھانے کی تیاری ہے۔ یہ اس بات کا اعلان ہے کہ بھارت میں ہندوراج استھاپت ہو چکا ہے۔ اگلے زمانوں میں جب کوئی راجہ کسی ملک یا علاقے کو فتح کرتا تھا تو قتل عام کر کے، عورتوں کی عزت لوٹ کر، کھیتیاں اور باغات تاراج کر کے، عزت داروں کو ذلیل کر کے اوران کے مذہبی مقامات کے تقدس کو پامال کر کے اپنی فتح کا اعلان کرتا تھا۔ آج کم وبیش یہی صورتحال ہندوستان میں دیکھنے کومل رہی ہے۔ بابری مسجد کا انہدام صرف ایک مسجد کا انہدام نہیں ہے بلکہ بھارت میں سیکولرزم، ڈیموکریسی اور قانون کی حکمرانی کا انہدام ہے۔ اس صورت میں ایک کمزور اقلیت کہاں جائے اور کس سے گہار لگائے۔

بنے ہیں اہل ہوس مدعی بھی منصف بھی
کسے وکیل کریں کس سے منصفی چاہیں؟

یہ وہ ہمہ گیر خوف کا ماحول ہے جس نے فرد سے لے کر پوری ملت کو اپنی گرفت میں لے لیا ہے۔ ادھر افغانستان، عراق، لیبیا، شام اور یمن میں بین الاقوامی سازشوں اور مداخلتوں کے نتیجے میں مشرق وسطی اور دیگر مسلم ملکوں میں طوائف الملوکی اور خانہ جنگی کا جو دور شروع ہوا ہے، اس کی وجہ سے خود ان ملکوں میں اور دنیا کے دیگر ممالک میں دہشت گردانہ واقعات میں تیزی سے اضافہ ہوا ہے اور یوروپ اور امریکہ کے کئی ممالک میں دہشت گردانہ حملے ہورہے ہیں۔ یہ کون کررہا ہے اور کون کرار ہا ہے اس پر وثوق کے ساتھ کچھ کہنا مشکل ہے؟ لیکن دنیا کے مختلف ممالک اور عالمی میڈیا اس میں کچھ مسلمان تنظیموں اور گروہوں کو ذمہ دار بتاتے ہیں اور اسے بڑی ہوشیاری سے اسلامی دہشت گردی کا نام دے دیا گیا ہے دراصل اسلامی دہشت گردی کہہ کر وہ ایک تیر سے دوشکار کرنا چاہتے ہیں۔ ایک تو اپنی مجرمانہ سازشوں پر پردہ ڈالنا

چاہتے ہیں اور دوسرے اسلام کو بدنام کر کے تمام اسلام دشمن قوتوں کو یکجا کر کے مسلمان ممالک کے ذرائع وسائل اور ان کی زمینوں پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔

ہندوستان بڑا ملک ہے اور اس ملک میں کئی عسکری پسند گروہ ہیں جو خوں ریزی اور تشدد میں یقین رکھتے ہیں۔لہٰذا ملک کے کسی نہ کسی حصے میں آئے دن تشدد آمیز اور دہشت گردانہ واقعات ہوتے رہتے ہیں۔نکسلی ،خالصتانی، بوڈو لبریشن آرمی،اُلفا،اندرون ملک رنویر سینا،سن لائٹ سینا اور اس قبیل کی سینکروں چھوٹی بڑی تنظیمیں ہیں جو تشدد میں یقین رکھتی ہیں اور جا بجا پولس،فوج اور سیویلین آبادی کو نشانہ بناتی رہتی ہیں۔

پاکستان اور چین سرحد پار سے لگا تار ملک میں انتشار پھیلانے کے درپے رہتے ہیں۔پاکستان کشمیر اور ملک کے دیگر سرحدی حصوں میں دراندازی کے ذریعہ اپنے ٹرینڈ لوگوں کو بھارت میں دہشت گردانہ کارروائی کے لیے بھیجتا رہتا ہے۔کشمیر گھاٹی میں اس طرح کے واقعات اور واردات کثرت سے دیکھنے کو مل رہے ہیں۔

اس وقت جو عالمی صورتحال ہے اور ملک کے جو اندرونی حالات ہیں نیز مسلمانوں میں عدم تحفظ جیسی بے چینی پائی جاتی ہے ممکن ہے کچھ لوگ کسی پروپیگنڈہ کا شکار ہو کر تشدد اور دہشت گردی کی راہ پر چل پڑے ہوں اور اس کے ذریعہ جوابی خوف کا ماحول پیدا کر کے ان چیزوں پر روک لگانا چاہتے ہوں۔وجہ کوئی بھی ہو اور ایسی حرکتیں جو کوئی بھی کر رہا ہے وہ سراسر غلط ہے۔دہشت گردی پوری انسانیت کے خلاف جرم ہے جس کی جتنی مذمت کی جائے کم ہے کیونکہ ایسی کارروائیوں میں زیادہ تر بے گناہ، بےقصور اور معصوم لوگ مارے جاتے ہیں۔شہر میں، بازار میں، میلے ٹھیلے میں، بس، ریل اور ہوائی جہاز میں، کھیل کے میدان،اسکول کالج میں،بم پھینک کر، اندھا دھند گولیاں چلا کر یا کسی اور طریقہ سے عورتوں بچوں بوڑھوں، جوانوں، مسافروں،مقیم، نہتے اور معصوم لوگوں کو مارنا انتہائی سنگین جرم ہے۔اگر یہ حرکت کوئی مسلمان یا مسلمانوں کا کوئی گروہ کرتا ہے تو یہ اور بھی سخت جرم ہے جو اسلامی تعلیمات اور قرآنی احکام کے سراسر منافی ہے۔اس طرح کی کارروائی کو اسلامی دہشت گردی یا جہادی دہشت گردی

کہنا نہ صرف ان مجرمانہ حرکتوں پر پردہ ڈالنا ہے بلکہ دہشت گردی کو بڑھاوا دینا ہے اسلام اور دہشت گردی ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اسلام امن کا علمبردار ہے جب کہ دہشت گردی بدامنی اور ظلم کے مترادف ہے۔ اس لیے اگر کوئی مسلمان یا مسلمانوں کی کوئی جماعت ایسی حرکت کرتی ہے تو یہ اس کا ذاتی فعل ہوسکتا ہے۔ اس بنیاد پر اسلام اور پوری مسلمان آبادی کو مجرم مان کر ان کو مشکوک نگاہوں سے دیکھنا اور ان کو ناروا ظلم کا شکار بنانا خود ایک دہشت گردانہ کارروائی ہے۔

ملک میں جب بھی کہیں دہشت گردانہ کارروائی ہوتی ہے تو خفیہ ایجنسیاں اور ملک کا سول اور پولٹیکل اسٹیبلشمنٹ اپنی ناکامی چھپانے کے لیے کسی نہ کسی تنظیم کا نام اچھال دیتے ہیں اور پھر کچھ نوجوانوں کو پکڑ کر جیل میں ڈال دیتے ہیں۔ اس کے بعد ٹی وی اور اخبارات کے ذریعے بڑے پیمانے پر تشہیر کی جاتی ہے کہ فلاں تنظیم اس کی ذمہ دار ہے اور اس کا ماسٹر مائنڈ اور اس کے ساتھی پکڑے گئے ہیں۔ اس طرح کچی پکی معلومات اور محض شک کی بنیاد پر سینکڑوں اور ہزاروں کی تعداد میں بے قصور نوجوانوں کو پکڑ کر جیل میں ٹھونس دیا جاتا ہے، ان کو ہر طرح سب وستم کا نشانہ بنایا جاتا ہے، برسوں جیل میں رکھنے کے بعد جب ان کے خلاف کوئی ثبوت نہیں ملتا تو مجبوراً عدالت دس دس بارہ برس کے بعد انہیں باعزت بری کر دیتی ہے۔

بات صرف یہیں تک نہیں رکتی، مسجد، مدرسہ اور اسلامی درسگاہوں کو دہشت گردی کی نرسری قرار دیا گیا اور ہر داڑھی اور ٹوپی والے نوجوان اور برقع پوش خاتون کو شک کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا۔ پہلے تو کہا گیا کہ اسلامی مدرسوں میں جہادی دہشت گردی کی تربیت دی جاتی ہے اور ان کو باضابطہ دہشت گرد بنایا جاتا ہے۔ پھر پڑھے لکھے نوجوان، ڈاکٹر، انجینئر اور پروفیشنل لوگوں کو پکڑا جانے لگا۔ ماحول ایسا بنایا گیا کہ والدین کو بھی پتہ نہیں ہے کہ ان کے بچے کیا ہیں؟ کس سے ملتے ہیں؟ پولس اور میڈیا سے خبر ملتی ہے کہ وہ دہشت گرد ہے اور فلاں دہشت گرد تنظیم سے وابستہ ہے۔ آج تک جو بھی مقدمات فیصل ہوئے ہیں ان میں ایک فیصد لوگ بھی قصوروار ثابت نہیں ہوئے ہیں۔ جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی ہمت شکنی اور ان کی ہمت کو توڑنے کے لیے ایک سوچی سمجھی سازش کے طور پر یہ ہوگی کھڑی کی گئی

ہے تا کہ پوری قوم کوخوف زدہ رکھا جاسکے اور ان کے اندر تمام نامساعد حالات کے باوجود آگے بڑھنے کا جو رجحان پیدا ہو رہا ہے اس کی حوصلہ شکنی کی جا سکے۔

حالات یہ ہیں کہ ہر کچھ دن پر مسلمان کو گھیرنے، ہراساں اور پریشان کرنے، ان کے اندر عدم تحفظ کے احساس کو پختہ کرنے کی مسلسل سازش رچی جارہی ہے۔ ایک Hate mill ہے جو اُورٹائم کام کر کے روز نت نئے شوشے چھوڑتا رہتا ہے۔ کبھی لو جہاد اور کبھی گاؤکشی کے نام پر مارنے کاٹنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ گھر کے اندر گھس کر فرج میں رکھے گوشت کو گائے کا گوشت بتا کر اخلاق نام کے ایک ادھیڑ عمر کے شخص کو اس کی بیوی بچوں کی موجودگی میں پیٹ پیٹ کر ہلاک کر دیا جاتا ہے۔

یہ تمام حالات وواقعات اس خوف اور عدم تحفظ کے احساس کو زبان حال سے بیان کررہے جو آزادی کے بعد پچھلے ستر سالوں سے مسلمانوں کا مقدر بن گئے ہیں۔ ایک سیاہ کالی رات ہے جو ختم ہونے کا نام نہیں لیتی ہے۔ ان تمام حالات میں ایک خوش آئند پہلو یہ ہے کہ مسلمان دبے کچلے اور حاشیہ پر پہنچ جانے کے باوجود ابھی تک ٹوٹے اور مایوس نہیں ہوئے ہیں۔ ابھی ان کے حواس سلامت ہیں۔ بھارت پر، بھارت کی عوام پر، حکومت، پولیس، سول ایڈمنسٹریشن، عدلیہ، پریس، ملک کی جمہوریت، انسانی حقوق کے اداروں یہاں کی سیاسی پارٹیوں اور خود اپنے قوت بازو اور خدا پر ان کا اعتماد قائم ہے اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ رات چاہے جتنی لمبی، تاریک، گھنی اور خوفناک کیوں نہ ہو۔ امید کا سورج ضرور طلوع ہوگا اور ان کے دن بدلیں گے اور وہ اس ملک میں عزت، آزادی، برابری، امن اور خوشحالی کے ساتھ جی سکیں گے۔ وہ اپنی تین نسلوں کی قربانی دے چکے ہیں۔ امید ہے ان کی آئندہ نسلیں ان آزمائشی حالات سے ضرور باہر نکلیں گی۔ تاہم اس ہمہ گیر احساس عدم تحفظ نے مسلمانوں کے اندر گھیٹو ذہنیت پیدا کی ہے جس کی وجہ سے وہ خول بند ہوتے جارہے ہیں اور عام ہندوستانی سماج سے ان کا ربط ضبط کمزور پڑتا جارہا ہے۔ اس کی وجہ سے عام ہندو سماج میں جو جارح اور فرقہ پرست نہیں بھی ہے وہ بھی ان کے حالات اور مسائل کے بارے میں حساس نہیں ہیں بلکہ ان کے اندر عدم تعلق اور

Indifference کی کیفیت نظر آتی ہے جو تشویش کا باعث ہے۔خوف اور عدم تحفظ کے ساتھ ساتھ ان ستر سالوں میں دو اور بڑے مسائل ابھر کر سامنے آئے ہیں۔ایک مسلمانوں کے اندر تیزی سے پیدا ہوتی بے اختیاری (Dis-empowerment) اور دوسری ملک کے عملی معاملات سے بے دخلی (Alienation)۔آئندہ صفحات میں ہم ان دونوں امور پر تفصیل سے روشنی ڈالیں گے۔

بے اختیاری:

عدم تحفظ کے بعد دوسرا بڑا مسئلہ بے اختیاری ہے۔اس سے پہلے کہ ہم اس مسئلہ پر غور کریں یہ جان لینا ضروری ہے کہ بااختیاری (Empowerment) اور بے اختیاری (Dis-empowerment) کا مفہوم کیا ہے؟ بااختیاری یعنی Empowerment کا ڈکشنری مفہوم کسی کو کچھ کرنے کا اختیار اور قوت دینا ہے۔یعنی اس کا مطلب کسی کو مضبوط اور پر اعتماد بنانا ہے تاکہ وہ اپنی زندگی کے معاملات پر خود نگراں ہو اور اپنے حقوق طلب کر سکے۔وی کی پیڈیا نے امپاورمنٹ کو مندرجہ ذیل الفاظ میں واضح کیا ہے۔

> The term empowement refers to measures designed to increase the degree of autonomy and self determination in people and communities in order to enable them to represent their interests in a responsible and self detrmined way, acting on their own authority.
>
> ترجمہ: بااختیاری کی اصطلاح ان اقدامات کی طرف اشارہ کرتی ہے جو افراد اور برادریوں کو عطا کی جاتی ہیں تاکہ ان کو یک گونہ اختیار و آزادی میسر ہو جس کے ذریعہ وہ ذمہ دارانہ طور پر اور حق خود اختیاری کے ساتھ از خود عمل کرنے کا اختیار رکھتے ہوں۔

Robert Adams نے حصول قوت کی تعریف اس طرح کی ہے:

Empowerment : the capacity of individuals, groups and /

or communities to take control of their circumstances, exercise powers and achieve their own goals and the process by which individually and collectively, they are able to help themselvs and others to maximise the quality of their lives.

بااختیاری افراد گروہ اور برادریوں کی اس صلاحیت کا نام ہے جس کے ذریعہ وہ اپنے حالات پر خود قابو رکھتے ہیں۔اپنے اختیار کا استعمال کرکے اپنے مقاصد کی تکمیل کرتے ہیں اور اس طریق عمل کا نام ہے جس کے ذریعہ انفرادی اور اجتماعی طور پر وہ اپنی مدد آپ کرنے کے اہل ہوتے ہیں نیز اپنی زندگیوں کو بہتر بنا سکتے ہیں۔

Rapport(1984) نے امپاورمنٹ کی تشریح اس طرح کی ہے:

Empowerment is viewed as a proess: the mechanism by which people, organizations and communities gain mastery over their lives

بااختیاری اس طریق عمل کے طور پر دیکھا جانے والا طریق کار ہے جس کے ذریعہ افراد تنظیم اور برادریاں اپنی زندگیوں کے خود مالک ہوتے ہیں۔

اس کے برعکس Disempowerment کا ڈکشنری مفہوم مندرجہ ذیل ہے:

To cause (a person or a group of people) to be less likely than others to succeed : to prevent (a person or group) from having power , authority or influence

کسی فرد یا افراد کے مجموعہ کو دوسرے کے مقابلہ کامیاب ہونے سے روکنا اور افراد یا گروہ کو قوت، اختیار اور اثر پیدا کرنے سے روکنا۔

اس کے دوسرے مفاہیم میں:

To deprive power, authority or influence, make weak, ineffectual or unimportant

ان کو قوت اختیار اور اثر سے محروم رکھنا، کمزور رکھنا، بے اثر اور غیر اہم بنانا۔

ہم لوگ بااختیاری Empowerment اور بے اختیاری Dis empowerment کے الفاظ کثرت سے بولتے ہیں۔ مگر بہت کم لوگ ان الفاظ کا صحیح مفہوم جانتے اور سمجھتے ہیں۔ اس لیے میں نے ان دونوں الفاظ کے مفاہیم واضح کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ آئندہ کے مباحث کو اس کے صحیح تناظر میں سمجھنا آسان ہوجائے۔

چونکہ انگریزوں نے اپنے پورے دورِ حکومت میں مسلمانوں کے خلاف معاندانہ رویہ رکھا اس لیے جس وقت ہندوستان آزاد ہوا مسلمان تعلیمی، معاشی اور سماجی اعتبار سے اپنی ہم عصر قوموں سے پس ماندہ تھے۔ آزادی کے بعد نہ صرف مسلمانوں کی چوٹی کے قائدین اور علمائے کرام بلکہ اعلیٰ اور درمیانی مڈل کلاس جس میں اعلی تعلیم یافتہ طبقہ اور دیگر شعبوں کے ماہرین شامل تھے تجار، صنعت کار، زمیندار اور جاگیر دار نیز نوکر شاہ قریب نوے پنچانوے فیصد ہجرت کرکے پاکستان چلے گئے۔ ہندوستان میں لور مڈل کلاس، چھوٹے کسان، چھوٹے دکان دار اور مزدور رہ گئے۔ دیکھتے دیکھتے ایک پوری کمیونیٹی یتیم اور بے سہارا ہوگئی۔

فسادات اور ہمہ گیر عدم تحفظ نے ایسی فضا پیدا کی کہ لوگ خوف کے مارے خول میں بند ہو گئے اور اس طرح ہندوستان کے وسائل و ذرائع سے بے دخلی کا عمل شروع ہوا۔ ہندوستان کے دستور نے اپنے ابتدائیہ (Preamble) میں سماجی، معاشی اور سیاسی انصاف کا وعدہ کیا ہے نیز خیالات، اظہار، عقیدے اور عبادات کی آزادی عطا کی، مرتبہ اور مواقع کی برابری کا غلغلہ بلند کیا اور شخصی احترام اور بھائی چارہ کی یقین دہانی کرائی۔ اس کے علاوہ بنیادی حقوق کے باب میں ملک کے عمومی شہری ہونے کی حیثیت سے اور ایک مذہبی، لسانی اور ثقافتی اقلیت ہونے کی حیثیت سے بھرپور ضمانت عطا کی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ شخصی حقوق کے ساتھ ساتھ عقیدہ، مذہب، طریق عبادت، زبان، تہذیب اور تعلیمی و ثقافتی ادارے سب محفوظ ہیں۔

ملک میں جمہوری آزادی کے ساتھ ساتھ عدلیہ اور پریس کی آزادی کا وعدہ کیا گیا۔ بھارت میں سیکولرزم کو ایک اسٹیٹ پالیسی کے طور پر اختیار کیا گیا جس کا مفہوم یہ تھا کہ اسٹیٹ نہ کسی مذہب کی طرفدار یا مخالف ہوگی بلکہ مذہب کے معاملہ میں نیوٹرل ہوگی۔ ملک میں عام

قانون سازی کسی مذہبی کتاب کی بنیاد پرنہیں ہوگی۔ پرسنل لاء کے علاوہ جملہ معاملات میں مصالح عام کے تحت حکومت قانون سازی کرے گی جس کا اطلاق شہریوں کے تمام طبقات پر بلالحاظ مذہب وعقیدہ ہوگا۔

ہندوستان کے دستور کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسلمانان ہند کے لیے کسی خوف اور اندیشہ کا موقع نہیں تھا۔ مگر دستور ہند عملاً ہاتھی کا وہ دانت ثابت ہوا جو صرف دکھانے کے کام آتا ہے۔ کھانے والا دانت منہ کے اندر تھا جو باہر سے نظر نہیں آتا تھا۔ چنانچہ مسلمانوں کے معاملہ میں دستوری ضمانتوں کی پامالی کا جس طرح التزام کیا گیا اتنا اس کے بجا آوری کا نہیں ہو ا۔ اور یہ کام ان لوگوں نے کیا جنھوں نے دستور کا حلف لے کر زمام اقتدار اپنے ہاتھوں میں لیا تھا۔ اس طرح دستور کا ایک موہوم سا تحفظی چھاتا (Protective umbrella) نفرت اور تعصب کی تیز آندھی اور بارش میں اڑ گیا اور مسلمانان ہند مسلسل حوادث کی زد میں ہیں اور دور دور تک کوئی سائبان یا پناہ گاہ نہیں ہے۔ یہ سلسلہ بھی ستر سال سے جاری ہے۔

21ویں صدی دیگر اقوام اور ملل کے لیے امید کی کرن لے کر آئی ہے لیکن مسلمانان ہند کے لیے ابھی بھی کالی رات کا سایہ پوری شدت کے ساتھ قائم ہے۔

ہمہ گیر پسماندگی:

ایک لمبے عرصے تک مسلمانوں کی حالت زار کے سلسلے میں کوئی باوثوق ڈاٹا مہیا نہیں کرایا گیا۔ بعض لوگوں کی ذاتی کاوشوں سے جو مطالعات اور رپورٹیں سامنے آئیں اس نے ثابت کیا کہ مسلمان ہندوستان کی دیگر اقوام کے مقابلے سب سے زیادہ پس ماندہ ہیں۔ بالآخر مارچ 2005 میں جسٹس راجندر سچر کی قیادت میں سات رکنی ایک اعلیٰ سطحی کمیٹی مسلمانان ہند کی سماجی، معاشی اور تعلیمی صورتحال کا جائزہ لینے کے لیے تشکیل دی گئی جس نے نومبر 2006 میں اپنی رپورٹ حکومت ہند کو پیش کر دی۔ اس کمیٹی نے پہلی بار تمام سرکاری دفاتر اور وزارتوں سے باوثوق ڈاٹا حاصل کر کے یہ بتایا کہ ہندوستانی مسلمان فی الوقت دلتوں سے بھی زیادہ پسماندہ

ہیں۔ دلتوں کو دستوری آزادی کے بعد ان کے امپاورمنٹ میں دن بدن اضافہ ہورہا ہے جب کہ مسلمانوں کا ڈس امپاورمنٹ بڑھتا جارہا ہے۔ مسلمانوں کی پس ماندگی کسی ایک جگہ اور کسی ایک شعبہ میں نہیں ہے بلکہ یہ پس ماندگی ملک گیر اور ہمہ جہت ہے۔

2001 کی مردم شماری کے مطابق مسلمانوں میں خواندگی 59.1% ہے جبکہ ملکی اوسط 65.1% ہے۔ 2016 میں کئے گئے ایک سروے کے مطابق مسلمانوں میں ناخواندہ لوگوں کی تعداد 42.7% ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ پچھلے 16 سالوں میں بھی حالات میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی ہے۔ سچر کمیٹی نے بتایا کہ انڈر گریجویٹ لیول پر سبھی کورسز میں مسلمانوں کی حصہ داری صرف 9% ہے جو ایس سی، ایس ٹی اور او بی سی سے بہت کم ہے۔ انجینیر نگ اور میڈیکل میں بھی ان کی حصہ داری بہت معمولی ہے۔ پی جی کے سبھی کورسز میں ان کی حصہ داری محض 5% ہے جبکہ او بی سی اور ایس سی، ایس ٹی کی 13% ہے۔ اعلیٰ تعلیم کی صورتحال اور بھی تشویش ناک ہے۔ 2016 کی رپورٹ کے مطابق مسلمانوں میں اعلیٰ تعلیم یعنی 18 سے 23 سال کے عمر کے نوجوانوں میں تعلیم کی شرح 13.8 ہے جبکہ قومی اوسط 23.6 ہے۔ غرض یہ قومی اوسط سے 10% کم ہے جبکہ بیک وارڈ طبقات میں اعلیٰ تعلیم کی شرح 22.1% ہے اور شیڈول کاسٹ اور شیڈول ٹرائبس میں 18.5% ہے۔ اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ مسلمان اس وقت پچھڑی ذاتوں سے قریب 9% اور دلت طبقات سے قریب 5% کمتر پوزیشن میں ہیں۔

(بحوالہ سیج پبلی کیشن: آل انڈیا سروے آف ہائر ایجوکیشن)

مدارس اسلامیہ میں تعلیم پانے والے بچے محض چار فیصد ہیں جن کی حالت بھی کسی طرح اطمینان بخش نہیں قرار دی جاسکتی ہے۔

سچر کمیٹی کے بعد وزارت اقلیتی امور حکومت ہند نے جے این یو کے پروفیسر امیتابھ کنڈو کی قیادت میں اکتوبر 2007 میں ایک مطالعاتی کمیٹی تشکیل دی جس نے 2008 میں اپنی رپورٹ بعنوان

Report of the Expert Group To Propose A Diversity

کے نام سے جمع کی۔اس رپورٹ میں تازہ اعداد وشمار کے حوالے سے جونقشہ پیش کیا گیا ہے وہ تعلیم کے حوالے سے کافی افسوسناک اورتشویش انگیز ہے جس پرحکومت اور خود مسلمان ملت کو بہت سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے۔رپورٹ کے مطابق ملکی سطح پر جہاں 17 سال کے یااس سے اوپر کے 26% نو جوان میٹرک کی تعلیم مکمل کرتے ہیں وہیں مسلمانوں میں یہ تناسب محض 17% ہے۔گویا اس معاملے میں مسلمان ملکی اوسط سے 9% کم ہیں۔محض 44% مسلمان طالب علم پرائمری لیول کی تعلیم مکمل کر پاتے ہیں جبکہ دوسرے مذہبی گروہ کے 65% بچے پرائمری تعلیم حاصل کرتے ہیں ملکی اوسط 75% ہے۔اس طرح الگ الگ برادریوں کے مقابلے وہ 21% پیچھے ہیں اور ملکی اوسط سے 31% پیچھے ہیں۔

50% جو بچے مڈل اسکول کی تعلیم تک پہنچ جاتے ہیں وہ عموماً میٹرک لیول تک تعلیم جاری رکھتے ہیں۔اس کا مطلب یہ ہے کہ 50% بچے مڈل اسکول تک آتے آتے تعلیم چھوڑ دیتے ہیں۔رپورٹ سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ سکنڈری لیول سے اوپر مسلمان طالب علموں کا اوسط کچھ بہتر ہے یعنی ان کا اوسط 26% ہے جبکہ دلت طبقات 23% اور ملکی اوسط 34% ہے۔ اس طرح سکنڈری لیول سے اوپر یہ دلتوں سے 3% زیادہ ہیں جبکہ یہاں بھی ملکی اوسط سے 8% کم ہیں۔

رپورٹ کے مطابق انڈر گریجویٹ لیول پر پچیس طلبا میں صرف ایک مسلمان طالب علم ہے جبکہ پوسٹ گریجویٹ لیول پر ہر پچاس طالب علم میں ایک مسلمان طالب علم ہوتا ہے۔

ان اعداد وشمار کی روشنی میں آپ مسلمانوں کی عمومی جہالت اور ان کی تعلیمی پسماندگی کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

تعلیم کسی فرد اور قوم کے امپاورمنٹ کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔جو فرد اور قوم تعلیم میں پیچھے رہے گی وہ کبھی ترقی کا اونچا زینہ طے نہیں کرسکتی۔اس پسماندگی کی متعدد وجوہات ہیں جس میں غربت، جہالت، احساس عدم تحفظ کے ساتھ ساتھ حکومت کی پالیسی اور طرز عمل

کا بھی دخل ہے۔ مسلمان بچے اپنی غربت کی وجہ سے زیادہ تر سرکاری اسکولوں کالجوں میں تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ جہاں کا نظام تعلیم اتنا ہی خراب ہے کہ بچے اسکول کالج نہیں جاتے اور بیچ میں اپنی تعلیم چھوڑ دیتے ہیں۔ بہر حال تعلیمی پسماندگی مسلمانوں کی سب سے بڑی کمزوری ہے جو ان کے امپاورمنٹ میں روکاوٹ پیدا کرتی ہے۔

تعلیم کے بعد امپاورمنٹ کے نقطہ نظر سے دوسرا معاملہ روزگار اور اس کے مواقع ہیں مسلمانوں کی 90% آبادی خود روزگار میں لگی ہے جو چھوٹے کاروباری، دکاندار، خوانچہ والے، پھیری لگانے والے، لو اسکلڈ جاب کرنے والے اور دہاڑی مزدور ہیں جو روز کمانے اور کھانے والے ہیں۔ ان کی کوئی مستقل آمدنی نہیں ہوتی اور نہ ان کو کوئی سماجی تحفظ حاصل ہے۔ یہ زیادہ تر بیمار رہتے ہیں اور قرض میں ڈوبے ہوتے ہیں۔ ان کی تنگ دستی ان کی راہ کا سب سے بڑا روڑہ ہے جس کی وجہ سے یہ آگے نہیں بڑھ پاتے۔ وزیر اعظم نریندر مودی نے پارلیمنٹ میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہ گجرات میں ایک مسلمان کو پچھلے ساٹھ سال سے سائیکل کا پنکچر بناتے دیکھ رہے ہیں۔ اس کا باپ بھی یہی کام کرتا تھا، وہ بھی یہی کام کرتا ہے اور اس کے بچے بھی یہی کام کرتے ہیں۔ گویا تین نسلوں سے اس کی حالت میں کوئی سدھار نہیں ہوا ہے۔ جب یہ آنکھوں دیکھی حقیقت ہے پھر اس طبقہ کی معاشی بہتری کے لیے کوئی مثبت اقدام (Affirmative Action) کرنے سے کس چیز نے روک رکھا ہے۔

مسلمانوں کے پاس جو روایتی صنعت تھی مثلاً چمڑے، تانبے، پیتل اور مرادآبادی برتنوں کی، بنارسی ساڑیوں، قالین، تالے، چوڑی، درزی گری اور اسی طرح کی کئی اور چیزوں کی وہ بازار کے بدلتے رخ، نئی ٹکنالوجی، نئی مصنوعات کی درامد و مسابقت، حکومت کی ناقص پالیسی اور سرمائے و قرض کی کمی کی وجہ سے بیمار ہیں اور دم توڑ رہے ہیں۔ ان سب نے مسلمانوں کے اس طبقے کو جواب تک خوش حال تھا مفلوک الحال بنا دیا ہے اور ان کی معاشی کمر توڑ دی ہے۔

مسلمانوں کی ستر فیصد آبادی دیہی علاقوں میں رہتی ہے۔ جہاں کا خاص پیشہ زراعت ہے۔ مگر مسلمانوں کے پاس زمین نہ کے برابر ہے۔ مسلمانوں میں محض پانچ فیصد

لوگ ایسے ہیں جن کے پاس پانچ ایکڑ یا اس سے زائد زمینیں ہیں 95% یا تو بے زمین مزدور ہیں یا جن کے پاس صفر سے ایک ایکڑ زمین ہے۔ ظاہر ہے کھیتی سے ان کی گزر اوقات نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ جن علاقوں میں مسلمان آبادیاں زیادہ ہیں وہاں کے بیشتر نوجوان بڑے شہروں اور دوسری ریاستوں میں مزدوری کی تلاش میں گھر سے باہر جاتے ہیں اور شہروں میں جانوروں سے زیادہ بدتر زندگی جینے پر مجبور ہوتے ہیں۔

اس وقت کھلے بازار اور عالمگیریت کے دور میں سرکاری سیکٹر کا دائرہ سکڑتا جا رہا ہے۔ جو لوگ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں یا ہائی اسکلڈ ہیں وہ ملٹی نیشنل کمپنیوں میں چلے جاتے ہیں۔ مسلمانوں میں چونکہ اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کی تعداد کم ہے اس لیے وہ ان مواقع کا پورا فائدہ نہیں اٹھا پا رہے ہیں۔ بعض ملکی کمپنیوں میں تعصب اور تنگ نظری کی وجہ سے ان کا داخلہ مشکل ہوتا ہے۔ اس لیے سرکاری نوکری چاہے وہ جس سطح کی ہو آج بھی ان کی پہلی ترجیح ہوتی ہے۔ مگر سرکاری سیکٹر کی صورتحال بہت مایوس کن ہے۔

سرکاری نوکری محض مستقل آمدنی کا ذریعہ نہیں ہوتی بلکہ یہ امپاورمنٹ اور سماجی اثر کے فروغ کا ذریعہ بھی ہوتی ہے۔ اس سے عوام میں اپنی پہچان بنانے اور خیر سگالی کا جذبہ پیدا کرنے میں مدد ملتی ہے۔ لہٰذا سرکاری نوکری کے چہار طرفہ فائدے ہیں۔ سچر کمیٹی نے تمام سرکاری دفاتر سے جو قابل وثوق ڈاٹا فراہم کیا ہے اس کی رو سے 2006 میں مسلمانوں کا تناسب آئی اے ایس، آئی ایف، ایس اور آئی پی ایس میں محض 3.2% ہے یعنی کل 8827 افسران میں مسلمان افسران 285 ہیں۔ ڈائرکٹ بحالی میں 2.4%، ریاستی سروس سے پرموٹ ہو کر آنے والے ہیں 5.5% ہیں۔ اس طرح انڈین ایڈمنسٹریٹو سروس میں ان کا کل تناسب 3% ہے ڈائرکٹ ریکورٹمنٹ میں 2.3 اور ریاست سے پروموٹ ہو کر آنے والے 5.0% ہیں۔ انڈین فورن سروس میں 1.8 ہیں انڈین پولس سروس میں 4.0 ہیں۔

سچر کمیٹی نے مرکزی اور ریاستی حکومتوں کے مختلف محکموں اور دفاتر کے جو اعداد وشمار جمع کئے ہیں اس کی رو سے مسلمان ریاستی حکومتوں کے محکمہ میں محض 6.3% ہیں، ریلوے

میں4.3%، بینک اور آر بی آئی میں2.2%، سیکورٹی ایجنسی یعنی سی آر پی ایف۔سی آئی ایس ایف، بی ایس ایف، اور دیگر ایجنسیوں میں مسلح افواج کو چھوڑ کر جنہوں نے کوئی ڈاٹا یا معلومات دینے سے انکار کردیا مسلمانوں کی تعداد 3.2 ہے۔ پوسٹل سروس میں5% یونیورسیٹی میں4.7% ہے یونیورسیٹی کا یہ ڈاٹا محض 129 یونیورسیٹی اور مرکزی حکومت کی پبلک سکٹر کمپنیوں میں مسلمانوں کا تناسب3.3% اور ریاستی حکومت کی کمپنیوں میں10.8% ہے۔اس طرح تمام سرکاری محکموں میں4.9.% اور سرکاری کارخانوں میں7.2% مسلمان نوکری میں ہیں۔

مزید تمام شعبہ جات میں اے۔ بی۔سی اور ڈی کیٹگری میں کتنے مسلمان ہیں اس کو مندرجہ ذیل ٹیبل میں دیکھا جاسکتا ہے۔

catogory	Total No of employees	civil service	Indian Railways	Post / Telegraph	Security service	Banks	University	Psu
A	231619	4.8	2.5	3.8	3.1	1.7	3.7	23 / 28
B	122551	-	3.4	4.4	3.9			
C	1486637	-	4.9	4.8	4.6			
D	659113	-	5.0	5.3	4.3	2.5	5.4	3.9

اوپر کے اعداد وشمار اور ٹیبل سے مجموعی طور پر سرکاری سکٹر اداروں اور محکموں میں مسلمانوں کے روزگار کی صورتحال کا اندازہ ہوتا ہے۔آپ گریڈ اے اور بی کی نوکریاں چھوڑ دیں جہاں مسابقت ہوتی ہے اور سخت مسابقت ہے۔ وہاں یہ کہا جاسکتا ہے کہ چونکہ مسلمان ان امتحانات میں کم پاس کرتے ہیں اس وجہ سے ان کی بحالی کم رہتی ہے لیکن گروپ سی اور ڈی میں بھی کہیں بھی اور کبھی بھی ان کا تناسب5% سے زائد نہیں ہے۔ایسا کیوں ہے؟ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے ساتھ امتیاز برتا جاتا ہے اور انہیں ان کا واجب حق نہیں دیا جاتا ہے۔اس سلسلے میں لازمی طور پر ریاستی اور مرکزی حکومت کو Affirmative Action سے کام لینا

چاہیے اور پروفیسر امیتابھ کنڈو کمیٹی نے جس Diversity-Index کی بات کی ہے اس کے ذریعہ پتہ لگا کر کے کس شعبہ ،سیکٹر اور دفتر میں مسلمانوں کی نمائندگی کم ہے۔ اس کو بڑھانے کا اہتمام کرنا چاہیے۔

یہ اعداد وشمار 2006 کے ہیں۔ ظاہری بات ہے کہ پچھلے 12 سالوں میں ان میں سے بہت لوگ ریٹائر ہو گئے ہوں گے ۔حال کے برسوں میں جس تناسب سے لوگ ریٹائر ہو رہے ہیں اس تناسب میں نئی بحالی نہیں ہوئی ہے۔ لہٰذا ان کی تعداد اور تناسب میں مزید کمی آئی ہوگی۔

بہر حال یہ اعداد وشمار صاف بتا رہے ہیں کہ مسلمان تعلیم اور روزگار ہر دو میدان میں ہندوستان کی پسماندہ ترین اکائی ہیں اور ان کی حالت دن بدن خراب سے خراب تر ہوتی جارہی ہے جس پر ملت، اکثریت اور حکومت، تمام سیاسی جماعتوں، سوسائٹی، پریس اور عدلیہ کو توجہ دینی چاہیے۔ اتنی بڑی اقلیت کا احساس محرومی میں جینا ملک وملت کسی کے لیے اچھا نہیں ہے۔

بی جے پی اور سنگھ پریوار کے لوگ سوتے جاگتے اٹھتے بیٹھتے مسلمانوں کی منہ بھرائی کی بات کرتے ہیں۔ان سے یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ منہ بھرائی کا مطلب کیا ہے؟ کبھی کبھی حکومت اور اس کے کارندے کچھ ایسی خوش کن باتیں کہہ جاتے ہیں جس سے منہ بھرائی کا دھوکہ ہوتا ہے۔مثلاً سابق وزیر اعظم من موہن سنگھ نے ایک بار کہہ دیا تھا کہ ملک کے وسائل پر پہلا حق اقلیتوں کا ہے۔ یہ بات ابھی ان کے منہ سے نکلی بھی نہیں تھی کہ بی جے پی نے شور مچانا شروع کر دیا کہ دیکھئے مسلمانوں کی منہ بھرائی کی جارہی ہے۔جبکہ یہ محض اعلان تھا اس کے پیچھے نہ کوئی فیصلہ تھا نہ منصوبہ بندی اور نہ عملاً ایسا کچھ ہوا۔ گویا یہ اعلان منہ بھرائی نہیں بلکہ محض ایک دھوکہ اور فریب کے سوا کچھ نہیں تھا۔اوپر دیئے گئے اعداد وشمار سے واضح ہے کہ جب مسلمانوں کو ان کا واجبی حق نہیں دیا جاتا اور زندگی کے کسی شعبہ میں ان کی نمائندگی برائے نام ہے تو پھر منہ بھرائی کی بات کرنا ایک تلخ مذاق بلکہ زخم پر نمک چھڑکنے جیسی بات ہے۔جس کی تائید مسلح

افواج، عدلیہ، پولس ،سول سروسز اور سیاست میں گھٹتی ہوئی مسلمانوں کی نمائندگی سے واضح ہے۔ جس سے مسلمانوں میں یک گونہ مایوسی کے ساتھ ساتھ ان کوملک کے اجتماعی معاملات سے الگ تھلگ کرنے کی ایک سوچی سمجھی سازش نظر آتی ہے۔

بے دخلی، عدم شرکت، حاشیت و ہمہ گیر محرومی

اوپر کی تفصیلات سے واضح ہے کہ ہندوستانی مسلمان ایک طرف ہمہ گیر عدم تحفظ کے شکار ہیں اور دوسری طرف تعلیم، سماجی اور معاشی پسماندگی اس حد تک بڑھی ہوئی ہے کہ دلت جو پچھلے پانچ ہزار سال سے ہندوستان کی اجتماعی زندگی میں حاشیہ پر تھے آج مسلمانوں سے کافی بہتر ہیں۔ مسلمان آزادی کی تمام برکات سے محروم کردیئے گئے ہیں اور وہ دلتوں سے بدتر حالت میں ہیں۔ گویا دلت اب اعلیٰ ذاتوں اور درمیانہ طبقات سے مسابقت کررہے ہیں اور مسلمان عملاً نئے دلت (Neo-Dalit) کے مقام پر دھکیل دیئے گئے ہیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ مسلمانوں کو بہت ہی منظّم طریقے سے اور ایک سوچی سمجھی پلاننگ کے تحت سیاسی طور پر بے دخل کرنے، حاشیہ پر رکھنے اور سیاسی اچھوت بنا کر رکھنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہر الیکشن کے بعد لوک سبھا اور ریاستی اسمبلیوں میں مسلمانوں کی نمائندگی گھٹتی جارہی ہے جو ملک اور مسلمان دونوں کے لیے تشویش کا باعث ہے۔ ہندوستان میں مسلمان ملک کی کل آبادی کا 15% ہیں جن کی مجموعی تعداد بیس کروڑ سے زائد ہے۔ اتنی بڑی آبادی کو فیصلے کے اجتماعی عمل سے محرورم رکھنا کسی طرح فال نیک نہیں ہے۔ جس پر ملک کے سیاسی رہنماؤں مسلم قائدین اور دانشوروں کو غور کرنا چاہیے۔

ہندوستان کی آزادی کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد نے مسلمانوں اور ملک کے حکمرانوں کے سامنے دو باتیں کہی تھیں انہوں نے مسلمانوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ اب آپ اپنی الگ سیاسی شناخت ختم کرکے پوری طرح ہندوستان کی مشترکہ سیاست میں شامل ہوجائیں اور اپنی تمام سیاسی گروپوں کو تحلیل کردیں۔ دوسری طرف ہندوستان کے ارباب حل و

عقد سے انہوں نے صاف اور کھلے لفظوں میں کہا تھا کہ مسلمانو ں کی شرکت کے بغیر ملک میں لیا گیا کوئی بھی فیصلہ ادھورا اور ناقص ہوگا۔ مولانا آزاد کے اس فیصلے پرعمل کرتے ہوئے نارتھ انڈیا کے مسلمانوں نے بالخصوص جہاں مسلمانوں کی 75% سے زائد آبادی رہتی ہے اپنی الگ سیاسی شناخت ختم کردی اور وہ کانگریس کے ساتھ ہوگئے۔ مذہبی اور سماجی امور میں انہوں نے علماء کی قیادت کوتسلیم کیا مگر سیاسی معاملات میں انہوں نے گاندھی، نہرو اور پٹیل کو اپنا قائد مانا یہاں تک کہ وہ کانگریس کے مستقل ووٹ بینک ہوگئے جس کی وجہ سے غیر کانگریسی پارٹیاں بالخصوص دائیں بازو کی انتہا پسند پارٹیوں نے ہمیشہ مسلمانوں کو اپنے نشانے پر رکھا اور مسلمانوں کے خلاف زہر افشانی کرنا اور ان کو سیاسی طور پر الگ تھلک رکھنا ان کی مستقل پالیسی بن گئی۔

1948 میں گاندھی جی کی شہادت کے بعد ہندوستان میں مشترکہ جمہوریت کا سب سے مضبوط ستون ٹوٹ گیا۔ پنڈت نہرو کی قدآور اور بااثر شخصیت موجود تھی جنھوں نے مرکزی حکومت کو بہت حد تک سیکولر آئیڈیل کے مطابق چلانے کی کوشش کی۔ مگر ریاستوں میں جو لوگ حکمران تھے بالخصوص یوپی، بہار، مدھیہ پردیش، راجستھان جس کو عرف عام میں ہندی بیلٹ یا کاؤ بلٹ کہا جاتا ہے ان کی سوچ معاندانہ تھی۔ لہٰذا انہوں نے کانگریس کی سیکولر روایات کے باوجود عملاً ہندو انتہا پسند طبقہ کی طرفداری کی اور مسلمانوں کے لیے عرصہ حیات تنگ کرنا شروع کردیا۔

26 جنوری 1950 کو ملک کا نیا دستور نافذ ہوا جس کے ابتدائیہ میں ہندوستان کے تمام شہریوں کو ''ہم بھارت کے لوگ'' کہہ کر بھارت کو ایک خودمختار عوامی جمہوریہ قرار دیا گیا اور ملک کے تمام شہریوں کو انصاف، آزادی، برابری اور بھائی چارہ کی ضمانت دی گئی۔ 1976 میں 42 ویں ترمیم کے ذریعہ ابتدائیہ میں سوشلسٹ اور سیکولر لفظ کا اضافہ کیا گیا گویا اب ہندوستان ایک خودمختار، سوشلسٹ، سیکولر اور عوامی جمہوریہ ہے۔

دستور کے باب اول دفعہ (ا) میں، ہندوستان جس کو بھارت کہتے ہیں کو ریاستوں

کا یونین قرار دیا گیا ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ بھارت ریاستوں کا ایک وفاق ہے ۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ مختلف ریاستوں کے وفاق سے بھارت کی تشکیل ہوئی ہے۔ لہٰذا بھارت کی سرحدوں کے اندر جو ریاستیں ہیں ان کے وفاق کو ہی بھارت کہا جاتا ہے۔ گویا بھارت ایک جسم ہے اور مختلف ریاستیں اس کے لازمی اجزا ہیں۔ ویسے تو ہندوستان کے دستور میں ایک مضبوط مرکز کا تصور پایا جاتا ہے تاہم ریاستوں کو انسانی بقا اور ترقی کی بنیادی ذمہ داری تفویض کی گئی ہے جس کے تحت لاء اینڈ آ ڈر، شہریوں کے جان و مال کا تحفظ، تعلیم، صحت اور سماجی فلاح کے منصوبے آتے ہیں، آمدنی میں اضافہ جس کے تحت زراعت تجارت انڈسٹری اور دیگر خدمات آتے ہیں اور زندگی گذارنے کے ذرائع جس میں سماجی تحفظ کے تمام کام شامل ہیں اور ماحولیات کی حفاظت جس میں قدرتی وسائل، معدنیات وغیرہ کا بہتر استعمال اور تحفظ شامل ہے۔ غرض ملک کی ترقی کے تمام بڑے کام ریاستوں کی ذمہ داری ہیں۔ اس طرح ہندوستانی وفاق میں ریاستوں کا دائرہ کار قانون سازی سے لے کر تمام جملہ امور پر محیط ہے۔ اس طرح کوئی ریاستی حکومت جو عوام کی آزادانہ مرضی سے منتخب ہو کر آتی ہے مرکز اس کو جلدی برطرف نہیں کرسکتا ہے۔ کچھ مخصوص حالات میں مرکز کو یہ اختیار حاصل ہے تاہم وفاقی ضابطوں کا تقاضہ ہے کہ اس کا غیر منطقی استعمال نہ کیا جائے۔

دستور ہند کے باب سوم میں بنیادی حقوق کی دفعہ (ا)15 میں کہا گیا کہ ریاست کسی شہری کے درمیان مذہب، نسل، ذات، جنس اور جائے پیدائش کی بنیاد پر کوئی فرق نہیں کرے گی۔ دستور ہند کی اس دفعہ کو دستور کے ابتدائیہ سے ملا کر اگر پڑھا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ کوئی شہری چاہے اس کا جو مذہب ہو، وہ کسی نسل اور ذات کا فرد ہو اور اس کی کوئی جنس ہو عورت ہو، مرد ہو یا مخنث ہو یا ہندوستان کی کسی ریاست اور کسی علاقے میں پیدا ہوا ہو اس کو انصاف، آزادی برابری اور مساوات کا حق حاصل ہوگا۔ انصاف کا مطلب سماجی، معاشی اور سیاسی انصاف ہے۔ یعنی سماج، معاش اور سیاست میں اس کے ساتھ کوئی بھید بھاؤ نہیں کیا جائے گا۔ دوسرا امر آزادی ہے یعنی اس کو خیال، اظہار عقیدے، ایمان اور عبادت کی آزادی

ہوگی۔یعنی جمہوری ملک کے شہری ہونے کے ناطے اس کو اپنی منفرد رائے رکھنے۔اس رائے کا دوسرے کے سامنے اظہار کرنے، اپنا مخصوص عقیدہ رکھنے، جس مذہب کی چاہے پیروی کرنے اور اپنے ایمان اور عقیدے کے مطابق عبادت کرنے کی آزادی ہوگی۔تیسری بات یہ ہے کہ تمام شہریوں کو رتبہ اور مواقع میں برابری کا حق حاصل ہوگا۔یعنی کوئی شہری کسی سے چھوٹا یا بڑا نہیں ہوگا۔با عزت اور ذلیل نہیں سمجھا جائے گا اور اس کے ساتھ کسی قسم کا امتیاز برتنے کی اجازت نہیں ہوگی۔چوتھی اور آخری بات یہ ہے کہ تمام شہری آپس میں بھائی بھائی ہوں گے یعنی برابر اور یکساں احترام کے مستحق ہوں گے۔

دستور ہند نے بلالحاظ مذہب و نسل تمام شہریوں کو یہ حق دیا ہے۔مگر کوئی سماج یا ملک یا ریاست محض افراد کا مجموعہ نہیں ہوتے ہیں۔ بلکہ ایک ریاست کے اندر مختلف زبان، نسل، مذہب، کلچر اور رنگ کے لوگ پائے جاتے ہیں ان میں کسی کی تعداد زیادہ ہوسکتی اور کسی کی کم۔ ایسا نہ ہو کہ زیادہ تعداد والے لوگ کم تعداد والے لوگوں کو دبوچ لیں اور ان کی شناخت ختم کردیں۔اس لیے جن گروہوں کا اپنا مخصوص عقیدہ ہے یا جن کی اپنی مخصوص زبان یا کلچر ہے فرد کی آزادی کے ساتھ ساتھ ان کو بھی بھرپور آزادی اور ضمانت دی گئی ہے۔فرد اپنی آزادی کی حفاظت تنہا نہیں کرسکتا ہے۔اس لیے اس کو ایک جماعت کی شکل میں رہنا ہوتا ہے۔لہٰذا آزادی اپنے نفاذ میں گروہی آزادی کی طالب ہوتی ہے۔

بھارت صرف ریاستوں کا وفاق نہیں ہے بلکہ اس کی 130 کروڑ کی آبادی ہندو مسلمان، سکھ، عیسائی، بودھ، جین، پارسی، یہودی اور دیگر مذہبی، لسانی اور تہذیبی اکائیوں پر مشتمل ہے۔اس لیے بھارت ایک تکثیری سماج (Plural Society) ہے اس لیے بجا طور پر بھارت کو مختلف قوموں، مذہبوں، زبانوں، اور کلچر کا وفاق کہا جاسکتا ہے۔ بھارت کی اصل قوت اس کی تنوع میں ہے۔اتحاد بھارت میں نہ صرف تکثیریت کو برداشت کرنے کا رجحان ہے بلکہ آگے بڑھ کر اس کو قبول کرنے کا رجحان پایا جاتا ہے۔وزیر اعظم نریندر مودی کے الفاظ میں یہ تکثیرت کا جشن ہے۔(Celeberation of Diversity)

دستور ہند نے واضح الفاظ میں اقلیت کی کوئی تعریف نہیں کی ہے۔ تاہم بنیادی حقوق کی دفعہ 25 میں ضمیر کی آزادی، آزادانہ پیشہ اختیار کرنے کی آزادی، مذہب پر عمل کرنے اور اس کی تبلیغ کی آزادی دی گئی ہے یہ حق فرد کو بھی ہے، جماعت اور گروہ کو بھی ہے، اکثریت اور اقلیت کو بھی ہے۔ دفعہ 26 کے تحت اپنے مذہبی امور کے انتظام انصرام کا اختیار دیا گیا ہے جس کے تحت مذہبی اور رفاہی ادارے قائم کرنے اور چلانے کا حق ہے، اپنے مذہبی امور کے انتظام کا حق شامل ہے۔ دفعہ 28 میں مخصوص تعلیمی اداروں میں مذہبی تعلیم میں شامل ہونے کا حق۔ دفعہ 29 میں جن اقلیتوں کی اپنی مخصوص زبان ہے اس کا رسم الخط اور کلچر ہے اس کے تحفظ کا حق دیا گیا ہے اور دفعہ 30 کے تحت اقلیتوں کو اپنے ادارے قائم کرنے اور ان کو چلانے کا اختیار دیا گیا ہے۔

اس طرح دستور ہند فرداً فرداً اور تمام مذہبی، نسلی، لسانی اور تہذیبی گروہوں کو چاہے ان کا تعلق اکثریتی فرقے سے ہو یا اقلیتی فرقے سے ان کی شخصی آزادی کے ساتھ مختلف گروہوں کو زبان، مذہب کلچر کی آزادی عطا کرتا ہے جس کو کسی طور چھینا یا ساقط نہیں کیا جاسکتا ہے تاوقتیکہ ملک میں اندرونی یا بیرونی ایمرجنسی نافذ نہ کی جائے۔ اس صورت میں شہریوں کے بنیادی حقوق کو وقتی طور پر معطل کیا جاسکتا ہے۔ مگر بھارت کا دستور تضادات کا مجموعہ ہے جس کی وجہ سے بقول شخصے اس کو وکیلوں کی جنت بھی کہا جاتا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ اس کی من مانی تاویل کی جاسکتی ہے۔ ایک طرف بنیادی حقوق کے باب میں فرد اور اقلیتوں کو ہر طرح کی مذہبی آزادی دی گئی جس میں ان کا پرسنل لا بھی شامل ہے۔ دوسری طرف دستور کے رہنما اصول دفعہ 44 میں یکساں سول کوڈ کی بات کہی گئی ہے جس کے تحت ریاست شہریوں کے لیے یکساں سول کوڈ کے حصول کی کوشش کرے گی جو سیدھے طور پر بنیادی حقوق کے باب میں دی گئی ضمانتوں کے برخلاف ہے۔ اگر چہ یہ بات واضح کی گئی ہے کہ رہنما اصول بنیادی حقوق پر حاوی نہیں ہوگا۔ اس کی حیثیت محض مشاورتی ہے اور جب کہ بنیادی حقوق کے خلاف ورزی کی صورت میں عدالت کے ذریعہ نافذ العمل ہوگا۔ دوسری طرف رہنما اصول عدالتوں کے ذریعہ

نافذ نہیں کیا جائے گا۔ ان واضح ہدایتوں کے باوجود یہ دیکھنے کو مل رہا ہے کہ مقنّنہ اور عدلیہ دونوں بنیادی حقوق کو پامال کرتے ہوئے اقلیتوں کے، مذہبی حقوق اور پرسنل لاء میں مداخلت کی نت نئی کوششیں کر رہی ہیں جس کی وجہ سے ہندوستان کی اقلیتیں بالخصوص مسلمان اقلیت سخت خلجان میں مبتلا ہے۔ مرکزی حکومت کی بد اندیشی اور عدالت عالیہ اور عدالت عظمٰی کی مسلسل ریشہ دوانیوں کی وجہ سے مسلم ملت کے مذہبی اور تہذیبی شناخت پر مسلسل خطرہ منڈلا رہا ہے اور ہندوستانی مسلمان اس چہار طرفہ حملہ میں خود کو بالکل بے بس پا رہے ہیں۔ جس نے ہندوستان کی تکثیری جمہوریت اور سیکولرزم کے سامنے سوالیہ نشان کھڑا کر دیا ہے؟

بھارت میں ایک طرف عمومی بالغ رائے دہندگان (universal adult suffrage) کی بنیاد پر ہر شخص جس کی عمر 18 سال ہے خواہ وہ مرد ہو یا عورت ہر فرد کو ایک ووٹ کا حق حاصل ہے۔ دوسرے یہاں ایک فرد یا ایک پارٹی کی حکمرانی نہیں ہوگی بلکہ ملٹی پارٹی ڈیموکریسی ہے۔ یعنی الیکشن میں متعدد پارٹیاں حصہ لیں گی اور جس امیدوار کو پوپولر ووٹ کی بنیاد پر اکثریت حاصل ہوگی وہ فاتح قرار دیا جائے گا۔ ریاستی اور مرکزی ایوان میں جس پارٹی، گروہ یا گروہ کے مجموعے کو پچاس فیصد سے زائد نشستیں حاصل ہوں گی اس کو حکومت بنانے کا اختیار دیا جائے گا اور جو پارٹی اکثریت سے محروم رہے گی وہ اقلیتی گروپ قرار دی جائے گی اور اسے حزب اختلاف مانا جائے گا۔ ڈیموکریسی ڈبیٹ اور ڈسکیشن سے چلتی ہے۔ فیصلہ یا تو اتفاق رائے سے ہوگا یا کثرت رائے سے ہوگا اور اسی بنیاد پر قانون سازی ہوگی۔ قانون بنانے کا اختیار اسمبلی یا پارلیمنٹ کو ہوگا، مگر وہ قانون دستور کے الفاظ اور روح کے مطابق ہے یا نہیں اس کا فیصلہ عدالت عظمٰی کرے گی۔ جس قانون کا دستور کے الفاظ اور روح سے مطابقت نہیں ہو اسے عدالت کالعدم قرار دے سکتی ہے اور اس کی جگہ نیا قانون بنانے کا حکم دے سکتی ہے۔

آزاد ہندوستان کا سفر انہیں دستوری، قانونی اور سیاسی ضابطوں کے تحت شروع ہوا۔ انتخابات ہوتے ہیں اور جس پارٹی یا گروہ کو ایوان میں اکثریت حاصل ہوتی ہے وہ سرکار بناتی ہے۔ آئندہ کے مباحث میں ہم بھارت میں ہونے والے ریاستی اور مرکزی انتخابات اور اس

میں مسلمانوں کی شمولیت اور حصہ داری پر روشنی ڈالیں گے جو مسلمانوں کی حاشیاتی حیثیت (Merginalisation) کی منہ بولتی تصویر ہے۔

2011 کی مردم شماری کے مطابق بھارت میں مسلمانوں کی کل آبادی 18 کروڑ تھی جو کل آبادی کا 14.9% ہے۔ 2018 میں ان کی آبادی 20 کروڑ سے متجاوز ہوگی اور کل آبادی میں وہ 15% سے یقیناً اوپر ہوں گے۔ اکیلے یوپی میں مسلمان کل آبادی کا 19.2% ہیں جن کی مجموعی تعداد ارجن ٹینا کے آبادی کے برابر یعنی 4.3 کروڑ ہے۔ مغربی بنگال میں مسلمان 25.2% ہیں، جبکہ آسام میں 30.9% کیرالہ میں 24.7% اور بہار میں 16.5% ہیں۔ مسلمانوں کی اکثریت یوپی، مغربی بنگال، بہار اور مہاراشٹر میں رہتی ہے۔ اس کے علاوہ 2011 کی مردم شماری کے مطابق، تلنگانہ، آسام، جموں کشمیر اور کرناٹک میں مسلمان 50 لاکھ سے ایک کروڑ کے درمیان ہیں۔ جب کہ راجستھان، گجرات، مدھیہ پردیش، جھارکھنڈ اور تامل ناڈو میں تیس لاکھ سے پچاس لاکھ کے درمیان ہیں۔

2001 کی مردم شماری کے مطابق بھارت کی 593 اضلاع میں 9 اضلاع ایسے ہیں جہاں مسلمانوں کی آبادی 75% سے زائد ہے۔ ان 9 اضلاع میں لکشدیپ اور جموں کشمیر کے 8 اضلاع شامل ہیں۔ 11 اضلاع ایسے ہیں جہاں ان کی آبادی 50 فیصد سے زائد ہیں جس میں 6 اضلاع آسام کے ہیں۔ دو جموں کشمیر کے اور ایک ایک کرالہ، بہار اور بنگال کے ہیں۔ 38 اضلاع ایسے ہیں جہاں ان کی آبادی 25% سے زائد اور 50% سے کم ہیں۔ اس میں اتر پردیش کے 12، بنگال کے 5، کیرالہ کے 5، آسام کے 4، بہار کے 3، جھارکھنڈ کے 2 اور دہلی کے دو اضلاع شامل ہیں۔ آندھرا، ہریانہ، جموں کشمیر، اترانچل، اور پونڈیچری کے ایک ایک ضلع شامل ہیں۔ مسلمانوں کی کل آبادی کا 2% ان اضلاع میں رہتی ہے۔ 182 اضلاع ایسے ہیں جہاں مسلمان 10 سے 25 فی صد ہیں اور 77 اضلاع میں مسلمانوں کی آبادی محض 1% ہے۔ اس طرح ملک میں کل 58 اضلاع ایسے ہیں جہاں مسلمانوں کی آبادی 25 سے 75 فیصد کے درمیان ہے۔ ظاہر ہے ان اضلاع میں مسلمان انتخابی نتائج پر اثر انداز ہونے کی

بھر پور صلاحیت رکھتے ہیں۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو مسلمان 73 لوک سبھا کی سیٹ پر جیت درج کر سکتے ہیں۔46 ایسی لوک سبھا کی نشستیں ہیں جہاں مسلمان30 فیصد سے زائد ہیں۔لہٰذا کم از کم اتنی سیٹ تو ضرور ملنی چاہیے۔ جبکہ مسلمانوں کی نمائندگی اس سے کم ہے۔اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ملک کی سیاسی پارٹیاں مسلمانوں کو بہت کم ٹکٹ دیتی ہیں۔ بی جے پی نے مسلمانوں کو بالکل ٹکٹ نہیں دینے کی پالیسی اپنا رکھی ہے اور کانگریس اور دیگر پارٹیاں بھی کم لوگوں کو ٹکٹ دیتی ہیں۔ دوسری بڑی وجہ ہے کہ جس حلقہ انتخاب میں مسلمانوں کا ووٹ زائد ہے وہاں اتنے لوگ کھڑے ہو جاتے ہیں اور ذات مسلک اور علاقائیت کے نام پر ان کے ووٹ اتنے حصے میں تقسیم ہو جاتے ہیں کہ ان حلقوں سے بھی غیر مسلم امیدوار جیت جاتے ہیں۔

اگر آپ 1952 سے 2014 تک کے لوک سبھا کے نتائج دیکھیں تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ کبھی مسلمانوں کو خاطر خواہ نمائندگی نہیں ملی۔ 1952 کے پہلے انتخاب میں ملک کی تقسیم کے بعد جب کہ ملک کی ہوا فضا پوری طرح کمیونلی چارج تھی ،مسلمان ڈرے سہمے تھے اور ان کی فرسٹ لائن لیڈر شپ پاکستان بھاگ گئی تھی ۔اس وقت 489 ممبران کے ہاؤس میں 21 مسلمان ایم پی تھے۔ 1977 تک ملک کے طول وعرض پر کانگریس کا دبدبہ تھا مسلمانوں کی نمائندگی 21 سے 34 کے درمیان رہی۔اس طرح ایوان میں ان کی نمائندگی 2 سے 7 فی صد کے درمیان رہی۔صرف 1980 میں یہ تعداد 49 تک پہنچی 1984 میں 46 ہوگئی 1989 کے بعد ملک کی سیاست میں بھارتیہ جنتا پارٹی کا زور بڑھا اور رام مندر تحریک نے ملک کی ہوا فضا کو پوری طرح فرقہ وارانہ رنگ میں رنگ دیا اور Polarisation کا دور شروع ہوا اس کے بعد مسلمانوں کی نمائندگی پھر گھٹنے لگی 2004 کے الیکشن میں صرف 22 مسلمان جیتنے میں کامیاب ہوئے جو پچھلے باسٹھ سال میں سب سے کم تھا۔ 15 ویں لوک سبھا میں صرف 22 مسلمان اور 16 ویں لوک سبھا میں جس میں نریندر مودی کی قیادت میں بی جے پی کو واضح اکثریت حاصل ہوئی کل 23 مسلمان ممبران ہیں۔اس طرح لوک سبھا میں مسلمانوں کی نمائندگی محض 4% ہے جو 1957 کے بعد سب سے کم ہے۔ان میں آندھرا پردیش،لکشدیپ اور تامل ناڈو سے ایک ایک،آسام

سے دو، بہار سے چار، جموں کشمیر اور کیرالہ سے تین تین اور مغربی بنگال سے 8 ایم پی ہیں۔ 8 ایم پی مسلم جماعتوں کے ہیں جس میں ایم آئی ایم۔ یو ڈی آف اور مسلم لیگ ہے۔ باقی کانگریس، آر جے ڈی اور ترنمول کانگریس اور این سی پی سے جیت کر آئے ہیں۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ یوپی جہاں مسلمانوں کی آبادی چار کروڑ سے اوپر ہے اور وہاں وہ کل آبادی کا 22% ہیں وہاں سے 2014 کے الیکشن میں کسی بھی پارٹی کا ایک بھی مسلمان ایم پی جیت کر نہیں آیا۔

معاملہ صرف لوک سبھا کا نہیں ہے ریاستی اسمبلیوں کا حال بھی بہت برا ہے۔ یوپی جو سب سے بڑی ریاست ہے اور جہاں مسلمانوں کی آبادی چار کروڑ سے اوپر ہے وہاں 1951 سے 1977 کے بیچ ان کی نمائندگی 5.9 فیصد سے 9.5 فیصد تھی۔ 2012 میں یہ 17.1% فی صد تک ہوگئی۔ مگر 2017 کے ریاستی انتخاب میں مسلمان 1951 کی پوزیشن میں پہنچ گئے اور ان کی نمائندگی محض 5.9% رہ گئی بہار میں 1985 میں مسلمانوں کی نمائندگی سب سے زیادہ 10.46% تھی 2015 کے الیکشن میں 243 کے ہاؤس میں ان کی نمائندگی صرف 24 ہے۔

مہاراشٹر، راجستھان، ام پی، ہریانہ، چھتیس گڑھ اور دہلی میں کل 968 سیٹ ہیں پچھلے دو الیکشن میں مسلمانوں کی تعداد 35 سے گھٹ کر محض 20 رہ گئی ہے۔ اس طرح مسلمانوں کی نمائندگی میں 35% کی کمی ہوئی ہے۔

2014 میں غیر بی جے پی ریاستوں میں کل مسلمان ایم ایل اے کی تعداد 300 ہے جو کل ایم ایل اے کی تعداد کا 13% ہے بی جے پی کے کل 1418 ایم ایل اے ہیں جن میں صرف 4 مسلمان ہیں جو مجموعی تعداد کا 0.28% ہے بی جے پی اس وقت ملک کی 29 میں سے 19 ریاستوں میں حکومت کر رہی ہے۔ محض تین ریاستوں من اس کے ٹکٹ پر ایک یا دو امیدوار جیتے ہیں۔

ان اعداد و شمار سے واضح ہوجاتا ہے کہ مسلمان سیاسی طور پر پوری طرح Marginalised ہوگئے ہیں اور ان کو سیاسی طور پر اچھوت بنا کر رکھنے کی سازش پوری طرح

کامیاب ہوتی نظر آ رہی ہے۔

2014 کے الیکشن میں نریندر مودی نے کانگریس مکت بھارت کا نعرہ دیا تھا۔ مگر عملاً یہ مسلمان مکت بھارت پر منتج ہو رہا ہے۔ اب تک ہندوستانی سیاست میں مسلمانوں کو ووٹ بنک کے طور پر دیکھا جاتا تھا اور یہ سمجھا جاتا تھا کہ مسلمان جس پارٹی یا گروہ کی حمایت کریں گے ملک کی زمام کار اس کے ہاتھ میں آئے گی۔ اس مفروضہ کی دو وجوہات تھیں۔ پہلی یہ کہ ہندوستان کا ہندو سماج ذات پات اور اگڑے پچھڑے میں بٹا ہوا ہے۔ لہٰذا جب ان طبقات کے درمیان اقتدار کی کشمکش ہوگی تو ان کا ووٹ تقسیم ہوگا اس صورت میں مسلمان جس گروہ یا طبقہ کی حمایت کریں گے اس کا پلڑا بھاری ہوگا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ مسلمان عموماً ان بلوک ووٹ کرتے ہیں لہٰذا ان کا ووٹ تقسیم نہیں ہوتا ہے۔ اس وجہ سے یہ الیکشن نتائج پر اثر انداز ہونے کی زیادہ صلاحیت رکھتے ہیں۔ اس اعتبار سے مسلمان ہندوستان میں کنگ میکر تصور کئے جاتے تھے۔ مگر 2014 کے لوک سبھا الیکشن نے اور 2017 کے یوپی اسمبلی کے الیکشن نے یہ بھرم پوری طرح توڑ دیا ہے۔

2014 میں نریندر مودی پورے بھارت میں ہندو ہردے سمراٹ بن کر ابھرے اور انہوں نے ایسی ہوا چلائی کہ سارے اگڑے پچھڑے اور دلت ان کے ساتھ ہو گئے اور پچھلے تیس سال سے جو کولیشن پالی ٹکس ہو رہی تھی اس کا خاتمہ ہو گیا اور بی جے پی کو اکیلے 282 سیٹیں حاصل ہوئیں اور بھارتیہ جنتا پارٹی کو واضح اکثریت مل گئی۔ مسلمانوں نے بی جے پی کو ووٹ نہیں دیا۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ مسلمان کنگ میکر نہیں ہیں اور ان کی حمایت کے بغیر بھی ایوان میں واضح اکثریت حاصل کی جا سکتی ہے۔

جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے کہ یوپی میں مسلمان چار کروڑ تیس لاکھ ہیں جو یوپی کی کل آبادی کا 22% ہے۔ مغربی یوپی کے کئی اضلاع ایسے ہیں جہاں ان کی ابادی 30% سے زائد ہے۔ اس کے باوجود 403 کے ہاؤس میں بی جے پی کو اکیلے 312 اور اس کی حلیف جماعتوں کو گیارہ نشستیں حاصل ہوئیں۔ بی جے پی نے ایک بھی مسلمان امیدوار کھڑا نہیں کیا اور

مسلمانوں کی نمائندگی گھٹ کر محض 5.9% رہ گئی۔ جواب تک کی سب سے کم نمائندگی ہے۔

ہندوستانی سیاست کی دوسری خطرناک بات یہ ہے کہ اس وقت پورے ملک میں سیکولرزم ایک دھوکہ کی ٹٹی ثابت ہوچکی ہے۔ لوگ بڑی آسانی کے ساتھ سیکولرزم کا نقاب اتارتے رہتے ہیں۔ جس کی حالیہ مثال بہار کا لالو یادو، نتیش کمار اور کانگریس کا مہا گٹھ بندھن تھا۔ لوگوں نے اس گٹھ بندھن کو بھاری ووٹ سے جتادیا اور بی جے پی کی کراری ہار ہوئی۔ لیکن چند مہینوں کے اندر ہی نتیش کمار نے پانسہ پلٹ دیا اور مہا گٹھ بندھن چھوڑ کر بی جے پی کی گود میں جا کر بیٹھ گئے۔ صرف جے ڈی یو ہی نہیں ملک کی کم وبیش تمام پارٹیاں اس طرح کا کھیل کھیلتی رہی ہیں۔ اس وجہ سے سیکولر زم اب تو ایک گالی ہوگئی ہے۔ یہاں تک کانگریس جو سیکولرزم کی سب سے بڑی علم بردار سمجھی جاتی رہی ہے اپنی اس شبیہہ سے چھٹکارا پانے کی کوشش کر رہی ہے اور اس نے سوفٹ ہندوتو کا راستہ اختیار کرلیا ہے۔ دراصل کانگریس نے 1971 سے ہی اپنی پالیسی میں تبدیلی کردی تھی اور اس نے سوفٹ ہندوتو کا راستہ اختیار کرلیا تھا۔ مگر بھارتیہ جنتا پارٹی اس میدان کی مجھی ہوئی کھلاڑی ہے اس لیے اس نے کانگریس کو مات دے دیا اور اس کے ہاتھ سے اقتدار چھین لیا۔ پچھلے گجرات چناؤ میں کانگریس نے اپنی پالیسی میں واضح بدلاؤ کیا اور وہ خود کو سیکولر سیاست سے دور کرتی نظر آرہی ہے۔ راہل گاندھی کا مندروں کا دورہ اس تبدیلی کی واضح علامت ہے۔

لہٰذا ہندوستانی سیاست اس وقت خطرناک موڑ مڑ چکی ہے اور اقلیت بالخصوص مسلمانوں کو حاشیہ پر رکھ کر بلکہ ان کو اور ان کے ایشوز کو پوری طرح نظر انداز کر کے سیاست کرنے کا رجحان نظر آرہا ہے۔ اس طرح ہندوستانی جمہوریت فسطائیت کا روپ اختیار کرتی جارہی ہے۔ ہندوستانی سیاست اور ذرائع ابلاغ کے ذریعہ ہندوستانی مسلمانوں کو پوری طرح شیطان بنا کر یعنی (Demonise) کر کے ان کے لیے ہمدردی کے جذبات ختم کرنے کی کوشش کی جارہی ہے تاکہ لوگ ان کی مظلومیت اور محرومی بلکہ ان کے خلاف ہونے والے ظلم کو ان کے کرتوت کا بدلا مان کر جواز ڈھونڈنے میں کامیاب ہوجائیں اور ان کے خلاف کی گئی کسی بھی کاروائی پر

زبان احتجاج بلند نہ کریں۔ اس صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے 22 جنوری 2018 کو انڈین ایکسپریس میں اپنے ایک مضمون میں نی سم منّا تھوکرن نے لکھا ہے۔

Unlike physical attacks against Muslims, this political cleansing is insiduous for it is executed through perfectly legitimate and democratic methods. After all, people might ask, what is democracy other than the enforcement of the will of the majority? The answer is that Hindutva's electorate majority does not want Muslims to be politically represented. This is what Alexis de Tocqueville called the "tyranny of majority " as early as the 19th century. The last four years have seen a terrifying demonstration of this tyranny in action.

(Nissim Manna Thukkaran is chairman in the Department of International Development Studies at Dalhousie University in Halifax, Canada)

''مسلمانوں پر جسمانی حملہ کے برعکس مسلمانوں کی یہ سیاسی تطہیر بہت ہوشیاری سے کی جارہی ہے کیونکہ یہ بات قانونی اور جمہوری طریقے سے کی جارہی ہے۔ آخر لوگ پوچھ سکتے ہیں کہ جمہوریت اکثریت کی خواہش کے نفاذ کے سوا اور کیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ہندوتو کے علم بردار اکثریتی رائے دہندگان نہیں چاہتے کہ مسلمانوں کی سیاسی نمائندگی ہو۔ یہ وہی چیز ہے جس کو الیکسس ڈی ٹوکویل نے ۱۹ویں صدی کے اوائل میں ہی اکثریت کا ظلم قرار دیا ہے۔

پچھلے چار سال میں ہم نے اس خوفناک چیز کو عملی طور پر دیکھا ہے۔''

اس مضمون کی ابتدا میں نی سم نے 18 ویں صدی کے انگلینڈ کے مشہور پارلیامنٹرین ایڈمنڈر برک کا مندرجہ ذیل قول نقل کیا ہے۔

"In a democracy , the majority of citizens is capable of

exercising the most cruel oppression upon the minority "
Edmund Burke

جمہوریت میں اکثریت،اقلیت پرحد درجہ ظالمانہ تعذیب کی صلاحیت رکھتی ہے اس کی مثال ہم جرمنی، اٹلی،کمبوڈیا،اسرائیل اورحالیہ دنوں کے میانمار میں دیکھ سکتے ہیں۔

2002 کے گجرات فساد کے بعدالیکشن ہوئے اس میں سونیا گاندھی نے نریندرمودی کوموت کا سوداگرقرار دیا۔اس وقت نریندرمودی گجرات میں ہندو ہردے سمراٹ بن چکے تھے اور ان کی مقبولیت نصف النہار پرتھی اس بات کا زبردست ردعمل ہوا اور کانگریس کو زبردست شکست ہوئی۔ دودھ کا جلا مٹھا پھونک پھونک کر پیتا ہے۔ اس سے سبق لیتے ہوئے اس بار کے گجرات انتخاب میں کانگریس مسلمان اورمسلم ایشوز کو بالکل بھول گئی اور راہل گاندھی مندر جاجا کر یہ ثابت کرنے میں لگ گئے کہ وہ بھی جینوٗدھاری ہندو ہیں۔اس سے ان کی نئی شناخت بنی اب تک جولوگ ان کو ہندوستانی سیاست کا پپو کہتے تھے ان کو سنجیدگی سے لینے لگے اور چناؤ نتیجوں نے بھی ان کے سیاسی قد کو بڑھادیا۔گویا ہندتو کی سیاست میں اس وقت آفیشیل کرنسی ہے اور آئندہ انتخابات اکثریتی ایجنڈے پر ہوں گے۔جس کا سیدھا مطلب ہے کہ مسلمان آنے والے دنوں میں سیاسی طور پرمزید حاشیہ پر لگادیے جائیں گے۔

اس کا واضح اشارہ 2018 کے انڈیا ٹوڈے کنکیلو میں سونیا گاندھی کے اس بیان سے ہوتا ہے جس میں انہوں نے کہا تھا کہ کانگریس کولوگ مسلمانوں کی پارٹی سمجھتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ مسلمانوں سے پیچھا چھڑانا چاہتی ہے اوراب کانگریس کوخالص ہندو پارٹی کے طور پر پروجیکٹ کرنے کی قواعد شروع ہوچکی ہے۔گویا کانگریس نے اپنانام نہاد سیکولر نقاب اتار کر پھینک دیا ہے۔

سونیا گاندھی کے اس بیان پرتبصرہ کرتے ہوئے ہرش مندر جنہوں نے 2002 کے گجرات فساد کے بعد ای اے اس کی نوکری سے رضا کارانہ سبکدوشی لے لی تھی اور اب وہ

انسانی حقوق کے تحفظ کے لیے ایک این جی او چلاتے ہیں نے 17 مارچ2018 کو انڈین ایکسپریس میں شائع اپنے ایک مضمون میں لکھا کہ اس وقت مسلمان اایک ایسے سیاسی یتیم ہیں جن کو کوئی پارٹی اپنانے کو تیار نہیں ہے۔موجودہ حالات تقسیم ہند کے دنوں کے حالات سے بھی بدتر ہیں جس کی وجہ سے مسلمانوں کی عظیم اکثریت خود کو یکا وتنہا اور بے یار و مددگار محسوس کرتی ہے۔اس وقت مسلمانوں سے کھلے عام نفرت کا اظہار معمول ہو گیا ہے۔اسکول، یونیورسٹی، کام کے مقام، ڈرائنگ روم، انٹرنیٹ اور سیاسی ریلیوں میں ان کے خلاف نفرت اور تشدد کا اظہار کیا جارہا ہے۔نتیجہ ہے کہ مسلمان اپنی شناخت چھپانے پر مجبور ہیں۔مسلمان اس وقت نہ صرف سیاسی طور پر غیر اہم بنادیئے گئے ہیں بلکہ وہ نئے سیاسی اچھوت ہیں۔ یہاں تک کہ دلت لیڈر شپ بھی مسلمانوں کو بغیر اپنی شناخت کے یعنی بغیر داڑھی ٹوپی اور برقع کے آنے کی ہدایت دے رہی ہے۔ان کے خیال میں مسلمان ان کے لیے بوجھ بنتے جارہے ہیں جس سے وہ خود کو الگ کرنا چاہتے ہیں۔

خود مسلمانوں کے اندر بھی مایوسی پیدا ہورہی ہے اور وہ سیاست سے کنارہ کشی کرتے نظر آرہے ہیں۔مسلمانوں سے ہمدردی یا تعلق منہ بھرائی تصور کی جاتی ہے جس سے ہندو رائے دہندگان ناراض ہوجاتے ہیں۔ہرش مندر نے انتباہ دیتے ہوئے کہا ہے کہ اگر لبرل سیاسی جماعتیں اس طرح کے اکثریتی سیاست کے سامنے گھٹنے ٹیک دیں گی تو یہ ملک کے لیے بہت خطرناک بات ہوگی۔لیکن سیاسی پارٹیوں کو اس سے کوئی لینا دینا نہیں ہے۔انہیں تو کسی طرح اقتدار میں آنا ہے۔چاہے وہ مسلمانوں کو مار کر آئیں یا ان کو نظر انداز کر کے آئیں۔

ہرش مندر کے مضمون کے جواب میں ایک دوسرے لبرل مورخ رام چندر گوہا نے ایک مضمون لکھا جس میں انہوں نے مسلمانوں کو برقعہ، ٹوپی، ڈاڑھی چھوڑ کر اپنی شناخت گم کرنے کا مشورہ دیا کیونکہ یہ ان کی نظر میں اس طرح قابل اعتراض ہے جیسے ترشول بھانجنا۔ رام چند گوہا ہندو کٹر پنتھیوں کو سمجھانے کے بجائے اور عوام کو اس طرح کی سیاسی ذہنیت کے نقصانات سے آگاہ کرنے کے بجائے، مسلمانوں کو شیخ عبداللہ، عارف محمد خان اور حمید دلوائی

کے نقش قدم پر چلنے کا مشورہ دینے لگے۔ میں شیخ عبداللہ پر کوئی تبصرہ کرنا نہیں چاہتا۔ عارف محمد خان[1] یہ گٹر میں کھلے کنول کے نئے پھول ہیں۔ انھوں نے اپنا چولا ہی نہیں بدلا ہے اپنا قبلہ بھی تبدیل کرلیا ہے۔ تاہم ان پر کوئی تبصرہ قبل از وقت ہوگا۔ تاہم حمید دلوائی تو سیدھے سیدھے اسلام کا قلادہ اتار کر قشقہ کھینچ کر دیر میں بیٹھنے کی تلقین کرتے تھے۔ لہٰذا مسلمان ان کے اس مشورے کو حقارت کے ساتھ رد کرتے ہیں۔

ہم اتنا جانتے ہیں کہ اکثریتی جمہوریت، جمہوریت کی نفی ہے جو ملک کے لیے فال نیک نہیں ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کو نظر انداز کرنا ایک خطرناک عمل ہوگا جس کے انجام بد سے ملک کو نہیں بچایا جا سکتا ہے۔ اوپر نی سم نے اپنے مذکورہ مضمون میں صاف صاف لکھا ہے۔

> A democracy will become brittle when its minorities are systematically subjected to political apartheid and denied political representation. certainly no democracy can be real democracy when its oppressed castes and class are pitted against each other on the basis of religion.
>
> ''ایک جمہوریت اس وقت ظالمانہ، ناپسندیدہ اور کمزور ہوجائے گی جب کہ اقلیتوں کو منظم طریقے سے سیاسی اچھوت بنادیا جائے اور اسے سیاسی نمائندگی سے محروم کردیا جائے۔ ظاہر ہے ایسی جمہوریت حقیقی جمہوریت نہیں ہوسکتی ہے جب اس کی دبی کچلی ذاتیں اور طبقات مذہب کے نام پر ایک دوسرے کے خلاف صف آرا کردی جائیں۔''

اب اگر سیاسی قائدین اور جماعتیں ان اندیشوں اور خطرات پر دھیان نہیں دیتی ہیں تو یہ ان کا معاملہ ہے مجھے نہیں معلوم کہ 2019 میں اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا۔[۲] مگر کانگریس

(۱) عارف محمد خان کی ایسی رائے کو نہیں جانتا جو مسلمانوں کی عام سمجھ اور مفاد کے خلاف ہے۔

(۲) 2019 کے الیکشن میں ملک نے پوری مضبوطی کے ساتھ بی جے پی کے حق میں فیصلہ دے دیا ہے اور اسے ایوان میں 302 سیٹیں ملی ہیں اور حلیف پارٹیوں کے ساتھ اس کی نمائندگی 350 ہے جو اس کی بڑھتی پھیلتی اور مضبوط ہوتی پوزیشن کی آئینہ دار ہے۔

بھی بی جے پی کی راہ چلتی ہے تو مسلمان اس کے زرخرید غلام نہیں ہیں وہ بھی اپنا سیاسی فیصلہ خود لیں گے۔

دستور پر بحران:

اس وقت معاملہ صرف اتنا نہیں ہے کہ مسلمان یا دلت طبقات پر خطرے کے بادل منڈلا رہے ہیں بلکہ جیسا کہ ہندوستان کے مشہور قانون داں فالی نری من نے کہا ہندوستان کا دستور خطرے میں ہے اور جس دن ملک کا موجودہ دستور خطرے میں پڑ جائے گا ملک کا سماجی امن اور اس کی جغرافیائی وحدت بھی خطرے میں پڑ جائے گی۔

لوگ تقسیم ملک کے لیے مسلم لیگ اور جناح کو جتنا بھی موردالزام ٹھہرائیں دراصل دو قومی نظریہ جناح صاحب کے ذہن کی پیداوار نہیں تھا۔ اس نظریہ کے اولین وکیل وی ڈی ساورکر تھے۔ جنہوں نے 1923 میں اپنے ایک مضمون میں ہندوتو میں اس نظریہ کو سب سے پہلے پیش کیا۔ اس کے بعد ہندو مہا سبھا کے لیڈر لالہ لاجپت رائے نے 14 دسمبر 1924 کو ''دی ٹری بیون'' اخبار جس میں نہ صرف دو قومی نظریہ کی وکالت کی بلکہ تقسم ملک کا پورا نقشہ پیش کیا۔ جناح صاحب نے اس کے 16 سال بعد اس نظریہ کو تسلیم کیا اور اس طرح ملک تقسیم ہوا۔ لالہ لاجپت رائے کا اقتباس مندرجہ ذیل ہے:

> "Under my scheme the Muslim will have four states (1) The pathan province or the North West Frontier; (2) Western Punjab (3) Sindh and (4) East Bengal. If there are compact Muslim communities in any pat of the India, sufficiently large to form province they should be similarly constituted. But it should be distinctly understood that it is not a united India. It means a clear partition of India into a Muslim India and a non-Muslim India "

''میرے منصوبے کے تحت مسلمانوں کو چار ریاستیں۔ پٹھان صوبہ یا شمال

مغربی سرحد (۲) مغربی پنجاب (۳) سندھ اور (۴) مشرقی بنگال ملیں گے۔
اگر مسلمانوں کی مجموعی آبادی ہندوستان کے کسی حصہ میں اتنی زیادہ ہے کہ وہ
ایک صوبہ بن سکتا ہے تو اس کو بھی اسی طرح تشکیل دیا جاسکتا ہے۔ مگر یہ بات
واضح طور پر سمجھ لینی چاہیے کہ یہ متحدہ ہندوستان نہیں ہوگا۔ اس کا مطلب ہے
کہ واضح طور پر ہندوستان کی تقسیم مسلم انڈیا اور غیر مسلم انڈیا کے طور پر ہوگی۔''

جب اتنے صاف الفاظ اور ایک واضح نقشہ کے ساتھ تقسیم ہند کی وکالت کی جارہی ہے تو سمجھا جاسکتا ہے کہ اس کا مقصد کیا تھا۔ دراصل ہندو انتہا پسند گروہ یہ سمجھتا تھا کہ اگر اس ملک میں مسلمانوں کی معتد بہ موجودگی رہے گی بالخصوص ان کے اکثریتی علاقے ہندوستان میں شامل رہیں گے تو ہندوستان کو ہندو راشٹر یہ نہیں بنایا جاسکتا ہے۔ اس لیے انہوں نے ہندوستان کے مسلم اکثریتی علاقے کو ہندوستان سے الگ کر کے بھارت کو ہندو راشٹر یہ بنانے کا منصوبہ پیش کیا۔

ابتداً کسی نے اس خیال کی تائید نہیں کی۔ مگر دھیرے دھیرے جیسے جیسے تحریک آزادی اپنے آخری انجام کی طرف بڑھنے لگی یہ لَے تیز ہوگئی۔ پے در پے سیاسی اصلاحات کی کوششیں جب ناکام ہوگئیں تو کانگریس اور مسلم لیگ کی لیڈر شپ نے انتہا پسند رہنماؤں کے نظریات کو تسلیم کرتے ہوئے تقسیم ملک کے فورمولے پر حامی بھر دی۔ اس معاملہ میں کس کو الزام دیا جائے اور کس کو بری کیا جائے، یہ متنازعہ سوال ہے۔ ہم اس کو ایک تاریخی موڑ اور تقدیر کا فیصلہ مانتے ہیں۔

بہرحال ویر ساورکر، آریہ سماج، ہندو مہاسبھا اور آر ایس ایس جیسی تنظیمیں اس بات کی حمایت کرتے تھے کہ تقسیم ملک کے بعد جو مسلمان ہندوستان میں رہ جائیں گے انہیں یا تو ہندو دھرم میں واپس آنا ہوگا یا ان کو تمام شہری حقوق سے محروم کر دیا جائے گا اور وہ ہندوستان میں دوسرے درجے کے شہری کی حیثیت سے رہیں گے۔ گولوالکر نے جو آر ایس ایس کے دوسرے سرسنچا لک ہیں اور جن کو ان کے ماننے والے گروجی کے نام سے پکارتے ہیں انہوں

نے 1939 میں We or Our Nation Defined کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں انہوں نے اپنی قومیت کے نظریات پر بحث کرتے ہوئے لکھا کہ

> "Foriegn races in Hindustan must either adopt the Hindu culture and language, must learn to respect and hold in reverence Hindu religion, must entertain no idea but those of glorification of the Hindu race and culture I.e.of the Hindu nation and must lose their separate existence to merge in the Hindu race or may stay in the country, wholly subordinated to Hindu nation claiming nothing, deserving no privileges far less any preferential treatment, not even citizens rights." (page 104 -5)

> ''ہندوستان میں رہنے والی غیر ہند واقوام کولازماً ہند وکلچر اور زبان اختیار کرنا ہوگا۔ ہندودھرم اور اس کے تقدیس کا احترام کرنا سیکھنا ہوگا۔ ہندوقوم اور کلچر کا گن گان کرنے کے علاوہ کوئی اور تصور نہیں رکھنا ہوگا۔ یعنی ہندوقوم کی عظمت تسلیم کرنی ہوگی اور ہندوقوم میں اپنی علیحدہ شناخت کوختم کرنا ہوگا انہیں ملک میں پوری طرح ہندوقوم کے زیر نگیں رہنا ہوگا ان کا کوئی حق یا استحقاق نہیں ہوگا۔کوئی ترجیحی سلوک تو دور انہیں شہری حقوق بھی حاصل نہیں ہوں گے۔''

یہ ہے وہ خوابوں کا ہندوستان جو بی جے پی اور آر ایس ایس اس ملک میں بنانا چاہتی ہے۔ واجپئی صاحب سے انڈیا ٹی وی کے مالک رجت شرما نے اپنی عدالت میں سوال کیا تھا تو انہوں نے کہا تھا کہ یہ بہت پرانی باتیں ہیں۔انہوں نے اس سوال پر تفصیلی روشنی ڈالنے کے بجائے خاموشی اختیار کرلی۔لیکن سنگھ پریوار بھارت کے دستور کوموجودہ شکل میں تسلیم نہیں کرتا۔ خود واجپئی جی کی وزارت میں دستور میں تبدیلی کی کوشش ہوتی رہی ہے جس کو اس وقت کے صدر جمہوریہ کے آر نارائنن نے تارپیڈو کردیا بعد میں سپرم کورٹ نے کیشوا نند بھارتی کیس میں فیصلہ دیتے ہوئے واضح کیا کہ دستور کے موجودہ خد وخال اور اس کے بنیادی ڈھانچہ میں

کوئی تبدیلی نہیں کی جاسکتی ہے۔تاہم سنگھ پریوار اپنی کوششوں سے باز نہیں آیا ہے۔

دس سال کی کانگریسی حکومت کے بعد جب 2014 میں نریندر مودی کی قیادت میں بی جے پی کی حکومت بنی تو انہوں نے اعلان کیا کہ دستور ہند ان کے لیے ایک مقدس کتاب ہے اور ملک دستور سے ہی چلے گا کوئی اور ضابطہ قابل قبول نہیں۔مگر جس تیزی کے ساتھ ملک کے دستوری اداروں کو ہندتو کے رنگ میں رنگا جارہا ہے اور دستوری عہدوں پر بیٹھے ہوئے لوگ جس طرح دستور کے خلاف بیان بازی کررہے ہیں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ محض دکھاوٹی باتیں ہیں اور درپردہ بھارت کو ہندوراشٹریہ بنانے کے ایجنڈے پر پوری ہوشیاری اور مستعدی سے کام ہورہا ہے۔صرف انتظار مناسب وقت اور اس شبھ گھڑی کا ہے فی الوقت ان کی کوشش ہے کہ ان کی موجودہ حکومت کو تھوڑا دوام واستحکام حاصل ہو تو ان کا ایجنڈا نافذ کرنا آسان ہوگا۔

مختلف ریاستوں کے وزرائے اعلیٰ، گورنر اور وزراء جس طرح کی بیان بازی کررہے ہیں اس سے ہوا کے رخ کا انداز ہوتا ہے۔دراصل بھارت میں ہندوؤں کی غالب اکثریت ہے۔اس لیے بھارت جمہوری طور پر ہندوراشٹریہ ہے ہی اور اس کی شروعات بقول ولیم کاولڈ 19 ویں صدی کے اواخر سے ہوچکی تھی۔اور ٹائمس آف انڈیا کے متوفی ایڈیٹر گری لال جین کے بقول1947 سے سوائے نام کے بھارت ہر طرح سے ہندور راشٹریہ رہا ہے۔اس کی تصدیق عوامی عہدوں پر مسلمانوں کی گھٹتی نمائندگی اور نت نئے نفسیاتی داؤ سے ہوتی ہے۔آزادی کے بعد کچھ مسلمان صدر نائب صدر اور گورنر ضرور ہوئے ہیں۔راجستھان، آسام، مہاراشٹر اور بہار میں اکا دکا لوگ کچھ وقتوں کے لیے وزیراعلیٰ بھی بنائے گئے ہیں۔مگر اب صورتحال بالکل بدل چکی ہے اور 21 ویں صدی کے ہندوستان میں ایسی کوئی چیز سوچنا محال ہے۔پچھلے گجرات چناؤ میں ہندو ووٹ کو پولرائز کرنے کے لیے وزیراعظم نریندر مودی نے یہ شوشہ چھوڑا کہ اگر کانگریس جیت گئی تو وہ کسی مسلمان کو وزیراعلیٰ بنانے کی سازش رچ رہی ہے۔ان کا اشارہ احمد پٹیل کی طرف تھا جو سونیا گاندھی کے سیاسی مشیر ہیں اور گجرات سے راجیہ سبھا کے ممبر ہیں۔اس ایک جملہ نے بی جے پی کی ہار کو جیت میں بدل دیا اور لوگ سارے گلے شکوے بھلا کر اس اندیشے

سے بچنے کے لیے بی جے پی کو ووٹ دینے پر مجبور ہو گئے۔ یوپی، آسام اور تمام دوسری ریاستوں میں بی جے پی نے ہندتو کارڈ کو جس بے شرمی سے کھیلا ہے وہ اس کی ذہنیت کی عکاس ہے یہ بی جے پی کے لیے سنجیون بوٹی اور ایسا ماسٹر اسٹروک ہے جس سے آخری وقت میں اپنے حق میں آسانی سے پانسہ پلٹا جا سکتا ہے۔

بی جے پی اور آر ایس ایس کی خاص بات یہ ہے کہ اس کے کئی ترجمان ہیں جو ایک ساتھ کئی زبانوں میں بات کرتے ہیں۔ ایک بات ہوا میں اچھال کر وہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ اس کا ردعمل کیا ہوا۔ اگر ردعمل ان کے نظریات کے مطابق نہیں ہوا تو بڑی آسانی سے اسے اس فرد کی ذاتی رائے قرار دے کر اپنا پلہ جھاڑ لیتے ہیں اور ردعمل ان کے حق میں ہوا پھر اسے وہ اپنی پالیسی بناتے ہیں۔ یہ سلسلہ چل رہا ہے۔ سنگھ پریوار ہر ممکن طریقہ سے اپنے اقتدار کو دوام بخشنا چاہتا ہے تاکہ وہ اپنا ہدف پورا کر سکے۔

مرکزی وزیر اننت ہیگڑے نے 26 دسمبر 2017 کو کرناٹک میں اعلان کیا کہ ہم لوگ آنے والے دنوں میں موجودہ دستور کو بدل دیں گے۔ ان کے اس اعلان پر دلت حلقوں نے بہت شور مچایا تو کہہ دیا گیا کہ یہ ان کی ذاتی رائے ہے۔ پوری خبر آئی کہ سنگھ نے مجوزہ دستور تیار کر لیا ہے جس کو مناسب وقت میں سامنے لایا جائے گا۔

ایک طرف سنگھ کی کوشش ہے کہ دلت طبقات اور آدی باسی کو خود سے قریب لایا جائے اور ان کے ہندوانے کا عمل تیز کر کے ان کو ہندو سماج سے پوری طرح جوڑ لیا جائے۔ دوسری طرف سنگھ ورن وستھا کو قائم رکھنا چاہتا ہے اور بڑی ذات بالخصوص برہمنوں کو ہندوستانی سماج میں اعلیٰ حیثیت میں برقرار رکھنا چاہتا ہے۔ تاکہ دھرم، سنسکرتی اور دیگر اداروں پر ان کا اقتدار برقرار رہے۔ اس مقصد کے حصول میں موجودہ دستور سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ اسی طرح وہ ریزرویشن کے دائرے کو Rationalise کر کے محدود کرنا چاہتا ہے تاکہ دلتوں میں جو مڈل کلاس تیزی سے ابھر رہا ہے اور اس کے Aspiration جس طرح سے جارح ہوتے جا رہے ہیں ان پر لگام لگائی جائے۔ آزادی کے 70 سال کے بعد بھی ہندوستانی ذہنیت نے ریزرویشن

کو قبول نہیں کیا ہے۔ اگر دلتوں اور او بی سی کا ریزرویشن ختم کر دیا جائے یا اس کو محدود کر دیا جائے تو دلت آدی باسی اور او بی سی نمائندگی یکا یک گھٹ کر دو سے پانچ فیصد رہ جائے گی اور پھر سے اعلیٰ ذاتوں کا مکمل دبدبہ قائم ہو جائے گا۔

اس لیے دستور میں تبدیلی کے پیچھے پہلا ٹارگٹ مسلمان اور دوسرا ٹارگٹ ایس سی، ایس ٹی ہیں یہی وجہ ہے کہ دلت طبقات میں بے چینی دیکھی جا رہی ہے اس لیے کہ وہ نوشتہ دیوار پڑھ رہے ہیں۔ بہر حال ملک ایک بار پھر ایک خطرناک موڑ پر کھڑا ہے اور ملک کا دستور دلت اور مسلمان تینوں پر خطرے کے بادل منڈلا رہے ہیں۔ دلت کیا رخ اختیار کریں گے یہ تو دلت لیڈرشپ بتائے گی۔ اس وقت کوشش یہ ہے کہ مسلمانوں کو الگ تھلگ کر کے پہلے ان سے نپٹ لیا جائے پھر اور طبقات کی طرف دیکھا جائے گا۔ حال کے دنوں میں تین طلاق کے نام پر مسلم پرسنل لاء میں چھیڑ چھاڑ، علی گڑھ اور جامعہ کے اقلیتی کردار پر حکومت کے موقف میں تبدیلی اور نئے سرے سے ہندو مسلم کش مکش میں اضافہ اور فسادات کی تیاری ایک واضح دھروی کرن کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ ہرش مندر نے لکھا ہے کہ بی جے پی اور سنگھ پریوار اپنے سازشی عزائم کی تکمیل کے لیے ایک طرف ہندوؤں کی تمام ذاتوں آدی باسیوں، یہاں تک کے نارتھ ایسٹ میں عیسائیوں کو بھی مسلمانوں کے خلاف گول بند کرنے میں کامیاب ہے۔ اس طرح اس وقت اس کے نشانے پر صرف مسلمان ہیں۔ لہٰذا 1947 کے بعد یعنی آزادی کے ستر سال بیتنے کے بعد اکیسویں صدی کی دوسری دہائی میں مسلمانوں کے سامنے پھر سے Existential crisis کھڑا ہو گیا ہے جس پر مسلمانوں کو بہت سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔

پس چہ باید کرد:

اس وقت حالات کم و بیش ویسے ہی ہیں جیسے 1857 اور 1947 میں تھے۔ مسلمانوں کو ایک بات اچھی طرح سمجھنی ہوگی کہ وقت کی گاڑی ایک نئی راہ پر چل پڑی ہے۔ اس لیے پچھلی صدیوں کا کوئی تجربہ یا حکمت عملی موجودہ حالات میں مددگار نہیں ہوگی۔ ہمیں آوٹ

آف باکس جا کر سوچنا ہوگا۔ ہمیں نئے حالات نئے مسائل میں نئی حکمت عملی اختیار کرنی ہوگی۔

ہم اس وقت جس چکر ویو (Labyrinth) میں پھنسے ہیں جس کو کچھ لوگ A nation at siege یعنی ایک قوم جو چاروں طرف سے گھیر لی گئی ہے سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس کا تقاضہ کیا ہے؟ کیا ہم اپنے دین وشریعت کو چھوڑ دیں، اپنی پہچان گم کر دیں، اپنے مطالبات ترک کر دیں اور اپنے حق سے دست بردار ہو جائیں یا اپنے جمہوری اور انسانی حقوق سے باز آ جائیں یا یہاں کی اکثریت میں خود کو ضم کر دیں یا دوسرے درجے کے شہری بن کر رہیں؟ جیسا کہ کچھ سمجھدار لوگ مشورہ دیتے ہیں یا اکثریت کے غالی عناصر چاہتے ہیں؟ یہ تو سیدھا شدھی کرن ہے جس کو آج کل گھر واپسی کہا جا رہا ہے۔ کیا یہ کوئی متبادل ہے؟ اس متبادل سے تو موت بہتر ہے؟ جب تک ایک مسلمان کے اندر دین وضمیر زندہ ہے اور رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان ہے وہ اس متبادل کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا ہے۔

ہم ایک دینی ملت ہیں۔ لہٰذا ہماری شناخت ہمارا دین ہے۔ باقی تمام حیثیتیں ثانوی ہیں۔ لہٰذا ہمیں اسی دائرے میں سوچنا چاہیے اور اپنے مسائل کا حل نکالنا چاہیے۔ مقاصد شریعت کی روشنی میں مسلم سماج کی پانچ ضرورتیں نمایاں طور پر سامنے آتی ہیں جو موجودہ حالات میں ہماری اولین ترجیح ہونی چاہیے۔ (۱) دین کی حفاظت (۲) جان کی حفاظت (۳) نسل کی حفاظت (۴) مال کی حفاظت (۵) عقل کی حفاظت۔ لیکن یہ کیسے بروئے کار لایا جائے گا یہ سب سے پہلا سوال ہے؟

یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ مادی طور پر ہماری اصلی قوت ہماری آبادی (Demography) اور ہمارے انسانی وسائل (Human resources) ہیں۔ ہم اس ملک میں اقلیت میں ہیں اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم دس بیس لاکھ یا دو چار کروڑ ہیں بلکہ ہم اس ملک میں 20 کروڑ ہیں جو ملک کی کل آبادی کا 1/6 حصہ یعنی 15 فیصد ہے اور کم وبیش 115 اضلاع میں یا تو اکثریت میں ہیں یا برابر ہیں۔ دوسرے ہم اس ملک کی ہر ریاست، ہر خطے اور ہر علاقے میں ہیں۔ کوئی شہر اور منطقہ ایسا نہیں ہے جہاں ہماری آبادی نہ ہو۔ یہ صحیح ہے کہ

ہندوؤں کی تمام ذاتوں اور برادریوں سمیت آبادی ہم سے چھ گنا زیادہ ہے لیکن ہم گنتی میں اتنے کم نہیں ہیں کہ کوئی ہمیں جہاں چاہیے اچک لے۔ ہماری آبادی برطانیہ اور فرانس کو ملا دیا جائے تو اس سے بھی زائد ہے۔ دنیا میں مشکل سے چھ یا سات ممالک ہیں جن کی مجموعی آبادی بیس کروڑ سے زائد ہے۔ اتنی بڑی آبادی کو کسی طرح ہلاک (Annihilate) یا ملک بدر (Banish) نہیں کیا جاسکتا ہے۔ ہلاکو، چنگیز خان، ہٹلر، موسلینی، پول پاٹ، اسٹلن ہیل سلاسی جیسے لوگ جنہوں نے لاکھوں انسانوں کو مروایا ہے سو بار بھی جنم لیں تو ہندوستان کے مسلمانوں کو ختم نہیں کر سکتے ہیں۔ پہلی اور دوسری جنگ عظیم یورپ۔ ایشیا اور افریقہ کے تین براعظموں میں لڑی گئی تھی تمام مہلک ہتھیار استعمال کئے گئے تھے۔ دو دو ایٹم بم گرائے گئے ایک انداز ے کے مطابق ان دونوں جنگوں میں قریب دو کروڑ لوگ مارے گئے۔ اس طرح ہندوستانی مسلمانوں کی موجودہ تعداد کو ختم کرنے کے لیے دس عالمی جنگیں درکار ہوں گی۔ ایسا کچھ ہوتا ہے تو صرف مسلمان ہی نہیں پورا ہندوستان تباہ ہو جائے گا۔ ملک کی تقسیم کے وقت قریب ایک کروڑ لوگ متاثر ہوئے ساٹھ لاکھ لوگ ادھر سے ادھر ہوئے۔ قریب پانچ لاکھ لوگ مارے گئے اور اربوں کی جائداد تباہ ہوئی۔ قوموں اور ملکوں کی زندگی میں اس طرح کے شاک لگتے رہتے ہیں۔

ہندوستان بالآخر ایک جمہوری ملک ہے۔ ہمارے یہاں جمہوریت کی جڑیں کافی گہری ہیں۔ مضبوط دستوری ادارے ہیں۔ آزاد پریس، آزاد عدلیہ، قانون کی حکمرانی ہے۔ مضبوط سول سوسائٹی ہے۔ انسانی حقوق کے ادارے ہیں۔ بیدار، منصف مزاج رائے عامہ ہے۔ پوری عالمی برادری ہے، انٹرنیشنل ادارے ہیں، حکومتیں ہیں۔ ان سب کی موجودگی میں اگر ایک چھوٹا سا گروہ مسلمانوں پر حملہ کرتا ہے تو اس کو آسانی سے الگ کر کے اس کا مقابلہ کیا جاسکتا ہے۔ ہندوستان کی ہندو سوسائٹی اس کی غالب اکثریت 95-90 فی صد شریف، مہذب امن پسند ہیں اور قتل وخوں ریزی سے نفرت کرتے ہیں اور وہ کسی ایسے کام میں حصہ دار نہیں ہو سکتے ہیں۔ اس لیے جو کچھ ہوسکتا ہے وہ صرف اتنا کہ کچھ شر پسند عناصر فسادات کے ذریعہ، موب لینچنگ کے ذریعہ، کبھی لو جہاد، کبھی گاؤکشی اور کبھی مندر مسجد کے نام پر قتل وخون کی ہولی

کھیلیں اور اس طرح ان دہشت گردانہ کاروائیوں کے ذریعہ ایک خوف کی نفسیات (Fear Psychosis) پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ اس طرح کے Low Scale war tactics کے ذریعہ عام مسلمانوں میں اتنا خوف و دہشت پیدا کردیں کہ وہ خود اپنی پہچان گم کردیں اور اپنے حقوق کے لیے منظّم ہوکر کھڑے ہونے کی جرات نہ کرسکیں۔

ان حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے ہمیں تلوار کی نہیں علم وحکمت، صبر وتحمل، عقل و تدبیر، اتحاد و تنظیم کی ضرورت ہے۔ خوب اچھی طرح سمجھئے ہم تلوار کی جنگ نہیں جیت سکتے ہیں۔ اس لیے تمام تر اشتعال انگیزی کے باوجود پورے صبر وتحمل سے کام لینا ہے اور اپنا ہاتھ روکے رکھنا ہے۔ حکمت نبوی کا تقاضہ ہے کہ جب تک طاقت حاصل نہ ہو اور ایک مضبوط سپورٹ سسٹم نہ بنالیا جائے اس وقت تک اقدام نہیں کرنا چاہیے۔

کسی ایک آدمی کا قتل ہو۔ کسی ایک کی جان چلی جائے۔ کسی کی آبرو لوٹ لی جائے۔ کوئی زخمی کردیا جائے کسی کا گھر مکان جلادیا جائے کسی کی دوکان اور بزنس اسٹبلشمنٹ تباہ کردی جائے۔ اس کا درد بیان سے باہر ہے۔ لہٰذا اس کو کسی طور پر کم کرکے نہیں دیکھنا چاہیے۔ جو لوگ بھی ان حالات سے دوچار ہوئے ہیں وہ ہماری ہمدردی اور تعاون کے مستحق ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ان حالات میں کیا کیا جائے؟ نبی کریمؐ کی سیرت وسنت اور قرآن پاک سے ہمیں چار واضح رہنمائی ملتی ہے۔

(۱) تمام طرح کے خوف، خطرات، ریشہ دوانیوں، ظلم واستہزا بائیکاٹ اور تشدد کے مقابلے صبر وتحمل سے کام لیا جائے اور حالات کے خوف سے اپنی پہچان نہ گم ہونے دی جائے۔

(۲) تمام لالچ اور دباؤ کے باوجود اپنے موقف پر ڈٹے رہا جائے۔

(۳) اللہ پر کامل یقین رکھا جائے اور کسی طرح کے خوف کو اپنے اوپر طاری نہ ہونے دیا جائے۔

(۴) اور قرآن کی ہدایت کے مطابق صبر کرو، پامردی سے کام لو اور ایک دوسرے سے جڑ

کر رہو۔

یہ وہ تعلیمات ہیں جن کو ہندوستان کی جنگ آزادی کے درمیان گاندھی جی نے اپنایا اور برٹش سامراج جس کے راج میں سورج نہیں ڈوبتا تھا اس کا سورج غروب ہوگیا۔ گاندھی جی نے اپنے عدم تشدد کی بنیاد پر قائم کردہ پرامن پیش قدمی کی اثر پذیری ساؤتھ افریقہ میں دیکھی تھی۔ لہٰذا جب وہ ہندوستان آئے تو انہوں نے یہاں کی ڈرے سہمے عوام کو جو برٹش سامراج کے معمولی سپاہی کو دیکھ کر ڈر سے گھروں میں گھس جاتے تھے، ان کو جمع کیا اور ان کو ایک منتر دیا کہ ہم ڈریں گے نہیں، ماریں گے نہیں، بھاگیں گے نہیں بلکہ ڈٹے رہیں گے۔ اب تک برٹش سرکار کی مخالفت ہندوستان کا اعلی اور حکمراں طبقہ کر رہا تھا جس کو عوام کی حمایت حاصل نہیں تھی۔ یہ طاقت سے طاقت کی لڑائی تھی۔ ظاہر سی بات ہے برٹش سرکار کے پاس وسائل بھی زیادہ تھے اور ان کے پاس اعلیٰ ٹکنالوجی تھی۔ اس لیے ہر جنگ میں ہندوستانیوں کو منہ کی کھانی پڑی۔ لیکن جب نہتے عوام آزادی کے جذبے سے سرشار ہوکر سڑکوں پر نکل پڑے، برٹش سرکار لاٹھی گولی برساتی رہی، اس کی جیلیں بھر گئیں۔ بالآخر حالات کے دباؤ میں ملک چھوڑ کر بھاگنا پڑا۔ جب اتنی بڑی سلطنت کو عوام کی پرامن مگر باحوصلہ قوت سے شکست دیا جاسکتا ہے تو ایسی کسی سیاسی جماعت یا دھرے بندی کا مقابلہ کرنا مشکل نہیں ہوگا۔

ڈاکٹر امبیڈکر جس طبقہ سے آتے ہیں ان کی ہندوستان کی پانچ ہزار سالہ تاریخ میں کوئی حیثیت نہیں رہی۔ انہوں نے اپنی اس مظلوم قوم کو جگایا اور آج وہ اس مقام پر پہنچ گئی ہے کہ تمام ذات برادری کو پیچھے چھوڑ چکی ہے۔ اس وقت وہ ملک کی ایک ایسی سماجی اکائی ہے جس پر بجا طور پر ملک کا سیاسی مستقبل منحصر ہے۔ وہ جس طرف چلی جائے اور جس کا ساتھ دے وہ ملک کے سیاہ سفید کا مالک ہو جاتا ہے۔ اب تو وہ خود قیادت کے اہل ہوگئے ہیں اور زمام کار اپنے ہاتھ میں لے کر لوگوں کو اپنے ساتھ چلنے کے لیے بلا رہے ہیں۔ ان پر ہونے والے مسلسل ظلم واستحصال نے ان کو جری اور بے باک بنادیا ہے۔ بابا صاحب امبیڈکر نے اپنی قوم کو ایک نعرہ دیا پڑھو، منظّم ہو اور جدوجہد کرو۔(Educate,organise and struggle)

حکمت مومن کی گمشدہ متاع ہے۔حکمت کی باتیں کام کی باتیں، اچھی باتیں، مفید باتیں حضور کا فرمان ہے جہاں ملیں وہاں سے لے لو۔ یہ باتیں ہم نے آپ کے سامنے بطور مثال پیش کی ہیں جن سے ہمیں موجودہ ہندوستان میں اپنی حکمت عملی طے کرنے میں مدد مل سکتی ہے۔

جنوب مشرقی ایشیا میں بہت چھوٹا سا ملک ہے ویت نام۔ جس پر امریکہ نے 1955 میں حملہ کردیا اور یہ جنگ 1975 تک یعنی سترہ سال چلتی رہی جس میں امریکہ نے اپنے جنگی جہازوں کے ذریعہ پورے ملک میں کارپٹ بومبنگ کی، نیپوم بم برسائے اور یہ جنگ ویت نام کے پہاڑوں جنگلوں، شہروں گاؤں اور کھیت کھلیانوں میں لڑی گئی۔ اس جنگ میں امریکہ اور ویت نام میں کوئی مقابلہ نہیں تھا۔ وہ ایک چھوٹا سا غریب ملک تھا جس کے پاس وسائل بالکل نہیں تھے لیکن ویت نامیوں نے ہوچی منہہ کی قیادت میں پوری پامردی کا مظاہرہ کیا۔ اس جنگ میں 58 ہزار امریکی فوجی مارے گئے اور 22 لاکھ ویت نامیوں نے اپنی جان کی قربانی دی۔ بالآخر 17 سال کی جنگ کے بعد امریکیوں کو شکست کھا کر واپس لوٹنا پڑ اور ویت نامی فتحیاب ہوئے۔ افغانستان میں جس طرح غیور افغان نے روسیوں کا مقابلہ کیا اور اس کی نظریاتی بنیاد ڈھادی اور شکست دے کر پسپا ہونے پر مجبور کردیا وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ایک Determined minority بڑی سے بڑی طاقت کو شکست دے سکتی ہے۔

کچھ لوگ ہندوستان میں خانہ جنگی کی دھمکی دیتے ہوئے سنے جاتے ہیں۔ وہ ایک چھوٹے سے حصے میں اپنے پوری اسٹیٹ مشنری، وسائل انٹیلیجنس کے باوجود ملک کے سرحدی صوبوں میں اور اندرون ملک جو دہشت گرد اور انتہا پسند تنظیمیں ہیں جن کی تعداد کسی طرح دو چار لاکھ سے زائد نہیں ہے، ان کو کنٹرول کرنے میں ناکام ہیں خدانخواستہ اگر واقعی ہندوستان میں خانہ جنگی کی کیفیت پیدا ہوگئی تو ملک تباہ برباد ہوجائے گا۔ اس لیے میں نہیں سمجھتا کہ ہندوستان میں کوئی سیاسی پارٹی یا کوئی سماجی ثقافتی اور مذہبی تنظیم اس حد تک جانے کی ہمت کرے گی۔ اس لیے میں مسلمانوں کو یہ یقین دلاتا ہوں کہ چند ہزاروں لوگوں کی ہلاکت سے اور اربوں کھربوں

کی جائداد کے اتلاف سے کوئی قوم فنا نہیں ہوسکتی ہے۔قوم اپنے اوپر خوف کی نفسیات طاری کرنے سے فنا ہوتی ہے۔مثل مشہور ہے جوڈر گیاوہ مرگیا۔لہٰذا اس وقت ہماری سب سے اولین ضرورت ملت کوخوف کی نفسیات سے باہر نکالنا ہے اور انہیں ملی تعمیر کے ایک جامع منصوبے پر جدو جہد کے لیے آمادہ کرنا ہے۔

جامع منصوبہ کا خدوخال:

اس عنوان کے تحت ہم چند داخلی اور خارجی امور کا تذکرہ کریں گے جو ہمارے ملی استحکام اور مستقبل کی منصوبہ بندی کے لیے ضروری ہے۔

(ا) اپنے انسانی وسائل کا تحفظ اور اس کی بہتر آبیاری:

ہم نے اوپر جس افرادی قوت کی بات کی ہے وہ کروڑوں میں ہونے کے باوجود وہ قدر نہیں رکھتی جو اس کا ہونا چاہیے۔لہذ ا اپنی عددی قوت کو جوہری قوت میں تبدیل کرنا سب سے پہلی ضرورت ہے ورنہ ہمارا تحفظ، ہماری شناخت اور ہماری بااختیاری سب خطرے میں پڑ جائے گی۔اس میں پہلی ضرورت مسلمان مردو خواتین بالخصوص بچوں اور بچیوں کی عمومی اور اچھی تعلیم ہے۔اس کام میں سرکار سے جو مدد ملتی ہے اس کو لیتے ہوئے خود ملت کو اور ملت کے تمام مذہبی ،ثقافتی اور سماجی اداروں کو ایک مربوط اور مضبوط منصوبے کے تحت ایک متعین وقت میں پوری ملت کو خواندہ اور تعلیم یافتہ بنانا ضروری ہوگا۔تعلیم کے بغیر ہم نہ کوئی جنگ لڑ سکتے ہیں اور نہ جیت سکتے ہیں۔

دوسری اہم چیز صحت اور حفظان صحت کا خیال ہے:

جہالت اور غربت دنیا کی سب سے بڑی بیماری ہے جو تمام بیماریوں اور کمزوریوں کی جڑ ہے۔لہٰذا وسائل کی فراہمی کے ساتھ بیداری بھی ضروری ہے۔خاص طور پر زچہ اور بچہ کی حیثیت بہت بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔مسلمان بچوں میں غذائیت کی کمی عام ہے۔ان کی ذہنی اور جسمانی نشو ونما ٹھیک ڈھنگ سے نہیں ہوتی ہے ان کا گروتھ اور وزن کم ہوتا ہے لہٰذا وہ بچپن

سے کمزور اور لاغر ہوتے ہیں، ان پر بیماریوں کا حملہ بھی زیادہ ہوتا ہے جس کی وجہ سے ان کی ذہنی صلاحیت اور قوت کار متاثر ہوتی ہے جو تاعمر ان کو گھیرے رکھتی ہے۔ اللہ کے رسولؐ نے فرمایا اللہ کو کمزور مومن کے مقابلے قوی مومن پسند ہے۔

لہٰذا جب ہم اپنے انسانی وسائل کی بہتری کی بات کرتے ہیں اس کا مطلب ہے پوری ملت کو علم اور جسم کے اعتبار سے قوی بنانا ہے۔ لہذا یہ ہماری اولین ترجیح ہونی چاہیے اور ہمارے تمام ملی دینی تنظیموں اور اداروں کو اس سلسلے میں خصوصی اہتمام اور انتظام کرنا چاہیے۔

(۲) داخلی محاذ پر دوسری اہم چیز ملت کے اندر اختلاف اور انتشار کو کم کرنے کی سعی ہے۔ دنیا کی ہر سماجی اور مذہبی اکائی میں اختلاف پایا جاتا ہے لیکن اس وقت مسلمانوں میں یہ کچھ زیادہ ہے۔ موجودہ حالات میں ایسے اختلاف کی وجہ سے ملت کا اتحاد پارہ پارہ ہو گیا ہے اور ایک مضبوط جمعیت رکھنے کے باوجود ان کی ہوا اکھڑ چکی ہے مسلمانوں سے کم تعداد والے گروہ زیادہ اہم اور بااثر ہیں جبکہ مسلمان بالکل بے وزن اور بے اثر ہو کر رہ گئے ہیں۔ تمام جماعتوں مسلکوں برادریوں اور دھڑوں کے علماء، قائدین، زعما اور ذمہ داروں کو اس بات پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے۔

مدارس اسلامیہ دین کے مضبوط اور محفوظ قلعہ ہیں۔ لہٰذا ان کی اہمیت اور ضرورت پر کوئی کلام نہیں کیا جاسکتا ہے۔ تاہم اس کا ایک پہلو بہت تاریک ہے اور وہ ہے مسلکی تشدد۔ مسلکی شدت پسندی نے اس وقت ملت کو پاش پاش کر دیا ہے، جو مدارس اسلامیہ کی ساری خوبیوں اور افادیت پر پانی پھیرنے کے مترادف ہے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ لوگ اپنا مسلک چھوڑ دیں یا اس کی برتری کے جذبے سے دست بردار ہو جائیں۔ جو جس مسلک پر عامل ہیں اس پر عامل اور قائم رہیں۔ ہم صرف اتنا چاہتے ہیں کہ لوگ اپنے اندر توسع پیدا کریں۔ اور ایک دوسرے کو برداشت کرنے کا جذبہ پیدا کریں۔ اختلاف کی صورت میں ایسی زبان اختیار نہ کریں جس سے آپس کا اختلاف بڑھے۔ جب ہم سب مانتے ہیں کہ حضرت امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل اور اہل سنت والجماعت کے تمام فقہی اسکول برحق ہیں۔

ایک دوسرے کے یہاں صرف ترجیح کا مسئلہ ہے تو اس کی وجہ سے اختلاف کی موجودہ شدت غیر منطقی لگتی ہے اور ملی نقطۂ نظر سے مہلک ہے۔ اس لیے صرف اتنا کرلیا جائے کہ ایک دوسرے کو ضال مضل، کافر مشرک، بدعتی یا اور کسی غلط نام سے نہ پکارا جائے تو عوام میں جو تشدد اور عدم برداشت ہے وہ کم ہوگا جو ملت میں آپسی اتحاد کو فروغ دینے میں مددگار رہوگا۔ لوگ اگر ایک دوسرے کے ساتھ نماز پڑھنے لگیں تو ایک اچھا پیغام جائے گا اور اتحاد ملت کے باب میں یہ پہلا موثر قدم مانا جائے گا۔ آپس میں مل بیٹھنے سے ہی بہت سے معاملات ومسائل پر قابو پایا جاسکتا ہے۔

شریعت اسلامی ہمیں مطلوب ومقصود ہے اور ہم اپنی جان دے کر بھی اپنے دین و شریعت کی حفاظت کریں گے۔ شریعت کے دو حصے ہیں ایک منصوص دوسرا مستنبط۔ منصوص وہ ہے جو قرآن پاک اور احادیث صحیحہ سے ثابت ہے۔ اور مستنبط وہ ہے جو استخراج واجتہاد پر مبنی ہے۔ مختلف فقہا اور ائمہ نے اپنے علم اور فہم کی بنیاد پر کسی آیت یا حدیث اور آثار کی بنیاد پر اپنے زمانے، حالات اور ظروف کے مطابق کوئی رائے اخذ کی اور اس کی روشنی میں امت کی رہنمائی فرمائی۔ ائمہ کے علم، فہم اور حالات اور مقام میں فرق کی وجہ سے ان کے اجتہاد واستنباط میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ کسی کے یہاں احتیاط کا عنصر غالب ہے تو کسی کے یہاں رخصت اور آسانی کا رجحان زیادہ ہے۔ لیکن جب تک کوئی رائے واضح نصوص اور مزاج دین سے نہیں ٹکراتی ہے اس وقت تک وہ ہمارے لیے قابل قبول مانی جائے گی اور یہ رائیں ایک سے زیادہ ہوسکتی ہیں۔ ائمہ کے درمیان اختلاف کی یہ بڑی وجہ ہے لہٰذا اس میں شدت پسندی کی ضرورت نہیں ہے۔ ہاں جس رائے کی تائید قرآن وسنت اور مصالح عام سے نہ کی جائے وہ رائے قابل قبول نہیں ہوگی۔ وقت اور حالات کے بدلنے سے اور مقام وماحول کی تبدیلی سے احکام کی نوعیت میں تبدیلی آتی ہے۔ اس وقت ہم جن حالات میں ہندوستان میں ہیں ایسے حالات دنیا میں کہیں اور کبھی پیدا نہیں ہوئے۔ لہٰذا اگر ہم اپنے ملک، زمانے اور ماحول سے آنکھیں بند کر کے شریعت کے احکامات کا نفاذ کریں گے تو بعض امور میں عدل کے بجائے ظلم ہوجائے گا

جو اسلامی شریعت کی عمومی روح کے منافی ہوگا اور اس کے بنیادی اصول کے خلاف بھی ہوگا۔

مشہور مفکر اسلام، محدث اور سیرت نگار علامہ ابن قیم (متوفی 751ھ) نے ایک جگہ لکھا ہے کہ شریعت کے احکام تمام تر عدل ہیں۔ شریعت سراپا عدل ہے۔ جہاں شریعت ہے وہاں عدل ہے جہاں عدل ہے وہاں شریعت ہونی چاہیے۔ اور جہاں عدل نہیں ہے وہاں شریعت نہیں ہوسکتی بالفاظ دیگر اگر کوئی شخص شریعت کے احکام کی ایسی تعبیر کرتا ہے جس کے نتیجے میں عدل قائم نہیں ہوتا ہے تو وہ تعبیر نظر ثانی کی محتاج ہے۔

میری رائے میں ہمارے علماء فقہا اور مفتیان کرام کو اس صائب رائے پر غور کرنا چاہیے اور ہندوستان کے مخصوص حالات میں اکیسویں صدی کے حالات اور ظروف، معاملات ومسائل کو دھیان میں رکھ کر قرآن وسنت کی روح اور عقل وعدل کے تقاضے کے تحت اپنے پورے فقہی سرمائے پر نظر ثانی کرنی چاہیے اور جہاں جہاں جھول نظر آتا ہے اس میں اصلاح و تبدیلی کا ماحول پیدا کرنا چاہیے۔ قرآن وحدیث میں کوئی تبدیلی نہیں کی جاسکتی ہے۔ مگر فقیہ کی رائے سے اختلاف کفر نہیں ہے۔ ہمارا جو وسیع تر فقہی سرمایہ ہے اس سے بغیر کسی تعصب اور تردد کے استفادہ کا رجحان پیدا کرنا چاہیے اور موجودہ حالت میں جو رائے زیادہ راجح ہو اس کو ترجیح دینا چاہیے۔ اگر ہمارے اندر اتنا توسع پیدا ہوجائے تو نہ صرف اتحاد ملت کی راہ ہموار ہوگی بلکہ ہم وقت کے فتنوں کا معقول اور موثر جواب بھی دے سکیں گے۔ ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ دین سے مسلک ہے، مسلک سے دین نہیں ہے۔ آدمی اگر ہمارے مسلک سے تعلق نہیں رکھتا اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ وہ دائرۂ دین سے باہر نکل گیا ہے۔ ماضی میں ہم ایسی غلطیاں کر چکے ہیں اور اسلام اور اہل اسلام کی کمزوری ذلت اور زبوں حالی ایسی انتشار اور بے وقعتی کی یہ بڑی وجہ رہی ہے جس نے ہمارے زوال کے عمل کو تیز تر کرنے میں فیصلہ کن کردار ادا کیا ہے۔ اب اگر ہم تاریخ کے رخ کو موڑنا چاہتے ہیں تو اتنی توسع پیدا کرلی جائے تو ایک نئے عہد کی شروعات ہوسکتی ہے۔

اسی طرح ہمارے یہاں برادریوں کا اختلاف بھی کافی شدید ہوتا جارہا ہے۔ مسلمان

سماج میں ہندو سماج کی طرح اونچ نیچ اور چھوا چھوت کا تصور نہیں پایا جاتا ہے اور نہ عیسائی سماج کی طرح کالے گورے کا فرق اور نسل پرستی ہے۔ تاہم کچھ لوگ مسلمانوں کو اشراف، اجلاف اور ارذال میں تقسیم کرتے ہیں اور بعض سیاسی وجوہات سے کچھ شخصی اور گروہی فائدے کے لیے اس طرح کے اختلاف کو ہوا دے رہے ہیں۔ تمام مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں اور برابر ہیں۔ سبھی کو اس کا واجب حق اور حصہ ملنا چاہیے۔ سماج کے جو طبقات کمزور ہیں اور پیچھے رہ گئے ہیں لازمی طور پر ان کو ترجیح ملنی چاہیے۔ مسلم سماج کی ہر اینٹ مضبوط اور سالم ہو گی تبھی ہماری سماجی عمارت کی ہر دیوار، ہر چھت، ہر حصہ، ہر کونہ مضبوط اور سالم ہوگا اور تبھی پوری عمارت مضبوط اور سالم کہی جاسکتی ہے۔ ماضی میں مسلمان اعلیٰ طبقہ کی طرف سے اس معاملے میں کوتاہی ہوئی ہے لہٰذا ان کو آگے بڑھ کر اس کی تلافی کرنی چاہیے اور اپنے ذہن ودماغ میں وسعت پیدا کر کے سماج کے نچلے سے نچلے طبقہ کو اوپر اٹھانے کا اہتمام کرنا چاہیے۔ یہ اسلام کا تقاضہ ہے، رسول کی سنت ہے اور وقت کا مطالبہ ہے۔

اس سلسلے میں ایک عملی قدم یہ ہوسکتا ہے کہ مسلمانوں کی تمام جماعتوں اور اداروں کو جمہوری بنایا جائے اور ان کی رینک اینڈ فائل میں مسلمانوں کے سبھی طبقات کو مناسب نمائندگی دی جائے۔ ہماری وہ تنظیمیں جو بین ملی حیثیت رکھتی ہیں مثلاً مسلم پرسنل لاء بورڈ اور مسلم مجلس مشاورت یا اور کوئی مشترکہ پلیٹ فارم اس میں بہ اہتمام تمام خطوں، برادریوں، طبقات، جماعتوں اور جنسوں کی نمائندگی کو یقینی بنانا نہ صرف لازمی ہے بلکہ اتحاد ملت کے لیے ضروری ہے۔ تمام جماعتیں اور دھڑے، مسلکی اور برادری کی بنیاد پر قائم تنظیمیں اپنی اپنی شناخت باقی رکھتے ہوئے مشترکہ امور ومسائل میں ایک ساتھ کام کرنے کے لیے آمادہ ہو جائیں تو ہمارا آدھا مسئلہ حل ہوسکتا ہے۔ اس کی ایک عملی صورت یہ ہوسکتی ہے کہ کسی ایک فرد کو قائد بنانے کے بجائے ایک انجمن صدور یعنی presidium بنادی جائے اور ان کے درمیان شعبہ جات تقسیم کر کے ایک کیبنٹ تشکیل دی جائے۔ تمام فیصلے آپسی بحث ومباحثہ کے بعد یا تو اتفاق رائے سے ہوں یا کثرت رائے سے۔ جو بھی فیصلہ ہو سب اس کو تسلیم کریں اور

اس کے مطابق عمل کرنے کی کوشش کریں۔ملی مفاد کی خاطر ذاتی رائے کو چھوڑ نا یا اس وقت تک ملتوی رکھنا جب تک لوگ دلائل کی بنیاد پر اس رائے سے اتفاق نہ کرلیں جمہوریت اور شریعت دنوں کا تقاضہ ہے۔

ہماری دینی ملی تنظیموں ،علماء دانشوروں سیاسی اور سماجی کارکنوں،صحافیوں ،ادیبوں شاعروں اور فنکاروں کی سب سے بڑی کمی یہ ہے کہ ان کے ایشوز اور دائر کار بہت محدود ہیں اور وہ ملت سے باہر جھانک کر دیکھنے کی زحمت گوارہ نہیں کرتے ہیں دوسرے لفظوں میں چوبیں گھنٹہ اپنے ہی حالات او رمسائل میں الجھے رہتے ہیں اور جو عمومی معاملات ومسائل ہیں، ان کے بارے میں ان کی یا تو کوئی معلومات اور سمجھ نہیں ہوتی ہے اور نہ وہ اس میں کوئی دلچسپی لینا ضروری سمجھتے ہیں۔نتیجہ یہ ہے کہ لوگ ان کو تمام بڑے فیصلوں اور مہاتی مسائل سے الگ رکھتے ہیں گویا یہ پنجرے میں بند ایک جانور ہیں جن کو کھانا پانی دے دیا جائے باقی معاملات میں نہ ان کے بارے میں سوچنے کی ضرورت ہے اور نہ ان سے کچھ پوچھنے یا جاننے کی حاجت ہے۔ ہمارے ملی ایشوز شریعت ،اوقاف،اردو،تحفظ،مسلم یونیورسٹی اور جامعہ، مسجد مدرسہ، قبرستان میں، یا زیادہ سے زیادہ دہشت گردی کے نام پر گرفتار بے قصور نوجوان،مسلمانوں کی غربت ، جہالت اور بے روزگاری ہے ان کے علاوہ اور ان سے زیادہ ہم سوچنے اور کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

اگر ہم عام آبادی سے الگ تھلگ رہیں گے اور ان کے مسائل اور معاملات میں کوئی دلچسپی نہیں لیں گے تو ظاہر سی بات ہے عام لوگ ہمارے ساتھ آنے سے کترائیں گے اور وہ بھی ہمارے مسائل اور معاملات میں کوئی دلچسپی نہیں لیں گے۔اب جبکہ ہم کومن الیکٹوریٹ کے تحت رہ رہے ہیں تو ہمارے مخصوص مسائل ہیں وہ اس وقت تک حل نہیں ہوسکتے جب تک ہم کو عام عوامی حمایت حاصل نہیں ہوگی ۔جمہوری ملکوں میں اس طرح الگ تھلگ رہ کر ہم اپنے مسائل حل نہیں کرسکتے۔ لہٰذا ہمیں اپنی تنگنائیوں سے باہر نکل کر وسیع تر میدان میں آنا ہوگا اور جو ملک اور عام انسانوں کے عمومی مسائل ہیں ان میں بھرپور دلچسپی لیتے ہوئے موثر حصہ داری کرنی ہوگی

۔ جب تک ہم اپنے مسائل کوملک کے مسائل سے جوڑ کرنہیں چلیں گے تب تک ہم اپنے مخصوص مسائل بھی حل نہیں کرا سکتے ہیں۔ کچھ لوگوں نے بڑی ہوشیاری سے ہمیں مین اسٹریم سے الگ کر دیا ہے اور ہم اس پر قانع ہوگئے ہیں یہ بات بعض مخصوص حالت میں تو صحیح ہوسکتی ہے لیکن یہ کبھی طویل المیعاد حکمت عملی نہیں ہوسکتی ہے۔ ایسا کرنا خودکشی کرنے کے مترادف ہوگا۔

ملک میں غربت ، جہالت ، بے روزگاری ، بڑھتی قیمتیں، کرپشن، علاقائی تفاوت، طبقاتی کش مکش، عورتوں، دلتوں آدی باسیوں کے خلاف ہونے والے مظالم، امیر اورغریب کا فرق، قدرتی وسائل اورمعدنیات کی تاراجی ،کسانوں اورمزدوروں کے مسائل، کمزور طبقات، پرظلم واستحصال، پانی کی قلت، ندیوں کی گندگی، باڑھ اور سکھاڑ، فضائی آلودگی، ماحولیات کے مسائل ، بڑھتی آبادی کا مسئلہ، تعلیم کا گرتا معیار، صحت عام کے مسائل ،صاف پانی اور قابل علاج بیماریوں کے انسداد کے مسائل نسلوں کا بحران اور اس قبیل کے سینکڑوں مسائل ہیں جن پر ہزاروں تنظیمیں اور لاکھوں افراد ملکی اور بین الاقوامی سطح پر کام کررہے ہیں مگر یہ مسائل مسلمانوں کے ڈسکورس میں کوئی جگہ نہیں رکھتے۔ میرے علم میں اکا دکا افراد کے علاوہ کم از کم ہندوستان کی سطح پر کوئی مسلم تنظیم یا جماعت نہیں ہے، کوئی دانشوروں کا کا حلقہ نہیں ہے کوئی این جی او نہیں ہے جو ان امور پر توجہ دیتی ہے ۔ یہ مسائل ملک کے 80% عوام کے مسائل ہیں۔ اگر آپ ان کے مسائل سے نہیں جڑیں گے تو پھر اکثریت کا آپ کے مسئلہ سے جڑنا یا آپ کے مسائل سے ہمدردی رکھنا ممکن نہیں ہے لہٰذا ہمیں ون وے نہیں بلکہ ٹو وے کمیونی کیشن ڈولپ کرنے کی ضرورت ہے ۔ یہ وہ اشوز ہیں جن سے آپ وسیع تر سماج سے جڑتے ہیں اور وسیع تر سماج آپ کے قریب آسکتا ہے ۔ ان مسائل پر تبادلہ خیال کے ساتھ ساتھ آپ اپنے مسائل پر بھی گفتگو کر سکتے ہیں اور اس طرح افہام وتفہیم کی ایک فضا بنانے میں مدد ملے گی ۔ لوگ سنجیدہ اور غیر جذباتی ماحول میں آپ کی باتیں سنیں گے تو اس کی معقولیت کے قائل ہوں گے اور اس طرح باہمی خیر سگالی اورتعاون کے ماحول میں ایک دوسرے کے مسائل کو سمجھنے اور ان کو حل کرنے میں مدد ملے گی۔ یہ وہ مثبت پہل ہے جو ملت اور اس کے اداروں اورتنظیموں کو کرنی

چاہیے۔ اگر کسی وجہ سے قائم اداروں اور تنظیموں کے دائرے کار میں ان ایشوز کی شمولیت کی گنجائش نہیں ہے تو ان ایشوز کے لیے الگ سے تنظیمیں اور ادارے بنانے کی ضرورت ہے اس میں ہمارے دانشوروں، صحافیوں اور پڑھے لکھے نوجوانوں کو آگے آنا چاہیے اور ایک وسیع البنیاد تحریک برپا کرنی چاہیے اور ان میدانوں میں کام کرنے والے افراد اور اداروں سے جڑنا چاہیے اور ان کا تعاون کرنا چاہیے۔ یقین جانیں اس کے بہت ہی مثبت اوردور رس نتائج برپا ہوں گے، آپ کا یہ سیاسی اور سماجی بن باس دور ہوگا اور آپ ایک مضبوط، جاندار، حساس، مستعد، بے خوف بیباک، ڈیٹرمنڈ سول سوسائٹی کا حصہ بن جائیں گے۔ اس طرح آپ کا Political integration and social integration میں مددگار ہوگا اور آپ کے اندر کا گھیٹوازم ٹوٹے گا۔

اس سلسلے میں مختصر طور پر تین کام کرنا ہے:

(۱) عام شہریوں کے ساتھ مستقل، صاف وشفاف اور مسلسل تعامل (intraction) بغیر کسی احساس برتری اور کمتری کے قائم کرنا۔

(۲) ملی کاموں میں ملت کے تمام دھڑوں گروہوں اور اجزاء کی حصہ داری، خاص طور سے خواتین کی بھرپور شمولیت اور ان کا ہر سطح پر امپاورمنٹ۔ تمام ملی اور اجتماعی فیصلوں میں انہیں اسی طرح شریک کرنا جس طرح مردوں کو شریک کیا جاتا ہے۔

(۳) جن میدانوں میں صلاحیت کی بنیاد پر آگے بڑھنے کے مواقع ہیں ان کو اپنا کر یعنی اپنی اہلیت کی بنیاد پر امپاورمنٹ کو متحقق کرتے ہوئے سرکاری سہولتوں سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کرنا تاکہ پھیلتی ہوئی معیشت میں پیدا ہونے والے مواقع سے اپنی صلاحیتوں کی تخلیق اور پھیلاؤ کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کا امکان روشن ہو سکے۔

اس بحث کے اخیر میں ہم مسلمانوں کے سیاسی امپاورمنٹ اور مسلم پولیٹیکل پارٹی کے قیام پر بات کریں گے جو اس مضمون کا منطقی پہلو ہے۔

مسلم امپاورمنٹ اور مسلم پولٹیکل پارٹی:

مسلمان ایک دینی ثقافتی گروہ ہیں لہٰذا انہیں اپنے دین وتہذیب زبان اورشناخت کے تحفظ کے ساتھ نیشنل کیک اور ملک کے انتظامی اور سیاسی فیصلوں کے عمل میں مناسب حصہ داری ملنی چاہیے۔ یہ ملک کے دستور اور جمہوری سیاست کا اولین تقاضہ ہے۔ یہ ایک افسوسناک حقیقت ہے کہ پچھلی سات دہائیوں میں زندگی کے کسی شعبہ میں ان کو مناسب نمائندگی نہیں ملی جس کی وجہ سے اس وقت وہ ملک کے تمام حصوں میں اور تمام مذہبی ذات برادریوں کے مقابلے مجموعی طور پر سب سے پسماندہ ہیں۔اس پس ماندگی اور درماندگی سے مسلمانوں کو باہر نکالنا ملک کے تمام سیاسی جماعتوں کی قانونی اوراخلاقی ذمہ داری ہے کیونکہ ملک کے 1/6 آبادی کو پسماندہ رکھ کر ملک آگے نہیں بڑھ سکتا ہے۔لیکن افسوس کی بات ہے کہ ملک کی سیاسی جماعتیں اس احساس سے خالی ہیں جس کی وجہ سے مسلمانوں میں بے چینی پائی جاتی ہے اور انہیں احساس ہوتا ہے کہ ان کی سیاسی جماعت ہونی چاہیے تاکہ اس کے ذریعہ وہ پارلیمنٹ، اسٹیٹ اسمبلیز اور پریس میں اپنی آواز بلند کرسکیں اور اپنے موقف اور مطالبات سے ملک کے عوام بالخصوص اقلیتوں کو واقف کرائیں۔ یہ احساس اس وجہ سے بھی زور پکڑ رہا ہے جبکہ مسلمان دیکھتے ہیں کہ پس ماندہ برادریوں اور دلتوں نے اپنی الگ پارٹی بنالی ہے جس کی وجہ سے ان کی سیاسی قوت میں کافی اضافہ ہوا ہے۔انہیں اقتدار میں آنے کا موقع ملا ہے اوراس کی وجہ سے کوئی ان کے مفاد کے خلاف کام کرنے کی جرات نہیں کرتا ہے۔ بظاہر یہ احساس بہت خوش کن ہے مگر یہ کتنا عملی ہے اس کا معروضی اور تجزیاتی مطالعہ کرکے ہی کوئی رائے قائم کرنی چاہیے بصورت دیگر یہ نقصاندہ ثابت ہوسکتا ہے۔

مسلمانوں کی سب سے بڑی دقت یہ ہے کہ عوام ہوں یا خواص ان کی سیاسی سمجھ بہت ناقص ہے۔ان کے اندر سیاسی ایجوکیشن اور سیاسی شعور کی بہت کمی ہے۔وہ سیاست کو بھی شاعری سمجھتے ہیں اور ہر وقت عالم بیخودی میں رہتے ہیں۔ پوری قوم جذباتی ہے اور جوش میں

ہوش کھودیتی ہے۔ مسلمانوں کی قیادت بالعموم علمائے کرام کے ہاتھ میں ہے اور علمائے کرام اپنی مسلکی حدبندیوں کے باہر جھانکنے کو تیار نہیں ہیں۔ اس لیے خود ان کی بین ملی قبولیت نہیں ہے دوسرے دینی معاملات میں ان کے علم وتفقہ پر تو اعتماد کیا جاسکتا ہے لیکن سیاسی معاملات میں وہ قیادت کے اہل ہیں اس پر سوالیہ نشان لگا ہوا ہے۔ پچھلے واقعات وحالات سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ ان میں سے بیشتر اپنے شخصی یا گروہی مفادات سے آگے نہیں دیکھتے اور بہت کم قیمت پر خود کو بیچ دیتے ہیں۔ اس لیے سیاسی عمل شروع کرنے سے پہلے ایک سیاسی سمجھ پیدا کرنی ہوگی پھر اس کے بعد کوئی سیاسی فیصلہ لینا مفید ہوگا۔

ہم اس وقت جس سیاسی چوکھٹے میں جی رہے ہیں وہ مشترکہ الیکٹوریٹ پر مبنی ہے جس میں ایک کنسٹی چیونسی میں مسلم غیر مسلم سبھی شامل ہوتے ہیں۔ بہت کم کنسٹی چونسی ایسی ہے جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں کچھ میں ان کی معتد بہ تعداد ہے باقی جگہوں پر وہ ایک فیصد سے دس فیصد کے درمیان ہیں۔ اس صورت میں الیکشن جیتنے کے لیے ہر طبقہ کا تعاون درکار ہے۔ کوئی امیداوار محض ایک طبقہ کے ووٹ سے کامیاب نہیں ہوسکتا ہے۔ بیس ووٹ کے ساتھ وننگ ووٹ بھی چاہیے جو دیگر طبقات سے حاصل ہوں گے۔ اس وقت صورتحال یہ ہے کہ ہمارے سماج کا کوئی طبقہ کسی مسلمان امیدوار کو ووٹ نہیں دینا چاہتا ہے۔ مسلمان پارٹی کی بات تو چھوڑ دیجئے، مین اسٹریم نیشنل اور ریجنل پارٹی سے بھی کوئی مسلمان کھڑا ہوتا ہے اس کو بھی اعلیٰ، درمیانی اوردلت ذاتوں کا ووٹ نہیں ملتا ہے۔ جس کی وجہ سے سیاسی پارٹیاں مسلمان امیدوار کھڑا کرنے سے گریز کرتی ہیں اور مسلمانوں کو وہی ٹکٹ دیتی ہیں جہاں کی 25-20 فیصد تعداد ہے۔ ایسی سیٹوں میں اتنے مسلمان امیدوار کھڑے ہوجاتے ہیں کہ مسلمانوں کا ووٹ ذات برادری، مسلک کے نام پر بٹ جاتا ہے اور وہاں سے بھی غیر مسلم امیدوار جیت جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ تمام پارٹیاں بشمول مسلم پارٹیوں کے پارلیمنٹ میں مسلمانوں کی نمائندگی 30-20 سے زیادہ نہیں ہوتی۔ یہی حال ریاستی اسمبلیوں کا ہے۔ مسلمان ایک طرح سیاسی اچھوت بن گئے ہیں۔ اس صورتحال میں مسلمان سیاسی امپاورمنٹ کا کیا طریقہ ہوگا اور کیا مسلم

سیاسی پارٹی ہونی چاہیے۔اس سوال پرموجودہ حالت اور حقائق کی روشنی میں غور کرنے کی ضرورت ہے۔

جیسا کہ اوپر ذکر کیا جاچکا ہے کہ آزادی کے بعد مولانا آزاد نے مسلمانوں کو اپنی تمام سیاسی دھڑے بندی ختم کر کے پوری طرح مین اسٹریم نیشنل سیاست میں ضم ہونے کا مشورہ دیا تھا اور جنوب میں تو ایک دولیڈر کے علاوہ نارتھ انڈیا کے تمام مسلمانوں نے ان کی رائے مان لی اور خود کو کانگریس سے وابستہ کرلیا۔اس طرح مسلمان کانگریس کے مضبوط ووٹ بنک بن گئے۔کانگریس میں دو دھڑے تھے ایک گاندھی اور نہرو کے فکر کے قریب تھا جو سیکولر اور لبرل تھا اور دوسرا کٹر پنتھی نظریات کا حامل تھا جو ہندو نشاۃ ثانیہ اور عظمت میں یقین رکھتا تھا اور ہر دوسری شناخت مٹادینا چاہتا تھا۔گاندھی کو آزادی کے چند مہینوں کے بعد گولی ماردی گئی۔اب نہرو گرچہ عبقری شخصیت کے مالک تھے تاہم اکیلے رہ گئے۔وہ محض اپنی عوامی مقبولیت کے دم پر پارٹی اور حکومت پر حاوی تھے تاہم انہیں قدم قدم پر کمپرومائز کرنا پڑتا تھا وہ وعظ ونصیحت کر کے اپنی ذمہ داری پوری کرتے تھے۔مسلمان اس وقت کسی مزاحمت کی پوزیشن میں نہیں تھے۔

مرکز میں نہرو نے بہت حد تک گاڑی کو پٹری سے نیچے نہیں اترنے دیا۔لیکن ریاستوں میں ان کی پکڑ کمزور تھی۔خاص طور سے یوپی، مدھیہ بردیش، بہار بنگال، گجرات مہاراشٹر اور راجستھان وغیرہ میں جو ریاستی اور علاقائی لیڈر شپ تھی مسلمانوں کے معاملے میں ان کا رویہ معاندانہ تھا اور نہرو چاہ کر بھی ان کو اس سے روک نہیں سکے۔آج مسلمانوں کو جن مسائل کا سامنا ہے وہ سب کانگریسی عہد کی پیداوار ہیں۔مسلمان بیچین تھے مگر ان کے سامنے کوئی چارہ کار نہیں تھا۔1960 میں جبل پور مدھیہ پردیش میں آزادی کے بعد کا سب سے بھیانک فساد ہوا اور اس میں انتظامیہ اور پولس کی جانب داری ابھر کر سامنے آئی اس وقت مسلمانوں کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا اور انہوں نے تمام ملی جماعتوں اور اداروں کو جمع کیا اور اس نئی صورتحال سے نکلنے کی صورت تلاش کرنے کی کوشش کی۔اس مشورے کے نتیجے میں مسلمانوں نے اپنی الگ سیاسی جماعت تو نہیں بنائی تاہم اس نے مسلمانوں کی سیاسی رہنمائی کے لیے مسلم مجلس مشاورت کی

بنیاد رکھی جس میں چند ایک کو چھوڑ کر تمام مسلم جماعتیں شامل ہوئیں۔ اور ڈاکٹر سید محمود اس کے صدر منتخب کئے گئے۔ اس پلیٹ فارم کے ذریعہ مسلمانوں نے کانگریس کو یہ پیغام دیا کہ اگر کانگریس نے اپنے رویہ میں تبدیلی نہیں کی تو مسلمان کانگریس کے علاوہ دیگر متبادل پر بھی غور کر سکتے ہیں۔

ڈاکٹر سید محمود کے انتقال کے بعد مشاورت کو پھر کوئی قابل قبول موثر قیادت نصیب نہیں ہوسکی اور بعض افراد اور جماعتوں نے اس کے کاز کو تارپیڈو کرنے کی کوشش کی نتیجہ یہ ہے کہ یہ ادارہ آج زندہ ہے مگر بے حس وحرکت ہے۔ 1962 میں چین سے شکست کے بعد نہرو کی اخلاقی پوزیشن کو بہت دھکا لگا اور وہ اس صدمے کی تاب نہ لاسکے اور بہت جلد 1964 میں چل بسے۔ اس درمیان کانگریس کی ساکھ کمزور ہونے لگی۔ نہرو کے بعد کانگریس کی قیادت جن لوگوں کے ہاتھوں میں آئی وہ نہرو کی روایت کے برعکس کام کرنے والے لوگ تھے۔ مسلمانوں کے سامنے متبادل بہت کم تھے۔ کانگریس کے مقابل جو قوت ابھر رہی تھی وہ جارح فرقہ پرست قوت تھی۔ لہٰذا مسلمانوں کے سامنے ایک طرف کھائی تھی دوسری طرف کنواں نتیجتاً مسلمانوں نے کانگریس سے خود کو جوڑے رکھا۔ 1990-1967 کے درمیان نارتھ اور ساؤتھ میں علاقائی پارٹیاں ابھر کر سامنے آئیں جنھوں نے کانگریس کے خلا کو پر کرنے کی کوشش کی۔ ان میں زیادہ تر لیڈران کانگریس چھوڑ کر آئے تھے۔ لہذا ان کی سوچ اور ذہنیت کانگریس جیسی رہی۔ سوشلسٹ اور کمیونسٹ بھی اپنے مذہب اور برادری کی شناخت سے باہر نہیں نکل سکے۔ اس لیے حکومت کرنے والے ہاتھ اور چہرے بدلتے رہے ذہنیت اور پالیسی میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔

1980 کی دہائی میں رام مندر تحریک نے زور پکڑا اور دیکھتے دیکھتے پورے ملک میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گیا۔

جن سنگھ اپنے نئے اوتار بی جے پی کی شکل میں واجپئی صاحب کی قیادت میں تمام سیکولر، غیر سیکولر اور علاقائی پارٹیوں کے تعاون سے اقتدار حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ اس طرح ملک میں خالص ہندو عہد کا آغاز ہوگیا۔ 2002 میں گجرات فساد نے نریندر مودی کی

مقبولیت اور سیاسی قد کو اتنا بڑھایا کہ اپنی پارٹی کے تمام سینئر لیڈران کو مات دے کر 2014 میں پوری اکثریت سے مرکز میں حکومت بنانے میں کامیاب ہوگئے۔ ان کی پوری کوشش ہے کہ اپنی حکومت کو مستحکم کر کے آئندہ 2019 کے الیکشن میں کامیابی حاصل کی جائے۔ اس وقت کم وبیش بیس ریاستوں میں بی جے پی اور اس کی حلیف جماعتوں کی حکومت ہے۔ ملک پوری مضبوطی کے ساتھ ہندوراشٹریہ کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ان حالات میں مسلمانوں کے سامنے کیا متبادل ہیں اور کیا ان حالات میں مسلم سیاسی پارٹی بنانا صحیح ہے اور اگر بنالیا جائے تو کیا وہ حالات پر کسی طور پر اثر انداز ہونے کی اہل ہوگی۔ آئندہ صفحات میں ان دوامور کا جائزہ لیا جائے گا۔

ایسا نہیں کہ مسلمانوں نے آزاد ہندوستان میں سیاسی پارٹی نہیں بنائی ہے 1948 میں جب مولانا آزاد نے اپنی الگ سیاسی بساط لپیٹ دینے کا مشورہ دیا تھا اس وقت محمد اسمعیل صاحب نے ان کی بات نہیں مانی اور مدراس میں آل انڈیا مسلم لیگ کے نام سے ایک الگ سیاسی شناخت جاری رکھی۔ مسلم لیگ آج بھی کیرالہ میں قائم ہے اور وہاں کی اسمبلی میں اس کی نمائندگی موجود ہے۔ کئی بار اسٹیٹ میں حکومت میں شامل ہوچکی ہے اور یو پی اے کی حکومت میں وہ بھی پارٹنر رہی ہے اور محمد کویا اور ای احمد وزیر بھی رہ چکے ہیں۔ اسی طرح حیدرآباد میں سلطان صلاح الدین اویسی نے 1958 میں مجلس اتحاد المسلمین قائم کی تھی اور وہاں سے چھ بار وہ رکن پارلیمنٹ رہے۔ اس وقت ان کے بڑے بیٹے اسد الدین اویسی رکن پارلیمانی ہیں اور اپنی پارٹی کو تلنگانہ کے علاوہ مہاراشٹر، بہار اور دیگر ریاستوں میں پھیلانے کی کوشش کر رہے ہیں 1970 کی دہائی میں ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی نے مسلم مجلس کے نام سے یو پی میں ایک تجربہ کیا تھا جس نے ابتدا میں بہت امید پیدا کی لیکن بعد میں یہ بکھر کر فنا ہوگئی۔ مولانا بدرالدین اجمل نے آل انڈیا یونائیٹڈ ڈیموکریٹک فرنٹ کے نام سے آسام میں ایک پارٹی بنائی ہے جس نے پچھلے الیکشن میں 18-17 سیٹ حاصل کی تھی مگر اس بار صرف 13 سیٹ حاصل کرسکی۔ بدرالدین اجمل اپنی پارٹی کی طرف سے پارلیمنٹ کے ممبر ہیں۔ اس کے علاوہ وہ یو پی اور کئی دیگر ریاستوں میں

مختلف افراد نے کئی پارٹیاں بنا رکھی ہیں اور وہ سیاسی جدوجہد کر رہے ہیں چند سال پہلے جماعت اسلامی نے ویلفیئر پارٹی کے نام سے ایک پارٹی بنائی ہے جس نے کیرالہ اور مغربی بنگال میں الیکشن میں حصہ لیا تھا مگر اس میں کوئی کامیابی نہیں ملی ہے۔

اس وقت مسلم شناخت کی جو بھی سیاسی پارٹیاں ہیں ان کا دائرہ اثر بہت محدود ہے۔ یہ پارٹیاں مسلمانوں کے مسائل حل کرنا تو دور ان کے imagination کو Catch کرنے میں ناکام ہیں۔ اس لیے مسلم رائے عامہ میں ان کی پذیرائی نہ کرنے کے برابر ہے اور ان سے مسلمانوں کو فائدہ پہنچنے کے بجائے ہندو انتہا پسند گروہوں کو زیادہ فائدہ ہو رہا ہے اور وہ ان کا ہوا کھڑا کر کے ہندوؤں کو پلورائز کرنے میں زیادہ کامیاب نظر آتے ہیں۔ موجودہ مسلم رہنماؤں میں اسدالدین اویسی زیادہ پڑھے لکھے ہیں۔ بیرسٹر ہیں ڈبیٹر ہیں اس لیے باوجود اس کے کہ وہ پارلیمنٹ میں اپنی پارٹی کے واحد ممبر ہیں میڈیا میں انہیں زیادہ کوریج ملتا ہے۔

دراصل یہ ایک سوچی سمجھی سازش کا حصہ ہے جس طرح ماضی میں سید شہاب الدین کی شبیہ کو اجاگر کر کے ہندو پولررائزیشن کے عمل کو تیز کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ اسی طرح اسد الدین اویسی کو اہمیت دے کر اس عمل کو زیادہ تیز اور مضبوط کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ اس لیے میری رائے میں مسلمان شناخت کی سیاسی پارٹیاں کم از کم موجودہ حالت میں شارٹ ٹرم میں فائدے کے بجائے نقصاندہ ثابت ہو رہی ہیں اس لیے ان کی پزیرائی کرنا نقصاندہ ہوگا۔

اس صورت میں مسلمانوں کے سامنے متبادل بہت محدود ہیں۔ دراصل ہندو مڈل کلاس مسلمانوں سے بہت برگشتہ ہے اور میڈیا کے ذریعہ مسلمانوں کے سلسلہ میں ایسا امیج بنانے میں لگا ہوا ہے تا کہ وہ عام لوگوں کی ہمدردی سے محروم ہو جائیں اور اگر ان پر ظلم ہو تو لوگ یا تو غیر حساس ہو جائیں یا یہ مانیں کہ جو کچھ ہو رہا ہے ٹھیک ہو رہا ہے اور یہ اس طرح کے برتاؤ کے مستحق ہیں۔ حالیہ دنوں میں موب لنچنگ کے واقعات جس کثرت سے ہوئے ہیں اور لوگوں نے جس طرح ٹھنڈے پیٹوں اس کو برداشت کیا ہے اور جس طرح لوگ کھل کر ظالموں کی حمایت میں سڑکوں پر آئے ہیں وہ بدلتے ہندوستان کا ایک بھیانک منظرنامہ پیش کرتا ہے۔

لیکن ایسا نہیں ہے کہ سب کچھ ختم ہو گیا ہے۔ یہ مٹھی بھر لوگ ہیں جو حکومت کی شہہ اور اسٹیٹ مشنری کے سہارے ایسی حرکتیں کر رہے ہیں آج بھی عوام کی غالب اکثریت امن پسند، صلح جو اور انصاف پسند ہے ہمارے ملک میں ایک مضبوط سول سوسائٹی ہے۔ آزاد پریس اور آزاد عدلیہ ہے۔ اس لیے امید کی کرن باقی ہے۔ ضرورت ہے کہ مسلمان جذبات اور مایوسی کے شکار بننے کے بجائے سمجھداری ہمت اور حکمت سے کام لیں اور نئے حالات میں نئے انداز سے سوچنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ ایک بات واضح ہے کہ اپنی علیحدہ مسلم سیاسی پارٹی درپیش حالات، مسائل اور چیلنجز کا حل نہیں ہے۔

بی جے پی کو مسلمانوں کی ووٹ کی ضرورت نہیں ہے۔ کانگریس بھی اب مسلمانوں سے جڑنے کے لیے تیار نہیں ہے دراصل کانگریس 1971 میں ہی سوفٹ ہندتو کی راہ پر چل پڑی تھی۔ مگر 1989 کے بعد بی جے پی نے بابری مسجد رام جنم بھومی مسئلہ کو جس طرح اٹھایا بی جے پی کا ہارڈ ہندتو کانگریس کے ہندتو پر غالب آ گیا۔ لیکن انڈیا شائنگ کے تحت بی جے پی نے جو سپنے دکھائے تھے وہ پورے نہیں ہوئے تو عوام نے 2004 میں بی جے پی کو ریجیکٹ کر دیا مگر 2014 میں نریندر مودی کی قیادت میں جس وکاس کا سنہرا سپنا دکھایا گیا لوگ اس سے مسحور ہو گئے اور بی جے پی کو 282 سیٹوں کے ساتھ واضح اکثریت حاصل ہو گئی۔ مگر بی جے پی کی یہ جیت اسٹریٹجک جیت تھی حقیقی جیت نہیں تھی کیونکہ ٹوٹل پول کاونٹ کا بی جے پی کو صرف 31% ووٹ حاصل ہوئے تھے جبکہ اس کی مخالفت میں 69% ووٹ پڑے تھے چونکہ 69% ووٹ اتنے حصوں میں تقسیم ہو گیا کہ بی جے پی کو آرام سے اکثریت حاصل ہو گئی۔ پچھلے چار سال میں بی جے پی کی کارکردگی مایوس کن رہی ہے اور وہ ہر فرنٹ پر ناکام رہی ہے اس لیے تیزی سے عوام کا موہ بھنگ ہو رہا ہے۔ غالب امکان یہ ہے کہ بی جے پی اور سنگھ پریوار اپنی ناکامی چھپانے اور عوام کے جذبات کو گرمانے کے لیے کوئی ایسا قدم اٹھائے جس سے ہندو مسلم کش مکش تیز ہو۔ فرقہ وارانہ فساد ہو اور لوگ آسانی سے پولرائز ہو جائیں۔ یہ بہت ہی کارگر نسخہ ہے جب کوئی معاملہ ہندو مسلم ہو جاتا ہے تو لوگ بڑی آسانی سے دو پھاڑ ہو جاتے

ہیں۔ 2018 میں گاؤ ویجلنٹی اور کاؤلنچنگ، لوجہاد، گھر واپسی جیسے مدوں کو ہوا دی گئی۔ حالیہ رام نومی کے موقع پر پورے ملک میں تلواروں اور ہتھیاروں کا مظاہرہ کیا گیا پرتشدد جلوس نکالے گئے اور اشتعال انگیز نعرے لگائے گئے جس کی وجہ سے کئی مقامات پر فسادات ہوئے اور امن و قانون کی صورتحال بگڑی۔ اندیشہ ہے کہ جیسے جیسے 2019 قریب آئے گا اس طرح کے واقعات اور واردات کے بڑھنے کا امکان ہے۔ لہٰذا مسلمانوں کو بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے اور کوشش کرنا ہے کہ تمام تر اشتعال کے باوجود شر پسند اور فسادی عناصر کے منصوبے کامیاب نہ ہونے دیا جائے۔ اس وقت ملک کا موجودہ دستور خطرے میں ہے اور ہندوستان کے آسمان پر فسطائیت کے بادل منڈلا رہے ہیں لہٰذا مسلمانوں کو بہت حکمت اور سمجھداری اور سیاسی سوجھ بوجھ سے کام لینا ہے۔ اپنے اوپر بیجا خوف اور سراسیمگی کو طاری نہیں ہونے دینا ہے۔ خوف اور سراسیمگی سے حوصلے پست ہوتے ہیں اور قویٰ شل ہوجاتے ہیں۔ پوری طرح الرٹ اور بے دار رہنا ہے۔

اگر اپوزیشن پارٹیاں کوئی مشترکہ فرنٹ بنانے میں کامیاب ہوتی ہیں اور بی جے پی سے سیدھا مقابلہ ہوتا ہے تو بہار میں مہاگٹھ بندھن جیسے نتائج حاصل کئے جاسکتے ہیں۔ خدانخواستہ سیاسی جماعتیں ساتھ آنے کو تیار نہ ہوں تو اس وقت نتائج الٹ بھی ہوسکتے ہیں۔ بہرحال سب کچھ مسلمانوں کے ہاتھ میں نہیں ہے مسلمان کنگ میکر نہیں ہیں۔ ایسی کسی غلط فہمی میں نہیں رہنا چاہیے۔ مشترکہ پلیٹ فارم کی صورت میں ہی ہمارے ووٹ کی اہمیت ہے۔

بہرحال سیاسی فیصلہ کرتے وقت یہ طے کرنا ہے کہ فسطائی قوتوں کو کامیاب نہیں ہونے دینا ہے۔ دوسرا معاملہ یہ ہے کہ ہم کیا چاہتے ہیں اور ہماری سیاسی ترجیحات کیا ہیں اس پر مل بیٹھ کر غور و فیصلہ کرنا ہے اور جو مشترکہ امور باہمی مشورے سے طے ہوجائیں ان کو لے کر سیکولر پارٹیوں اور ان کے محاذ سے کھل کر بات کرنی ہے اور جو پارٹی یا محاذ ان مطالبات کو تسلیم کرنے کو تیار ہو اس کے حق میں اپنا بھرپور وزن ڈالنا ہے۔ ماضی میں ایسے کئی تجربات ہوچکے ہیں اور لوگوں نے بعد میں چل کر دھوکہ دیا ہے اس لیے باضابطہ ان امور پر معاہدہ ہو اور ان

مطالبات کو مینی فسٹو میں شامل کیا جائے۔ یہ صرف الیکشن تک محدود نہ رکھا جائے بلکہ ایک فالواپ کمیٹی تشکیل دی جائے اور واچ ڈوگ بھی بنایا جائے، میری رائے میں مسلمانوں کو اپنی سیاسی پارٹی بنانے یا کسی مسلمان قیادت والی پارٹی کو مضبوط کرنے کے بجائے آئندہ دو الیکشن تک مشترکہ سیاسی پلیٹ فارم کے ساتھ مل کر اقدام کرنا چاہیے۔ اگر خدانخواستہ یہ تجربہ بھی ناکام ہوجاتا ہے تو آئندہ حسب حال کوئی اقدام کیا جاسکتا ہے۔ فی الوقت 2019 تک ہمیں یہی حکمت عملی اختیار کرنی چاہیے۔

سول سوسائٹی سے ربط:

یہ تو تھی سیاسی حکمت عملی کی بات۔ سیاست کے میدان سے باہر جب تک ہم عام عوام اور یہاں کی سول سوسائٹی سے گہرا ربط نہیں بڑھاتے ہیں اس وقت تک ہم اپنے مسائل حل نہیں کرسکتے۔ تمام تر کمیوں کے باوجود ملک میں پھیلے ہزاروں افراد اور اداروں نے سول سوسائٹی اور ہیومن رائٹس گروپ نے اور صحافیوں نے جس مضبوطی، بے باکی اور بے خوفی سے مسلمانوں پر ہونے والے مظالم اور ناانصافیوں کے خلاف آواز اٹھائی ہے اس سے امید بندھتی ہے اور محسوس ہوتا ہے کہ ایسا نہیں کہ سب کچھ ختم ہوگیا ہے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ مسلمان عوام، دانشوروں، مسلمان اداروں، علماء اور دیگر تنظیموں کو جس مضبوطی کے ساتھ ان سے جڑنا چاہیے۔ مسلمان اس طرح ان سے نہیں جڑتے ہیں۔ اپنی قومی ملی جنگ عام لوگوں سے الگ ہوکر نہیں جیت سکتے۔ اس کے لیے ہمیں یہاں کی عوام سے جڑنا ہوگا اور ان کو ساتھ لے کر کام کرنا ہوگا۔ ہم ہندوستانی قوم کا جزولاینفک ہیں اس لیے پورے شعور کے ساتھ عام لوگوں کے عام مسائل میں دلچسپی لینی ہوگی اور ایک نئے شعور کے ساتھ وسیع تر عوام سے رابطہ قائم کرنا ہوگا۔

ہم اب تک دو ہی میدان میں کام کرنے کے عادی رہے ہیں۔ ایک مذہبی میدان اور دوسرا سیاسی میدان، ہمارے مذہبی کام سے عام لوگوں کو کیا دلچسپی ہوسکتی ہے اور سیاسی میدان میں ہم اپنی غرض سے جاتے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم غیر مذہبی اور غیر

سیاسی تنظیم بنائیں اور ملک میں کام کرنے والی ایسی تمام غیر مذہبی اور غیر سیاسی جماعتوں سے انسلاک پیدا کریں جو سماجی، فلاحی اور دیگر امور میں کام کر رہے ہیں جس کا اجمالاً تذکرہ اوپر کے صفحات میں کیا گیا ہے۔ ہم نے اپنے اوپر جو ذہنی اور سماجی علیحدگی کو مسلط کر رکھا ہے اس سے باہر نکلیں اور وسیع تر سماج اور اس کے اداروں میں سرگرمی سے حصہ لیں۔ آپ دیکھیں گے کہ اس سے خیر سگالی کی ایک نئی فضا بنے گی اور سول سوسائٹی کے تعاون سے آپ کے مسائل ایک ایک کر کے حل ہوں گے۔

ہم نے داخلی محاذ پر جن کاموں کی نشاندہی کی ہے بالخصوص تعلیم اور صحت کے باب میں اس کو اولیت دینے کی ضرورت ہے۔ یہ ہے تو سماجی کام مگر اس سے ہمارا ہیومن رسورس بہتر ہوگا جو ہماری سیاسی قوت کا بھی ذریعہ بنے گا۔

میں نے اوپر کے صفحات میں جس وسیع کینوس میں تمام تاریخی، تمدنی، سیاسی اور سماجی پہلوؤں پر گفتگو کی ہے وہ محض چیئر ہیڈس ہیں ان پر ملت کے زعما، علماء، دانشوروں اور صحافیوں کو سر جوڑ کر بیٹھنا چاہیے اور اتحاد فکر اور اتحاد عمل کے ذریعہ ملک اور ملت دونوں کے سامنے ایک واضح لائحہ عمل پیش کرنا چاہیے۔ اکیسویں صدی کی دوسری دہائی رخصت ہوا چاہتی ہے اور ہم اس وقت فیصلے کے عمل سے گذر رہے ہیں۔ وقت کا مورخ ہاتھ میں قلم لیے اس انتظار میں بیٹھا ہے کہ ہم کیا فیصلہ لیتے ہیں اور کیا طرز عمل اختیار کرتے ہیں۔ بقول شخصے ایک صحیح فیصلہ قوم کی صدیوں کی محرومی کو دور کرنے کا شاخسانہ بنتی ہے اور ایک غلط فیصلہ قوم کو صدیوں پیچھے کر دیتی ہے۔ ہم اسی فیصلہ کن لمحہ میں ہیں۔ اللہ قوم کو صحیح سمجھ اور صالح فکر عطا کرے تا کہ قوم ایک تاریخ ساز فیصلہ کرنے کی اہل ہو سکے۔ آمین۔

باب چہارم

- دہشت گردی اور اسلام
- آزادی کے بعد اردو زبان کو درپیش مسائل
- اردو کا مقدمہ عوام کی عدالت میں
- مدارس اسلامیہ اور ہماری ذمہ داریاں

دہشت گردی اور اسلام

ابتدائیہ

دہشت گردی اس وقت دنیا بھر میں کافی زیر بحث (Most Debated topic) موضوع ہے۔ مقامی اور ملکی فورموں سے لے کر غیر ملکی اور بین الاقوامی فورموں اور پالیسی ساز اداروں میں اس پر گرما گرم بحث جاری ہے اور اس کی روک تھام کے لیے عالمی معاہدات کئے جارہے ہیں نیز تمام ملکوں کی خارجہ پالیسی کا ایک ایسا نکتہ ہے جس کی بناء پر مختلف ممالک، اقوام اور اداروں کے درمیان مشترکہ حکمت عملی طے کرنے اور مشترکہ اقدام کے ذریعہ اس کے قلع قمع کرنے کی مسلسل کوششیں کی جارہی ہیں۔ یہ مسئلہ اس وقت پیچیدہ اور دھماکہ خیز بن جاتا ہے جب دہشت گردی کو اسلام سے جوڑ کر دیکھنے کی کوشش کی جاتی ہے اور اسلام کو اس کا مبنٰی اور مرکز مانا جاتا ہے یعنی یہ اسلام ہے جو دہشت گردی کو جنم دیتا ہے اور اسلام کی تعلیمات کی وجہ سے دنیا بھر میں دہشت گردانہ کاروائیاں ہورہی ہیں۔اس طرح دہشت گردی کے نام پر اکیسویں صدی میں ایک دوسری نظریاتی جنگ چھیڑ دی گئی ہے۔ لہٰذا یہ مسئلہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے سنگین نتائج کا حامل ہے جس پر نہایت غیر جذباتی، معروضی اور علمی انداز میں غور کرنے کی ضرورت ہے تاکہ ایک طرف صحیح بات غلط بات سے چھانٹ کر الگ کردی جائے اور دوسری طرف اسلام کی صحیح تعلیمات کی روشنی میں اسلام، امت مسلمہ، عالم اسلام اور پوری انسانی دنیا کو

دہشت گردی اوراس کے مضمرات سے محفوظ رکھنے کا اہتمام کیا جائے۔

دہشت گردی کی تعریف اور تاریخ

دہشت گردی جس کو ہندی میں آتنک واد اورانگریزی میں Terrorism کہتے ہیں آج کل ایک بہت ہی معروف اورمشہور اصطلاح ہے جس سے بچہ بچہ واقف ہے۔مگرآج تک اس کی کوئی ایسی متعین تعریف نہیں دی جاسکی ہے جوتمام حلقوں میں قابل قبول ہو۔اس کی وجہ یہ ہے کہ مختلف ملک،ادارے اورافراد اپنے اپنے نقطۂ نظر سے اس کی تعریف کرتے ہیں۔ایک کے نزدیک جو چیز دہشت گردی ہے دوسرے کے نزدیک وہ دہشت گردی نہیں ہے۔لہذا اس کی تعریف میں معروضیت (Objectivity) کا فقدان نظرآتا ہے۔

کسی اورزبان کے مقابلے انگریزی اصطلاح Terrorism زیادہ معروف ہے۔لہٰذا اس کے مفہوم کوسمجھنے کے لیے ہم یہاں اسی کے حوالے سے گفتگو کریں گے،Terrorism کی اصطلاح فرانسیسی لفظ Terrorisme سے مشتق ہے جو Latin لفظ Terror سے لیا گیاہے جس کا مفہوم حد درجہ خوف وہراس،خوفناک اور دہشت ہے۔روم میں 105 قبل مسیح میں سمبری قبیلہ (Cimbri tribe) کے جنگجوؤں نے جوخوف ودہشت کا ماحول بنارکھا تھا اس کو Terror Cimbricus کہا گیا۔ستمبر 1793 میں فرانس کے قومی کنونشن میں یہ اعلان کیا گیا کہ Terror is the order of the day یعنی دہشت وقت کا نظام ہے۔لہٰذا 94-1793 کی مدت کو فرانس میں La Terreur یا Reign of terror یعنی عہد دہشت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔1794 میں فرانسیسی انقلاب کے ایک رہنما Maximelien Robespierre نے اعلان کیا کہ Terror is nothing other than justice prompt, severe & inflexible یعنی دہشت اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ انصاف ہے بروقت،شدید اور بے لچک اور Committee of public safety کے اہل کار جن کو دہشت کی اس پالیسی کونافذ کرنے کی ذمہ داری دی گئی تھی ان کو Terrorists یعنی دہشت گرد کہا جاتا تھا۔ لفظ

Terrorism پہلی بار 1798 میں انگریزی فرہنگ (English Lexicon) میں شامل کیا گیا جس کا مفہوم Systemic use of terror as policy یعنی دہشت کی پالیسی کو منظم انداز سے نافذ کرنا ہے۔

اگرچہ عہد جدید میں فرانسیسی حکومت نے Reign of terror کو باضابطہ سرکاری پالیسی کے طور پر نافذ کیا تھا تاہم آج کل Terrorism کی اصطلاح کا اطلاق ان غیر سرکاری سیاسی کارندوں پر ہوتا ہے جو سیاسی مقاصد کے لیے لوگوں کا قتل کرتے ہیں۔ 1870 میں روسی شدت پسندوں (Russian Radicals) نے خوف کی پالیسی اختیار کی اور 1869 میں سرگی نیچوف (Sergey Nechayev) نے جس نے عوامی انتقام ((Peoples' Retribution کی بنیاد رکھی اس نے خود کو دہشت گرد (Terrorist) کہہ کر پکارا۔ 1880 میں جرمنی کے انارکسٹ مصنف جوہان موسٹ (johan Most) نے اس اصطلاح کو مقبول بنایا اور اس نے دہشت گردوں کے مشیر کے طور پر کام کیا۔ ڈاکٹر مائی را ویلیم سن (Dr. Myra Willaimson) کے مطابق وقت کے ساتھ دہشت گردی Terrorism کے مفہوم میں بڑی تبدیلی آئی ہے۔ عہد دہشت (Reign of terror) کے وقت یہ حکومت کی ایک پالیسی کے طور پر اختیار کیا گیا تھا اور حکمرانی Governance کا ایک طریقہ مانا جاتا تھا جس کے ذریعہ انقلابی حکومت عوام دشمن لوگوں کو خوف زدہ کر کے خود سے دور رکھنے کی کوشش کرتی تھی۔ جب کہ آج کے دور میں بالعموم ریاست کے خلاف غیر ریاستی اہل کار (Non-State actor) یا (Sub- national entity) یا ذیلی قومی اکائیوں کے ذریعہ جو دہشت گردانہ کاروائی ہوتی ہے اس کو دہشت گردانہ عمل (Act of terror) یا دہشت گردی (Terrorism) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

دہشت گردی (Terrorism) کی متفقہ تعریف نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ دہشت گردانہ کاروائیوں کے پیچھے اتنے عوامل کارفرما ہوتے ہیں جن پر سب کا اتفاق قریب قریب ناممکن ہے۔ 1970-1980 کے درمیان اقوام متحدہ نے اس اصطلاح کی تعریف متعین کرنے کی کوشش کی تھی مگر مختلف ممبران کے درمیان قومی آزادی اور حق خود اختیاری کی وجہ سے جو کش

کش(Conflict) ہے اس پر اتفاق نہیں ہوسکا کہ آیا اس کو دہشت گردانہ کاروائی مانا جائے یا نہیں مانا جائے۔ ان امور پر اختلاف کے باعث دنیا اب تک دہشت گردی پر (Comprehensive Convention on international terrorism) کسی ایک رائے پر پہنچنے میں ناکام رہی جس کے ذریعہ قانونی، اور فوجداری قانون کے تحت دہشت گردی کی قابل گرفت تعریف متعین کی جاسکے۔

اس درمیان عالمی برادری نے مختلف علاقائی کنونشن میں دہشت گردی کی تعرف متعین کرنے کی کوشش کی ہے تا کہ ان مجرمانہ سرگرمیوں کی روک تھام کی جاسکے۔ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے دہشت گردی کو اس طرح بیان کیا ہے۔

> "Criminal acts intended or calculated to provoke a state of terror in the general public , a group of persons or particular persons for political purposes are in any circumstances unjustifiable. Whatever the considerations of political, philosophical, ideological, racial, ethnic, religious or any other nature that may invoke to justify them"
>
> ''یعنی مجرمانہ اقدام جو متعین انداز میں عام عوام میں دہشت کا ماحول پیدا کرنے کی غرض سے کیے جائیں جو کسی طرح جائز نہیں ہیں، چاہے ان کو جائز ٹھہرانے کے لیے کوئی بھی سیاسی، فلسفیانہ، نظریاتی، قومی، نسلی، مذہبی یا کسی اور طرح کا جواز بیان کرنے کی کوشش کی جائے اسے درست نہیں مانا جاسکتا ہے۔''

اب تک دہشت گردی کی ایک سو سے زائد تعریفیں کی گئی ہیں مگر ان سب میں معروضیت کا فقدان ہے اور ساری تعریفیں داخلی نوعیت (Subjective) کی ہیں۔ والٹر لوکیور (Walter Laqueur) کے مطابق اس کی عمومی خاصیت یہ ہے کہ اس میں تشدد اور تشدد آمیز دھمکی پائی جاتی ہے۔ مگر یہ دہشت گردی تک محدود نہیں ہے بلکہ جنگ (War) جبری سفارت کاری (Coercive Diplomcy) اور ڈرانے دھمکانے کی کاروائی (Bar room

brawls) میں بھی تشدد اور تشدد کی دھمکی ہوتی ہے تو کیا اسے بھی دہشت گردی شمار کیا جائے گا؟

اس طرح Terrorism بروس ہوف مین Bruce Hoffman کے مطابق ایک ناپسندیدہ اصطلاح (Prejorative term) ہے اور اس میں داخلیت (Subjectivity) پائی جاتی ہے جس کو ایک گروہ اور ملک دہشت گرد قرار دیتا ہے دوسرا اس کو دہشت گرد نہیں مانتا۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے ذرائع ابلاغ جیسے رائٹر وغیرہ دہشت گردی کی اصطلاح کی جگہ بمبار (Bombar) جنگجو (Militant) کی اصطلاح اپنانا بہتر سمجھتے ہیں۔ بہت سے ملکوں میں قانونی طور پر دہشت گردی کو مجرمانہ عمل سے ہٹ کر دیکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ لہذا آج کل ہر ملک اور گروہ اپنے اپنے نظریہ کے تحت دہشت گردی کی تعریف متعین کرتا ہے، ایک کی نظر میں جو عمل مجرمانہ اور قانوناً قابل گرفت ہے دوسرے کی نظر میں واجبی عمل ہے اور اپنے حقوق کو محفوظ رکھنے اور حاصل کرنے کا طریقہ ہے۔

لبنانی اسکالر اور ڈپلومیٹ سمیع زیدان نے دہشت گردی کی تعریف متعین کرنے کی دقتوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

> 'There is no general consesus on the definition of terroism. The difficulty of defining terrorism lies in the risk it entails of taking positions. The political value of the term currently prevails over its legal one. Left to its political meaning, terrorism easily falls prey to change that suits the interests of particular states at particular times. The Taliban and Osama bin Laden were once called freedom fighters and backed by the C.I.A. When they were resisting the Soviet occupation of Afghanistan. Now they are on top of international terrorist lists. Today, the United Nations views Palestinians as freedom fighters, struggling against the unlawful occupation of their land by Israil, and engaged in a long established legitimate resistance. Yet Israil regards them as terrorists.

Israil also brands the Hizbullah of Lebonan as a terrorist group. Whereas most of the international community regards it as a legitimate resistance group fighting Israeli occupation of southern Lebanon. Infact, the successful ousting of Israili forces from most of the south by the Hizbullah in 2000 made Lebanon the only Arab country to actually defeat the Israili army. The repercussion of the preponderance of the political over the legal value of terrorism is costly, leaving the war against terrorism selective, incomplete and ineffective."

دہشت گردی کی تعریف کے باب میں کوئی اتفاق رائے نہیں ہے۔ اس کی تعریف متعین کرنے میں دقت یہ ہے کہ اس میں جانب داری کا خدشہ لاحق ہے۔ اس اصطلاح کی سیاسی حیثیت فی الوقت اس کے قانونی پہلو پر حاوی ہے۔ اس طرح یہ صرف سیاسی شاخسانہ بن جاتا ہے۔ دہشت گردی کی تعریف آسانی سے مخصوص حالات میں ریاست کے مخصوص مفادات کے پیش نظر الگ الگ وقتوں میں بدلتی رہتی ہے۔ جس وقت طالبان اور اسامہ بن لادن افغانستان پر روسی قبضہ کے خلاف برسر پیکار تھے اور انہیں سی آئی اے کی حمایت حاصل تھی، اس وقت انہیں مجاہدین آزادی کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ آج وہ عالمی دہشت گردوں میں سرفہرست شمار کئے جاتے ہیں۔ آج اقوام متحدہ فلسطینیوں کو مجاہدین آزادی مانتا ہے جو اپنی زمینوں پر اسرائیل کے غاصبانہ قبضہ کے خلاف جد و جہد کر رہے ہیں اور وہ ایک طویل قانونی جد و جہد میں مصروف ہیں، مگر اسرائیل انہیں دہشت گرد قرار دیتا ہے۔ اسرائیل لبنان کی حزب اللہ کو دہشت گرد گروہ مانتا ہے جبکہ زیادہ تر عالمی برادری اسے جنوبی لبنان میں اسرائیلی قبضے کے خلاف واجبی مزاحمتی گروہ قرار دیتا ہے۔ دراصل اسرائیلی فوجوں کو جنوبی لبنان کے بڑے حصے سے حزب اللہ نے سن ۲۰۰۰

میں جس طرح باہر نکالنے میں کامیابی حاصل کی اس نے لبنان کو وہ واحد عرب ملک بنادیا جس نے واقعتاً اسرائیل کی فوج کو شکست دی۔ دہشت گردی کے باب میں قانونی نقطہ نظر کے بجائے سیاسی پہلوؤں کی برتری نے دہشت گردی کے خلاف جنگ کو مہنگا، مخصوص، نامکمل اور بے اثر بنادیا ہے۔''

دہشت گردی کی تمام تعریفوں اور ان کے اندرونی تضادات کا جائزہ لینے کے بعد اس کی کوئی قابل قبول تعریف متعین نہ کرنے پر تبصرہ کرتے ہوئے حتمی طور پر پامیلا گرائی سٹ (Pamila griset) نے لکھا ہے۔

The meaning of terrorism is embedded in a persons' or nations' philosophy. Thus the determination of the right definiton of terrorism is subjective .

دہشت گردی کا مفہوم ایک فرد اور قوم کی سوچ اور اس کے فکر وفلسفہ میں پیوست ہے۔ اس لیے دہشت گردی کی صحیح تعریف کرنا مشکل ہے کیونکہ یہ داخلی اور غیر معروضی ہے۔

تاہم جب کوئی گروہ، فرد، حکومت یا جماعت اپنے مقاصد اور عزائم کے حصول کے لیے طاقت کا استعمال کرتی ہے اور اس کے ذریعہ لوگوں کو خوف زدہ کرکے اوران کے بنیادی انسانی حقوق کو پامال کرکے اپنا مقصد حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے تو اسے دہشت گردانہ کاروائی کہا جائے گا۔

اس بحث سے چند باتیں متحقق ہوکر سامنے آتی ہیں۔

(۱) دہشت گردی آج کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ زمانہ قدیم سے یہ طریقہ چلا آرہا ہے۔

(۳) دہشت گردی سب سے پہلے عہد جدید میں یورپ میں روم میں شروع ہوئی۔

(۳) دہشت گردی کو سب سے پہلے فرانس نے اسٹیٹ پالیسی کے طور پر اختیار کیا اور باضابطہ Reign of terror کے ذریعہ لوگوں پر بے پناہ مظالم ڈھائے۔

(۴) دہشت گردی کی باضابطہ تبلیغ اور تشہیر جرمنی اور روس میں کی گئی اورانارکسٹ لوگوں

نے اس کو ایک نظریہ کے طور پر پھیلایا۔

(۵) دہشت گردی کی آج تک متعین اور قابل قبول تعریف نہیں کی جاسکی ہے اس کی وجہ نقطہ نظر کا اختلاف ہے اور مفاد پرستانہ رویہ ہے۔

(۶) ایک وقت میں ایک گروہ یا فرد کو مجاہد آزادی مانا جاتا ہے اور دوسرے وقت میں اسی کو دہشت گرد قرار دیا جاتا ہے۔

(۷) یہ ایک موضوعی (Subjetive) اور قابل نفریں اصطلاح (Prejorative term) ہے جس کو لوگ اپنے اپنے قومی مفاد اور مقاصد کے تحت متعین (Define) کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

(۸) تاہم اس میں خوف و دہشت خون خرابہ، تشدد آمیز کاروائی اور انسانی حقوق کی خلاف ورزی لازمی عنصر ہے جس کی وجہ سے اس طرح کی کاروائی کو دہشت گردی قرار دیا جاتا ہے۔

میرے نزدیک کسی بھی مقصد کو حاصل کرنے کے لیے دو طرح سے جد جہد کی جاتی ہے۔ ایک سطح زمین پر (Open , peceaful & through democratice method) کھلے عام پرامن اور جمہوری طریقے سے جدوجہد کرنا، جس میں تقریر، تحریر، اجتماع، جلوس، دھرنا، مظاہرہ، ہڑتال، تالہ بندی، پی کیٹنگ، ریل اور سڑک پر آمدورفت روکنا، جیل بھرنا، ترک موالات، بھوک ہڑتال، عدم تعاون، بائیکاٹ، وغیرہ شامل ہیں۔ آج کے جمہوری دور میں احتجاج اور مقصد برآری کے یہ تمام طریقے جائز مانے جاتے ہیں۔ اور دنیا کی بیشتر حکومتیں ان ذرائع کو اختیار کرنے کو جائز مانتی ہیں۔ حکومت کی طرف سے لاٹھی چارج، آنسو گیس، فائرنگ اور جیل میں ڈالنے اور مقدمات کے ذریعہ سزا دینے کی کوشش کی جاتی ہے۔ پریس اور عدالتیں بالعموم آزادانہ طور پر کام کرتی ہیں اور ہونے والی زیادتیوں کا نوٹس لیتی ہیں۔ انسانی حقوق کے ادارے بھی واچ ڈوگ کا کام کرتے ہیں۔ جمہوری ملک میں جہاں دستور اور قانون کی حکومت ہے زیادہ تر یہی طریقہ رائج ہے۔

جد و جہد کا دوسرا طریقہ زیر زمین خفیہ مسلح جد و جہد (Underground Armed Struggle) کا ہے۔ عام طور پر جن ملکوں میں جمہوریت نہیں ہے ،انسانی آزادی اورانسانی حقوق کا پوری طرح احترام نہیں کیا جاتا ہے۔ اور جہاں اجتماع اور احتجاج کی اجازت نہیں ہے، بالعموم ان ممالک میں زیر زمین خفیہ سرگرمیاں چلائی جاتی ہیں جو پرتشدد کاروائیوں کے ذریعہ اپنا احتجاج درج کرتی ہیں نیز اپنے کاز کو آگے بڑھانے کی کوشش کرتی ہیں۔ اس طرح کی جدوجہد کو روکنے لیے حکومت کی طرف سے ظالمانہ (Repressive) کاروائی ہوتی ہے جس میں بے پناہ خون خرابہ ہوتا ہے۔ بدقسمتی سے ایفروایشیائی ممالک اور لاطینی امریکہ کے بہت سے ممالک میں جمہوریت کا فقدان ہے۔ اس لیے وہاں زیر زمین خفیہ عسکری تنظیموں کی سرگرمیاں بڑے پیمانے پر دیکھنے کو ملتی ہیں جس کے نتیجے میں ان ملکوں میں بے پناہ خون خرابہ ہو رہا ہے۔

اس معاملے میں کون صحیح ہے کون غلط میں اس کا فیصلہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں کیونکہ میرے پاس ان عوامل اور سرگرمیوں کی پوری جانکاری نہیں ہے۔

دنیا کے بیشتر ملکوں میں جمہوری اور انسانی حقوق کی پامالی اور ظلم وناانصافی ایک عام مسئلہ ہے لہٰذا بیشتر جگہوں پر دہشت گردانہ کاروائی ردعمل کے طور پر ظہور پذیر ہوتی ہے۔ چنانچہ ایسے حالات پیدا کرنے میں حکومتیں بھی ذمہ دار ہیں، جن ملکوں کی آزادی تلف کر لی گئی ہیں اور ان کے وسائل پر جبراً قبضہ کرلیا گیا ہے وہاں ایسے بہت سے گروہ اٹھ کھڑے ہوئے ہیں جو بزور قوت اپنا حق واپس لینا چاہتے ہیں اور اس کے لیے انہوں نے دہشت گردی کا راستہ اختیار کیا ہے۔ یہ راستہ صحیح ہے یا غلط، مفید ہے یا مضر اور اس راستے سے ان کو کامیابی ملے گی یا نہیں یہ ان کے سوچنے کا کام ہے۔ ہماری نظر میں اس عمل کے نتیجہ میں بیجا انسانی خون کا بہانا ایک افسوسناک عمل ہے۔

دنیا میں بہت سے نظریہ حیات ہیں جو پرتشدد جدوجہد میں یقین رکھتے ہیں۔ جس میں ناززم، فاشزم اور مارکسزم قابل ذکر ہیں۔ مارکسزم مزدوروں کی تانا شاہی

(Dictatorship of the prolatariate) کو قائم کرنے کے لیے عسکری جد و جہد کو ایک لازمی طریقہ مانتا ہے۔ اس کا مشہور قول ہے power flows from the barrel of gun طاقت بندوق کی نلی سے نکلتی ہے۔ لہٰذا اس کے نزدیک بورژوا طبقے کے خلاف پرتشدد کاروائی غلط نہیں ہے۔ حال کے دنوں میں اگرچہ ان تحریکوں کا زور ٹوٹ گیا ہے تاہم ان کے بعض منتشر گروہ (Splinter group) دنیا کے مختلف حصوں میں مصروف ہیں جو پرتشدد طریقے سے اپنی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے ہیں۔ ہندوستان میں نکسلی تحریک اس کی ایک بڑی مثال ہے۔

ہندوستان میں دہشت گردی کی تاریخ اور موجودہ صورتحال

ہندوستان میں گاندھی جی کے آنے سے قبل آزادی کی جو بھی تحریک اٹھی اور جس فرد اور جماعت نے اس کی کوشش کی، ان کا خیال تھا کہ انگریزوں سے اس ملک کو عسکری سرگرمیوں، نیز طاقت اور تشدد سے ہی آزاد کرایا جاسکتا ہے۔ مسلسل ناکامی کے باوجود لوگ اسی طریقے پر کاربند رہے۔ گاندھی جی کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے پورے جدو جہد کی قواعد (Grammer of struggle) کو بدل دیا اور تشدد (Voilence) کی جگہ عدم تشدد (Non. Violence) کا طریقہ اختیار کیا۔ ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد ایک طرف انگریزوں نے انتقامی کاروائی کی تمام حدیں پار کردیں، وہیں دوسری طرف مختلف انقلابیوں کا ایک نیا گروہ پیدا ہوگیا جس کا خیال تھا کہ پرتشدد کاروائی ہی انقلاب کی واحد راہ ہے۔ لہٰذا ملک کے اندر اور باہر جو انگریز مخالف قوتیں تھیں ان افراد اور حکومتوں سے تعاون لے کر پرتشدد جارحانہ کاروائیوں کے ذریعہ انگریزی حکومت کے خاتمہ کی کوشش جاری رہی۔ اس طرح ہندوؤں اور مسلمانوں کے مختلف گروہ باہم مل کر اور الگ الگ انقلابی سرگرمیاں چلاتے رہے۔ بیسویں صدی کی ابتدائی تین دہائیوں میں تشدد آمیز انقلابی سرگرمیوں کا زور رہا جن کو تاریخ میں باضابطہ انقلابی دہشت گرد (Rovolutionary Terrorist) کہا جاتا تھا۔ اس گروپ کے بڑے رہنماؤں میں جوگیش چند چڑجی، سوریہ سین، جتن داس، چندر شیکھر آزاد،

بھگت سنگھ ،سکھد یو، شوور ما،بھگوتی چرن وہرا، جے دیو کپور،اشفاق اللہ خان،رام پرشاد بسمل، روشن سنگھ راجندر لاہیری اور راج گرو جیسے نوجوان تھے،جنہوں نے اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے سرکاری خزانے کو لوٹا ،سرکاری اہل کاروں کا قتل کیا،اسمبلی میں بم پھینکے۔ یہ ساری کاروائیاں عرف عام میں دہشت گردی کی تعریف میں آتی ہیں۔اپنی پھانسی سے تھوڑا قبل بھگت سنگھ نے ۲رفروری ۱۹۳۱ء کو اعلان کیا کہ

> ' Apparently, I have acted like a terrorist. But i am not a terroist ... . Let me announce with all sterngth at my command that i am not a terrorist and i never was, except perhaps in the begining of my revolutionary career. And I am convinced that we canot gain anything through those methods.
>
> بظاہر میں نے ایک دہشت گرد کی طرح کام کیا ہے مگر میں دہشت گرد نہیں ہو ں مجھے پوری قوت سے اعلان کردنے دیجئے کہ میں دہشت گرد نہیں ہوں اوراپنی انقلابی زندگی کے ابتدائی ایام کے علاوہ میں اپنے پورے انقلابی دور میں، دہشت گرد نہیں تھا،اور میں پوری طرح سمجھ چکا ہوں کہ ان طریقوں سے کچھ بھی حاصل نہیں کیا جاسکتا ہے۔

عسکری جدوجہد(Arm struggle) کی دوسری مثال آزاد ہندفوج ہے جس نے سبھاش چندر بوس کی قیادت میں محوری قوتوں کی مدد سے عسکری طور پر انگریزوں کو اس ملک سے نکال باہر کرنے کی کوشش کی لیکن یہ ساری کوششیں ممکن ہے ماحول سازی میں مددگار ہوئی ہوں تاہم انگریزوں کو شکست دینے میں ناکام رہیں۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ دہشت گردانہ کاروائیوں سے حکومت وقت کو پریشان تو کیا جاسکتا ہے لیکن اس سے اقتدار میں تبدیلی (Regime change) نہیں لائی جاسکتی۔

ہندوستان کی آزادی اپنی جلو میں تقسیم کا المیہ لے کر آئی اور ملک میں بڑے پیمانے

پرخانہ جنگی شروع ہوگئی۔ بنگال، بہار، یوپی، دہلی اور پنجاب آگ اور خون کی ہولی میں ڈوب گئے اور لاکھوں ہندو، مسلمان اور سکھ اس کی بھینٹ چڑھ گئے۔ فرقہ پرست اور جرائم پیشہ عناصر نے وہ قتل وغارت گری، لوٹ پاٹ اور آبروریزی کی جس کی مثال ملنی مشکل ہے۔

آزادی کے بعد فرقہ پرست قوتوں نے مسلمانوں کے لیے عرصہ حیات تنگ کرنے کا منصوبہ بنایا اور ملک کے کسی نہ کسی حصہ میں وقفہ وقفہ پر فرقہ وارانہ فسادات کا لامتناہی سلسلہ شروع کیا جس میں حکومتوں کی سرد مہری اور مقامی انتظامیہ کی انفعالیت نے ایسے عناصر کی حوصلہ افزائی کی اور وہ زیادہ منظّم ہوکر منصوبہ بند ڈھنگ سے بڑے پیمانے پر اس کو انجام دینے لگے۔ اب تک اس ملک میں چھوٹے بڑے ہزاروں فسادات ہو چکے ہیں جن میں لاکھوں لوگوں کی جانیں گئی ہیں اور اربوں کھربوں کی جائداد تباہ و برباد ہوئی ہے۔ جس نے ایک طرف ایک پسماندہ غریب ملت سے اٹھنے اور آگے بڑھنے کا حوصلہ چھین لیا ہے وہیں دوسری طرف خوف اور مستقل احساس عدم تحفظ کے باعث پوری ملت نفسیاتی عدم استحکام (Psychologically uprooted) کی کیفیت سے دوچار ہے۔ آزاد ہندوستان میں ۱۹۸۴ء کے سکھ فسادات، ۱۹۹۲ء میں بابری مسجد کی شہادت، سابرمتی ایکسپریس میں گودھرا میں آگ زنی اور ۲۰۰۲ء کے گجرات دنگے دہشت گردی کی کچھ ایسی مثالیں ہیں جن میں حکومت، اس کی ایجنسی اور حکمراں پارٹی کی حمایت وشمولیت دیکھی گئی ہے اور جس نے آزادی، جمہوریت، انسانیت اور سیکولرزم کے چہرے پر مستقل نشانات چھوڑے ہیں۔ جو صرف جسم پر ہی نہیں بلکہ پوری قوم کے اجتماعی نفسیات (Collective Psyche) میں بہت گہرائی تک اتر گئی ہیں۔

اس وقت دہشت گردی کے نام پر بہت سارے مسلم نوجوانوں کو گرفتار کر کے بغیر کوئی فرد جرم عائد کیے محض شک کی بنیاد پر حبس بیجا میں رکھنے کا عام چلن ہے۔ جھوٹے انکاونٹر میں ان کا بے رحمی سے قتل (Cold blooded murder) کیا جا رہا ہے جس پر پریس اور انسانی حقوق کے لیے کام کرنے والی بہت سی تنظیموں نے آواز اٹھائی ہے۔ برسوں جیل میں رکھنے کے باوجود ان پر دہشت گردی کا الزام ثابت نہیں کیا جاسکا ہے اور کورٹ کے حکم سے ان کو رہا کیا گیا ہے۔

یہ اور اس طرح کی بہت سی مثالیں ہیں جو اسٹیٹ ٹیررزم کو ثابت کرتی ہیں گویا فرانس کا عہد دہشت (Reign of terror) صرف تاریخ کا حصہ نہیں ہے بلکہ آج بھی اسٹیٹ پالیسی میں کہیں نہ کہیں اس کی جھلک دیکھنے کو ملتی ہے۔ 1975 میں بھارت میں ایمرجنسی کا نفاذ ریاستی دہشت گردی کی واضح مثال ہے۔

دہشت گردی کی یہ تفصیل اور مثالیں اس لیے دی گئی ہیں تاکہ اس کی تعریف متعین کرنے میں جو دشواری محسوس ہوتی ہے اس کو مثالوں اور واقعات سے سمجھا جا سکے۔ مختصراً ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے یہاں اس وقت دہشت گردی کی دو صورتیں پائی جاتی ہیں۔

ایک ریاستی دہشت گردی (State terrorism) یا ریاست کے زیر اہتمام دہشت گردی (State sponsored terrorim) ہے اور دوسرا غیر ریاستی عناصر کی دہشت گردی (Non state actor terrorism) ہے۔ ان غیر ریاستی دہشت گردوں میں اکثریت اور اقلیت کے عناصر اور افراد کے علاوہ بین سرحدی دہشت گرد (Cross border terrorist) اور بین الاقوامی دہشت گرد گروہ بھی شامل ہیں۔ اس وقت پاکستان، ایران، افغانستان، چیچنیا، روس، ہندوستان، سیریا، عراق، لیبیا، فلسطین، لبنان اور اسرائیل جیسے ممالک میں دہشت گردانہ کاروائیاں آئے دن کا معمول ہیں۔ فوج، پولس اور سرکاری تنصیبات سے لے کر سویلین آبادیوں پر بھی حملے ہو رہے ہیں۔ پاکستان اور صوبہ سرحد کے قبائلی علاقوں میں دہشت گردی کے ایسے ایسے واقعات سننے کو ملتے ہیں جو نہ صرف انسانیت سوز ہیں بلکہ حد درجہ وحشیانہ ہیں۔ مسجدوں میں گھس کر حملہ کرنا، جنازے کے جلوس پر حملہ، مقتول کی گردن کاٹ دینا، اس کی لاش کی بے حرمتی کرنا اور اس کا مثلہ کرنا دور وحشت کی یاد دلاتا ہے۔ جب یہ باتیں مسلمانوں سے منسوب ہوتی ہیں تو سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیسے مسلمان ہیں اور کیا ان کو مسلمان کہا جا سکتا ہے؟

میری نظر میں دہشت گردی (Terrorism) اور جنگ جوئی (Militancy) اور انتشار گردی (Insurgercy) میں ایک واضح اور جوہری فرق ہے۔ ملی ٹینسی اور انسرجنسی بالعموم زیادہ تر سرکار مخالف سرگرمیوں کو کہتے ہیں جس میں ملٹری، پولس اور سرکاری تنصیبات

پر حملے ہوتے ہیں اوران کونقصان پہنچانے کی کوشش کی جاتی ہے جب کہ Terrorism ایک ایسی کاروائی ہے جس میں زیادہ تر شہری آبادی کواور معصوم لوگوں کونشانہ بنایا جاتا ہے۔ واضح الفاظ میں کہا جائے تو کسی بازار میں، عبادت خانوں میں، میلے ٹھیلے میں، مال میں، سڑکوں اور شاہراہوں پر، ٹرین، ہوائی جہاز، میٹرو، ہوٹل، تفریح گاہ، کھیل کے میدان، اسکول کالج اسپتال یا تجارتی مراکز میں بم پھوڑنے جاتے ہیں، خودکش حملے ہوتے ہیں یا اندھا دھند فائرنگ ہوتی ہے، جس میں بے گناہ ، بےقصوراور معصوم بچے، عورتیں، بوڑھے، نوجوان، مقیم اور مسافر مارے جاتے ہیں، گھائل ہوتے ہیں یادائمی طور پر اپاہج ہوجاتے ہیں تو اسے دہشت گردانہ کاروائی کہا جائے گا۔ قطع نظر اس سے کہ یہ کون کررہاہے اور اس کا مقصد کیا ہے؟ یہ انتہائی بزدلانہ، ظالمانہ، مجرمانہ اورانسانیت سوز حرکت ہے بلکہ یہ انسانیت کے خلاف جرم ہے جوقابل سخت مذمت اورقابل سخت سزا ہے۔ میری نظر میں ایسی کسی کاروائی کا کوئی قانونی اور اخلاقی جواز نہیں ہے اور کوئی بھی حقیقی دین اور مہذب معاشرہ اس کی اجازت نہیں دے سکتا کجا کہ اسے اسلام سے منسوب کیا جائے یا اسلام کے نام پر ایسی حرکت کی جائے۔

ان تفصیلات اور مباحث کی روشنی میں یہ دیکھنا چاہیے کہ کیا اسلام دہشت گردی کی اجازت دیتا ہے؟ یہ امر اس لیے ضروری ہے کہ دہشت گردی کو ایک خاص مذہبی رخ دے کر اسلامی دہشت گردی اور جہادی دہشت گردی کی اصطلاح بڑے پیمانے پر استعمال کی جارہی ہے گویا اسلام دہشت گردی کا منبع ہے اور جہاد دہشت گردی کی ایک شکل ہے۔

دہشت گردی اوراسلام

اوپر ہم نے 94-1793 میں فرانس میں دہشت گردی کوبطور order of the day کے طور پر دیکھا ہے جس کا مفہوم یہ بتایا گیا کہ دہشت گردی بروقت سخت اور بے لچک انصاف قائم کرنے کا طریقہ تھا۔

اور 1798 میں جب یہ لفظ انگریزی لغت میں شامل کیا گیا تو اس کا مفہوم

Systematic use of terror as policy تھا۔

Webstor's Encylopedic Unabridged Dictioncy نے terrorism کا مفہوم یہ بتایا ہے۔یعنی دہشت کو باضابطہ خوف کی پالیسی کی طرح استعمال کرنا بتایا گیا ہے۔

(1) The use of terrorising method
(2) The state of fear and submission so produced
(3) A terroristic method of governing or of resisting a goverment

(۱) دہشت پیدا کرنے والے طریقے کا استعمال
(۲) خوف کا ماحول پیدا کر کے لوگوں کو سپر انداز ہونے پر مجبور کرنا
(۳) دہشت گردانہ طریقوں کے ذریعہ حکومت کرنا یا حکومت کی مخالفت کرنا۔

(1) Person who uses or favours terrorising method
(2) (Formerly) a member of a political group in Russia aiming at the demoralization of the goverment by terror.
(3) And agent or partisan of the revolutionary tribunal during the reign of terror in France.

(۱) وہ آدمی جو دہشت کے طریقوں کا استعمال کرتا ہے یا اس کی حمایت کرتا ہے
(۲) سابق میں روس کی ایک سیاسی جماعت جو دہشت کے ذریعہ حکومت کے ساکھ کو ختم کرنا چاہتی تھی۔
(۳) فرانس میں دور دہشت کے عہد میں انقلابی عدالت کا کام یا اس کا طرفدار۔

غرض لوگوں کو خوف زدہ کرنے ہراساں کرنے، ہلاک کرنے، حکومتوں کو ہراساں (Demoralize) کرنے اور بہ جبر ان پر کسی نظام کو تھوپنے کی جو کوشش کی جاتی ہے اس کو Terrorism کہتے ہیں۔یہ کام حکومتیں بھی کرتی ہیں اور کوئی دوسرا گروہ بھی کرتا ہے۔

دہشت گردی میں خوف اور خوں ریزی کا عنصر غالب ہے۔دنیا میں بہت سے

مما لک ہیں جہاں کے حکمرانوں نے عوام کی عزت وآزادی چھین لی ہے اورخوف ودہشت کی حکمرانی قائم کررکھی ہے۔اسی طرح چور،ڈاکو،راہ زن اور بہت سے غارت گرگروہ ہیں جنہوں نے خشکی اورتری میں فساد برپا کررکھا ہے اورسفاکانہ طریقے سے لوگوں کی جان لیتے ہیں اوران کے مال،عزت وآزادی اوروسائل حیات پر قبضہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ سب دہشت گردانہ عمل ہیں جن سے خوف،بدامنی اورسراسیمگی پیدا ہوتی ہے نیز سماج ،تمدن،معیشت و سیاست یاتو تباہ ہوتی ہیں یاان کوان اقدامات سے زبردست دھکا لگتا ہے۔

اسلام کی حقیقت

اسلام دہشت گردی کی اجازت دیتاہے یا نہیں؟ اس سلسلے میں دوواضح گروہ نظر آتے ہیں۔جولوگ حاملین اسلام ہیں ان کا ماننا ہے کہ اسلام امن کا مذہب ہے اوردہشت گردی کی اجازت نہیں دیتاہے۔ دوسرا گروہ جومخالفین اسلام ہیں ان کی رائے میں اسلام وہ مذہب ہے جوتشدد کی اجازت دیتاہے۔بعض مذہبی،تاریخی،سیاسی اورمعاشی وجوہات سے آج کل اسلام مخالف گروہ کے ذریعہ پھیلائی جانے والی رائے کہ اسلام تشدد پسند مذہب ہے ساری دنیا میں مشہور ہوگیا ہے۔لہٰذا لوگ آگے بڑھ کر بعض افراداورگروہوں کے ذریعہ کی جانے والی دہشت گردانہ کاروائیوں کو سیدھے طور پر اسلام سے جوڑ کر اس کو اسلامی دہشت گردی اور جہادی دہشت گردی سے تعبیر کرتے ہیں۔اس صورت میں عملی اورمعروضی انداز میں یہ دیکھنا ضروری ہے کہ اسلام درحقیقت کیا ہے؟اس کا مزاج ومنہاج کیا ہے؟اس کا اپروچ اورانداز کیا ہے؟ اس کا مقصد اورطریقہ کار کیا ہے؟ جب تک ان سوالوں کا صحیح جواب نہیں مل جاتا کسی نتیجہ پر پہنچنا غلط ہوگا۔

اسلام بنیادی طور پر ایک دین ہے۔جس کا ایک نظام عقیدہ ،نظام عبادت،نظام اخلاق، نظام معاشرت، نظام سیاست،نظام معیشت اورنظام صلح وجنگ اورنظام بین الاقوامی تعلقات ہیں۔لہٰذا جب کبھی اسلام پر گفتگو ہوگی تو اس کے پورے چوکھٹے (Frame work)

کو دھیان میں رکھ کر ہوگی ورنہ ہم کبھی کسی صحیح نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتے ہیں۔ خاص طور پر اس وقت جب کسی بات کو سیاق وسباق سے الگ کر کے دیکھا جائے گا تو سوائے غلط فہمی اور گمرہی کے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔قرآن نے خود اس بات کو واضح کیا ہے کہ

يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَيَهْدِىْ بِهٖ كَثِيْرًا (البقرة: ٢٦)

''اس طرح ایک ہی بات سے بہت سے لوگ گمراہی میں مبتلا ہوجاتے ہیں اور بہت سے لوگ راہ راست پالیتے ہیں۔''

اسلام کا معنی

اسلام عربی زبان کا ایک لفظ ہے جس کا مادہ س ل م ہے۔جس کا ایک معنی خود سپردگی اوراطاعت وفرمابرداری ہے اور دوسرا سِلم یعنی امن ہے۔ یہ لفظ اسم ذات بھی ہے اور اسم صفت بھی۔ خدا کے آخری دین کا نام ہونے کے لحاظ سے یہ اسم ذات ہے اور چونکہ اس میں اطاعت وخودسپردگی نیز امن کی خصوصیات پائی جاتی ہیں اس لیے یہ اسم صفت ہے۔

کائنات کی تخلیق

اسلام کا عقیدہ یہ ہے کہ یہ پوری کائنات اپنے تمام جزئیات وکلیات کے ساتھ خدائے واحد کی تخلیق ہے جو آپ سے آپ ہے۔ اس کا کوئی ثانی اور ہمسر نہیں ہے۔ساری کائنات طوعاً وکرہاً اسی کی عبادت کررہی ہے، اسی کا حکم مانتی ہے، اس لیے پوری کائنات میں ایک Orderly System قائم ہے جس سے کائنات کا نظم اور امن برقرار ہے۔

اللہ نے مٹی سے آدم کی تخلیق کی اسی سے اس کا جوڑا بنایا پھر ان دونوں سے بہت سے مرد عورت پیدا کئے۔اس طرح سارے انسان آپس میں برابر، ہیں بھائی بھائی ہیں، ہم رتبہ اور ہم درجہ ہیں، کوئی کسی سے بڑا یا چھوٹا نہیں ہے۔

یہ ساری کائنات اللہ کی ملک ہے۔ زمین اور آسمان کے خزانے اور تمام مظاہرِ قدرت انسان کے فائدے کے لیے ہیں۔ انسان کا کام ہے کہ اپنے علم وحکمت اور محنت وذہانت سے

ان سے فائدہ اٹھائے اور اپنی اور اپنے نوع کے حقوق کو ادا کرے۔

انسان کو جو کچھ حاصل ہے اس پر صرف اسی کا حق نہیں ہے بلکہ کسی وجہ سے جو محروم ہیں ان کا بھی حق ہے۔ انسان کا کام ہے کہ حق اور فرض پر قائم رہے، انصاف اور رواداری سے کام لے، ظلم و ناانصافی سے باز رہے اور اگر کوئی ظلم و ناانصافی پر آمادہ ہے تو اسے تفہیم، تنظیم اور طاقت کے ذریعہ روکے تاکہ اصلاح کے بعد زمین پر فساد بر پا نہ ہو۔

فساد فی الارض سے خود بچے اور دوسروں کو بھی اس سے بچائے۔ ایک ایسا نظم اجتماعی قائم کرے جو انسانی شرف وآزدی اور باہمی حقوق کی پاسدار ہو۔ وہ قوتیں جو اس میں رخنہ ڈالتی ہیں یا ظلم و ناانصافی سے کام لینے والی ہیں یا اپنے حق سے زائد لینے والی یا استحصال کرنے والی ہیں ان کو روکے اور ایسا کرنے سے باز رکھے۔

نصح و خیر خواہی سے کام لے، صلح جوئی اور امن کو ہر حال میں مقدم رکھے اور جو عناصر اس میں خلل پیدا کرتے ہیں ان کو ایسا کرنے سے روکے۔ اگر وہ تفہیم و فہمائش سے باز نہیں آتے ہیں تو ان کی تادیب کرے تاکہ فتنہ مٹ جائے اور زمین پر پھر عدل وقسط قائم ہو جائے۔

فرد کی آزادی میں جان و مال کی آزادی کے بعد سب سے اہم عقیدے کی آزادی ہے۔ اگر کوئی انسان اسلام کے پیش کردہ عقائد کو نہیں مانتا ہے، تو اس کے ساتھ جبر نہیں کیا جائے گا۔ اسے اپنے عقیدے کے مطابق عبادت کی آزادی ہوگی۔ یہ معاملہ بندے اور بندے کا نہیں ہے بلکہ بندے اور خدا کا ہے۔ اس نے خدا کا حق مارا ہے اور اللہ اپنے حق کا خود نگراں ہے۔ آخر کار ہر شخص کو لوٹ کر خدا کے پاس جانا ہے۔ وہ اسے اس کے عقیدے کے مطابق سزا یا جزا دے گا۔ زور زبردستی کا کسی کو کوئی اختیار نہیں ہے۔ جس طرح زور زبردستی کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں ہے اسی طرح کسی غیر مسلم کو بھی زور زبردستی کی اجازت نہیں دی جا سکتی ہے۔ اگر کوئی غیر مسلم اس مقدس فطری معاہدہ کو توڑتا ہے اور اللہ کے ان بندوں کو محض اس لیے ستاتا ہے کہ وہ ایک خدا کے ماننے والے ہیں یا ان کی تعداد کم ہے، ان کے پاس کم وسائل و ذرائع ہیں تو ایسے

عناصر کے خلاف آواز اٹھانے اوران سے لڑنے کی اجازت دی گئی ہے تاکہ انسانی شرف و آزادی کی حفاظت کی جاسکے۔

اسلام انفرادی عقیدہ بھی ہے اور ایک اجتماعی نظام بھی ہے۔ جن ملکوں اور علاقوں میں یہ نظام اور عقیدہ قائم ہے ان علاقوں کے لوگوں کو اپنے دین وعقیدے، اپنے علاقے اور وسائل، اپنی آزادی اور خودمختاری کی حفاظت کا فطری اور قانونی حق حاصل ہے۔ اگر کوئی گروہ یا ملک اس کے خلاف سازش کرتا ہے یا اس کو نقصان پہنچاتا ہے یا اس پر حملہ کرتا ہے یا حملہ کی تیاری کررہا ہے تو اپنے دفاع اور استحکام کے لیے اس سے لڑنا اس کا حق ہے وقت اور حالات کے لحاظ سے دفاعی اور اقدامی دونوں طریقے اختیار کرنے کی اجازت ہے۔ مقصد یہ کہ اس کو طاقت واستحکام حاصل ہوتا کہ وہ اپنی آزادی اور اپنے دین اور اپنے ملک کی حفاظت کرسکے۔

جنگ کی صورت میں پوری قوت اور طاقت سے لڑنا اور دشمن کا قلع قمع کرنا اولین ہدف ہونا چاہیے لیکن چونکہ جنگ خون خرابے اور تباہی و بربادی کا نام ہے اس لیے اگر دشمن صلح پر آمادہ ہو تو صلح کو ترجیح دے کر بقائے باہم کے اصول کے تحت صلح کرلینا چاہیے اور اس پر اس وقت تک قائم رہنا چاہیے جب تک معاہدے کی خلاف ورزی (Breach of agreement) نہ ہو۔

اسلام دونوں جہاں کی خیر و فلاح کا ضامن ہے۔ اور اس کا پورا نظام نیکی، بدی، اچھائی، برائی، پاکی ناپاکی، حلال وحرام، جائز ناجائز کی تمیز پر قائم ہے یہ انتہا پسندی سے اجتناب کرتا ہے اور اعتدال ومیانہ روی کو پسند کرتا ہے۔ مقصد کی پاکیزگی اور درستگی کے ساتھ ساتھ ذرائع کی پاکیزگی اور درستگی کا بھی قائل ہے۔

مشترکہ ملک وسماج میں اسلام کا رویہ

ایک ایسے ملک اور معاشرہ میں جہاں ایک سے زائد مذاہب کے لوگ رہتے ہیں، کوئی جبریہ نظام نافذ نہیں ہے لوگوں کو عقیدے، عبادات، عائلی معاملات اور دیگر امور کی آزادی حاصل ہے۔ باہم مل جل کر رہنا، جائز امور میں تعاون واشتراک کرنا، بلا لحاظ مذہب وملت

ضرورت کے وقت اورحالت ناگہانی میں لوگوں کی مدد کرنا اور ہرحال میں انصاف، اخلاق، فراخ دلی اور فیاضی کا سلوک کرنا ایک اسلامی معاشرہ کا طرہ امتیاز ہے اور ہونا چاہیے۔ حدیث کی رو سے مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے تمام مسلمان محفوظ رہیں اور مومن وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے پوری انسانیت محفوظ رہے۔ پڑوسی خواہ مسلم ہو یا غیر مسلم اس کا حق مسلم ہے۔ ناحق کسی انسان کا خون بہانا پوری انسانیت کے قتل کے مترادف ہے اور کسی ایک انسان کی جان بچانا پوری انسانیت کی جان بچانے کے برابر ہے۔

اس صورت میں اسلام اور دہشت گردی اجتماع ضدین ہیں (Contradiction in term) اس طرح اسلام کو دہشت گرد قرار دینا اور اسلامی دہشت گردی کی اصطلاح استعمال کرنا ایک شرارت انگیز اور دہشت گردانہ ذہنیت کی عکاس ہے جس کا مقصد مسلمانوں اور اسلام کے خلاف ایک ایسی فضا پیدا کرنا ہے جسے عام لوگوں کے ذہنوں میں غلط فہمی اور بدگمانی پیدا ہو اور استعماری قوتوں کی طرف سے مسلمان ملکوں اور آبادیوں کو تاراج کرنے، خوف زدہ کرنے، ان کی عزت وآزدی پر حملہ کرنے ان کے علاقوں اور وسائل کو ان سے چھیننے کی جو سازش کی جارہی ہے اس کا جواز فراہم کیا جاسکے۔ تہذیبوں کی کش مکش اور War on terror کے پیچھے یہی ذہنیت کارفرما ہے۔

جہاد

جہاں تک لفظ جہاد کا تعلق ہے۔ آج کل اس اصطلاح کو بالکل غلط سیاق (Context) میں استعمال کیا جاتا ہے۔ جہاد جنگ کا مترادف لفظ نہیں ہے۔ جہاد حد درجہ جد وجہد یعنی (Utmost endeavour) یا (Intense struggle) کا ہم معنی ہے۔ قرآن میں جنگ کے لیے ایک دوسرا لفظ قتال استعمال کیا گیا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ ہر جد و جہد یا جنگ جہاد کی تعریف میں نہیں آتی ہے۔ بلکہ اسلام جہاد کے ساتھ جہاد فی سبیل اللہ کی اصطلاح استعمال کرتا ہے یعنی اللہ کی راہ میں جنگ۔

جنگ کی بہت سی وجوہات ہوسکتی ہیں مثلا اپنے ملک کی سرحد بڑھانے، دوسرے ملک پر قبضہ کرنے، اس کے وسائل سے فائدہ اٹھانے، محفوظ بازار تلاش کرنے اور دیگر وجوہات سے جنگ ہوسکتی ہیں۔ ساتھ ہی اپنی بہادری اور عسکری قوت کا مظاہرہ کرنے یا اپنے ہتھیاروں کی نمائش کرکے دنیا کے ملکوں میں اس کی تجارت بڑھانے کی غرض سے بھی جنگ ہوتی ہے۔ بعض اوقات مختلف ملکوں اوران کی حکومتوں کو ڈرانے اور ان کو اپنی شرطیں منوانے کے لیے بھی جنگ کی جاتی ہیں۔ فی زمانہ کوئی مسلمان ملک ایسا نہیں ہے جو اس طرح کی حماقت کرے الا یہ کہ مانگے کے ہتھیار سے آپس میں خونی جنگ لڑکر اپنی تباہی کا راستہ اختیار کرے جیسا کہ حالیہ خلیج کی جنگ میں دیکھنے کو ملا ہے۔ جس نے اس علاقے میں امریکہ اور دیگر استعماری قوتوں کو مداخلت کا موقع فراہم کیا۔ ان میں سے کوئی جنگ جہاد فی سبیل اللہ کے دائرے میں نہیں آتی ہے۔ صرف وہ جنگ جو اعلائے کلمۃ اللہ کی بلندی کے لیے اور خالص رضائے الٰہی کے حصول کے لیے کی جائے وہی جہاد فی سبیل اللہ کہلائے گی، اس جنگ میں طاقت کا استعمال تو ہوگا مگر دہشت گردی نہیں ہوگی۔ پچھلے دنوں ہند پاک سرحد پر جو گولا باری اور چھیڑ چھاڑ ہوئی اس میں کچھ بھارتی فوجی لڑتے ہوئے مارے گئے۔ خبر آئی کہ ان کے سر کاٹ لیے گئے اور ان کی لاش کا مثلہ کیا گیا۔ ان کی بے حرمتی کی گئی۔ اگر یہ خبر صحیح ہے تو نہ صرف یہ کہ یہ انتہائی گھناؤنی اور سفاکانہ عمل ہے بلکہ ایک غیر اسلامی ااور غیر انسانی عمل ہے۔ اسلام نہ صرف یہ کہ ایسی کسی حرکت کی اجازت نہیں دیتا بلکہ اس نے اس کو سختی سے روکا ہے۔ لہٰذا جس کسی نے یہ کام کیا ہے وہ ظلم و گناہ ہے اور حد درجہ قابل مذمت ہے۔

جہاد کے سلسلے میں یہ بات ذہن نشیں رہنی چاہیے کہ جہاد فی سبیل اللہ کسی فرد یا جماعت کا کام نہیں ہے بلکہ یہ ریاست کا کام ہے۔ دوسرے اس کے کچھ حدود وآداب ہیں جن کا پاس ولحاظ رکھنا ضروری ہے۔ مثلا بچوں، عورتوں، ضعیفوں، مذہبی لوگوں کو قتل نہ کیا یا جائے گا اور ان کو نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔ مذہبی مقامات پر حملے نہیں کئے جائیں گے۔ کھیتی، باغات، پانی کے ذرائع وغیرہ کو نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔ دشمن کے فوجیوں کے لاش کی بے حرمتی

نہیں کی جائے گی ان کا مثلہ نہیں کیا جائے گا۔اور اگر کوئی کرتا ہے تو قانونی طور پر اس کو مجرم قرار دے کر سزادی جائے گی۔دشمن قیدیوں کے ساتھ حسن سلوک کیا جائے گا۔انہیں ایذا نہیں دی جائے گی۔ان حدود و آداب کے ساتھ ہی جنگ لڑی جائے گی، جنگ کا مقصد لوگوں کو ہلاک و برباد کرنا نہیں ہے بلکہ اس زور وقوت کو توڑنا ہے جو فتنہ اور فساد فی الارض کی وجہ ہے۔ اس معاملے میں اسلام نے جو جنگی اصول وضع کئے ہیں آج کی نام نہاد مہذب دنیا اس سے آگے نہیں جاسکی ہے بلکہ دوقدم پیچھے ہے۔ نہ تو صحیح معنوں میں معاہدات کی پاسداری ہوتی ہے اور نہ ان کا احترام کیا جاتا ہے بلکہ معاہدات اسی لیے کرتے ہیں تا کہ ان کو توڑا جائے ۔پہلی اور دوسری جنگ عظیم میں اور حالیہ ویت نام اور عراق کی جنگ میں امریکہ نے ان ملکوں کی شہری آبادی،فوجیوں اور قیدیوں کے ساتھ جو سلوک کیا ہے اس کے بعد بھی وہ مما لک انسانی حقوق کے چمپئن شمار ہوتے ہیں خود کو مہذب اور تہذیب کے علمبردار مانتے ہیں تو مجھے نہیں معلوم جنگل کے وحشی درندوں کو کس نام سے یاد کیا جائے گا۔ان لوگوں نے بہت سے اسکولوں اور اسپتالوں پر بے دردی سے بم برسائے اور پناہ گزیں کیمپوں کو بھی نہیں بخشا۔

بہرحال اگر مسلمان ملکوں اور علاقوں میں کوئی دہشت گردی پائی جاتی ہے یا کوئی دہشت گرد گروہ ہے تو وہ سیدھے سیدھے دہشت گرد ہے۔ اسے جہادی دہشت گرد نہیں کہا جاسکتا ہے کیونکہ جہاد کا مفہوم و مقصد ،اس کا طریقہ اور منہاج الگ ہے اور دہشت گردی کا Modus operandi الگ ہے۔

اس سلسلے میں ایک اور پہلو قابل غور ہے۔اسلام عقیدہ کے اعتبار سے پوری انسانی آبادی کو دو گروہوں میں تقسیم کرتا ہے۔ایک وہ جو مومن و مسلم ہیں اور دوسرے وہ جو مومن و مسلم نہیں ہیں۔

جو لوگ مومن و مسلم نہیں ہیں انہیں کافر گروہ قرار دیا جاتا ہے یعنی یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ان چیزوں کو ماننے سے انکار کر دیا ہے جس کو ماننے کا حکم اللہ اور اس کے رسول نے دیا ہے۔ او پر واضح کیا جا چکا ہے کہ اسلام عقیدے کی آزادی کو تمام انسانوں کا بنیادی حق

مانتا ہے۔ لہٰذا وہ اس معاملے میں کسی جبر کا قائل نہیں ہے۔ اگر منکر گروہ کی طرف سے کوئی زیادتی نہیں ہوتی ہے اور مومنین کی عزت وآزادی پر حملے نہیں ہوتے ہیں تو ان سے تعارض کرنے کا کوئی موقع نہیں ہے۔

اسلام کافر آبادی کو دو گروہوں میں تقسیم کرتا ہے۔ایک وہ گروہ ہے جو مسلمانوں سے محض اس لیے لڑتا ہے کہ وہ اللہ اور رسول پر ایمان رکھتے ہیں اور شرک وکفر سے بچتے ہیں اس گروہ کو جنگجو (Combatant) گروہ کہا جاتا ہے۔دوسرا گروہ وہ ہے جو اپنے عقیدے پر پوری سختی سے قائم ہے مگر مسلمانوں سے کوئی تعارض نہیں کرتا ہے بلکہ پرامن بقائے باہم کے اصول پر کار بند ہے۔ یہ گروہ چاہے معاہد ہو یا غیر معاہد اسلام اس کو غیر مزاحم یعنی (Non- Combatant) گروہ مانتا ہے۔اسلام کا اصول عام یہ ہے کہ جو غیر مزاحم گروہ ہے اس کے ساتھ زیادتی نہ کی جائے بلکہ اس کے ساتھ پرامن طریقہ سے رہا جائے۔ ان سے جنگ کرنا یا ان کے افراد و اموال کو نقصان پہنچانا جائز نہیں ہے۔

اسلام اپنے ماننے والوں کو اپنے اصول وعقائد پر سختی سے کاربند رہنے کی تلقین کرتا ہے لیکن وہ کسی حال میں ظلم وزیادتی کا طرفدار نہیں ہے بلکہ عفو درگذر کی تلقین کرتا ہے۔ برائی کو اچھائی سے دور کرنے کی نصیحت دیتا ہے اس کے فوائد بیان کرتا ہے۔اس کی ایک اصولی تعلیم ہے کہ نیکی اور خیر کے کاموں میں لوگوں سے دل کھول کر تعاون کیا جائے اور ظلم وتعدی میں کسی سے کوئی اشتراک نہ کیا جائے۔

جب آپ اسلامی تعلیمات کو دیکھتے ہیں اور ان تعلیمات کی عینک سے دہشت گردی کو دیکھتے ہیں تو واضح ہو جاتا ہے کہ دہشت گردی اور اسلام کا کوئی جوڑ نہیں ہے کیونکہ دہشت گرد بالعموم Combatant اور Non-Combatant کے درمیان فرق نہیں کرتے بلکہ بسا اوقات ان کا حملہ Soft target پر ہوتا ہے جس میں بیشتر معصوم اور بے گناہ غیر متحارب عوام مارے جاتے ہیں۔اس لیے دہشت گردی جہاد نہیں ہے۔ لہٰذا دہشت گردی اور اسلام کا کوئی جوڑ نہیں ہے بلکہ یہ ایک بزدلانہ، ظالمانہ، انسانیت سوز حرکت ہے جس کی جتنی مذمت کی جائے

کم ہے۔ یہ اسلام کی تعلیم ہے۔ جو مسلمان مما لک ہیں وہ کتنا اسلام پر قائم ہیں اس کا اندازہ اسی بات سے کیا جاسکتا ہے کہ ان ملکوں میں سرکاری اور غیر سرکاری دونوں سطحوں پر بڑے پیمانے پر دہشت گردانہ کاروائیاں ہوتی ہیں۔ انہوں نے ظلم وتعدی کی تمام حدوں کو پار کردیا ہے اور پورا پورا ملک خوف و دہشت بے امنی اور بدامنی کے سایہ میں جی رہا ہے۔ یہ مما لک شہری حقوق کے معاملہ میں غیر اسلامی مما لک سے زیادہ بدتر حالت میں ہیں جو اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ وہ اسلامی مما لک نہیں ہیں لہٰذا ان سے اسلام کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ ان کے ذریعہ کئے جانے والے بیشتر کام غیر اسلامی ہیں جن سے اسلام اپنی برأت کا اعلان کرتا ہے۔

دہشت گردی کا شکار صرف غیر مسلم مما لک ہی نہیں ہوتے بلکہ اس وقت بیشتر مسلم مما لک اور علاقے دہشت گردی کا شکار ہیں۔ جن ملکوں میں کسی نہ کسی نوع کا جبری نظام قائم ہے اور لا اینڈ آڈر مشنری ناتجربہ کار ہے، جن کا نگرانی کا نظام (Surviellance System) کمزور ہے اور جہاں کرپشن عام ہے وہاں ان واقعات میں زیادتی دیکھنے کو ملتی ہیں۔ اس وقت خاص طور سے عراق، افغانستان اور پاکستان میں دہشت گردانہ کاروائی جس بڑے پیمانے پر ہورہی ہیں اس نے ان مما لک کو خانہ جنگی کے مقام پر پہنچادیا ہے۔ مجھے نہیں معلوم ان کے اسباب ومحرکات کیا ہیں اور وہ کون عناصر ہیں جو ان دہشت گردانہ کاروائیوں میں ملوث ہیں اور ان کا مقصد کیا ہے؟ تاہم اس سے ان مما لک کی اندرونی بدامنی اور بے چینی کا پتہ چلتا ہے دوسرے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان ملکوں میں غیر ریاستی عناصر (Non. Stale actors) بہت سرگرم ہیں اور وہ مما لک بین الاقوامی سازش کے مرکز (Epicentre) بن گئے ہیں۔ جو ایک ساتھ کئی مقاصد حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اس لیے دہشت گردی سے غیر مسلم دنیا ہی نہیں مسلم دنیا بھی بری طرح متاثر ہے۔ بلکہ مسلم دنیا میں جس پیمانے پر دہشت گردانہ حملے ہورہے ہیں اس سے خون مسلم کی ارزانی کا پتہ چلتا ہے۔ لہٰذا ایسی کاروائیوں پر روک انسانیت عامہ اور مسلمان دونوں کے لیے ضروری ہے۔

مجھے نہیں معلوم کہ ہندوستان میں اور ہندوستان سے باہر جن گروہوں کو دہشت گرد

قرار دیا جارہا ہے وہ واقعتاً دہشت گرد ہیں یا ان پر جھوٹے الزام لگائے جارہے ہیں۔ یا ان کو بدنام کرنے کے لیے کچھ دوسرے عناصر کا نام استعمال کرکے اس طرح کی حرکت کررہے ہیں۔

ہندوستان کی صورتحال یہ ہے کہ جب تک ہندو دہشت گردی کے الزام میں پکڑے نہیں گئے تھے اس وقت تک میڈیا کے ذریعہ اور ذمہ دار سیاسی اور سماجی رہنماؤں کے ذریعہ نیز پولیس اور بیوروکریسی کی طرف سے جہاں کہیں بھی اور جب کبھی بھی دہشت گردانہ کارروائی ہوتی فوراً کسی مسلمان تنظیم یا ادارے کا نام اچھالا جاتا اور کچھ نوجوانوں کو گرفتار کرکے ان کو مبینہ دہشت گرد قرار دے کر بغیر مقدمہ چلائے اور کوئی فرد جرم عائد کئے جیلوں میں بھر دیا جاتا اور ان کو دس دس، بارہ بارہ، چودہ چودہ سال حبس بے جا میں رکھا جاتا۔ جب ملی تنظیموں اور انسانی حقوق کے اداروں نے آواز اٹھائی اور اس ظلم و زیادتی کے خلاف مہم چھیڑی تو انہیں عدالتوں کے سامنے حاضر کیا گیا مگر پولس ان کو گنہ گار ثابت نہیں کرسکی اور ان کو بالآخر بےقصور اور معصوم قرار دے کر رہا کیا گیا۔

دوسری طرف بعض ہندو تنظیموں کے افراد اور کارکنان دہشت گردی کے الزام میں گرفتار ہوئے تو پہلے جو لوگ دہشت گردی کو اسلام سے جوڑ کر دیکھتے تھے اور اسلامی دہشت گردی اور جہادی دہشت گردی کی اصطلاح کھلے عام استعمال کرتے تھے اور ان کے نزدیک یہ سب اسلامی تعلیمات کا نتیجہ تھا لہٰذا مدرسوں کو دہشت گردی کی نرسری اور مسجدوں کو اس کا مرکز قرار دیتے تھے۔ جب بھگوا، کیسریا اور ہندو دہشت گرد کے الفاظ میڈیا میں استعمال کئے جانے لگے تو انہوں نے کہنا شروع کیا کہ دہشت گرد دہشت گرد ہوتا ہے، دہشت گردی کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ اس کا کوئی رنگ نہیں ہوتا۔ اس کی کوئی ذات نہیں ہوتی۔

ہم بھی یہی چاہتے ہیں کہ دہشت گردی انسانیت کے خلاف ایک جرم ہے ایک ظلم اور گناہ ہے اس کو اسلام اور مسلمان سے جوڑنا اور اس کے ذریعہ اسلام یا جہاد کی اصطلاح کا غلط معنی لوگوں کو بتانا گمراہ کن ہے۔ اس طرح آپ دہشت گردی کا مقابلہ نہیں کرسکتے۔ بلکہ اس طرح کے اقدامات سے دہشت گردی کو شہ ملے گی اور ان کو محفوظ پناہ گاہ (Safe haven) مل

سکتا ہے۔ کیونکہ جب آپ اس کے ذریعہ اسلام اور مسلمانوں کو بدنام کریں گے اور بے قصور لوگوں کو گرفتار کریں گے اور اس کے ذریعہ لوگوں کو مذہب کے نام پر تقسیم کرنے کی سیاست کریں گے تو آپ اس مسئلہ پر قابو نہیں پا سکتے بلکہ یہ دوسرے قسم کی قومی کش مکش کو جنم دے گا جو ملک وقوم کے لیے نقصاندہ ثابت ہوگی۔ اس لیے ایسی سازشوں سے ملک وقوم بالخصوص مسلمانوں کو بچانا ضروری ہے۔

دہشت گردی ایک غلط پالیسی

اب میں مسلمانوں میں ان لوگوں سے مخاطب ہوں جو دہشت گردی کو رومانی انداز میں (Romanticise) دیکھتے ہیں اور شاید یہ خیال رکھتے ہیں کہ وہ اس کے ذریعہ غیر اسلامی قوتوں کی سازشوں کا توڑ کر سکیں گے، انہیں شکست دے سکیں گے یا ان کو اتنا نقصان پہنچانے میں کامیاب ہو جائیں گے کہ ان کے عزائم سے ان کو باز رکھ سکیں گے۔ میں ایسے تمام عناصر کی غلط فہمی ایک جملہ میں دور کر دینا چاہتا ہوں کہ یہ ایک بچکانہ اور احمقانہ خیال ہے آپ ایسی کوششوں کے ذریعہ کوئی بڑی اور دائمی تبدیلی نہیں لا سکتے۔ ہاں! کچھ خون خرابے میں کامیاب ہو جائیں گے جو بالآخر آپ کی ذلت ورسوائی اور شکست وریخت کا باعث ہوگا۔ اس لیے اس غلط فہمی سے جتنی جلد ہو سکے باہر آنا چاہیے اور عوامی جدوجہد کا پرامن اور جائز طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔ میری نظر میں دہشت گردی کی پالیسی کیوں غلط ہے اس کے چند موٹے موٹے وجوہات ہیں۔

(۱) یہ طریقہ کبھی آپ کو فیصلہ کن موڑ پر نہیں پہنچا سکتا ہے۔

(۲) یہ غیر انسانی اور غیر اسلامی فعل ہے جس سے اسلام اور مسلمان کی بدنامی ہوتی ہے اور ان کی اخلاقی ساکھ متاثر ہوتی ہے۔ اسلام کو دنیا کی نظروں میں گرا کر آپ کوئی کامیابی حاصل کر بھی لیں تو یہ خسارے کا سودا ہے۔

(۳) آپ کی تنظیم، افرادی قوت، ٹریننگ اور Resources اتنے محدود ہیں جو Low

scale activities کوبھی بہت دیر تک جاری نہیں رکھ سکتے اس لیے بکھراؤ اور شکست آپ کا مقدر ہے۔

(۴) آپ کے حملہ کے نتیجے میں جوانتقامی اور شک کی بنیاد پر کاروائی ہوتی ہے اس سے بہت سے بے گناہ اور غیر متعلق نو جوانوں کی زندگیاں تباہ ہورہی ہیں اور ملت میں خوف وہراس اور عدم تحفظ کا احساس گہرا ہوتا جاتا ہے جو اس کی ترقی اور استحکام کی راہ میں بڑی رکاوٹ بن رہی ہے۔

(۵) ان حرکتوں کی وجہ سے غیر اسلامی دنیا مسلمانوں کو حقیر اور مشکوک نظر سے دیکھتی ہے او ران کے اندر اسلام اور مسلمان سے نفرت بڑھ رہی ہے۔

(۶) اس کاروائی سے war on Terror جیسی ظالمانہ کاروایوں کا جواز فراہم ہوتا ہے جس سے مسلم ملکوں کی آزادی اوران کے وسائل پر خطرہ لاحق ہوگیا ہے اوروہ قوتیں ہمارے ہی وسائل سے ہماری آبادیوں میں تباہی اور بربادی کا ڈرامہ اسٹیج کررہی ہیں۔

(۷) یہ دور علمی دور ہے۔ہم افکار کی جنگ ہتھیار سے نہیں لڑ سکتے اور وہ بھی ان ہتھیاروں سے جوخود ہمارے حریفوں نے ہمیں فراہم کیے ہیں۔ان کے پاس جو تکنیک اور وسائل ہیں وہ ہمارے مقابلے لاکھ گنا زیادہ ہیں۔ہم ابھی زمین پر سنبھل کر چلنا سیکھ رہے ہیں اور وہ آسمان کی اونچائیوں میں کمندیں ڈال رہے ہیں۔ہمارا ان کا کوئی مقابلہ نہیں ہے اس کا اندازہ صرف اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ امریکہ کے ایک کالج Princeton کالج میں ۳۰ ایسے پروفیسر ہیں جونوبل انعام یافتہ ہیں جب کہ عالم اسلام میں آج تک اتنے لوگوں کو نابل انعام نہیں ملے ہیں۔وہاں جس درجہ کی علمی بلندی پائی جاتی ہے، روز جس طرح کی ایجادات ہورہی ہیں ہم سوچ بھی نہیں سکتے ۔لہٰذا ہمیں ہتھیار کی جنگ کے بجائے علمی جنگ کی تیاری کرنی چاہیے۔ اور اپنی نئی نسلوں کو بچوں اور بچیوں کو علم وصحت سے آراستہ کرنے پر پورا زور صرف

کرنا چاہیے۔

(۸) ایک بڑی آبادی اور وسائل رکھنے کے باوجود ہم ساری دنیا میں پسماندہ قوم ہیں۔ مسلمان ملکوں کے پاس تیل کی دولت ضرور ہے مگر وہ ان وسائل کا بہتر استعمال کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ وہ دنیا کے لیے کچے مال کی فراہمی اور ان کے تیار مال کی کھپت کا بڑا بازار ہیں مگر خود دنیا کے وسائل سے فائدہ اٹھانے کی ان میں صلاحیت نہیں ہے۔ جن ملکوں میں تیل کی دولت ہے اگر ان کی تیل کی دولت سے حاصل شدہ آمدنی کو اگر الگ کر دیا جائے تو ان کی کل قومی دولت سوئزرلینڈ جیسے چھوٹے ملک سے کم ہے اور بین الاقوامی بازار میں ان کی درآمدات فن لینڈ جیسے ایک بہت ہی چھوٹے ملک سے بھی کم ہے۔ جب ہم یورپ کے چھوٹے سے چھوٹے ملک جو صنعتی اور عسکری طور پر بہت کمزور ہیں کا مقابلہ معاشی میدان میں نہیں کر سکتے ہیں تو دنیا کے بڑے اور طاقت ور ملکوں کا مقابلہ کیسے کر سکتے ہیں؟

(۹) ہمیں اس وقت غربت، جہالت، عدم تفاوت اور علاقائی پسماندگی کے خلاف جنگ لڑنا ہے۔ یہ لڑائی کسی اور لڑائی سے بڑی ہے اس کے لیے پرامن ماحول اور مصالحانہ فضا چاہیے اور عالمی برادری سے اچھے رشتہ درکار ہیں۔ لہٰذا یہ اسلام کا اور مسلمان کا اور عام انسانی مفاد کا تقاضہ ہے کہ مسلمان ایسی ہر اس چیز سے بچیں جو ان کی شبیہ بگاڑتی ہو جس سے اسلام، مسلمان اور پوری انسانیت کو نقصان پہنچ سکتا ہو۔

(۱۰) آخری بات یہ ہے کہ اس وقت پوری دنیا میں مسلمان ایک منقسم گروہ (Divided House) ہیں۔ وہ فرقہ بندی، ذات پات، مسلکی جھگڑے، علاقائیت اور لسانی عصبیت میں گرفتار ہیں اور آپس میں ایک دوسرے کا خون بہانا جہاد اور اسلامی خدمت سمجھتے ہیں۔ اس صورت میں دہشت گردی جیسی کاروائی خودکشی کے مترادف ہے۔ ہم نہیں سمجھتے کہ قوم کی اجتماعی سوچ اتنی مفلوج ہوگئی ہے اور اس کا اجتماعی ضمیر اتنا مردہ ہو چکا ہے جو ایسی احمقانہ اور ظالمانہ حرکتوں کی اجازت دے گا۔ لہٰذا ہمیں

موجودہ جدو جہد کے طریقے کو بدل کر وقت اور حالات کے مطابق اپنے ملک اور سماج میں بنیادی تبدیلی لانے کے لیے پوری Strategy میں تبدیلی لانی ہوگی اور پورے Grammer of struggle کو اندراور باہر سے بدلنا ہوگا تبھی ہم اکیسویں صدی میں کامیاب ہوسکتے ہیں۔

دہشت گردی کے سلسلے میں ہماری پالیسی

(۱) اخیر میں ہم کہنا چاہتے ہیں کہ دہشت گردی اسلام میں جائز نہیں ہے اور ہم دہشت گردی کی ہر قسم کی، جوکسی بھی شخص، گروہ، یا تنظیم کے ذریعہ انجام دی جارہی ہے خواہ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم اس کی پرزور مذمت کرتے ہیں۔ اسے انسانیت کے خلاف ایک مجرمانہ عمل اور جرم عظیم مانتے ہیں اور اس کا قلع قمع کرنے میں ہر ممکن تعاون دینے کو تیار ہیں۔

(۲) اگر کوئی مسلمان فرد یا گروہ اس طرح کا کام کرتا ہے تو ہم اس سے اپنی برأت کا اعلان کرتے ہیں اور عامۃ المسلمین سے درخواست کرتے ہیں کہ ایسے عناصر کو ملت سے نکال باہر کریں۔ یہ اسلام مسلمان اور انسانیت تینوں کے مجرم ہیں۔ لہٰذا ایسے عناصر کے خلاف آواز بلند کرنا اور ان کو Expose کرنا ضروری ہے۔

(۳) دہشت گردی کے نام پر اسلام، مسلمان، اسلامی اداروں، جماعتوں اور افراد کو بدنام کرنے کی سازش اور کوشش کی جارہی ہے۔ اس کی بھی سخت مذمت کرتے ہیں اور ایسے افراد اور اداروں کو جو اس سازش میں ملوث ہیں ان کو بھی Expose کرنے کی پرزور مہم چلانے کی ضرورت ہیں۔

(۴) پرنٹ اور الیکٹرونک میڈیا کے ذریعہ، جھوٹی اور اشتعال انگیز خبریں، فیچر اور پروگرام نشر کئے جاتے ہیں ان کا سختی اور سنجیدگی سے نوٹس لیا جانا چاہیے۔ پریس کونسل، عدالت، پارلیمنٹ اور رائے عامہ میں ان کے خلاف پوری مضبوطی سے آواز بلند

کرنا چاہیے تا کہ وہ اپنی مذموم حرکتوں سے باز آ جائیں۔

(۵) خفیہ ایجنسیاں اور پولس جس طرح مسلم نوجوانوں کو غیر قانونی ڈھنگ سے گرفتار کرتی ہیں اور حبس بیجا میں رکھتی ہیں ان کے خلا ف سول سوسائٹی، حقوق انسانی کے اداروں، پریس، عدالت اور پارلیمنٹ میں زوردار آواز اٹھانی چاہیے تا کہ وہ اس طرح کی مجرمانہ اور غیر قانونی کاروائیاں نہ کرسکیں۔

(۶) جو مسلم نوجوان اور دیگر لوگ برسہا برس سے جیلوں میں بند ہیں اور جن پر ابھی تک فرد جرم عائد نہیں کی گئی ہے ان کا پتہ لگا کر ان کو قانونی مدد فراہم کرانی چاہیے۔ اس کے لیے ایک مشترکہ ملی فورم بنانا چاہیے جو اس کام کو انجام دے اور حکومت پر زور ڈالنا چاہیے کہ ان کے لیے Special Court بنائے تا کہ جلد سے جلد ان کی شنوائی ہو اور ان کو انصاف ملے۔

(۷) جو لوگ عدالتوں کے فیصلہ سے بے قصور ثابت ہوئے ہیں ان کی باز آباد کاری کا معقول انتظام کیا جانا چاہیے۔ ان کو مناسب معاوضہ دلوانے کی باضابطہ جدو جہد کی جانی چاہیے تا کہ وہ پھر سے اپنے پاؤں پر کھڑے ہو کر باعزت زندگی گذار سکیں۔

(۸) جن بے قصوور لوگوں کو سازش کے تحت جھوٹے الزمات میں پھنسا کر جیلوں میں بند کر دیا گیا ہے اور عدالت نے ان کو بے قصور ثابت کر دیا۔ ایسے پولس اور دیگر اہل کار جو ان کی گرفتاری میں پیش پیش رہے ہیں ان کے خلاف باضابطہ ہندوستانی قانون میں شہری تحفظات کے تحت مقدمہ دائر کیا جانا چاہیے اور ان سے ہرجانہ وصول کرنے کی جدو جہد کرنی چاہیے۔

(۹) انسداد دہشت گردی کے لیے تمام افراد اور جماعتوں کے ساتھ مل کر ملک گیر مہم چلانی چاہیے اور جو بھی دہشت گرد ہے چاہے وہ ہندو ہو، مسلم یا کسی اور قوم و برادری کا فرد ہو اس کے خلاف پوری طاقت سے متحد ہو کر لڑنے کا عزم پیدا کرنا چاہے۔

(۱۰) جو لوگ دہشت گردانہ کاروائی میں اپنے عزیز وا قارب گنوا بیٹھے ہیں، جسمانی اور ذہنی

طور پر مفلوج ہو گئے ہیں یا جن کے مال وجائداد کو نقصان پہنچا ہے ایسے تمام لوگوں کو مناسب معاوضہ دلوانے، ان کی باز آباد کاری کرنے اور ان کو ہر ممکن تعاون دینے کی مشترکہ کوشش کی جانی چاہیے۔

دہشت گردی ایک مشترکہ مسئلہ ہے لہٰذا اس کا مشترکہ حل نکالنے کے لیے تمام امن پسند لوگوں کو آگے آنا چاہیے۔ چونکہ یہ مشترکہ قومی مسئلہ ہے جس کے شکار ہندو اور مسلمان سبھی ہوتے ہیں اس لیے سبھوں کو مل کر اس کے خلاف لڑنے اور اس کو ختم کرنے کی ضرورت ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ایسی ہر کوشش کی اسلام حمایت کرتا ہے اور مسلمان بحیثیت امت اس کی تائید کرتے ہیں۔ بس اتنی گذارش ہے کہ اسلامی اور جہادی دہشت گردی کی اصطلاح پر مکمل پابندی لگائی جائے کیونکہ یہ اپنے آپ میں ایک دہشت گردانہ ذہنیت کی غماز ہے۔ اور خود ایک دہشت گردی ہے۔

آزادی کے بعد اردو زبان کو درپیش مسائل

بنیادی طور پر کوئی بھی زبان اس کے پڑھنے، لکھنے اور بولنے والوں سے طاقت حاصل کرتی ہے۔ وہ زبان کتنی زندہ اور اثر پذیر ہے یہ اس تعداد اور افرادی قوت پر منحصر ہے جو اس کو اپنے روزمرہ کے معاملات میں ذریعہ اظہار کے طور پر استعمال کرتی ہے۔ اردو کے ساتھ سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ آزادی سے قبل اردو ہندوستان کی ایک مشترکہ زبان تھی اور شمالی ہند کی ایک بڑی آبادی کشمیر سے لے کر بنگال تک اس زبان کو اپنے ذریعۂ اظہار کے طور پر استعمال کرتی تھی۔ کشمیر میں اردو ہندوؤں اور مسلمانوں کی ادبی اور علمی زبان تھی۔ اسی طرح پنجاب تو اردو کا گھر ہی تھا اور وہاں سکھ، پنجابی اور مسلمان بلکہ بہت سے ہندو اس زبان کو مادری زبان کی حیثیت سے بولتے اور پڑھتے تھے۔ دہلی اور یوپی پر اردو تہذیب کا جو غلبہ تھا اس کے اثرات آج بھی دیکھے اور محسوس کئے جا سکتے ہیں۔ بہار اردو ایک بڑا مرکز رہا ہے۔ کلکتہ، مرشدہ آباد اور ڈھاکہ اردو کے بڑے مراکز رہے ہیں اور یہ ہندوستان کی مشترکہ زبان رہی ہے۔ اردو کے ادیبوں، شاعروں، ناقدوں اور دیگر اصناف سخن میں مسلمانوں کے علاوہ قریب قریب ہر قوم اور برادری کے افراد کا بڑا حصہ رہا ہے جس کی باقیات آج بھی موجود ہیں۔ لیکن اب یہ صرف مسلمانوں کی زبان بن کر رہ گئی ہے جس پر چہار جانب سے فرقہ واریت کا پہرہ ہے جو اس زبان کے فروغ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ اردو تحریک کے قائدین اور اردو کے فروغ

کے لیے قائم اداروں کو اس جانب توجہ دینی چاہیے اور اس پر غور کرنا چاہیے کہ کیسے ایک بار پھر اردو ملک کی مشترکہ زبان کی حیثیت اختیار کر سکتی ہے۔

کوئی زبان کسی خاص قوم کی میراث نہیں ہوتی۔ لیکن جس زبان کو کسی خاص قوم کے لوگ یا کسی خاص خطہ میں آباد افراد زیادہ بولتے ہیں اور اپنے ذریعۂ اظہار کے طور پر استعمال کرتے ہیں بالعموم وہ زبان اس قوم یا خطہ سے موسوم ہو جاتی ہے۔

اردو خالص بھارتی زبان ہے جو ہماری مشترکہ تہذیب کی علامت ہے۔ اس کا جنم ہندوستان میں آباد مختلف قوموں کے اختلاط سے میدان جنگ، بازاروں اور کھیت کھلیانوں میں ہوا ہے جس کا قدیم نام ریختہ، ہندوی اور ہندوستانی ہے۔ لیکن جب سے یہ زبان رائج ہے اس کو ہمیشہ فارسی رسم الخط میں ہی لکھا جاتا رہا ہے۔ اپنے رسم الخط کے قرب کی وجہ سے یہ زبان فارسی اور عربی سے قریب رہی اور اس میں مروج بیشتر الفاظ ومحاورات پر اس کی چھاپ دیکھی جاسکتی ہے۔ اس کا یہی قرب ہے جس کی وجہ سے یہ زبان مسلمانوں سے قریب ہوگئی اور بعد میں مسلمانوں نے اپنی تمدنی زبان کی حیثیت سے اپنا لیا۔ مغل حکومت کے آخری ادوار میں جب فارسی کا زور ٹوٹا تو اردو کو اس کی جگہ پر سرکاری اور درباری زبان کا درجہ حاصل ہو گیا اور سترہویں صدی کے اواخر اور اٹھارہویں صدی کے اوائل سے یہ لکھنے پڑھنے کی زبان بن گئی جس میں باضابطہ شعر گوئی اور تصنیف وتالیف کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

مسلمانوں نے اس زبان کو فروغ دینے میں بیش بہا خدمات انجام دی ہیں اور اس کو ہر طرح کے موضوعات کے اظہار کا وسیلہ بنایا۔ آج مسلمانوں کا تاریخی، تمدنی اور مذہبی لٹریچر جتنا اس زبان میں موجود ہے شاید ہی کسی مشرقی زبان میں ہو۔

عربی اور فارسی کے بعد جتنا مذہبی سرمایہ اردو زبان میں ہے دنیا کی کسی دوسری زبان میں نہیں ہے بلکہ اردو زبان میں بعض ایسے اوریجنل اور معرکۃ الآرا کام ہوئے ہیں کہ عربی اور فارسی کے ماہرین بھی اس کو بطور سند استعمال کرتے ہیں۔ اس لیے مسلمانوں سے اس زبان کا اتنا گہرا تمدنی رشتہ ہے جو ہندوستان بالخصوص شمالی ہندوستان میں ان کے وجود کی

علامت بن گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان اس زبان کے بارے میں تھوڑے جذباتی واقع ہوئے ہیں اور اس کی حفاظت اپنی ماں کی طرح کرنا چاہتے ہیں۔ ہندوستان میں جب دوسرے لوگوں نے اس زبان کو بعض تاریخی اورسیاسی اسباب کی بناپر چھوڑ نا شروع کیا تو مسلمانوں نے اس کو گلے سے لگایا اوراس کی حفاظت وفروغ کی زبردست مہم چلائی جواس وقت ایک بڑی سیاسی تحریک بن گئی ہے۔

اردوزبان کوسب سے بڑادھکا اس وقت لگا جب انگریزوں نے یہاں کے نظام تعلیم اورنصاب تعلیم کو بدل دیااوردیسی زبانوں کی جگہ انگریزی کوتعلیم کا ذریعہ بنایا۔فطری بات ہے جس زبان کا اقتدار ہوتاہے اس کا فروغ زیادہ ہوتا ہے۔ چنانچہ انگریزی علمی،ثقافتی،سرکاری زبان کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے مختلف خطوں میں رابطہ کی زبان بن کرابھری ۔اوراس کی پکڑاتنی مضبوط ہوئی کہ آزادی کے بعدبھی اس کا دبدبہ قائم ہےاوراب اس عالمگیریت کے دور میں کامیابی کی کنجی مانی جاتی ہے۔اس وقت صورتحال یہ ہے کہ انگریزی کا جتنا چرچہ انگریزوں کے وقت نہیں تھا اس سے کہیں زیادہ چرچہ اس وقت ہےاوراس کی سب سے واضح علامت یہ ہے کہ آپ کوشہروں،قصبوں حتی کہ دیہاتوں میں ہرجگہ نام نہاد انگریزی میڈیم اسکول کے بورڈ نظرآئیں گے۔ یہ کتنی اورکیسی انگریزی پڑھاتے ہیں یہ الگ سوال ہے۔لیکن انگریزی کا جادو سرچڑھ کر بول رہاہے ۔ یہ ایک زندہ حقیقت ہے لیکن انگریزوں نے اس ملک پرسات سمندر پارسے آکر یوں ہی حکومت نہیں کی تھی۔ان کے پاس بہتر انتظامی صلاحیت،مضبوط فوجی قوت، اعلیٰ ٹکنالوجی ہی نہیں تھی بلکہ وہ Diversity Managment اچھی طرح جانتے تھے۔ان کے اندرعملی طورپر وسعت نظری اوروسعت قلبی بھی تھی جس کی وجہ سے انہوں نے دیسی زبانوں کی تعلیم اورترقی کا اچھاانتظام کررکھا تھااور ہرطبقہ اورزبان کواپنے مذہب،تہذیب،کلچراورزبان کی حفاظت کی آزادی دے رکھی تھی۔ وہ ان کی دکھتی رگ کوتبھی چھیڑتے تھے جب ان کا سیاسی مفادخطرے میں ہوتا تھا۔

لیکن ہندوستان کوجس فرقہ وارانہ اورقومی کش مکش کے جلو میں آزادی حاصل ہوئی

اس نے ہمارے بعض حکمرانوں کے دلوں کو چھوٹا کر دیا اور وہ تعصب وتنگ نظری سے اپنا دامن بچا نہیں سکے۔ اردو ایسے لوگوں کے ہاتھ چڑھ گئی اور وہ بالواسطہ اور بلا واسطہ اس کو زک پہنچانے اور ختم کرنے کے لیے سرگرم ہو گئے۔ آزادی کے فوراً بعد پنجابیوں کی نئی نسل نے اردو سے ناطہ توڑ لیا۔ وہ لوگ جو اردو تہذیب کے پروردہ تھے اپنی نسلوں کو اردو پڑھانا بند کر دیا گویا وہ روایت ان پر آ کر ختم ہو گئی۔ غضب بالائے غضب یہ ہوا کہ نہ صرف ہندوؤں پر اردو زبان کے دروازے بند کر دئے گئے بلکہ پہلے گوبند بلونتھ اور بعد میں سمپورنا نند نے یوپی میں سرکاری پرائمری اور سکنڈری اسکولوں میں اردو تعلیم کو نصاب سے خارج کر دیا۔ اس طرح عام مسلمانوں پر اردو تعلیم کے دروازے بند ہو گئے۔ بھلا ہو اردو اور عربی مدارس کا، مولانا حفظ الرحمٰن اور دینی تعلیمی کاؤنسل کا جنہوں نے ایک زبردست دفاعی نظام کھڑا کر کے اردو تعلیم اور اردو کا زبان کو باقی رکھا اور آج پھر اردو کا کارواں اپنی کھوئی زمینوں کی بازیافت میں رواں دواں ہے۔

کوئی زبان خراب یا بری نہیں ہوتی۔ اس کا استعمال خراب اور غلط ہو سکتا ہے۔ یہی زبان ہے جس سے کوئی آدمی کسی کو گالی دیتا ہے اور یہی زبان ہے جس سے کسی کی تعریف کرتا ہے۔ تو گالی کا جواب یہ نہیں ہے کہ زبان کاٹ دی جائے بلکہ اس کو صحیح تہذیب سکھائی جائے۔ اس معاملے میں کسی Linguistic Chauvinism کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے۔

دنیا کی ہر زبان اچھی ہے اور ایک شخص کے پڑھے لکھے ہونے کی ایک علامت یہ بھی ہے کہ وہ کتنی زبانیں جانتا ہے۔ ہمارا سماج اور ہمارا تعلیمی نظام Multi - Lingual ہے۔ ایک زمانے میں ہمارے یہاں زبان کو لے کر کافی ہنگامہ آرائی ہو چکی ہے۔ اس مسئلہ کے حل کے طور پر سہ لسانی فورمولہ پیش کیا گیا جس میں ہر بچہ کو تین زبانوں کی تعلیم کی بات کی گئی تھی۔ ایک مادری زبان، دوسری قومی زبان تیسری رابطے کی زبان۔ مسلمانوں کے لیے اس کا مفہوم اردو، ہندی اور انگریزی قرار پایا۔ غیر مسلم بچوں کے لیے آج تک یہ طے نہیں ہو پایا کہ سہ لسانی فورمولہ کس طرح نافذ العمل ہوگا۔ کچھ لوگوں نے مقامی بولیوں کو زبان کا درجہ دے کر اس فورمولہ کو اپنانے کا مشورہ دیا تو کچھ نے جنوبی ریاستوں کی کسی زبان کی تعلیم کی تجویز پیش کی۔

جب کہ اتر بھارت میں اگر تیسری زبان کی حیثیت سے ہندی، انگریزی کے ساتھ اردو کو سہ لسانی فورمولہ کے تحت اختیار کرلیا جاتا تو اس سے اردو زبان کو فروغ بھی ہوتا اور قومی یکجہتی کو مستحکم کرنے میں مدد بھی ملتی۔ پتہ نہیں ہمارے سیاست کاروں اور بیورکریٹس کو کب یہ بات سمجھ میں آئے گی۔ بہرحال یہ اپنوں کی بے توجہی اور غیروں کے تعصب کا شکار ہے۔

ایک عہد تھا کہ اردو شرفاء کی زبان سمجھی جاتی تھی اور ایک آدمی کے پڑھا لکھا ہونے کی پہچان یہ تھی کہ اسے کتنی اردو اور فارسی آتی ہے۔اب صورتحال بالکل بدل گئی ہے۔ مسلمانوں کے بڑے اور اعلیٰ طبقہ نے انگریزوں کے دور اقتدار سے ہی اردو کو اپنے نصاب بلکہ اپنے گھروں سے نکال دیا تھا اور وہ نقلی انگریز بن کر انگریزی کو اپنی نجی اور گھریلو زبان کے طور پر اپنانے لگے تھے۔ تبدیلیٔ اقتدار سے ان کی ذہنیت پر کوئی فرق نہیں پڑا اس لیے کہ آج بھی ان کے گھروں میں انگریزی کا بول بالا ہے۔ اب انہوں نے اتنی تبدیلی ضرور کرلی ہے کہ انگریزی کے ساتھ ساتھ ہندی سیکھنے پر زور دے رہے ہیں اور اپنی سرکاری اور سیاسی ضروتیں انگریزی اور ہندی دونوں زبانوں میں پوری کرتے ہیں۔اردو کے باقی رہنے اور نہ رہنے سے ان کی صحت پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہ دیسی گانوں اور غزلوں کے بجائے ویسٹرن میوزک اور ویسٹرن گانے ہی زیادہ پسند کرتے ہیں۔

مسلمانوں میں غربت و جہالت عام ہے اس لیے مسلمان آبادی کی لگ بھگ ۷۰ فیصد تعداد آج بھی جہالت کی اندھی کھائی میں پڑی ہے۔ ظاہر سی بات ہے ان کے لیے کسی زبان کا مسئلہ کوئی معنی نہیں رکھتا۔ یہ مسئلہ ان کے لیے ہے جو پڑھنا لکھنا چاہتے ہیں۔ یہ آبادی کیسے تعلیم حاصل کرے گی اور اس آبادی کے لیے اردو ذریعہ تعلیم کے طور پر کیسے لائق استعمال بنائی جائے گی یہ ہمارے سامنے سب سے بڑا چیلنج ہے۔

کسی قوم کی ترقی کا پورا انحصار اس کے اندر مڈل کلاس طبقے کے وجود اور تعداد پر ہوتا ہے۔ مسلمانوں میں یہ طبقہ بہت ہی محدود ہے اس لیے مسلمانوں کی عام آبادی پسماندہ ہے جہاں مؤثر لیڈرشپ کی کمی ہے جس کی وجہ سے اس کا کوئی مسئلہ حل نہیں ہو رہا ہے۔ یہ کمیونٹی دو

قدم آگے اور تین قدم پیچھے کی رفتار سے چل رہی ہے۔ ہر جگہ ایک ناخوشگوار ٹھہراؤ اور جمود کی کیفیت دیکھنے کو مل رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو زبان آزادی کے بعد ترقی کے بجائے تنزل پذیر ہے اور مسلمان آبادیوں سے اردو غائب ہورہی ہے۔ آپ کو اردو میں نہ کوئی نیم پلیٹ نظر آئے گا، نہ بورڈ ملے گا۔ اردو اخبارات ورسائل کا سرکولیشن بہت کوشش کے باوجود بھی بہت کم ہے۔ اب لوگ خطوط، شادیوں کے کارڈ اور دیگر گھریلوں ضروریات بھی غیر اردو زبانوں میں لکھتے ہیں۔ اردو کا سماجی چلن اتنا کم ہوگیا کہ اب اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگ صحیح اردو لکھنے بولنے پر قدرت نہیں رکھتے اور اس زبان کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ خاص طور سے آپ اسکول میں تعلیم پانے والے کسی طالب علم سے ملیں اور اردو میں اس سے بات کیجئے آپ کو ایسا محسوس ہوگا گویا آپ اس کے سامنے کسی ایسی زبان میں بات کررہے ہیں جس کے پچاس فیصد الفاظ و محاورات اس کی سمجھ سے باہر ہیں۔

مجھے اس تلخ گوئی کے لیے معاف کیا جائے کہ اردو کے ساتھ سب سے بڑی غداری اردو اساتذہ نے کی ہے۔ پرائمری سے لے کر پوسٹ گریجویٹ تک چند مستثنیات کے علاوہ اردو کی جس طرح تعلیم دی جارہی ہے اور جو لوگ اردو تعلیم کے کام پر مامور ہیں ان کے لیے اس کے علاوہ کوئی لفظ استعمال نہیں کیا جاسکتا کہ وہ اردو زبان کے قاتل ہیں۔ ایک تو ان میں سے بہت کم لوگ اپنے بچوں کو اردو تعلیم دلواتے ہیں دوسرے وہ ایسی سہل انگاری اور بے ایمانی کا مظاہرہ کرتے ہیں جس سے طلباء میں زبان کا ذوق پیدا نہیں ہوپاتا اور جب یہی لوگ ٹیچر اور لیکچرر بحال ہوکر آجاتے ہیں تو پھر اس زبان کا خدا ہی حافظ ہے۔

اردو عوام کی اردو سے دلچسپی اس قدر گھٹتی جارہی ہے کہ اب اردو ذریعۂ تعلیم کے تحت بچوں کو تعلیم دلانا بلکہ اردو کو بطور ایک مضمون کے پڑھوانا بھی ان کو گوارہ نہیں ہے۔ بچہ ابھی تین سال کا ہوا نہیں وہ ٹھیک سے چلنا اور بولنا بھی سیکھ نہیں پایا کہ اس کا داخلہ کسی نام نہاد کونونٹ اسکول میں کرادیا جاتا ہے جہاں کے نصاب میں اردو شامل نہیں ہے۔ پہلے جو لوگ ایسا کرتے بھی تھے وہ کم از کم اپنے گھروں پر اردو قرآن اور دینیات کی تعلیم کے لیے مولوی صاحبان کی مدد

لیا کرتے تھے لیکن اب ان بچوں پر ایک تو بستہ کا بوجھ اتنا بڑھ گیا اس پر مستزاد ٹی وی کلچر نے اس طرح مسحور کر رکھا ہے کہ وہ فرصت کے اوقات میں کوئی دوسرا کام کرنا پسند ہی نہیں کرتے۔ ایسی صورت میں زمانے کے چلن اور تہذیبی یلغار سے اردو زبان کو زبردست نقصان ہو رہا ہے۔

سرکاری اسکولوں میں اردو تعلیم کا معقول انتظام نہیں ہے۔ایک تو اردو میڈیم پرائمری اور سکنڈری اسکولوں کی بہت کمی ہے اور اگر کہیں ہے بھی تو اکثر جگہوں پر یہ شکایت سننے کو ملتی ہے کہ اردو اساتذہ کی جگہ پر غیر اردو اساتذہ بحال ہیں نتیجے کے طور پر جب اردو ٹیچر نہیں ہوں گے تو اردو پڑھائے گا کون؟ سرکار کی واضح پالیسی کے باوجود جہاں اردو آبادی ہوگی وہاں اردو میڈیم پرائمری اور مڈل اسکول کھولے جائیں گے اور جس ادارے میں دس بچے اردو پڑھنے والے ہوں گے وہاں ایک اردو یونٹ دیا جائے گا لیکن اس کے باوجود اس پر عملدرآمد نہیں ہو رہا ہے۔ میرا مشورہ ہے کہ انجمن ترقی اردو بہار، بہار اردو اکیڈمی۔ اقلیتی کمیشن اور وزارت اقلیتی فلاح کو اس جانب خصوصی توجہ دینی چاہیے اور مسلمان آبادیوں کا سروے کرا کر اردو میڈیم اداروں کے احتیاج کی فہرست ضلع دار حکومت کے حوالے کرنی چاہیے اور اردو یونٹ پر اردو اساتذہ کی تقرری کو یقینی بنانے کی مہم چلانی چاہیے۔دوسرا مشورہ یہ ہے کہ جو اساتذہ اردو یونٹ پر بحال ہیں ان کی شارٹ ٹرم ٹریننگ اور Orientation پروگرام انجمن ترقی اردو اور اردو اکیڈمی کو چلانا چاہیے تا کہ اردو تعلیم و تعلم کا معیار بلند ہو سکے اور یہ لوگ ٹھیک ڈھنگ سے اردو زبان کی تعلیم دے سکیں ساتھ ہی ابتدائی درجات سے ہی اردو کمپیوٹر کورس شروع کرنے پر زور دینا چاہیے۔

سی بی ایس ای نصاب میں دولسانی فورمولہ کو اختیار کر کے اردو کو پہلے سے ہی خارج از نصاب کر دیا گیا ہے جس کی وجہ سے جو طلباء اس نصاب کے تحت تعلیم حاصل کر رہے ہیں وہ اردو تعلیم سے محروم رہ جاتے ہیں۔اب ہر جگہ سی بی ایس ای نصاب کا فیشن چل گیا ہے لہٰذا ایسے پرائیوٹ اداروں میں بھی اردو نہیں پڑھائی جاتی۔ ہمارے لیے یہ بھی توجہ کا میدان ہے۔ہمیں مرکزی حکومت کے ذمہ داران اور کندریہ ودیالیہ سنگٹھن سے رابطہ کر کے اردو کو داخل نصاب

کرانے کی تحریک چلانی چاہیے ۔اس کا ایک قابل عمل طریقہ یہ ہے کہ اردو آبادی کے بچے پچاس نمبر کی ہندی اور پچاس نمبر کی اردو پڑھیں تو نصاب میں کوئی بڑی تبدیلی لائے بغیر یہ گنجائش نکالی جاسکتی ہے۔

بہار سکنڈری بورڈ کو بھی سی بی ایس ای نصاب کے تحت چلانے کی بات سرکار کے زیر غور ہے۔کچھ لوگ سازش کر کے اردو کو خارج از نصاب کرنے کے لیے کوشاں ہیں۔اگر ہم سی بی ایس ای نصاب اس لیے لاگو کرنا چاہتے ہیں کہ ہمارے بچوں کو زیادہ نمبر ملیں اور ان کا اوسط اونچا ہوتو اس کے لیے مضامین کو گھٹانے اور بڑھانے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔اس کے لیے نصاب کی از سر نو تدوین کرنی ہوگی اور سوالات کے پیٹرن کو بدلنا ہوگا ساتھ ہی Standardized Marking کا طریقہ متعین کرنا ہوگا۔ ۔اس لیے کہ سی بی ایس ای کے امتحان پانچ سو نمبر کے ضرور ہوتے ہیں لیکن اس کا Courses of Studies ہمارے بورڈ سے کسی بھی مضمون میں کہیں زیادہ ہے۔ ہمارے یہاں نصاب کا مسئلہ کم اور System Failure کا مسئلہ زیادہ ہے اس لیے جب تک ہم سسٹم میں سدھار نہیں لاتے محض نصاب بدلنے اور کسی مضمون کو گھٹانے بڑھانے سے مسئلہ حل نہیں ہوگا۔سوال یہ ہے کہ نصاب میں جو تبدیلی بھی لائی جائے اردو کا مقام محفوظ رہنا چاہیے اس معاملے میں تمام متعلقہ اداروں اور افراد کو چوکنا رہنے کی ضرورت ہے۔

ہمارے یہاں دو طرح کے مدارس پائے جاتے ہیں۔ ایک سرکاری دوسرے غیر سرکاری۔ مدرسہ بورڈ کے تحت جو ادارے چلائے جارہے ہیں جہاں اردو بحیثیت زبان نصاب میں شامل ہے بالعموم اس کا حال بہت برا ہے اور غیر سرکاری مدرسوں میں اردو ذریعہ تعلیم تو ہے لیکن اردو زبان وادب کی حیثیت سے ان کے نصاب کا حصہ نہیں ہے۔ مدرسوں نے اردو کو زندہ رکھنے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے لہٰذا ہماری درخواست ہے کہ مدرسوں کے نصاب میں اردو زبان وادب کو شامل کیا جائے تا کہ اردو کو ٹھوس زمین فراہم ہو سکے۔

اردو تعلیم و تعلم کے باب میں اقلیتی سکنڈری اسکولوں اور کالجوں کا حال بھی بہت برا

ہے۔ اردو تحریک کو ان اداروں کو مرکز بنا کر یہاں اردو کے فروغ کے لیے خصوصی مہم چلانی چاہیے۔

کسی زبان کی جنگ محض سیاسی نعروں سے نہیں جیتی جا سکتی بلکہ اس کے لیے سماج میں عام قبولیت کی فضا پیدا کرنا ضروری ہے۔ اردو کو اس کا جائز حق ملے اور اس کی سیاسی کوششوں کے ساتھ ساتھ اس کا چلن عام ہو اس کے لیے تعلیمی اور سماجی کوشش کو تیز کرنے کی ضرورت ہے ورنہ علی سردار جعفری کی طرح اردو رسم الخط کو تبدیل کرنے کی وکالت کرنی ہوگی یا پھر بشیر بدر کی طرح اپنی شاعری کو زندہ رکھنے کے لیے گویّوں کا سہارا لینا ہوگا اور کیسٹ اور البم کی مدد سے یا پھر دیوناگری رسم الخط میں اپنی شاعری چھاپ کر لوگوں تک پہنچانا ہوگا یا پھر مجتبیٰ حسین کی طرح انڈمان نکوبار جا کر اردو کا آخری قاری تلاش کرنا ہوگا۔ یہ کسی فرد کا مسئلہ نہیں ہے جو اپنی ترسیل کے لیے کوئی بھی میڈیم اختیار کر سکتا ہے۔ یہ اس زبان اور اس زبان کے بولنے والوں کا مسئلہ ہے جن کو اپنے وجود کو ثابت کرنے کے لیے اپنے پاؤں تلے گز بھر ٹھوس زمین اور سر پر مٹھی بھر آسمان چاہیے۔

اردو کا مقدمہ عوام کی عدالت میں

بھارت میں اردو

اردو نہ تو ایران اورعرب سے برآمد کی ہوئی زبان ہےاور نہ یہ انگریزی ،فرنچ، روسی، جرمن، چینی اور جاپانی زبانوں کی طرح غیر ملکی زبان ہے، بلکہ یہ ہندی ، بنگلہ ،تامل ،تلگو، ملیالم مراٹھی، اور کنڑ زبانوں کی طرح خالص ہندوستانی زبان ہے جو بھارت کی زرخیز آب وہوا میں پیدا ہوئی پلی بڑھی اور جوان ہوئی ہے۔یہی سرزمین اس کی جائے پیدائش ہے۔ ہندوستان جنت نشان جہاں چشتی نے پیغام حق سنایا اور نانک نے وحدت کے گیت گائے، اردو زبان اس ملک میں وہ نیا شوالہ ہے جہاں پہنچ کر غیرت کے پردے اٹھ جاتے ہیں،نقش دوئی مٹ جاتی ہے، منہ سے میٹھے منتر نکلتے ہیں اور پریت کی گنگا بہتی ہے جس سے خاک وطن کا ہر ذرہ پاک اور مقدس بن جاتا ہے۔ بھارت کی عظمت کے ترانے جتنی اردو زبان میں گائے گئے ہیں شاید ہندوستان کی کسی دوسری زبان میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا اس کے مثل اور اس کے برابر کا کوئی شعر کوئی ہندوستانی زبان تو کیا پورے عالمی لٹریچر میں موجود نہیں ہے ۔ ہندوستان کی عظمت کے بارے میں اس سے بہتر اور اس سے اونچا کچھ بھی نہیں کہا جاسکتا ہے۔

اردو ایک لشکری زبان ہے جس نے تاریخ کے مختلف ادوار دیکھے ہیں۔ پنجاب کے

کھیت کھلیان، کشمیر کی وادیاں، قلعہ معلیٰ کا پرشکوہ منظر، حیدرآباد کا آصف جاہی دربار، بھوپال کے نوابین کا جلال، اودھ کا جمال، عظیم آباد کی گلیوں کی چہل پہل اور مرشدآباد کی رونق وہ کونسا منظر ہے جس کی اردو شاہد وامین نہیں ہے۔ اس نے بہادر شاہ کے بیٹوں کے تراشیدہ سر بھی دیکھے ہیں۔ غدر کے خونچکاں منظر کی بھی یہ راوی ہے۔ اس نے بیگم حضرت محل اور زینت محل کو ننگے سر اور ننگے پاؤں اپنی جان اور عصمت کی حفاظت کے لیے سرگرداں اور حیراں ادھر سے ادھر دوڑتے اور پناہ ڈھونڈتے دیکھا ہے۔ یہ جنگ آزادی کا ہراول دستہ بن کر انقلاب زندہ باد کا نعرہ لگاتے ہوئے دیس کے ہر شہر، ہر گلی، ہر بازار، ہر قصبہ اور گاؤں سے گذری ہے اور سرفروشی کے جوہر دکھاتے ہوئے کنجشک فرومایہ کو شاہین سے لڑنے کا درس دیتی رہی ہے جس نے بالآخر انگریزوں کو ملک چھوڑنے پر مجبور کر دیا اور بھارت آزاد ہوکر رہا۔

اردو، مزدور کا نعرہ، کسان کا ہل۔ صنعت کار کی ہمت، تاجر کی حکمت، عالم کا نطق، دانشور کا قلم، فن کار کا فن، صحافی کا ہتھیار، سیاست داں کی شیرینی، استاد کا جوہر اور طالب علم کا سرمایۂ حیات ہے۔ یہ محض ایک زبان نہیں ہے، ایک تاریخ ایک تہذیب ایک ثقافت ہے بقول رگھوپتی سہائے فراقؔ اردو مہذب گفتار کا ذریعہ ہے۔

برا ہو وقت کی سیاست کا جس نے اردو اور ہندی کو جو ماں جائی بہنیں ہیں ایک دوسرے کا سوتن بنا دیا۔ دونوں ایک ہی خاندان کی زبانیں ہیں جن کے ستر فیصد الفاظ مشترک ہیں۔ صرف رسم الخط کا فرق ہے۔ اردو اور ہندی کے جھگڑے نے نہ صرف تخلیقی سطح پر ان دونوں زبانوں کو نقصان پہنچایا ہے بلکہ سیاسی اور سماجی سطح پر بھی چپقلش پیدا کی ہے۔ شمالی ہند کے ہندوؤں اور مسلمانوں میں جو متنازعہ امور ہیں ان میں ایک اردو اور ہندی کا غیر منطقی تضاد بھی ہے جب کہ اردو کی تاریخ وتہذیب کا جائزہ لیا جائے تو یہ ہماری مشترکہ تہذیب جس کو گنگا جمنی تہذیب کہا جاتا ہے جس نے قومی یک جہتی کو فروغ دیا ہے اس کی علامت ہے۔ لہٰذا اردو کا فروغ ملک کا فروغ ہے۔ ملک میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی، رواداری، وسعت قلبی، وسعت نظری اور اتحاد ویگانگت کا فروغ ہے کیونکہ اردو ان قدروں کی بدرجہ اتم امین، محافظ اور پیامبر ہے۔

ایک معنی میں اردو کسی مذہبی صحیفہ کی زبان نہیں ہے۔ لہٰذا یہ خالصتاً سیکولر زبان ہے۔ اس طرح بھارت کی یک جہتی اور اتحاد و سالمیت کی نیو کی اینٹ ہے۔ اس کو ہندو و مسلم کے عینک سے دیکھنا اور اردو بنام ہندی بنانا ہندی اور اردو دونوں زبانوں کی تاریخ اور ارتقا سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔

انگریزوں کی آمد نے اردو زبان وادب کو کیا فائدہ اور نقصان پہنچایا، جنگ آزادی کے درمیان اردو، ہندی کشمکش نے کیا حالات پیدا کئے، یہ ہماری تاریخ کا ایک تلخ باب ہے جس کی تفصیل میں جانے کا یہاں کوئی موقع نہیں ہے۔ بس اتنا جانئے کہ شمالی ہند میں ہند و مسلم کش مکش کا آغاز اس لسانی تعصب کی وجہ سے ہوا جو اردو اور ہندی کے درمیان بعض تنگ نظر رہنماؤں نے پیدا کر دیا تھا۔ اور اردو و ہندی جو ماں جائی بہنیں تھیں جو ایک قبیلے اور ایک خاندان سے آتی تھیں ان کو سوت اور سوتیلا بنا دیا۔ تمام تعصب اور تنگ نظری کے باوجود انتہائی جذباتی ماحول میں بھی جب دستور ساز اسمبلی میں اردو ہندی کے درمیان قومی زبان کا مسئلہ چھڑا تو محض ایک ووٹ یعنی صدر کے کاسٹنگ ووٹ سے ہندی کو اردو پر اولیت حاصل ہوئی، اس طرح ہندی ملک کی آفیشیل لینگویج قرار پائی جس نے آزاد ہندوستان کے لسانی منظر نامے کو بالکل بدل کر رکھ دیا۔

آزادی سے قبل اردو پنجاب سے لے کر آسام تک ایک اہم بلکہ واحد رابطے کی زبان تھی جس کو تمام قوموں اور برادریوں کے لوگ تمام تر ثقافتی اور سیاسی ڈسکورس کا ذریعہ بناتے تھے بلکہ یہ تحریک آزادی کی آفیشیل لینگویج تھی جس کی جھلک ہمیں دستور ساز اسمبلی میں کی گئی لسانی بحثوں میں بھی ملتی ہے۔ اردو کی مقبولیت سے خوف زدہ ایک لابی نے محسوس کیا کہ جب تک اردو تعلیم و تعلم پر قدغن نہیں لگایا جاتا اردو زبان کے اثرات کو ختم کرنا ممکن نہیں ہوگا۔ چنانچہ آزادی کے بعد تقسیم ہند کے نتیجے میں ملک کا ماحول بے حد جذباتی اور خوں آشام بنا ہوا تھا اس وقت ہندی ہارٹ لینڈ کی دو بڑی ریاستوں یوپی اور مدھیہ پردیش نے اردو تعلیم و تعلم کا رشتہ نئی نسل سے منقطع کرنے کی نیت سے پرائمری اور سکنڈری درجات میں اردو کی تعلیم کا سلسلہ

بندکر دیا اور یہاں سے آزاد ہندوستان میں اردو کو محدود اور مسدود کرنے کی سرکاری سطح پر ناپاک سازش کا آغاز ہوا۔

بھارت کا دستور اور اردو کی لسانی حیثیت:

آزاد ہندوستان کا دستور دنیا کا سب و قیع ضخیم اور مثالی دستور ہے جس میں ہندوستان کے تنوع اور تضاد کو سمونے اور باہم متصادم خیالات کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے کی بے پناہ صلاحیت ہے یہ انتہائی لچیلا اور عملی دستور ہے جس پر بھارت کو ناز ہے۔ اس دستور کے نفاذ کے وقت ڈاکٹر امبیڈکر نے جو دستور کی ڈرافٹنگ کمیٹی کے چیرمین تھے تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ کوئی دستور چاہے کتنا اچھا ہوا گر اس کو نافذ کرنے والے ہاتھ اور دماغ اس کے تئیں ایماندار اور وفادار نہیں ہوں گے تو دستور کے ضابطے اور پروویژن بے جان الفاظ ہوں گے جس میں کوئی قوت نافذہ نہیں ہے؟ آج بھارت کا المیہ یہ ہے کہ ہمارا دستور ایک بحران سے دوچار ہے۔ دستور اور قانون میں تبدیلی کئے بغیر اس کی روح پامال ہورہی ہے۔ جس کی وجہ سے ملک کے کمزور طبقات بالخصوص مذہبی اور لسانی اقلیتوں کو ان کے واجبی حقوق نہیں مل پارہے ہیں اور وہ جمہوریت اور سکیولرزم کے برکات سے محروم ہیں۔ مسئلہ مسلمانوں کے حقوق یا اردو زبان کے تحفظ و ترویج کا نہیں ہے بلکہ دستور میں مندرج بنیادی حقوق دیگر ضابطوں اور ضمانتوں کی بازیابی کا ہے۔ یہ کوئی فرقہ وارانہ مسئلہ نہیں ہے بلکہ دستور میں مندرج لسانی حقوق کے تحفظ کا مسئلہ ہے جس کے لیے حکومت اور انتظامیہ پابند عہد ہے کیونکہ اسی دستور کا حلف لے کر وہ ملک کا نظام چلاتے ہیں۔ آیئے ہم ان دستوری ضمانتوں پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالتے چلیں جو لسانی اکائیوں کو بالخصوص لسانی اقلیتوں کو دستور ہند نے فراہم کر رکھے ہیں۔

اردو دستور ہند کی آٹھویں شیڈول جس میں ہندوستان کی دیگر زبانیں مثلاً آسامی، بنگالی، گجراتی، ہندی، کنڑ، کشمیری، کونکنی، ملیالم، منی پوری، مراٹھی، نیپالی، اڑیہ، پنجابی، سنسکرت، سندھی، تامل اور تلگو وغیرہ درج ہیں۔ ان میں شامل ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ اردو بھی دیگر

ہندوستانی زبانوں کی طرح بھارت کی ایک دستوری قومی زبان ہے جس کا ایک مخصوص حروف تہجی، مخصوص قواعد اور مخصوص رسم الخط ہے۔ جب بھارت کا دستور اردو کو ملک کی ایک قومی زبان تسلیم کرتا ہے تو کون ہے جو اس کی حیثیت کو تسلیم نہ کرے۔ جو ایسا کرے گا وہ دستور کی خلاف ورزی کرنے والا قرار دیا جائے گا۔

جن زبانوں کو دستور کے آٹھویں شیڈول میں شامل کیا گیا ہے۔ ان کو کسی ریاست کی آفیشیل زبان بنانے، اس کو ریاست کی سرکاری زبان طے کرنے، اس کو عوامی مطالبات کی تکمیل کا ذریعہ بنانے، پرائمری سطح پر اس کی تعلیم کا معقول انتظام کرنے اور اس کے تحفظ کے لیے خصوصی افسر اور نگراں بحال کرنے وغیرہ کی دستوری ضمانت دی گئی ہے۔

دستور کی دفعہ ۳۴۵ کے تحت ریاستی مقنّنہ ریاست میں مستعمل کوئی ایک یا زاید زبانوں کو یا ہندی یا کسی دوسری زبانوں کو سرکاری کام کاج کے لیے استعمال کرسکتی ہے۔ اس دفعہ کی رو سے ریاست ہندی یا اس کے علاوہ ریاست میں مستعمل کسی دوسری زبان کو بھی بطور آفیشیل زبان کے استعمال کرسکتی ہے۔ یعنی جس کے ذریعہ سرکاری کام کاج کئے جاسکتے ہیں۔

دستور کی دفعہ ۳۴۷ کے تحت اگر کسی ریاست کی معتد بہ آبادی جس زبان کو بولتی ہے وہ اس بات کی خواہش مند ہو کہ اس زبان کو ریاستی زبان کا درجہ دیا جائے، تو صدر مملکت، ریاست کو یہ ہدایت دیں گے کہ اس زبان کو ریاست کے کسی حصہ یا پوری ریاست میں سرکاری زبان تسلیم کیا جائے۔ بہار میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دستور کی اسی دفعہ کے تحت دیا گیا ہے۔

دستور کی دفعہ ۳۵۰ کی رو سے ہر شخص کو ملک میں مستعمل یعنی مرکز اور ریاست میں مستعمل کسی زبان میں اپنے مطالبات اور ضروریات کے ازالے کے لیے کسی بھی ریاستی یا مرکزی ذمہ دار یا افسر کو درخواست دینے کا حق ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ جس زبان کے جاننے والے ہیں جو زبان بولتے ہیں اور لکھتے ہیں۔ اس زبان میں مرکزی یا ریاستی سرکار کی کسی آفس میں اپنی درخواست یا عرض داشت دے سکتے ہیں۔ جس کو قبول کرنا اور آپ

کی حاجات پوری کرنا اس افسر یا ادارے کی ذمہ داری ہوگی۔ یہ آپ کا دستوری حق ہے۔ اگر کوئی آپ کو اس دستوری حق سے محروم کرتا ہے تو آپ اس دفعہ کے تحت اس کے خلاف قانونی چارہ جوئی کر سکتے ہیں۔

دستور کی دفعہ 350 A کے تحت جو لسانی اقلیت کے بچے ہیں ریاست اور مقامی انتظامیہ کی ذمہ داری ہوگی کہ ان بچوں کو ان کی مادری زبان میں پرائمری تعلیم کا معقول نظم کرے۔ اگر کوئی ریاست اس طرح کی سہولت بہم نہیں پہنچاتی ہے تو اس کے خلاف دستوری اور قانونی چارہ جوئی کی جائے گی۔ اس دفعہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ لسانی اقلیت، یعنی جس زبان کے بولنے والوں کی تعداد ریاست میں رائج اکثریتی طبقہ کی زبان بولنے والوں سے کم ہے۔ ان کے بچوں کی ابتدائی تعلیم یعنی درجہ اول سے ثانوی سطح تک یعنی 14-6 سال کے بچوں کی تعلیم ان کی مادری زبان میں فراہم کرانا ریاست اور مقامی انتظامیہ یعنی میونسپل کارپوریشن اور پنچایت کی دستوری ذمہ داری ہے جس سے وہ منہ نہیں موڑ سکتے ہیں۔

دستور کی دفعہ 350 B میں لسانی اقلیتوں کو تحفظ فراہم کرنے کے لیے ایک اسپیشل افسر کی تعیناتی کا نظم ہے جس کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ دستور میں مندرج لسانی اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ کرے اور ان تمام امور کی نگرانی کرے نیز صدر مملکت کو متعینہ وقفہ پر اس کی رپورٹ دے۔ صدر اس رپورٹ کو پارلیمنٹ اور ریاستی اسمبلیوں میں پیش کرنے کی ہدایت دیں گے۔ اور اس کے ساتھ اس بات کو متحقق کریں گے کہ لسانی اقلیتیں اپنی زبان کو محفوظ رکھتے ہوئے تمام کاموں میں اس کا استعمال کریں بالخصوص ان کے بچوں کی ابتدائی تعلیم ان کی زبان میں دینے کا معقول نظم ہو۔

دستور ہند کے باب میں شہریوں کے بنیادی حقوق کا ذکر ہے۔ بنیادی حقوق وہ حقوق ہیں جن کو فطری حقوق کہا جاتا ہے۔ جس طرح سانس لینا انسان کے زندہ رہنے کے لیے ایک فطری عمل ہے جس کے بغیر ایک انسان زندہ نہیں رہ سکتا ہے۔ اسی طرح بنیادی حقوق کسی شہری کا وہ بنیادی حق ہے جس کے بغیر وہ عزت، برابری بنیادی تحفظ اور اختیار کے ساتھ شہری زندگی

نہیں گذار سکتا ہے۔ یہ حقوق بلالحاظ مذہب وملت، ذات برادری جنس، زبان، رنگ، نسل اور مقام کے تمام شہریوں کو چاہے ان کی تعداد کم ہو یا زیادہ شخصی اور انفرادی طور پر حاصل ہوتے ہیں۔ یہ حق شہریوں کو ریاست یا اسی کی کسی ایجنسی یا کسی طاقت ور غالب گروہ کے مقابلے حاصل ہوتا ہے تا کہ اگر ریاست یا اس کا کوئی ادارہ یا کوئی گروہ اس کی خلاف ورزی کرے تو اس صورت میں اس کے خلاف چارہ جوئی کی جا سکے اس معاملے میں عدلیہ پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ ریاست یا اس کے کسی ادارے یا کسی غالب گروہ کے مقابلے عام شہریوں یا ان کے گروہ کو دستوری تحفظ فراہم کرے۔

بنیادی حقوق کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ نا قابل تنسیخ یعنی Irrevocable ہیں یعنی کسی صورت میں ان کو کالعدم یا معطل نہیں کیا جا سکتا ہے۔ صرف ہنگامی حالات میں یا انتہائی ناگزیر صورت حال میں ہی ان کو معطل کیا جا سکتا ہے جیسا کہ 1975 میں اندرا گاندھی نے کیا تھا۔ بنیادی حقوق کی دوسری بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان کا تعلق دستور کے بنیادی ڈھانچے سے ہے۔ سپریم کورٹ کے ایک فیصلے کے مطابق دستور کا بنیادی ڈھانچہ نا قابل تنسیخ اور نا قابل ترمیم ہے۔ عام طور پر دستور میں دوتہائی اکثریت کے ذریعہ کوئی تبدیلی کی جا سکتی ہے لیکن بنیادی حقوق میں کوئی تبدیلی ممکن نہیں ہے۔ سپریم کورٹ ایسے کسی ترمیم کو رد کرنے کا دستوری حق رکھتا ہے۔ بنیادی حقوق کی تیسری خوبی یہ ہے کہ اگر ریاست یا اس کا کوئی ادارہ اس کو دینے میں کوتاہی برتتا ہے یا اس کی حق تلفی کرنا چاہتا ہے تو اس کو عدالت کے ذریعہ پابند عمل کیا جائے یعنی یہ Justifiably enforceable ہے اسی بنیادی حقوق کی دفعہ ۲۱ میں زندگی اور شخصی آزادی کے تحت شہریوں کو عزت کے ساتھ جینے کا حق دیا گیا ہے جس میں خوراک (Right to food) اور تعلیم (Right to education) شامل ہے۔ یعنی ریاست شہریوں کی خوراک اور تعلیم کی ذمہ دار ہے اور یہ کسی شہری کا بنیادی حق ہے جس کے بغیر اس کی زندگی اور شخصی آزادی محفوظ نہیں رہ سکتی ہے۔

بنیادی حقوق کی دفعہ ۲۹ کے تحت شہریوں کا کوئی طبقہ جو بھارت میں یا اس کے کسی

حصے میں رہتا ہے جس کی مخصوص زبان ہے، رسم الخط یا کلچر ہے اس کو اس کے تحفظ کا حق ہوگا۔ یہ حق دستور نے اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کے باب میں عطا کیا ہے جس میں یہ بات بھی شامل ہے کہ حکومت کے ذریعہ چلائے جانے والے کسی ادارے یا حکومت کی جانب سے دی گئی مدد کے ذریعہ چلنے والے ادارے میں محض مذہب، نسل، ذات، زبان یا اور کسی بنیاد پر کسی شہری کو داخلہ دینے سے منع نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح اقلیتوں پر تمام حکومتی تعلیمی ادارے یا حکومت کے ذریعہ امداد یافتہ تعلیمی اداروں کے دروازے کھلے ہیں۔

بنیادی حقوق کی دفعہ ۳۰ کے تحت سبھی اقلیتیں چاہے وہ مذہبی ہوں یا لسانی ان کو اپنی پسند کے ادارے کھولنے اور چلانے کا حق حاصل ہوگا۔ حکومت اس بناء پر کہ وہ کسی مذہبی یا لسانی اقلیت کے ذریعہ چلائے جانے والے ادارے ہیں ان کی امداد میں کوئی امتیاز نہیں برتے گی۔ یہی وہ دفعہ ہے جس کی بنیاد پر ملک میں تمام مذہبی یا لسانی اقلیتی ادارے قائم ہیں۔

اس حق میں یہ خاص بات ہے کہ اقلیتوں کو اپنے اداروں کو چلانے کا بنیادی حق حاصل ہے۔ اس کا مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ان کو Maladministration یا Mismanage کا بھی حق حاصل ہے۔ اگر وہ اس کا نظم و نسق ٹھیک سے نہیں چلا پاتے ہیں یا بدانتظامی پھیلتی ہے تو اس ادارے کو اقلیتی حیثیت سے محروم کیا جا سکتا ہے۔ سرکار اس کو بند کر سکتی ہے یا اس پر قبضہ کر سکتی ہے۔ ایک بات اچھی طرح ذہن نشیں ہونی چاہیے کہ دستور میں مندرج کوئی حق بلا شرط نہیں ہے بلکہ ہر شرط عوامی نظم اخلاق، برابری اور مبنی بر عدل ہوگا تا کہ شہریوں یا اس کے کسی طبقے کے خلاف کوئی ظلم یا استحصال نہ ہو۔

یہ وہ دستوری ضمانتیں اور فریم ورک ہیں جس میں ہم کو جو لسانی تحفظ، ترویج اور ترقی کے اختیارات دئے گئے ہیں اس کے حصول کی کوشش کرنی ہے۔ دستور کے ان دفعات کے استحضار سے یہ تو واضح ہے کہ دستوری طور پر ہمیں کافی وشافی ضمانتیں اور اختیارات حاصل ہیں یعنی قانونی طور پر لسانی تحفظ کے باب میں صورت حال بالکل مستحکم ہے۔ ان دستوری تحفظات اور اختیارات سے مندرجہ ذیل نکات ابھر کر سامنے آتے ہیں۔

(۱) اردو بھارت کی ایک تسلیم شدہ قومی زبان ہے۔
(۲) بنیادی حقوق کے باب میں اس کے رسم الخط کو تحفظ دیا گیا ہے۔
(۳) اس زبان میں اپنے بچوں کی ابتدائی تعلیم کا قانونی اور دستوری حق حاصل ہے۔
(۴) اس زبان کی تعلیم، فروغ، اشاعت اور ترقی کے لیے تعلیمی ادارے کھولنے کا بنیادی حق حاصل ہے۔
(۵) اگر کسی مقام پر یا ریاست میں ان حقوق کی خلاف ورزی ہوتی ہے تو سرکاری طور پر شکایت کرنے کا اور قانونی چارہ جوئی کا حق حاصل ہے۔
(۶) سرکار لسانی اقلیتوں کے حقوق کی نگرانی کے لیے اسپیشل افسر بحال کرے گی جو اس بات کا جائزہ لے گا کہ ان تحفظات کے باب میں ٹھیک سے عمل ہورہا ہے یا نہیں۔ اگر اس میں کہیں کوئی کوتاہی برتی جارہی ہے تو وہ اس کی رپورٹ صدر جمہوریہ سے کرے گا اور صدر جمہوریہ اس رپورٹ کی روشنی میں مرکز اور ریاستی سرکاروں کو ضروری ہدایت دیں گے۔

اس طرح ان تحفظات کے استحضار سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اردو زبان کو تمام تر ضمانتیں حاصل ہیں مگر ان پر عمل درآمد ٹھیک سے نہیں ہورہا ہے یا اس طرح سارا مسئلہ ان دستوری تحفظات کے ایماندارانہ نفاذ کا ہے۔

جیسا میں نے شروع میں عرض کیا کہ ہندوستان میں اردو زبان کے تحفظ یا ترویج کے باب میں کوئی قانونی یا دستوری رکاوٹ نہیں ہے بلکہ سارا مسئلہ جس کو میں دستور کا بحران (Crisis of constitution) مانتا ہوں وہ اس کے نفاذ کا ہے۔

بہار ہندوستان کی وہ پہلی ریاست ہے جس نے دستور کی دفعہ ۳۴۷ کے تحت 1981 میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا ہے۔ اس طرح قانونی طور پر پورے ملک کے مقابلے بہار میں اردو کی پوزیشن سب سے زیادہ محفوظ اور مستحکم ہے۔ اس کے باوجود سیاسی قوت ارادی کی کمی، انتظامی کوتاہی، کرپشن اور فرقہ وارانہ رجحان اور اردو آبادی کی عدم دلچسپی، انتشار،

بے ایمانی اور بے توجہی کے باعث بہار میں اردو کی صورت حال اطمنان بخش نہیں ہے۔

مولانا آزاد نے ۱۹۴۹ میں دستور ساز اسمبلی میں اردو کی لسانی حیثیت پر تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ ''فطری طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وفاقی ہند میں اردو کی حیثیت کیا ہوگی؟ سچ ہے اگر ایک زبان کو لاکھوں لوگ اپنی روزمرہ کی زندگی میں بولتے ہیں اس زبان کی زندگی حکومت کے ماننے یا نہ ماننے پر منحصر نہیں ہے جب تک لوگ خود اس زبان کو باہم متفق ہو کر نہ چھوڑ دیں، کوئی انہیں اس زبان کو چھوڑنے پر مجبور نہیں کر سکتا ہے۔'' اس کے ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی کہا کہ ''تاہم یہ کسی جمہوری دستور کے لیے نامناسب ہے کہ وہ کسی ایسی زبان کو تسلیم نہ کرے جو لاکھوں ہندو اور مسلمان کی مشترکہ وراثت ہے اور جو ان کی مادری زبان ہے۔''

اس تقریر میں مولانا آزاد نے اردو کو ایک زندہ عوامی زبان قرار دیا ہے جو روزمرہ کے استعمال میں ہے۔

اردو کی بقا محض حکومت کے تسلیم یا عدم تسلیم کی مرہون منت نہیں ہے۔ اردو صرف مسلمانوں کی نہیں بلکہ لاکھوں ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ وراثت ہے۔ یہ اردو آبادی کی مادری زبان ہے۔ لہٰذا ایسی زبان اس وقت تک نہیں مٹ سکتی ہے جب تک سب لوگ مل کر یعنی Common Concensus سے اس کو نہ چھوڑ دیں۔

اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اردو کی بقا، ترویج، اشاعت، استحکام کا سارا دار ومدار اردو عوام کی آزادانہ مرضی، ان کی اجتماعی قوت ارادی اور ان کے فیصلے پر منحصر ہے۔

آزای کے بعد دوقومی نظریہ کے حاملین:

تقسیم ہند کے بعد مسلمانوں میں جو لوگ دوقومی نظریہ کے حاملین تھے وہ پاکستان چلے گئے مگر جو لوگ اکثریتی طبقہ میں دوقومی نظریہ کے حاملین تھے دھیرے دھیرے انہوں نے ملک کے انتظامی معاملات کو اپنے ہاتھ میں لینا شروع کیا اور وہ تمام چیزیں جن کا دور اور نزدیک سے مسلمانوں سے تعلق تھا، اس کو حاشیہ پر لانے کی ہر ممکن کوشش شروع کر دی۔ اس کی سب

سے واضح مثال اردو زبان ہے ۔اردو جو خالص ہندوستانی زبان ہے ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کی علامت ہے اور جو مضبوط سیکولر روایات کی امین ہے جس کا جنم اتر پردیش میں ہوا جس کو کروڑوں ہندو مسلمان بولتے ہیں پورے نارتھ انڈیا میں بالخصوص دہلی اور لکھنؤ میں اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں یہ تمام تر سرگرمیوں کے اظہار کا ذریعہ رہی ،آزادی کے بعد اس زبان کو تمام تر دستوری ضمانتوں اور تحفظات کے باوجود دیس نکالا دے دیا گیا اور پورے اتر پردیش میں ہندی کو بطور قومی اور ریاستی زبان کے تسلیم کیا گیا اور اردو کے وجود سے سراسر انکار کر دیا گیا۔ جب سہ لسانی فارمولہ کا استعمال ہوا اس وقت بھی اردو کی جگہ سنسکرت کو شامل کیا گیا اس طرح اتر پردیش میں پرائمری اور ثانوی درجات میں اردو کی تعلیم معطل کر دی گئی۔ جب لوگوں نے اس پر احتجاج کیا تو ان کو صاف جواب دے دیا گیا کہ اردو ہندوستان کی زبان نہیں ہے۔ معاملہ مرکزی حکومت تک پہنچا پنڈت جواہر لال نہرو نے ۱۲؍ مارچ ۱۹۵۴ء کو مولانا آزاد کو بحیثیت وزیر تعلیم ایک خط لکھا جس میں انہوں نے اس طرز عمل پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے یہ بھی کہا کہ اگر چہ دستور کی رو سے صدر جمہوریہ سے کوئی ہدایت نامہ جاری کی کرنے کی سفارش کی جاسکتی ہے مگر اس بات کا اندیشہ ہے کہ اس سے دستوری بحران پیدا ہوسکتا ہے جس سے یہ مسئلہ اور پیچیدہ اور تلخ ہوسکتا ہے جو اردو کے امکانات کو مزید مجروح کرسکتی ہے لہٰذا اس مسئلہ کے حل کے لیے دوستانہ اور موافقانہ طریقہ اختیار کرنا ہی بہتر ہوگا۔ یہ مسئلہ اس وجہ سے پیدا ہوا کہ تعلیم اگر چہ دستور کے مشترکہ فہرست میں شامل ہے تاہم پرائمری اور ثانوی تعلیم ریاستی حکومت کے زیر انتظام آتی ہے۔ اور ریاستی حکومت نے جان بوجھ کر اردو کو اپنے ریاستی تعلیمی نظام سے الگ کر دیا۔

دراصل جو لوگ ہندی زبان کے حاملین تھے ان کو یہ خوف ستا رہا تھا کہ جب تک اردو کو ختم نہیں کریں گے ہندی زبان کو فروغ نہیں مل سکتا ہے۔ پنڈت نہرو نے ۲۹؍ مارچ ۱۹۵۴ء کو اس وقت کے مدھیہ پردیش کے وزیر اعلی روی شنکر شکلا کو خط لکھا کہ اردو کو تعلیمی سہولت فراہم کرنے سے ہندی کے مفاد پر کوئی ضرب نہیں پڑے گی کیونکہ ہندی قومی زبان کی حیثیت

سے پوری مضبوطی سے براجمان ہے جب کہ اردو کو اس کی مناسب جگہ نہیں دینے کی وجہ سے مسلمانوں میں گہری مایوسی پیدا ہو رہی ہے۔

اردو کی موجودہ صورتحال:

جب ملک میں ہندی کو بطور قومی زبان تسلیم کرلیا گیا تو تمام مسلمانوں نے اس کو کھلے دل سے قبول کیا اور اپنی تعلیمی ترجیحات میں بدلاؤ لاکر ہندی کو بڑھ چڑھ کر اپنایا اور اپنی نسلوں کو ہندی پڑھنے اور سیکھنے کی تلقین کی جب کہ ہندؤں نے اردو سے خود کو پوری طرح الگ کرلیا۔ یہاں تک کہ جو لوگ اردو کے ادیب ناقد اور شاعر تھے ان کی نسلوں نے بھی اردو سے کنارہ کرلیا۔ پورا پنجاب جو اردو لکھتا بولتا تھا آزادی کے فوراً بعد اردو رسم الخط کو چھوڑ کر گرومکھی رسم الخط کو استعمال کرنے لگا۔ ۱۹۴۷ء کے پہلے کی نسل اردو کی باقیات بن کر رہ گئی۔ دھیرے دھیرے ان کے ساتھ اردو زبان اب پنجاب سے ختم ہوتی جارہی ہے۔ اتر پردیش خاص طور سے لکھنؤ جو اردو تہذیب کا مرکز تھا جس کی ہوا فضا میں اردو لطافت رچی بسی تھی اور اردو تہذیبی روایات سے خالی ہوتی جارہی ہے۔ اردو والوں کے لیے آسمان دور اور زمین سخت ہوتی چلی گئی۔

اس ماحول میں اور ان حالات میں بہار نے اردو کو دوسری سرکاری زبان تسلیم کر کے اس کے جان ناتواں میں نئی روح پھونک دی ہے اور اردو کو ایک مضبوط جائے پناہ مل گئی ہے یہاں کی زمین بھی نرم ہے اور سر پر مٹھی بھر آسمان موجود ہے۔ اب یہ اردو والوں پر منحصر ہے کہ وہ اپنی زبان کی حفاظت کیسے کرتے ہیں؟

سچر کمیٹی کی رپورٹ کے مطابق اسکول جانے والے بچوں میں یعنی 14-6 سال کی عمر کے بچوں میں 4% فیصد بچے مدرسوں میں زیر تعلیم ہیں۔ باقی بچے اردو میڈیم اسکولوں اور غیر اردو میڈیم اسکولوں میں زیر تعلیم ہیں۔ روایتی طور پر نارتھ انڈیا کی ریاستیں اردو آبادی کا خطہ مانی جاتی ہیں۔ مگر اردو میڈیم اسکولوں کی بات کریں تو نارتھ انڈیا کے مقابلے ساؤتھ انڈیا کی

دو ریاستوں کرناٹک اور آندھرا پردیش اور مغربی ہندوستان کی ریاست مہاراشٹر میں اردو میڈیم اسکولوں کی تعداد اتر پردیش، بہار، جھارکھنڈ سے زیادہ ہے۔ وہاں کے اداروں میں طلباء کی تعداد زیادہ ہے اور ان کا معیار تعلیم بھی بہتر ہے۔

کرناٹک کے جنوبی حصہ میں اردو بولنے والوں کی خاصی تعداد ہے جو اپنے بچوں کی بنیادی تعلیم اردو میڈیم اسکولوں میں دلانا پسند کرتے ہیں۔ ۲۰۰۱ء کی مردم شماری کے مطابق کرناٹک میں 6.5 ملین مسلمان جو کل آبادی کا 12% ہیں جن میں ۲۰۰۴ء کے اعداد وشمار کے مطابق 0.2 ملین 14-6 عمر کے بچے ہیں جو اس عمر کے بچوں کی کل آبادی کا 14% ہیں ان میں 70% بچوں نے اپنی مادری زبان اردو بتائی ہے۔ کرناٹک کے شعبہ تعلیم کے مطابق اقلیتی زبان کی تعلیم دینے والے اداروں میں اردو میڈیم اسکولوں کی تعداد 77% ہے۔ اس طرح 70% اردو بولنے والے بچے اردو میڈیم اسکولوں میں پڑھتے ہیں۔

مہاراشٹر میں 7.5% اور آندھرا میں 8.5 اردو آبادی ہے جن کے بیشتر بچے اردو میڈیم اسکولوں میں پڑھتے ہیں ان کا معیار تعلیم بہتر ہے اور بہت سے اردو میڈیم اسکولوں کے طلباء ہر سال سکنڈری بورڈ کے اکزامنیشن میں ٹاپ پوزیشن حاصل کرتے ہیں۔ بہار اور جھارکھنڈ میں آبادی کے تناسب سے اردو میڈیم اسکولوں کی تعداد کم ہے اور ان کا معیار تعلیم بھی اچھا نہیں ہے۔ ایسے غیر اردو میڈیم اسکولوں میں اردو بحیثیت ایک زبان کے پڑھانے کا نظم بہت کم اداروں میں ہے جس کی وجہ سے بہت سے اردو آبادی کے طلباء ہندی اور سنسکرت زبان کے ذریعہ زیر تعلیم ہیں۔ جس کی وجہ سے ان گھروں کا رشتہ اردو سے ٹوٹتا جا رہا ہے۔ سب سے افسوسناک بات یہ ہے کہ اردو میڈیم اسکولوں بالخصوص مسلم اقلیتی تعلیمی اداروں کا معیار بہت گھٹیا ہے جس کی وجہ سے آج کے مسابقت کے دور میں ان اداروں کے بچے کامیاب نہیں ہو پاتے ہیں جو قوم کی اجتماعی محرومی کی ایک بڑی وجہ ہے۔

سید حامد سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے ایک بار کہا تھا کہ جب اللہ تعالیٰ کسی قوم کے زوال کا فیصلہ کر لیتا ہے تو اس سے ادارہ چلانے کا سلیقہ چھین لیتا ہے۔ میں

مسلم اقلیتی تعلیمی ادارروں کے خارجی مسائل سے اچھی طرح واقف ہوں۔ سرکاری سطح پر ان کے ساتھ جوسوتیلا سلوک ہوتا ہے اور تعلیمی دفاتر میں ان کو قدم قدم پر جو دقتیں پیش آتی ہیں وہ سب تسلیم ہیں۔ یہ مسئلہ صرف مسلم تعلیمی اداروں کے ساتھ نہیں ہے بلکہ دیگر اقلیتی اور عام اداروں کے ساتھ بھی ہے۔ یہ بہت حد تک ہماری ذہنیت اور ورک کلچر کا حصہ ہے اس میں عمومیت ہے۔ اس کے باوجود عیسائی اقلیتی ادارے، ڈی اے وی، رام کرشن اور اس قبیل کے کئی ادارے ہیں جو بہت معیاری ڈھنگ سے چل رہے ہیں اور لوگ ان اداروں میں اپنے بچوں کا داخلہ کرانا فخر اور شان محسوس کرتے ہیں۔ اس کے برخلاف مسلمانوں کے ذریعہ چلائے جانے والا ایک بھی ادارہ ایسا نہیں جس کے معیار تعلیم کا چرچا ہوتا ہے یا وہ مسلمانوں کی پہلی پسند ہوتی ہے۔ یہ ادارے چاہے مدرسہ ہوں اسکول یا کالج ہوں ایسا کیوں ہے؟ اس کی چند موٹی موٹی وجہیں ہیں ان اداروں کے منتظمین کا ذہنی افق یعنی ویژن محدود ہے۔ ان کے اندر عصری آگہی اور شعور کی کمی ہے۔ وہ مسلکی، گروہی اور برادری کے تعصّبات میں گرفتار ہیں۔ ان کے اندر خود غرضی اور بے ایمانی عام ہے۔ ملت کا پورا سپورٹ نہیں ملتا ہے اور وہ ادارے بدعنوانی اور اقربا پروری کا اڈہ ہوتے ہیں۔ ان اداروں سے عوام کی بڑھتی عدم دلچسپی کی وجہ سے ان کی ساکھ متاثر ہو رہی ہے۔ ممکن ہے ووٹ پالٹیکس کی وجہ سے حکومت ان اداروں پر ہاتھ نہ ڈالے مگر ان کی بڑھتی Discredibility کی وجہ سے ان کی عوامی افادیت معدوم ہوتی جارہی ہے اور یہ ادارے ملت کے عروج و استحکام کے بجائے ان کی زوال پسندی کی علامت بنتے جارہے ہیں۔

یہ ہیں وہ حالات جس میں اس وقت اردو، اردو میڈیم اسکول اور اردو مسلم اقلیتی ادارے چل رہے ہیں جہاں ان کی کمیت (Quantity) میں اضافے کی ضرورت ہے وہیں ان کی کیفیت (Quality) میں بھی بہتری ضروری ہے۔ کوئی بھی اقلیت جس کی تعداد کم ہے وہ اپنی اہلیت اور استعداد کے بل پر ہی عددی قوت کا مقابلہ کرسکتی ہے۔ اس لیے وقت آگیا ہے کہ سر جوڑ کر بیٹھیں اور اپنے اداروں کو عصری معیار اور تقاضوں کے مطابق چلانے کی شعوری اور ایماندارانہ کوشش کریں ورنہ ہمارے حصہ میں محرومی اور نوحہ خوانی کے علاوہ کچھ ہاتھ آنے

والانہیں ہے۔

اردو کا مقدمہ عوام کی عدالت میں:

یہ وہ احوال وظروف ہیں جس میں اردو کا مقدمہ عوامی عدالت میں پیش کیا جارہا ہے۔ کسی زبان کے تحفظ ،ترویج اور ترقی کے تین بڑے عوامل ہوتے ہیں ایک سرکار دوسرے بازار اور تیسرا عوام ہم نے اوپر سرکار کے رول کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ تمام تر دستوری ضمانتوں اور قانونی گنجائشوں کے باوجود سرکاری سطح پر اردو کے نفاذ اور اس کے فروغ میں جو تعصب اور دھاندلی برتی جارہی ہے وہ جگ ظاہر ہے۔ ہمیں ایک لڑائی سرکاری سطح پر لڑنی ہے تا کہ اردو تعلیم کا معقول انتظام متحقق کیا جاسکے، جن جگہوں میں اردو تعلیم کا نظام نہیں ہے یا اردو اساتذہ نہیں ہیں ان کا پتہ لگا کر سرکاری سطح پر تحریک چلا کر، عوامی بیداری پیدا کر کے اردو اسکول کھلوانے اور اردو اساتذہ بحال کرانے کی کوشش کرنی ہے۔ جمہوری ملکوں میں جب تک عوامی دباؤ نہیں ہوتا ہے اس وقت تک حکومت کان میں تیل ڈال کر پڑی رہتی ہے۔ اس لیے عوامی سطح پر اردو کے لیے ایک مضبوط اور مسلسل تحریک چلانے کی ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں انجمن ترقی اردو، اردو مشاورتی بورڈ، اردو ڈائرکٹوریت اور اس قبیل کے تمام سرکاری اور غیر سرکاری اداروں کو واچ ڈوگ کے طور پر کام کرنے کی ضرورت ہوگی اس لیے کہ جب تک اردو کی تعلیم کا معقول انتظام نہیں ہوگا نئی نسل اردو سے واقف نہیں ہوسکتی ہے۔ اردو کی بقا کے لیے اردو آبادی میں اردو تعلیم کا انتظام اردو کے استحکام کا پہلا قدم ہے۔ بہار میں اردو کو جب سیاسی مدا بنایا گیا تو آپ نے دیکھا کہ اس کے مثبت نتائج سامنے آئے ہیں اس تحریک کو مزید مستحکم اور وسیع کرنے کی ضرورت ہے جس کے لیے اردو عوام میں عام بیداری پیدا کرنے اور ان کو مسلسل متحرک رکھنے کے لیے ہر قریہ، ہر گاؤں اور ہر شہر میں اردو تحریک کو از سر نو مضبوط کرنے اور شروع کرنے کی ضرورت ہوگی تا کہ یہ ایک ایسا عوامی مطالبہ بنے جس کو کوئی حکومت اور کوئی پارٹی نظر انداز نہ کر سکے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ تمام دستوری اور قانونی ضمانتوں کے باوجود عملاً اردو کی

صورتحال اطمینان بخش نہیں ہے بلکہ اس کا Public use اور Public Display محدود سے محدودتر ہوتا جارہا ہے یہاں تک کہ جو اردو پڑھنے اور لکھنے والے لوگ ہیں ان کی بھی حوصلہ شکنی ہوتی ہے بہار میں اردو کو دوسری سرکاری زبان بنائے تین دہائی سے زیادہ ہوگئے مگر اس نوٹی فیکیشن کے مطابق ایک فیصد بھی عمل نہیں ہوتا ہے۔ ہمارے یہاں اردو ڈائرکٹوریٹ، اردو مشاورتی بورڈ ہر ضلع میں اردو سیل قائم ہیں مگر یہ سب نمائشی ادارے ہیں۔ ان کو Inspection اور Enforcement کا کوئی اختیار نہیں ہے۔ ان کی کارکردگی کی رپورٹ بھی شائع نہیں ہوتی ہے جس سے یہ پتہ چل سکے کہ یہ کیا کام کرہی ہیں۔ بہار میں جب غلام سرور صاحب ودھان سبھا کے اسپیکر تھے اور جابر حسین صاحب ودھان پریشد کے چیرمین تھے تو ان لوگوں نے قانون سازیہ میں اردو سیل قائم کیا تھا، ان حضرات کے جانے کے بعد آج وہ ادارے اپنی آخری سانسیں گن رہے ہیں عملاً وہ معطل ہوچکے ہیں۔ اکا دکا لوگ اس شعبہ میں بچے ہیں۔ جن کے بعد اردو سیل بند ہوجائے گا۔ جب قانون سازیہ میں جہاں ریاست کے لیے قانون بنائے جاتے ہیں اور تمام پارٹیوں کے عوامی نمائندے موجود ہیں یہ حال ہے تو اور جگہوں کا اندازہ ہی لگایا جاسکتا ہے۔ دراصل اب ہمیں علامتی چیزوں سے باہر آنا چاہیے اور دکھاوٹی چیزوں کے بجائے ذہنیت میں تبدیلی لانی چاہیے۔ جب تک ذہنیت نہیں بدلتی ہے طریق عمل میں تبدیلی نہیں آئے گی پھر کسی ٹھوس نتیجہ کا حاصل کرنا مشکل ہے۔

ہمیں ایک بات اور اچھی طرح ذہن نشیں کرلینی چاہیے کہ کوئی زبان محض حکومت کے بل بوتے پر زندہ اور باقی نہیں رکھی جاسکتی ہے۔ ایسی کوئی کوشش آثار قدیمہ کے باقیات کے تحفظ کے لیے مفید ہوتی ہے۔ کسی زبان کو زندہ اور باقی رکھنے کے لیے عوامی پہل کی ضرورت ہے۔ موجودہ حالات میں جو لوگ اردو زبان کو اپنی مادری اور ملی زبان مانتے ہیں ان کی ذمہ داری دوچند ہوجاتی ہے۔ پہلی اس کو اپنے درمیان زندہ اور مروج رکھنا اور دوسری اپنی آئندہ نسلوں کو منتقل کرنا۔ میری رائے میں کسی زبان کے فروغ واشاعت میں چار عوامل کارفرما ہوتے ہیں۔

(۱) خاندان

(۲) ملت

(۳) تعلیمی ادارے اور

(۴) سماجی اور ثقافتی ادارے

خاندان کسی بھی معاشرہ کا اولین ادارہ ہوتا ہے۔ ایک بچہ جس گود میں پلتا بڑھتا ہے اور جس خاندان میں پرورش پاتا ہے وہی اس کی پہلی لسانی درس گاہ ہوتی ہے۔ ماں جس زبان میں بچے سے پیار کرتی ہے، لوری سناتی ہے وہی اس کی مادری زبان کہلاتی ہے۔ اس طرح گھر میں جو زبان بولی جائے گی اور گھر کا جو لسانی ماحول ہوگا بچہ وہی زبان سیکھے اور بولے گا۔ لہٰذا اس وقت یہ دیکھنا ضروری ہے کہ ہمارے گھروں میں اردو بولی، پڑھی اور لکھی جاتی ہے یا نہیں۔ بالخصوص ہماری مائیں اور گھر کی خواتین اردو بولتی ہیں یا نہیں۔ اگر ہاں! تو آدھا مسئلہ حل ہے اور نہیں تو پھر اردو زبان کے تحفظ کی بات کرنا فضول ہے۔ اگر جڑ سوکھی ہو تو شاخ کی آبیاری کرکے آپ پودے کو ہرا بھرا نہیں رکھ سکتے ہیں۔

اس وقت ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے گھروں میں اردو کا چلن کم ہوتا جارہا ہے اور ہم لسانی دیوالیہ پن (Linguistic Bankruptcy) کے شکار ہیں لہٰذا سب سے پہلے ہمیں اپنے گھر کی خبر لینی چاہیے اور اپنا لسانی قبلہ (Linguistic Direction) درست کرنا چاہیے۔ یہ اس مسئلہ کا پہلا لازمی اور دائمی حل ہے کسی بھی بچے کی بنیادی ابتدائی تعلیم لازمی طور پر اس کے لسانی ماحول میں ہونی چاہیے۔ اس سے نہ صرف زبان کو فروغ حاصل ہوگا بلکہ بچے کی سیکھنے کے عمل (Learning process) میں تیزی آئے گی اور وہ چیزوں کو آسانی سے سمجھ (Conceptualise) سکے گا۔ لہٰذا جیسا کہ تمام تر ماہرین تعلیم کی رائے ہے یہ زبان اور تعلیم دونوں نقطۂ نظر سے مفید ہے۔

خاندان کے بعد دوسرا عامل ملت ہے جو قریبی ماحول اور سماج سے عبارت ہے۔ ایک آدمی جس معاشرے میں رہتا ہے اس سے اس کے گوناگوں تعلقات ہوتے ہیں۔ لہٰذا رشتہ

دار پڑوسی، دوست احباب اور روز مرہ کے ماحول میں جن لوگوں سے ملنا جلنا ہوتا ہے۔ وہ تمام لوگ عام طور پر جو زبان بولتے ہیں، محاورات کا استعمال کرتے ہیں ان کا جولب ولہجہ ہوتا ہے اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ان کے آپسی رابطے کی زبان کیا ہے۔ اب اگر ہمارے گھروں اور معاشرے میں اردو زبان کا چلن کم ہو رہا ہے تو یہ تشویش کی بات ہے جس پر سنجیدگی سے دھیان دینے کی ضرورت ہے موجودہ حالات میں بہت سے گارجین اپنے بچوں کو اردو بان کی تعلیم نہیں دیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ نئی نسل میں ایسے بچوں کو تعداد پچاس فی صد سے زیادہ ہوگئی ہے جو اردو لکھنا پڑھنا نہیں جانتے ہیں۔ جب گھروں میں اردو نہیں بولی جائے گی اور بچوں کو اردو نہیں سکھائی جائے گی۔ اردو ہمارے معاشرے میں کیسے زندہ اور باقی رہے گی۔ لہٰذا ملت کو اس پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے۔ ورنہ ہم اردو کی سیاسی جنگ جیت کر بھی سماج میں ہار جائیں گے۔ ہم نے ابھی سے ان امور پر توجہ نہیں دی تو بعد میں کف افسوس ملنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ جائے گا۔

ہم کسی لسانی عصبیت کی بات نہیں کر رہے ہیں۔ ہمیں اپنے بچوں کو اردو کے ساتھ اچھی ہندی اور انگریزی زبان کی تعلیم بھی دلانی چاہیے بلکہ ایسا کرنا ضروری ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ ان زبانوں کا آپس میں کوئی ٹکراؤ نہیں ہے۔ یہ سارا شاخسانہ بعض تنگ نظر لوگوں نے کھڑا کر رکھا ہے۔ حقیقت واقعہ یہ ہے کہ ایک سے زائد زبان جاننے سے ہمارا ثقافتی افق بلند ہوگا ہماری موبی لیٹی بڑھے گی اور ہم دیگر زبانوں کے تجربات سے اچھی طرح اور براہ راست استفادہ کر سکیں گے۔ اس سے ہماری مسابقانہ اہلیت بھی بہتر ہوگی۔

زبان کے فروغ واشاعت میں خاندان اور سماج کے بعد تیسرا بڑا عنصر تعلیمی ادارے ہیں۔ کسی زبان کے ترویج واستحکام میں اس زبان کی اچھی اور معیاری تعلیم سب سے مضبوط اور قابل وثوق ضمانت ہے۔ زبان کی اچھی تعلیم کے لیے باصلاحیت، ٹرینڈ اور ایماندار اساتذہ کا ہونا بہت ضروری ہے۔ ہمارا جو تدریسی مواد ہے (Teaching Material) وہ اعلیٰ اور معیاری ہونا چاہیے ساتھ ہی اساتذہ محنتی ایماندار اور ٹرینڈ ہوں سارا مسئلہ حل ہو جائے گا۔

اس وقت اردو زبان کا المیہ یہ ہے کہ پرائمری درجات سے لے کر یونیورسیٹی اور مدارس اسلامیہ تک یہاں تک کہ جو ہمارے تحقیقی ادارے ہیں ان کا معیار گھٹیا ہے۔لوگ ان جگہوں پر جس بے پروائی، سہل پسندی بلکہ بے ایمانی کا مظاہرہ کرتے ہیں اس نے صورتحال کو دھما کہ خیز بنا رکھا ہے۔جس طرح بے زبان معصوم بچیوں کو رحم مادر میں مار ڈالنے کے قبیح فعل کا ارتکاب کیا جا رہا ہے ٹھیک وہی سلوک اردو اساتذہ، طلبا اور اردو کے نام پر قائم ادارے اردو کے ساتھ کر رہے ہیں۔ گویا وہ اپنی ذات پر اردو کو ختم کر دینا چاہتے ہیں۔ میں ہر سطح کے اردو اساتذہ اور طلبا سے مودبانہ گذارش کرنا چاہتا ہوں کہ خدارا اس مظلوم زبان پر رحم کیجئے اور اس کو زندہ درگور ہونے سے بچایئے۔

ہم یہ شکایت کرتے ہیں کہ اردو یونٹ پر غیر اردو اساتذہ بحال کر دئے جاتے ہیں یا ان کا تبادلہ کر دیا جاتا ہے۔ اردو کی نصابی کتابیں وقت پر دستیاب نہیں ہوتی ہیں، اردو میں سوالات نہیں پوچھے جاتے ہیں اردو میں لکھی کاپیاں ٹھیک سے نہیں جانچی جاتی ہیں، اردو ممتحن بحال نہیں کئے جاتے ہیں اور اردو اساتذہ کو اردو میں حاضری بنانے نہیں دیا جاتا ہے۔اس کے علاوہ اردو اساتذہ کی ٹریننگ کا معقول انتظام نہیں ہے یا ان کو مختلف بہانوں سے پریشان کیا جاتا ہے۔ یہ ساری شکایتیں حقیقی ہیں۔مگر یہ سارے انتظامی مسائل ہیں جو تھوڑی بیداری، سرگرمی، آپسی اتحاد، سماجی اور سیاسی دباؤ سے دور کئے جاسکتے ہیں۔لیکن تعلیم میں جو کوتاہی اور بے ایمانی ہے اس کا تدارک کیسے ہوگا۔ اچھا استاد بننے کے لیے اچھا طالب علم بننا ضروری ہے لہذ اردو پڑھانے سے پہلے خود اس کا پڑھنا ضروری ہے۔

اگر آپ اردو کتابوں اور رسائل و جرائد کا مطالعہ کریں گے اردو میں لکھیں گے بولیں گے، علمی سرگرمیوں میں حصہ لیں گے تو خود بخود آپ کی زبان اچھی اور معیاری ہو جائے گی۔اس سے آپ کی تعلیم میں جلا آئے گی اور آپ واقعی ایسے معمار قوم ثابت ہوں گے جن کے خون جگر اور تازہ نفسی سے قوم اور اس کی زبان کو وہ تازگی اور حرارت حاصل ہوگی جو اس کے حیات کو دوام عطا کرنے میں معاون ہوگی۔

اردو زبان کے فروغ اور استحکام میں چوتھا اور آخری عامل ایسے سماجی اور ثقافتی اداروں کا قیام اور پھیلاؤ ہے جہاں اردو تہذیب وثقافت نیز اردو زبان کے استعمال کو ادارہ جاتی سپورٹ حاصل ہو۔ ہمارے یہاں مذہبی تعلیم اور تقریر کی زبان اردو ہے ۔شعر وافسانے بھی اردو میں لکھے جاتے ہیں۔مگر دیگر امور ومعاملات میں اردو کا استعمال نہ کے برابر ہوتا ہے۔ جبکہ اردو زبان کو تمام شعبہ علم اور زندگی کے مختلف دائروں میں پھیلانے کی ضرورت ہے۔ایک زمانے میں یہ ہمارے کورٹ کچہری کی زبان تھی۔ بازار میں بھی اس کا چلن تھا اور مختلف شعبہ علم کی تعلیم اس زبان میں دی جاتی تھی۔ ایک بار پھر سے اس زبان کے دائرے عمل کو وسعت دینے کی ضرورت ہے۔کوئی اگر یہ خیال کرتا ہے کہ اردو جدید علوم کی متحمل نہیں ہوسکتی تو یہ اس کی ناسمجھی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ صرف ترجمہ کے بل پر اعلی تعلیم کے مدارج طے نہیں کئے جاسکتے ہیں۔ اس کے لیے خود اردو میں اوریجنل ورک کی ضرورت ہے۔ اگر فرنچ ،اسپنش، پولش، جاپانی اور چینی زبانیں اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ بن سکتی ہیں اور ان زبانوں میں اعلیٰ سائنسی اور معاشی لٹریچر تیار ہوسکتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ اردو اس کی متحمل نہیں ہوسکتی ہے ضرورت ہے احساس کمتری سے باہر نکلنے کی اور اس زبان کو دیگر تمام شعبہ حیات میں وسعت دینے کی ہمیں دور جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہندوستان میں آزادی کے بعد ہندی زبان کو جو فروغ اور استحکام ملا ہے اور وہ زبان جس طرح زندگی کے تمام دائروں میں پھیلتی جارہی ہے۔اردو کسی طرح اس سے کم نہیں پھر صرف ہندی نہیں بلکہ بنگلہ، تامل، ملیالم، کنڑ اور تلگو زبان کی بھی بیش بہا ترقی ہوئی۔اردو کا لسانی اور تہذیبی سرمایہ ان زبانوں سے کسی درجہ میں کم نہیں ہے۔اس لیے اس کے فروغ کے لیے ادارہ جاتی سپورٹ بہت اہم ہے۔

دوسرا عامل بازار ہے۔جس زبان میں معیاری تعلیم وتحقیق، تجارت اور روزگار کے مواقع زیادہ ہوں گے فطری طور پر عوام میں اس کے تئیں دلچسپی زیادہ ہوگی۔آپ نے دیکھا کہ ساٹھ کی دہائی میں انگریزی کے خلاف زبردست عوامی احتجاج شروع ہوا جس کے نتیجے میں بہت سی ریاستوں میں انگریزی کو پرائمری اور سکنڈری اسکولوں کے نصاب سے خارج کردیا گیا۔

آج جب گلوبلائزیشن کا دور شروع ہوا ہے تو انگریزی زبان کی مانگ تیزی سے بڑھی ہے۔ اب جن ریاستوں کو ترقی کے دوڑ میں آگے آنا ہے انہوں نے پھر سے انگریزی کو ابتدائی درجات سے ہی داخل نصاب کرنا شروع کیا ہے جس کی مخالفت تو کجا اب ہر سطح پر اس کا استقبال کیا جا رہا ہے۔

اس لیے اگر کوئی زبان اعلیٰ تعلیم و تحقیق، سائنس اور ٹیکنولوجی، تجارت اور معیشت کی زبان بنتی ہے اور اس میں روزگار کے مواقع زیادہ پیدا ہوتے ہیں تو فطری طور پر لوگوں کی دلچسپی اس زبان کو سیکھنے اور جاننے کی ہوتی ہے۔ آج چینی، جاپانی، جرمن، فرانسیسی اور عربی زبان میں روزگار کے مواقع جیسے جیسے بڑھ رہے ہیں بڑے شہروں میں ان زبانوں کی تعلیم کے ادارے بہت مقبول ہیں اور بہت سی یونیورسیٹیوں میں ان کی تعلیم ہوتی ہے جس میں خاصی تعداد میں طلباء داخلہ لیتے ہیں۔

ہم اردو کا رونا روتے ہیں۔ لیکن ایسا نہیں ہے کہ اردو زبان میں کوئی امکان موجود نہیں ہے۔ آج بھی جو لوگ اردو پڑھتے ہیں اور اردو جانتے ہیں ان کے روزگار کے مواقع دوسری زبانوں کے مقابلے زیادہ ہیں۔ مسلمانوں میں 90% لوگ جو Employed ہیں وہ یا تو اردو اساتذہ ہیں یا اردو ٹرانسلیٹر ہیں۔ محض 10% فیصد مسلمان کسی اور شعبہ میں Employed ہیں اس طرح اردو زبان کی Employability کسی اور زبان اور مضمون کے مقابلے کہیں زیادہ ہے۔ یہاں تک کہ مسابقت کے امتحان میں بھی ان کی کامیابی کا امکان زیادہ ہوتا ہے جو اردو یا فارسی کے ذریعے مسابقت کے امتحان میں حصہ لیتے ہیں۔ لہٰذا اردو زبان کی معیاری تعلیم بازار کے لحاظ سے بھی لازمی ہے۔

موجودہ دور اردو کے لیے ایک سخت دور ہے تاہم اس کا ایک خوش آئند پہلو بھی ہے۔ اس وقت ہندوستان میں اردو بولنے، پڑھنے اور لکھنے والوں کی جتنی آبادی ہے تاریخ کے کسی دور میں اتنے لوگ اردو بولنے اور پڑھنے والے نہیں تھے۔ اردو کے سینکڑوں اشاعتی ادارے ہیں۔ اردو کے اخبارات اور رسائل ملک کے ہر حصے سے نکل رہے ہیں۔ کم و بیش سات آٹھ

ارد و چینل ہیں جہاں اردو نشریات ہوتی ہیں۔ سینکڑوں ریڈیو اسٹیشن سے اردو نشریات اور اردو پروگرام ہوتے ہیں۔ اردو اب صرف ہندوستان کی زبان نہیں رہی۔ یہ بین الاقوامی زبان بن گئی ہے۔ ۲۰۰۵ء کے عالمی زبانوں کے سروے کے مطابق دنیا میں ۱۰۴ ملین آبادی اردو بولتی ہے۔ عوامی زبانوں کی فہرست میں اردو انیسویں مقام پر ہے انٹرنیٹ جیسی جدید ٹکنولوجی نے اردو کو نہ صرف دوام واستحکام بخشا ہے بلکہ اس کے ذریعہ اردو کی وسعت اور پہنچ میں بے پناہ اضافہ ہوا ہے۔ گوگل سرچ کے مطابق فی الوقت نیٹ پر مختلف نوعیت کے ۲۶ رلاکھ ۶۰ر ہزار ویب سائٹس ہیں۔ ادبی، اطلاعاتی اور معلوماتی ویب سائٹس کی تعداد تقریباً ایک ہزار ہے۔ ہند و پاک میں 10.8 ملین ارد وآبادی اطلاعات ومعلومات حاصل کرنے کے لیے انٹرنیٹ کا استعمال کرتی ہے۔ اس طرح انٹرنیٹ نے اردو کو گلوبل زبان بنادیا ہے۔ آپ گھر بیٹھے پوری دنیا کی اردو آبادی، ان کی تخلیقات سے جڑ سکتے ہیں اور ارکائیو کے سہارے جدید وقدیم ہر چیز تک آپ ان سے رسائی پاسکتے ہیں۔ یورپ امریکہ، دوبئ اور سعودی عرب میں ہزاروں کی تعداد میں اردو کی نئی بستیاں بن گئی ہیں۔ ہندوستان میں ۲۰۰۱ء کی مردم شماری کے مطابق ۵۱.۵۳ ملین اردو بولنے والے ہیں۔ پورے بھارت میں اردو زبان چھٹے نمبر پر ہے بہار میں ۱۷ر ملین اردو بولنے والے ہیں جو کل آبادی کا ۱۷٪ ہے۔ اس طرح اردو ایک زندہ اور توانا زبان ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ اردو ادیب، شاعر، فن کار اور صحافی کو ہندی اور اور انگریزی کی طرح ان کی محنت کی اجرت نہیں ملتی ہے۔ کوئی آدمی ہندی اور انگریزی زبان میں لکھ کر اپنی زندگی گزارنا چاہیے تو وہ ایک خوشحال زندگی گزار سکتا ہے۔ جب کہ اگر کوئی اردو زبان کو اپنا ذریعہ معاش بنائے تو اس کی زندگی تنگ دستی میں گزرتی ہے۔ لہٰذا جہاں اردو میں Employaibilty بڑھانے کی ضرورت ہے وہیں اردو والوں کو معقول معاوضہ بھی ملنا ضروری ہے تاکہ نئی نسل کے لوگ اردو کو اپنا کیریر بناسکیں۔ اس لحاظ سے اردو کو بازار کی ضرورتوں کے مطابق ڈھالنے اور تیار کرنے کی کوشش کرنی چاہیے تاکہ اردو زبان بھی معاشی فروغ کا ذریعہ بن سکے۔

اردو کا تیسرا عامل عوام ہے۔ عوام سے مراد ہم آپ ہیں۔ یہ سچ ہے کہ اردو

ہندوستان کی مشترکہ زبان ہے یہ صرف مسلمانوں کی زبان نہیں ہے تاہم آزادی کے بعد ملک میں دھیرے دھیرے جو حالات پیدا ہوئے اس کے نتیجے میں قریب قریب سبھی قوموں نے اردو کا ساتھ چھوڑ دیا ہے۔ اس وقت پورے ملک میں شاید ایک فیصد بھی غیر مسلم طالب علم اردو میں داخلہ نہیں لیتے۔ اس لیے اردو کی بقا کا سارا دارومدار اس وقت مسلمانوں کے رویہ اور طرز فکر پر ہے۔ مسلمانوں کا اردو زبان سے جو رشتہ ہے وہ کسی اور قوم کا نہیں ہے لہٰذا مسلم عوام ہی اردو عوام ہیں اور ان کو ہی اردو کے تحفظ و بقا کی جدو جہد کرنی ہے۔

اردو کے تحفظ اور بقا کی سب سے اولین ضمانت یہ ہے کہ مسلمان گھروں میں جو بچے اور بچیاں زیر تعلیم ہیں ان کو اردو تعلیم کا معقول انتظام کیا جائے تاکہ ان کے اندر اردو زبان سے فطری دلچسپی پیدا ہو اور وہ اس کی ترویج واشاعت میں عملاً حصہ لے سکیں۔ اس وقت چونکہ ہندی اور انگریزی کا چلن عام ہے اور اردو میڈیم یا اقلیتی اسکولوں کا حال اچھا نہیں ہے اس لیے کھاتے پیتے گھرانوں کے لوگ اپنے بچوں کو انگریزی میڈیم اسکولوں میں داخلہ کراتے ہیں۔ ان اداروں میں اس وقت 50% سے زائد طلباء پڑھتے ہیں جہاں اردو تعلیم کا کوئی نظم نہیں ہے۔ وہاں سہ لسانی فورمولہ کے بجائے دولسانی فورمولہ کے تحت ہندی اور انگریزی پڑھائی جاتی ہے اور تیسری زبان کے طور پر سنسکرت پڑھائی جاتی ہے اردو کی تعلیم کا کوئی نظم نہیں ہے۔ اس مسئلہ کا دو حل ہے ایک یہ کہ ان اسکولوں کے انتظامیہ سے مل کر ان پر دباؤ ڈالا جائے کہ وہ اپنے یہاں اردو تعلیم کا نظم کریں اور گارجین سے بھی گذارش کریں کہ وہ اپنے بچوں کو اردو کی تعلیم دلوانے کے لیے اسکول انتظامیہ پر دباؤ ڈالیں۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اپنے گھر پر اردو تعلیم کا معقول انتظام کریں۔ شبینہ اور صباحی اداروں کے ذریعہ اپنے بچوں کو اردو تعلیم دلوائیں۔ آپ نے دیکھا کہ جب معیاری گھریلو تعلیم کے ذریعہ بغیر مروجہ اسکولی تعلیم کے امریکہ کے ام ای ٹی میں داخلہ ممکن ہے تو اردو کی تعلیم کا گھر پر معقول انتظام کیوں نہیں ہوسکتا ہے۔ صرف تھوڑی دلچسپی اور تھوڑی سی توجہ کی ضرورت ہے۔

ہمارے یہاں جو مدارس ہیں ان میں دو طرح کے مدارس ہیں۔ ایک وہ جو مدرسہ

بورڈ سے الحاق شدہ یعنی سرکاری یا نیم سرکاری مدارس ہیں اور دوسرے آزاد درس نظامیہ کے تحت چلنے والے مدارس ہیں۔ سرکاری مدارس میں اردو بحیثیت زبان نصاب میں شامل ہے لیکن بیشتر سرکاری مدرسوں کا حال بہت برا ہے۔ وہاں تعلیم کے علاوہ سب کچھ ہوتا ہے۔ جو درس نظامیہ کے تحت چلنے والے ادارے ہیں ان کا ذریعہ تعلیم اردو ہے مگر ان اداروں میں اردو زبان و ادب کی تعلیم نہیں ہوتی۔ اردو کی بقا کے لیے ضروری ہے کہ مدارس اسلامیہ میں باضابطہ اردو زبان وادب کو داخل نصاب کیا جائے تا کہ ان مدارس کے فارغین سبھی اردو لکھنے بولنے پر قادر ہوں۔ اردو زبان کے استحکام میں یہ ضروری قدم ہے جس پر درس نظامی کے مدارس کے ذمہ داروں کو سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے۔

اردو اس وقت شاعری اور تفریح کی زبان بن کر رہ گئی ہے یا پھر یہ مذہبی گفتگو کی زبان ہے۔ اردو کو عوامی اور عمومی زبان بنانے کی ضرورت ہے۔ اردو میں اگر تمام علوم وفنون کی اعلیٰ تصنیفات سامنے آئیں تو اس سے اردو زبان کو وسعت اور وقار حاصل ہوگا جس سے اردو کے استحکام میں مدد ملے گی۔

یورپ میں سائنس، معاشیات اور دیگر علم وفن صرف انگریزی زبانوں میں نہیں لکھے جاتے ہیں بلکہ فرانسیسی، جرمنی اور دیگر تمام زبانوں میں لکھے جاتے ہیں۔ ان زبانوں میں ایسا کچھ نہیں جو اردو زبان میں موجود نہیں ہے۔ اردو زبان صرف ترجمہ کی زبان نہیں ہے بلکہ اگر اس میں اعلیٰ اوریجنل ریسرچ ہوں تو دنیا کی دوسری زبانیں بھی اس سے استفادہ کرسکتی ہیں۔ لہٰذا جو لوگ سائنس، معاشیات اور دیگر علوم کے جاننے والے ہیں ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ اردو زبان کو وسعت اور استحکام دینے کے لیے اور اس کو پروقار بنانے کے لیے اپنی اعلیٰ علمی کاوشوں اور تحقیقات کی ترسیل کے لیے اردو کو ذریعہ بنائیں۔ اس کے لیے سب سے اہم چیز اردو کی عوامی تائید اور نصرت ہے۔ لہٰذا چاہے سرکار ہو یا بازار وہ عوامی زور اور دلچسپی سے صرف نظر نہیں کرسکتے ہیں۔ اس لیے اردو کا مقدمہ عوام کی عدالت میں پیش کیا جاتا ہے کہ اردو عوام اردو کے تحفظ، بقا، ترویج اور استحکام میں اپنا تعاون دینے کو تیار ہے یا نہیں۔ اگر عوام اردو کی حمایت میں

کھڑے ہوجاتے ہیں تو زمین کی کوئی قوت اردو کو نہ صرف ہندوستان سے ختم نہیں کرسکتی ہے بلکہ اس کے فروغ اور ترقی کو بھی نہیں روک سکتی ہے۔ اردو کی بقا اردو عوام کے مثبت فیصلہ پر منحصر ہے۔

اردو کے فروغ کے لیے ضروری اقدام

مختصراً اردو کے فروغ کے لیے مندرجہ ذیل اقدام ضروری ہیں۔

(۱) اردو بیداری تحریک کو مضبوط اور منظّم کرنے کی ضرورت ہے تاکہ اردو سے عام لوگوں کی دلچسپی پیدا ہو اور وہ اپنے بچوں کی اردو تعلیم کی طرف راغب ہوں۔

(۲) پرائمری تا اعلیٰ سطح تک اردو کے تعلیمی نظام کو وسیع، مستحکم اور معیاری بنانے کی ضرورت ہے۔

(۳) اردو میڈیم اسکولوں کی تعداد میں اضافہ، ضرورت کے مطابق اردو اساتذہ کی بحالی، اردو اسکولوں میں مناسب انفراسٹکچر کی فراہمی یعنی مناسب فرنیچر، لائبریری، بیت الخلاء، بجلی پانی اور صفائی ستھرائی کا معقول انتظام کرنے کی ضرورت ہے۔

(۴) اردو کی نصابی کتابوں کی وقت پر اشاعت، فراہمی اور تقسیم کے نظام کو بہتر بنانے کی ضرورت ہے۔

(۵) اردو میڈیم اسکولوں اور اردو اساتذہ کے مسائل کو حل کرنے، ان کی تنخواہوں اور دیگر سہولیات کے سلسلے میں جو دقتیں ہیں ان کو دور کرنے کے لیے سیاسی اور سماجی دباؤ کے ذریعہ ان کو حل کرانے پر توجہ دینی چاہیے۔

(۶) اردو کے فروغ کے جو سرکاری اور عوامی ادارے قائم ہیں مثلاً اردو مشاورتی بورڈ، اردو ڈائرکٹوریٹ، انجمن ترقی اردو وغیرہ، ان کے درمیان بہتر کورڈینیشن پیدا کرنے کی ضرورت ہے تاکہ مندرجہ بالا امور کے سلسلے میں مشترکہ اقدام کرنے میں آسانی ہو۔

(۷) اردو اساتذہ کی تربیت کے لیے خصوصی انتظام پر زور دینا اردو کی معیاری تعلیم کے

لیے لازمی ہوگا۔اس لیے اردو ٹریننگ اداروں کے قیام پر توجہ دینا ضروری ہے۔

(۸) اردو بہار کی دوسری سرکاری زبان ہے لہٰذا سرکاری غیر اردوداں ملازمین میں اردو سیکھنے کا جذبہ پیدا کرنے کے لیے اگر سرکار ایسے ملازمین کو جو اردو سیکھتے ہیں ان کو کم سے کم دو انکریمنٹ دے تو سرکاری ملازمین میں اردو سیکھنے کا شوق پیدا ہوگا جو اردو کے فروغ میں معاون ہوگا۔

(۹) اردو ڈائرکٹوریت کو غیر اردو داں سرکاری ملازمین کو اردو سکھانے کا ایک شاٹ سرٹیفیکٹ کورس شروع کرنا چاہیے جس کے ذریعہ ان کو اتنی اردو سکھادیں تاکہ وہ ضروری اردو پڑھنا لکھنا سیکھ جائیں۔

(۱۰) بہار میں ساٹھ کی دہائی میں پوری ریاست میں سرکاری امداد یافتہ ۲۵۰ اردو لائبریریاں تھیں جس کا اندراج انجمن ترقی اردو کے میمورنڈم میں موجود ہے۔ ان تمام لائبریریوں کو پھر سے زندہ اور فعال بنانے کی ضرورت ہے ساتھ میں ان کے گرانٹ کو بحال کرانے پر توجہ دینی ہوگی۔

(۱۱) شاعری، فکشن، تنقید وغیرہ کے علاوہ اردو میں جو لوگ، سائنسی، معاشی، ماحولیاتی، عمرانی اور عمومی عوامی اور علمی موضوعات پر لکھنے والے مصنّفین ہیں ان کی خدمات کے اعتراف اور قدرافزائی کے لیے خصوصی انعام دینے کا انتظام کیا جانا چاہیے اور ان کتابوں کی اشاعت میں معقول مالی مدد دی جانی چاہیے تاکہ اردو زبان کا دائرہ وسیع ہو اور ایسے قلم کاروں کی ہمت افزائی ہو۔

(۱۲) سرکاری سطح پر اردو کے استحکام کے لیے جو قدم اٹھائے جارہے ہیں۔اس کے ساتھ ساتھ سرکاری طور پر اردو کتابوں کی خریدنے کے لیے اردو مشاورتی بورڈ اردو ڈائرکٹوریٹ اور اردو اکیڈمی کو خصوصی رقم فراہم کی جائے تاکہ وہ ان کتابوں کو خرید کر عام لوگوں میں تقسیم کرسکیں۔

یہ چند اقدامات ہیں جن کو اگر روبعمل لایا جائے تو اردو کے فروغ وبقا میں کافی

مدد ملے گی اور اردو پھر سے ایک عوامی اور عمومی زبان کی طرح زندہ اور مستعمل زبان بن سکتی ہے۔ اس کا سارادارومدار عوامی بیداری، دلچسپی، مستعدی، اشتراک اور تحریک پر ہے۔ آپ زندہ اور بیدار ہیں تو اردو بھی زندہ اور جاندار رہے گی۔ جن کے دلوں میں اردو کا درد ہے وہ آگے آئیں اور اپنی زندگی کا ثبوت دیں ؂

خدا درد والوں کو آباد رکھے
جو جاگے ہوئے ہیں جگائے ہوئے ہیں

مدارس اسلامیہ اور ہماری ذمہ داریاں

مساجد کی تعمیر، تزئین وتوسیع اور مدارس کی بڑھتی تعداد کو دیکھ کر بعض سیاسی اور ہندو مذہبی تنظیموں نے اور بعض انگریزی اور ہندی پرنٹ اور الیکٹرونک میڈیا نے بہت واویلا مچا رکھا ہے اور ان چیزوں سے جوڑ کر طرح طرح کی افواہیں بڑے پیمانے پر پھیلائی جارہی ہیں۔ مدارس اور مساجد کے بڑھتے اس نٹ ورک کو لوگ غیر قانونی طور پر بیرونی سرمایہ کا عمل دخل قرار دے رہے ہیں اور بعض کے نزدیک یہ آئی ایس آئی کا اڈہ ہیں تو بعض اس کو انتہا پسندی، بنیاد پرستی اور دہشت گردی کا مرکز مانتے ہیں۔ بعض دانشور قسم کے لوگ مدارس کو مسلم پسماندگی کی علامت اور وجہ بتاتے ہیں۔

موجودہ دور میں مسلمانوں کی اصلاح حال کے لیے سرکار کی جانب سے جو تجاویز آرہی ہیں، ان میں مدارس کے نصاب میں واضح تبدیلی اور ان کی جدید کاری کی بات بڑے زور وشور کے ساتھ کی جاتی ہے۔ اصولی طور پر اس بات سے کوئی اختلاف نہیں ہے کہ کسی سسٹم کی افادیت اور اہمیت کو باقی رکھنے کے لیے وقت کے تقاضے کے تحت اسے اپنے آپ کو بدلنا بھی چاہیے اور آگے بڑھانا بھی چاہیے۔ لیکن تبدیلی اور ارتقا کی یہ تحریک داخلی ہونی چاہیے۔ نہ کہ اوپر سے تھوپی جانی چاہے۔ اگر اوپر سے کوئی چیز تھوپی جاتی ہے تو لوگوں کا اندیشوں میں مبتلا ہونا اور مشکوک نگاہوں سے دیکھنا فطری ہے۔ خاص طور سے اس وقت جب، تبدیلی کی یہ کوشش

ایسی جانب سے ہو رہی ہے جس کی نیت پر لوگوں کو پہلے ہی شک ہے۔

مدارس کا مقصد اور ان کی خدمات:

مدارس کے باب میں کوئی بحث کرنے سے پہلے یا اس کی جدید کاری اور اصلاح پر گفتگو کرنے سے قبل یہ جاننا ضروری ہے کہ مدارس کا مقصد کیا ہے؟ ہر تعلیمی نظام اور تعلیمی ادارے کا ایک مقصد ہوتا ہے اور اس کی اہمیت وافادیت کو اسی مقصد کے تناظر میں دیکھا اور سمجھا جانا چاہیے۔ اگر ہم اس کے مقصد کو نظر انداز کر کے اپنی طرف سے کوئی اور مقصد طے کر لیتے ہیں تو یہ کوئی چیز تو ہوگی مگر وہ نہیں ہوگا جس کے لیے یہ ادارے قائم کئے گئے ہیں۔

بحث کو طول دیے بغیر یہ کہا جا سکتا ہے کہ مدارس کے قیام کا بنیادی مقصد مسلمان بچوں میں دینی تعلیم اور اسلامی تہذیب واخلاق کا فروغ ہے۔ ان اداروں کے ذریعہ علماء، فضلا، مفتیان، محدثین، فقہا، مفسرین، محققین، داعی اور مبلغ، امام، واعظ، موذن وخطیب، حافظ، قاری، معقولات اور منقولات کے ماہرین، عربی زبان کے عالم ومعلم اور اسلامی مفکر پیدا کئے جاتے ہیں۔ یہ نظام تعلیم اسکول اور کالج کے نظام تعلیم سے مختلف ہے اس لیے اس کا نصاب بھی مختلف ہے۔ آج کل بہت ساری دینی جماعتیں اور تحریکات کام کر رہی ہیں جن میں ڈاکٹر، انجینئر، پروفیسر، آفیسر، طالب علم او زندگی کے تمام شعبہ سے متعلق لوگ دینی کاموں میں لگے ہوئے ہیں اور ان کی دینی معلومات بھی اچھی ہے۔ لیکن کوئی جماعت اور تحریک دینی مدارس کا بدل نہیں ہو سکتی ہے۔ یہ زیادہ سے زیادہ معاون ہو سکتی ہیں تا کہ سماج میں دینی ماحول بنانے میں مدد مل سکے۔ اس وقت کفر وشرک، الحاد و دہریت کی آندھی جس تیزی کے ساتھ چل رہی ہے اس کا رخ موڑنے میں اور ملت کو بے دینی کے سیلاب سے بچانے میں مدارس اسلامیہ نے جو کردار ادا کیا ہے اس کا کوئی متبادل نہیں ہے۔ ہمارے روشن خیال دانش ور حضرات مدارس کے رول کو کمتر دکھانے کی چاہے جتنی کوشش کریں اس وقت دین کا جو چلن قائم ہے وہ انہیں بوریہ نشیں لوگوں کی خدمات کا نتیجہ ہیں۔ ہم لوگ دراصل اپنی خوبیاں کبھی نہیں دیکھتے۔ احساس کمتری

نے ہمیں اپنی اچھی صلاحیتوں کو پہچاننے کے لائق بھی نہیں رکھا ہے۔ ہم جب چرچ کے پادری، نن، ننگ دھڑنگ سادھو سنت کو دیکھتے ہیں تو سمجھتے ہیں کہ یہ لوگ کتنے Dedication کے ساتھ کام کرتے ہیں اور کس طرح اپنے دین وتہذیب کی اشاعت میں لگے ہوئے ہیں اور خود ہماری آبادیوں میں قربانیوں کی جو عظیم الشان مثالیں پیش کی جارہی ہیں اس کا کوئی اعتراف واحساس نہیں ہے۔ اس کی قدر اور اہمیت کو ہم بہت کم سمجھتے ہیں۔ آج کے دور میں جب کہ ایک رکشہ پولر، پھیری والا اور روز کی مزدوری کرنے والا شخص بھی پانچ ہزار اور دس ہزار روپیہ ماہانہ کما تا ہے جب کہ مدرسے کے کسی مولوی یا امام کو غریب آبادیوں میں تو دور، کھاتے پیتے شہری علاقوں میں مشکل سے تین سے پانچ ہزار کی رقم ماہانہ ملتی ہے۔ مؤذن کی تنخواہ اس سے بھی کم ہے۔ سب سے خراب بات یہ ہے کہ لوگ ان خادمان دین کو بسااوقات ہیچ نظر سے دیکھتے ہیں۔ اگر یہ لوگ نہ ہوں تو دور دراز کے علاقوں میں موسم اور حالت کی تمام تر سختی برداشت کرتے ہوئے یہ جو اذان اور نماز کا سلسلہ قائم ہے کب کا ختم ہو جاتا اور غریب بچوں کو کلمہ، نماز اور ناظرہ قرآن کی جو تعلیم دی جاتی ہے وہ نہیں ہو پاتی۔

لوگوں میں جو تھوڑی دینی شد بد ہے، جمعہ اور عیدین کا اہتمام ہے، میلاد اور سیرت کے جلسے ہوتے ہیں جہاں خدا اور اس کے رسول کا نام کثرت سے لیا جاتا ہے، لوگ کلمہ اور نماز سے واقف ہیں، دینی شعائر کے احترام کا چلن ہے، ختنہ اور عقیقہ کی رسم چل رہی ہے، نماز جنازہ، قل اور فاتحہ کا اہتمام ہوتا ہے، جو کسی مسلم سماج اور سوسائٹی کی پہچان ہے، یہ سب کچھ نہیں ہوگا، اگر یہ خادمان دین نہ ہوں۔ آج ایسی جگہوں پر جہاں مسلمان بہت کم ہیں اور جنہوں نے ان چیزوں کو اہمیت نہیں دے رکھی ہے۔ بالخصوص پڑھے لکھے کھاتے پیتے گھرانے میں جو اعلی مناصب پر فائز بھی ہیں ان کے گھروں میں بے دینی نے ڈیرے ڈال دئے ہیں۔ ان کے بچے کلمہ نماز، ناظرہ قران مجید، تحیات اور درود سے ناواقف ہیں۔ ان گھروں میں ناپاکی، عریانی اور فحاشی کا چلن عام ہے۔ جب ان کے گھروں میں کوئی مرجاتا ہے تو اس کو غسل دینے، کندھا دینے اور جنازہ پڑھنے والا بھی کوئی جلدی اور آسانی سے نہیں ملتا اور ان کو یہ سب کام کرایہ کے

آدمیوں سے کروانا پڑتا ہے۔

ٹھیک یہی حال ان آبادیوں کا ہے جہاں غربت وجہالت ہے اور جو آس پاس کی مسلم آبادی سے دور ہیں ان کا اسلامی کلچر اور مسلم سماج سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ان کی زبان وبول چال، رہن سہن، کھانا پینا، لباس پوشاک وغیرہ سے وہ مسلم سماج کا حصہ نہیں معلوم ہوتے ہیں۔ وہ نماز، وضو، طہارت جیسی بنیادی چیزوں سے بھی واقف نہیں ہیں۔ ذبیحہ نہیں جانتے اور ان کے مردے بھی غیر اسلامی طور پر بغیر غسل اور جنازے کے دفن کر دیئے جاتے ہیں۔ ملت کا یہ بنیادی کام کون دانش ور اور سیاسی وسماجی کارکن کر رہا ہے۔؟ میں کسی کی اہمیت گھٹانا نہیں چاہتا اور کسی کی خدمات کو حقیر نہیں سمجھتا۔ لیکن یہ وہ کام ہے جس کو بنائے دین وملت کہا جاسکتا ہے جو یہ لوگ ہی انجام دیتے ہیں۔

اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ ان خادمان دین کی خدمات کا اعتراف کریں اور ان کے احسان مند ہوں۔ بہت سی جگہوں پر ان کے کھانے پینے کا کوئی معقول انتظام نہیں ہوتا ہے بلکہ انہیں گھر گھر جا کر کھانا کھانا ہوتا ہے۔ ان کے لیے کوئی جائے قیام نہیں ہوتی۔ وہ کسی کے دروازے پر یا مسجد میں رہتے اور سوتے ہیں۔ ایک مناسب کھاٹ اور صاف بستر بھی ان کو میسر نہیں ہوتا ہے۔ اس سے زیادہ بے لوثی آخر کس قوم اور مذہب کے لوگوں کے اند رہے۔

مدارس اسلامیہ کی اہمیت وافادیت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ان کے ذریعہ بالعموم پسماندہ ترین آبادی کے بچوں کی تعلیم وتربیت کا نظم قائم ہے اور اپنی تمام تر کمیوں کے باوجود یہ سسٹم ملک میں رائج کسی بھی سرکاری اور غیر سرکاری اسکیم سے بہتر ہے۔

(۱) ہندوستان کے دستور میں چھ سے چودہ سال کے بچوں کی مفت اور لازمی تعلیم کی بات کہی گئی ہے۔ مگر ہنوز دستور کا یہ وعدہ ایک سنہرا خواب ہے۔ ملک میں آزادی کے وقت جتنی آبادی تھی آج ستر سالوں کے بعد اس سے زیادہ آبادی غریب اور ان پڑھ ہے۔ سرکاری اور غیر سرکاری اداروں کی طرف سے جاری تمام تر کوششیں نہ

صرف ناکافی بلکہ ناکام ثابت ہورہی ہیں ۔سرکار نے پچھلے دس سالوں سے ورلڈ بینک اوردیگر بین الاقوامی اداروں جیسے یونیسکو وغیرہ کی مدد سے ملک میں سروشکچھا ابھیان ،تعلیم بالغان،آنگن باڑی اور بہت ساری دوسری اسکیمیں شروع کر رکھی ہیں۔ ہریجن اورآدی باسی بچوں کو ایک روپیہ یومیہ کے حساب سے ترغیبی مدددی جاتی ہے تاکہ وہ اسکول میں آئیں اور بہت سارے اضلاع میں دن کے کھانے کی اسکیم شروع کی گئی ہے۔مگر اس پورے عمل میں جو بدانتظامی اور بے ایمانی ہے وہ سب جانتے ہیں۔اسکیم کا فائدہ ان لوگوں کو پوری طرح نہیں مل پاتا جن کے لیے یہ بنائی گئی ہے۔دوسرے اس کا بیشتر حصہ سرکاری عملہ اور بیچولیے ہڑپ کر جاتے ہیں۔ جو کھانا دیا جاتا ہے وہ اتنا خراب ہوتا ہے کہ بچے اس کو کھانے سے اکثر بیمار پڑ جاتے ہیں۔ان اسکیموں پر اربوں کھربوں کی رقم خرچ ہوتی ہے تب بھی یہ اپنے مقصد میں بری طرح ناکام ہیں۔سرکاری رپورٹوں میں جو اعداد وشمار دئے جاتے ہیں اگر ان کا زمینی جائزہ لیا جائے تو پچاس فیصد غلط ثابت ہوں گے۔ دوسری طرف مدارس کو دیکھئے ایک غریب بچہ مدرسہ میں داخل ہوتا ہے،مدرسہ اس کے تعلیم کی ذمہ داری لیتا ہے۔ساتھ ہی اس کو مدرسے میں رہنے کی جگہ ملتی ہے اس کے کھانے کا انتظام کیا جاتا ہے۔ اس کے دواعلاج کا انتظام کیا جاتا ہے اور کہیں کہیں اس کو کپڑے بھی فراہم کئے جاتے ہیں۔اور یہ سب بالکل مفت ہوتا ہے۔ایسے مدارس پورے ملک میں ہزاروں کی تعداد میں پھیلے ہوئے ہیں جن میں ایک عام اندازے کے مطابق پانچ لاکھ بچے زیرتعلیم ہیں۔ بہت کم مدرسے ایسے ہیں جن کے پاس مستقل آمدنی کا ذریعہ ہے اکثر مدارس کا پورا بجٹ عوامی چندے سے پورا ہوتا ہے۔مسلمانوں کے پانچ فیصد سے زیادہ بچے مدارس میں پڑھتے ہیں۔ مدارس کی وجہ سے ہی مسلمانوں میں شرح خواندگی تیس فیصد ہے۔اگر یہ نہ ہوتو ان کی شرح خواندگی تمام تر دعوؤں کے باوجود 20 فیصد سے زیادہ نہیں ہوگی۔

(۲) اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ غربت کے سبب اسکولی تعلیم حاصل کرنا ان کے لیے محال ہے۔ حال کے برسوں میں مدارس اور مساجد کی تعداد میں جو اضافہ ہوا ہے اس کی دو بڑی وجہیں ہیں۔ایک آبادی میں اضافہ کے سبب نئے علاقوں میں آبادی کا پھیلاؤ ہوا ہے جہاں مدارس اور مساجد کی ضرورت ہے۔ دوسرے سالانہ ایک بڑی تعداد میں مدرسے سے جو فارغین نکلتے ہیں ان میں بہت کم لوگ ہیں جن کی اپنی کھیتی باڑی یا تجارت وصنعت ہے۔ زیادہ تر لوگ وہ ہیں جن کے پاس کچھ نہیں ہے۔ آج کل جب ڈاکٹر، انجینئر اور اعلیٰ ڈگری رکھنے والے لوگوں کو نوکری نہیں ملتی ہے تو مدارس کے فارغین کی کھپت کہاں ہوگی؟ اس لیے یہ لوگ مختلف جگہوں پر مدرسے کھول کر بیٹھ جاتے ہیں اور وہاں ایک نیا چراغ جل جاتا ہے۔ان کو مدرسہ کھولنے میں زیادہ دقت اس لیے نہیں ہوتی کہ بہت کم انفراسٹرکچر کے ساتھ مدرسہ کھولا جاسکتا ہے اور وہاں اساتذہ کو تنخواہ دینے کے لیے کسی بڑی رقم کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔ یہ لوگ چندے کے ذریعہ اپنی اور اپنی بچوں کی کفالت کا نظم کرتے ہیں اور اسی طرح پسماندہ ترین آبادی میں بھی علم وشعور کا چراغ جلانے میں مشغول رہتے ہیں۔ان میں دو چار پانچ فیصد لوگ غلط بھی ہوسکتے ہیں تو یہ سماج کی خرابی مانی جائے گی نہ کہ سسٹم کی۔جن علاقوں میں مسلمانوں کی آبادی زیادہ ہے وہاں فطری طور پر مدارس اور مساجد کی تعداد زیادہ ہوگی اور جیسے جیسے یہ شعور بڑھے گا ان کی تعداد بڑھے گی۔ لہٰذا مدرسوں کی تعداد میں اضافہ بیرونی سرمایہ کی کارستانی نہیں ہے۔اور اگر کوئی ایسا الزام لگاتا ہے تو وہ یہ ثابت کرے۔ جھوٹے پروپیگنڈے سے عوام میں بدگمانی پیدا کرنا ملک اور سماج کے لیے نقصاندہ ہے۔

مدارس کا ذریعہ آمدنی:

مدرسوں کی آمدنی کے تین بڑے ذرائع ہیں اور ایک چھوٹا ذریعہ ہے۔ رمضان کے

مہینہ میں ہرکوئی اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے کہ ہر شہراورقصبہ میں سینکڑوں کی تعداد میں مدرسوں کے محصلین گھر گھر جا کر زکوٰۃ اور صدقۂ فطر وصول کرتے ہیں اور دس، بیس، پچاس، سو، دوسو، ہزار، دو ہزار کر کے سال میں لاکھوں رقم جمع کرتے ہیں جوان کی سال بھر کفالت کا ذریعہ بنتی ہے۔ یہ پیسے بچوں کے نام پر جمع کئے جاتے ہیں اور تعلیم سمیت ان کے جملہ اخراجات اسی پیسے سے پورے ہوتے ہیں۔ دوسرا ذریعہ بقرعید کے موقع پر چرم قربانی ہے۔ بالعموم لوگ زیادہ تر چرم قربانی مدرسوں کو دیتے ہیں۔ جس کے پاس تھوڑی بھی معاشی خوشحالی ہے وہ قربانی ضرور کرنا چاہتا ہے۔ اس لیے چرم قربانی کی تعداد ہر سال بڑھ رہی ہے جس سے مدارس کو لاکھوں روپے کی سالانہ آمدنی ہوتی ہے۔ مدارس کی آمدنی کا تیسرا بڑا ذریعہ عشر ہے۔ مسلم کسان اپنی پیداوار کا دسواں اور بیسواں حصہ نکالتے ہیں اور یہ رقم بھی بالخصوص مدارس کو ہی جاتی ہے۔ اس طرح تین ذرائع ہیں جن پر مدارس کا پورا انظام قائم ہے۔ اس کے علاوہ بعض مدارس کے پاس کچھ جائدادیں ہیں جن کی آمدنی ان کے کام آتی ہے۔ ساتھ ہی صدقات، خیرات وغیرہ کے ذریعہ لوگ مدد کرتے ہیں۔ تعمیری اور دیگر کاموں کے لیے ہنگامی چندے بھی ہوتے ہیں۔

مسلمان میں تو غربت ہے مگر ان کے اندر انفاق کا جذبہ بھی پایا جاتا ہے اور یہ جذبہ کبھی کبھی غلط رنگ میں بھی ظاہر ہوتا ہے۔ مسلمانوں میں بھیک مانگنے والوں کی بڑی تعداد کی ایک وجہ جہاں ان کی غربت ہے وہیں دوسری وجہ آسانی سے ان کو مل جانے والی بھیک بھی ہے جس کی وجہ سے وہ نکھٹو ہو کر بھیک مانگتے ہیں۔ بہر حال مسلمان اس جذبہ انفاق کی وجہ سے مدارس اور مساجد میں دل کھول کر خرچ کرتے ہیں۔ مسلمانوں میں کچھ لوگ جو عرب ممالک یا کسی اور بیرونی ممالک میں چلے گئے ہیں اور وہاں اچھا پیسہ کما رہے ہیں وہ بھی ان کاموں پر خرچ کرتے ہیں۔ غیر قانونی طور پر کسی بیرونی سرمایہ کا کوئی معاملہ سامنے آیا ہے تو اس کی مناسب تفتیش ہونی چاہیے اور اس پر روک لگنی چاہیے۔ میری معلومات میں جو پیسے بھی جہاں سے آرہے ہیں قانونی طور پر اور حکومتی ایجنسیوں کی پوری معلومات کے تحت آرہے ہیں اس لیے ایسے پروپیگنڈے کا مقصد محض غلط فہمی پھیلا کر سماج کو گمراہ کرنا ہے جس کا سیاسی مقصد ہے۔

مدارس اور دہشت گردی:

جہاں تک مدارس اسلامیہ پر انتہا پسندی، بنیاد پرستی اور دہشت گردی کا اڈہ ہونے کا الزام ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ مدارس آج سے نہیں ہیں بلکہ چودہ سو سالوں سے دنیا کے ہر حصے میں موجود ہیں اور کہیں بھی اور کبھی بھی ان پر یہ الزام نہیں لگایا گیا۔ دراصل یہ الزام موجودہ عالمی سیاسی چپقلش کا نتیجہ ہے اور اسلام، مسلمان اور اسلامی اداروں، تنظیموں اور تحریکوں کو بدنام کرنے کی ایک وسیع تر سازش کا حصہ ہے۔

جس وقت افغانستان میں روسی تسلط تھا تو امریکہ نے غیور افغانی قوم کی دینی حمیت کو برانگیختہ کر کے ان کو ہتھیار اور پیسے دے کر جہاد کے لیے ابھارا اور ان کو یہ یقین دلایا کہ وہ ان کا دوست ہے اور ان کی کھوئی ہوئی آزادی واپس دلانا چاہتا ہے۔ لہٰذا ان کو افغانستان سے باہر نکال کر ان کے لیے مدرسے قائم کئے گئے جہاں ان کو دینی تعلیم کے ساتھ ہتھیار چلانے کی ٹریننگ بھی دی جاتی تھی اور اس طرح ان کو ٹریننگ دے کر افغانستان میں روسی فوج سے لڑنے کے لیے بھیجا جاتا تھا۔ جب روس نے شکست کھا کر افغانستان سے پسپائی اختیار کی تو امریکہ نے اس جگہ پر قبضہ کرنا چاہا۔ جب امریکی عزائم کھل کر افغانیوں کے سامنے آئے تو انہوں نے امریکہ کی بھی اسی طرح مخالفت شروع کر دی جیسی روسیوں کی کی تھی۔ یہاں تک کہ امریکہ نے افغانستان پر براہ راست جنگ کر کے طالبان کی حکومت ختم کر دی، طالبان کی حکومت کتنی اچھی تھی یا بری تھی اس پر تبصرہ کرنے کا یہ موقع نہیں ہے۔ امریکہ کی اس ظالمانہ حرکت کے خلاف افغانی عوام نے جو جوابی کاروائی شروع کی اس کو امریکہ نے اسلامی دہشت گردی کا نام دے دیا۔ پھر کیا تھا دنیا بھر کی اسلام دشمن قوتیں اس اصطلاح کو لے اڑیں اور اسلام کو دہشت گردی سے جوڑ دیا گیا اور مدرسہ جہاں اسلام کی تعلیم ہوتی ہے اسے دہشت گردی کی نرسری قرار دیا جانے لگا۔

بھارت میں سنگھ پریوار کے لوگوں نے اس بات کو خوب خوب اچھالا کیونکہ یہ ان کے

مزاج اور مفاد میں تھا۔ ہمارے سنگھی بھائی بھی کمیونسٹوں سے کم نہیں ہیں۔ایک زمانے میں روس میں جب برف باری ہوتی تھی تو دلی میں بھی کمیونسٹ پارٹی کے لوگ رین کوٹ پہن کر اور چھاتا لے کر چلتے تھے کیونکہ ریڈیو ماسکو نے برف باری کی خبر دی تھی۔ٹھیک اسی طرح اگر امریکہ کو زکام ہوتا ہے تو سنگھ پریوار کے لوگ فلو میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔دیسی سورماؤں کا یہ امریکی بدیشی پریم کیسی بھارتیتا ہے اس کا جواب تو وہی دے سکتے ہیں؟ بہر حال مدارس کو دہشت گردی سے جوڑنے کی ناپاک کوشش امریکی سازش کا نتیجہ ہے،جس کی گونج بھارت میں بھی سنائی دیتی ہے اور سنگی میڈیا اور اس کے ہم نوا بڑے پیمانے پر اس کی تشہیر کرتے نظر آتے ہیں۔ مدارس اسلامیہ کو بالعلوم مسلمانوں کی پسماندگی کی علامت مانا جاتا ہے۔ جس کو جدید سائنس اور ٹکنالوجی سے دور دقیانوسیت اور رجعت پسندی کی دلیل سمجھا جاتا ہے جو ایک ایسے خول میں بند ہیں جہاں جدید دنیا کی ہوا بھی نہیں لگتی ۔جب کہ آج کے دہشت گرد جدید ہتھیاروں کا استعمال کرتے ہیں اور تمام حفاظتی انتظامات کے باوجود جہاں چاہتے ہیں آگ اور خون کی ہولی کھیلنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔اگر مدارس کے لوگ اتنے ماہرفن ہیں کہ وہ جدید ہتھیار بنا بھی سکتے ہیں اور چلا بھی سکتے ہیں تو ان پر پسماندہ،دقیانوس اور جاہل واحمق ہونے کا الزام غلط ہوگا۔ بلکہ جو کام اسکول کالج کے اچھے اچھے تعلیم یافتہ،حضرات نہیں کرسکتے ہیں اگر یہ لوگ ایسا کرنے پر قادر ہیں،اس کا مطلب ہے کہ ان کا تعلیمی نظام بہت اعلیٰ اور ان کی ذہنی صلاحیت بہت اونچی ہے۔ایسی صورت میں ان کے بارے میں جو دقیانوسیت اور علم و ہنر سے عاری ہونے کا جو الزام لگایا جاتا ہے وہ سراسر بے معنی ہے۔

مدارس اسلامیہ دہشت گردی کے نہیں بلکہ علم،امن، بھائی چارہ،اخلاق،ایمانداری، سنجیدگی اور شرافت کے گہوارے ہیں۔اتنا بےضرر اور پرامن تعلیمی ادارہ تو پورے ملک میں کوئی دوسرا نہیں ہے،جہاں نہ انتظامیہ اور اساتذہ کا ٹکراؤ ہے نہ طلباء اور اساتذہ سے لڑائی ہے۔ بلکہ یہ جس آبادی میں رہتے ہیں ان کی بہو بیٹیاں عزت وحفاظت کے ساتھ رہتی ہیں کیونکہ یہاں کا طالب علم کسی غیر عورت کو نظر اٹھا کر دیکھنا بھی پسند نہیں کرتا ہے۔اگر اس کے خلاف کوئی بات

کسی کے علم میں ہوتو بطور دلیل پیش کرے۔

اصلاح کی ضرورت:

ان تمام مثبت باتوں کے تذکرے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مدارس کے نصاب اور نظام میں اصلاح کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارے یہاں مدارس کے دو نظام ہیں۔ ایک وہ جو سرکاری تحویل میں چلائے جارہے ہیں اور دوسرے وہ جو آزادانہ طور پر رضا کارانہ انداز سے رفاہی اور فلاحی مقاصد سے چلائے جارہے ہیں۔ میں نے ساری بحث رضا کارانہ مدارس کے باب میں کی ہے۔ سرکار اپنی تحویل میں جو مدارس چلارہی ہے اور جو تجربات کرنا چاہتی ہے۔ سرکار وہ کرے۔ اگر وہ ملت کے عمومی مفاد میں ٹھیک پایا گیا تو ملت خود بخود اس کا آگے بڑھ کر استقبال کرے گی۔ لیکن فی الوقت سرکار رضا کارانہ طور پر چلنے والے اداروں کے ساتھ کوئی چھیڑ چھاڑ نہ کرے۔ اب تک سرکاری مدارس کا جو تجربہ سامنے آیا ہے اس سے ملت کو بہت مایوسی ہوئی ہے۔ ان اداروں میں نہ دین ہے اور نہ تعلیم، نہ اساتذہ کو پوری تنخواہ ملتی ہے۔ یہ ادارے سیاست کا شکار ہیں اور حکومت اور بیورو کریسی کے جال میں ایسے پھنسے ہیں جہاں سے نکلنا مشکل ہے۔ سرکار مدرسوں کی جدید کاری کے باب میں جو تجربہ کرنا چاہتی ہے وہ ان اداروں میں کرے۔ جو کمیاں دینی مدارس میں ہیں ملت کی پہل سے ان میں اصلاح کی اشد ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

ہمارے یہاں دینی تعلیم کے نام پر مسلک کی تعلیم پر بہت زور دیا جاتا ہے۔ یہ جاننے اور ماننے کے باوجود کے فقہ کے تمام مکاتب برحق ہیں اور امت کا اس پر اجماع ہے مسلکی بنیاد پر سخت اختلاف وانتشار پایا جاتا ہے۔ اس وجہ سے مختلف مقامات پر مسلمان آپس میں اس طرح باہم دست وگریباں ہوجاتے ہیں جیسے دو دشمن قومیں ایک دوسرے سے لڑتی ہیں۔ ۳۰/اکتوبر ۲۰۰۴ء کے قومی تنظیم میں یوپی کے ایک قصبے اروئی میں دیوبندی، بریلوی دو عالموں کے قتل کی دل سوز خبر شائع ہوئی تھی جو انتہائی افسوسناک اور قابل مذمت ہے۔ ایسے واقعات وحادثات

سے دین کا وقار مجروح ہوتا ہے اور ملت کا بھرم ٹوٹتا ہے۔ دشمنان اسلام کے حوصلے بلند ہوتے ہیں۔ اس وقت جبکہ ملت ہندوستان میں اپنے وجود و بقا کی جنگ لڑ رہی ہے۔ اس طرح کے واقعات شرمناک ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ ہم اپنے مفاد و ضرر کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ میں نے کچھ دن قبل اپنے ایک مضمون میں مسلمانوں کے اتحاد پر گفتگو کرتے ہوئے ان لوگوں کی مذمت کی تھی جو بظاہر اپنے لباس پوشاک اور تراش خراش سے بڑے دین دار نظر آتے ہیں لیکن انتشار و افتراق کی گفتگو کرتے ہیں۔ تو ایک صاحب نے مجھ پر تنقید کرتے ہوئے تبصرہ کیا تھا کہ میں ابھی مضمون نویسی کی مشق کر رہا ہوں۔ ہمارے دین دار حلقہ کو یہ بات اچھی طرح سمجھنی چاہیے کہ دین مسلک سے بڑا ہے اور دینی وملی مفاد کسی بھی شخصی اور گروہی مفاد سے اوپر ہے۔ جب دین اور شعائر دین پر آفت آئی ہوئی ہے وہاں فروعی معاملات ومسائل پر آپس میں سر پھٹول کرنا کہاں کی دینداری اور دانائی ہے۔ ہمارے اس خطہ میں بالعموم فقہی اعتبار سے حنفی اور اہل حدیث مسلمان ہیں۔ دیوبندی اور بریلوی فقہی اعتبار سے حنفی مسلک کے ہی ماننے والے ہیں۔ یہ سارا جھگڑا چند جملوں اور چند عبارتوں کا ہے جس کے بارے میں دونوں طرف کے لوگوں کی رائے یہ ہے کہ صحیح نہیں ہیں۔ اس بات کو اتنا طول دے دیا گیا کہ سارا کام چھوڑ کر ایک دوسرے کے خلاف لٹھ لے کر دوڑ پڑتے ہیں۔ اولاً تو جن لوگوں سے یہ جملے منسوب ہیں ان کو نظر انداز کر کے آگے بڑھنا چاہیے اور اصول دین کی تعلیم پر زور دینا چاہیے۔ اگر آپ کسی سے مفاہمت کے لیے آمادہ نہ ہوں تو اپنے مسلک پر قائم رہیے مگر انتشار نہ پیدا کیجئے۔ مدارس اسلامیہ کے تعلیمی نظام اور مزاج میں یہ اصلاح ضروری ہے ورنہ ان کی ساری افادیت ختم ہو جائے گی۔ لہٰذا میں تمام مسلک کے علماء کرام سے گذارش کرتا ہوں کہ خدا کے واسطے تریاق کو زہر نہ بنایئے اگر تریاق زہر ہو گیا تو لوگ شفایابی کے لیے کہاں جائیں گے؟

اصلاح کا دوسرا میدان یہ ہے کہ مدارس میں بالعموم کتابی تعلیم ہوتی ہے۔ وہاں لکھنے پر زور نہیں دیا جاتا ہے۔ مدارس کا معیار تعلیم بالعموم اچھا نہیں ہے۔ وہاں امتحان لینے اور سند دینے کا نظام اور طور طریقے پرانے ہیں۔ ان میں اصلاح کی ضرورت محسوس ہوتی ہے تاکہ

مدارس کے فارغین میں یکسانیت پیدا ہوسکے۔ مشورے سے اس کا ایک ضابطہ طے کرلیں تو ان کا معیار بلند ہوسکتا ہے۔ ہر مدرسے میں ایک اچھا کتب خانہ ہونا چاہیے اور وہاں بچوں کو ہر طرح کی کتابیں پڑھنے کی آزادی دی جانی چاہیے۔

مدارس اسلامیہ میں عربی اور فارسی کی تعلیم بحیثیت زبان کے اچھی طرح نہیں دی جاتی ہے۔ مدارس میں ذریعۂ تعلیم تو اردو ہے مگر اردو زبان و ادب کی تعلیم کا کوئی نظم نہیں ہے۔ اس لیے مولویانہ اردو اس اردو سے مختلف ہے جو عام طور پر لوگ بولتے اور لکھتے ہیں۔ میرے خیال میں اردو زبان کی بقا اور حفاظت کے لیے صحیح اردو لکھنے اور بولنے پر قدرت پیدا کرنے کے لیے مدارس کے نصاب میں اردو زبان کی تعلیم ایک خوش گوار اضافہ مانا جائے گا۔

میں اس بات کا قائل ہوں کہ مدارس کو مدارس رہنے دیا جائے انھیں اسکول نہ بنایا جائے۔ ٹیکنیکل اور روزگار کی تعلیم اگر دینی بھی ہے تو مدارس کے فارغین کو دی جائے۔ مدارس کا جو مقصد ہے اسے تحلیل ہونے سے بچانا ضروری ہے۔ لیکن وقت اور زمانے سے بالکل آنکھ بند کرکے جینا بھی سہی نہیں ہے اس لیے تدریجی طور پر مدارس کے نصاب میں اردو، ہندی، انگریزی، حساب اور معلومات عامہ کو شامل کیا جانا چاہیے تاکہ مدارس کے بچے دنیا کو براہ راست اپنی آنکھ سے پڑھ اور سمجھ سکیں اور اپنی دینی و علمی ذمہ داری بحسن وخوبی انجام دے سکیں۔

اللہ کے فضل سے ہمارے پاس دیندار دانش وروں کی ایک اچھی جماعت موجود ہے ان کو ان مدارس سے جڑنا چاہیے اور ان کی ضرورتوں کی کفالت کے ساتھ ساتھ ان کے نظم کو بہتر اور مفید بنانے میں مدد دینی چاہیے۔

مدارس اسلامیہ محض ادارے نہیں ہیں بلکہ یہ دین کی حفاظت کے محفوظ قلعے ہیں۔ اس قلعہ کی حفاظت اور مضبوطی ہمارا دینی و ملی فریضہ ہے۔ لہٰذا ہندوستان میں مسلمانوں کی حفاظت وبقا کی کوئی اسکیم بناتے وقت مدارس اسلامیہ کے رول اور اہمیت کے پیش نظر اس کو وسیع اور مستحکم کرنے کے کام کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ بلکہ مدارس اسلامیہ کا استحکام دینی و ملی استحکام کا بنیادی پتھر ہے۔ اس کی اس اہمیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس کی ہر ممکن مدد کے لیے افراد ملت کو

آگے آنا چاہیے۔

ہر بڑے مدرسے میں جو خود کو دارالعلوم ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں وہاں اختصاص اور تحقیق کا شعبہ ہونا چاہیے جہاں اعلیٰ تعلیم دی جائے نیز باصلاحیت نوجوان علماء کو تحقیق وتصنیف کی طرف راغب کرنا چاہیے۔ مدارس میں آزادانہ اظہار خیال کا ماحول بنانا چاہیے نیز بحث و مباحثہ کی کھلی فضا میسر کرانا چاہیے۔ اختلاف رائے کی اجازت دینی چاہیے۔فتویٰ کی زبان استعمال کرنے کے بجائے افہام وتفہیم کا ایسا ماحول بنانا چاہیے جہاں کھل کر سوال پوچھا جا سکے اور جن سوالوں کے جوابات بروقت میسر نہ ہوں ان پر مزید تحقیق کی جا سکے۔ اپنے بڑے اور بزرگوں سے اختلاف رائے رکھنا بے ادبی، بدتمیزی اور بے دینی نہیں ہے۔ ان باتوں کا بھونڈے اور غیر علمی انداز میں اظہار کرنا بدتمیزی ااور ناشائستگی ہے۔ لہٰذا ان دونوں کے فرق کو سمجھ کر ہمیں ایک ایسا طرز عمل اور ایسا ماحول بنانا چاہیے جہاں علمی تحقیق کی حوصلہ افزائی ہو اور مدارس اسلامیہ عصری معاملات ومسائل پر اہل ایمان کی علمی رہنمائی کرنے کی اہل ہوں۔ اس وقت ملت میں جو فکری انتشار ہے وہ اسی وجہ سے ہے کہ لوگوں کو جدید حالات اور مسائل کی باب میں واضح دینی رہنمائی اور متبادل نظم نہیں مل پاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ پوری ملت شتر بے مہار بنی ہوئی ہے اور لوگ زبردست ذہنی خلجان میں مبتلا ہیں۔

ایک دوسری بات قابل غور ہے۔ ہم ہندوستان میں رہتے ہیں ہندوستان کے مشترکہ سماج میں بہت سے معاملات ومسائل ایسے ہیں جو یہاں کی اکثریت اور اقلیت دونوں کو یکساں متاثر کرتی ہیں اور ان کے لیے یکساں اہمیت کی حامل ہیں۔ بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو ایک دوسرے سے ٹکراتی ہیں جس کی وجہ سے اختلاف ونزاع کی فضا بنتی ہے۔ یہاں کی غیر مسلم آبادی ایک جہالت کی وجہ سے اور دوسرے غلط معلومات کی وجہ سے اسلام اور مسلمانوں سے نہ صرف دینی اور نفسیاتی طور پر الگ ہے بلکہ جا بجا سماجی تصادم اور فرقہ وارانہ کش مکش بھی پیدا ہوتی ہے۔ سیاسی لوگ اپنے مفاد کی خاطر دونوں قوموں کو لڑا کر اپنا الو سیدھا کرتے ہیں اور انہیں نفرت وتشدد کی کبھی نہ بجھنے والی آگ میں جھونک دیتے ہیں اس صورت میں مدارس اسلامیہ

کوایک مثبت رول ادا کرنا ہے۔ ان کے یہاں جواعلیٰ تعلیم ،اختصاص اورتحقیق وتصنیف کا شعبہ قائم ہو وہاں ہندوستان، ہندوستانی سماج، یہاں کی تاریخ ،تہذیب، تمدن، عقائد، سماجی معاملات، سیاسی اوراقتصادی صورت حال یہاں کی زبانوں پرمطالعہ اورتحقیق کاایک شعبہ ضرور قائم ہوناچاہیے جہاں اعلیٰ تحقیق معیاری معروضی مطالعات جدید زبان اور انداز میں سامنے آئیں تاکہ یہاں کے سماج اور ماحول کوسمجھنے کی صلاحیت پیدا ہوسکے نیز ان حالات ومعاملات میں کیسے اپنے دین ودعوت کو پیش کرنا چاہیے تاکہ لوگوں کی غلط فہمی دور ہواوروہ اسلام اور مسلمانوں کوصحیح تناظر میں سمجھنے کے اہل ہوں۔ اس کام کومدارس اسلامیہ کوکرنا چاہیے اوراپنے نصاب اور ماحول میں وسعت پیدا کرنی چاہیے۔

مدارس اسلامیہ میں اصلاح کاایک باب یہ بھی ہے کہ بچوں کو خاک بازی نہیں بلکہ خاک ساری کی تعلیم دینی چاہیے ۔بچوں میں عزت نفس اورخودداری پیدا کرنا ایک باوقار قوم کے لیے ضروری ہے ۔اکثر مدارس کی عمارت اچھی ہوتی ہے مگران کے ہوسٹل کانظم اچھا نہیں ہوتا۔ بچوں کوڈھنگ کے بستر میسرنہیں ہوتے اور کھانے کانظم اچھانہیں ہوتا۔ان کی صحت و صفائی پردھیان نہیں دیا جاتا۔ بیت الخلا، پیشاب خانہ، مطبخ اورآس پاس کا ماحول بہت گندا ہوتا ہے۔ بے ڈھنگا پن اور بے ترتیبی عام ہے۔لوگ پاک رہنا کافی سمجھتے ہیں صاف رہنا ضروری نہیں سمجھتے۔ جب کہ ہمیں پاکی اورصفائی دونوں کااہتمام کرنا چاہیے۔ بچوں کی صحت کی جانچ کراتے رہنا چاہیے۔ اساتذہ بھی غیرصحت مند لائف اسٹائیل کی وجہ سے اکثر بیمار رہتے ہیں اورمختلف امراض کے شکار ہوجاتے ہیں ۔فربہی، موٹاپا، پیٹ کا نکلنا یہ صحت کی نہیں بیماری کی علامت ہے۔لہٰذا مدارس کے ماحول اوراس کے نظام کوصحت مند بنانے کی ضرورت ہے یقیناً اس میں خرچ زیادہ آئے گا۔مگر جب سارے اخراجات قوم پورا کرتی ہےتو اس خرچ کوبھی قوم برداشت کرے گی۔ اس لیے آپ کوایک معیاری نظم بنانے کا اہتمام کرنا چاہیے۔ اللہ کوکمزور مومن کے مقابلے جسمانی طور پرمضبوط مومن زیادہ پسند ہیں تومدارس کواس کے مطابق خودکوتیار کرنا چاہیے تاکہ قوم کے سامنے ایک اچھا آئیڈیل پیش ہواورایک مثبت پیغام پہنچے۔

مدارس جس طرح کی تعلیم عام کرنے کی جدو جہد کررہے ہیں۔اگر مسلکی شدت پسندی کوکم کرنے اورایک دوسرے کو برداشت کرنے کی شعوری کوشش کریں تو ملت اسلامیہ ہند کوموجودہ قعر مذلت سے نکالا جاسکتا ہے اورانہیں ایک باشعور دینی ملت کے ساتھ ساتھ سیسہ پلائی دیوار بنایا جاسکتا ہے۔ کیاہمارے مدارس یہ رول ادا کرنے کو تیار ہیں؟ ہندوستان میں مسلمان ملت کا مستقبل بہت کچھ اس سوال کے مثبت جواب پر منحصر کرتا ہے۔

■❖■

صدائے بازگشت

تصویرِ وطن

یہ کتاب 2019 کے لوک سبھا کے نتائج آنے کے فوراً بعد مرتب ہوکر پریس میں جاچکی تھی لہٰذا اس کے بعد کی صورتحال پر کوئی تفصیلی گفتگو نہیں کی گئی۔ مگر جن اندیشوں اور خطرات کا اندازہ تھا وہ اس کتاب کے بین السطور میں موجود ہیں۔ الیکشن کے بعد اعلان کیا گیا کہ سب کا ساتھ اور سب کا وکاس اور سب کا وشواس جس میں خاص طور سے مسلمانوں کو بھی اعتماد میں لے کر آگے بڑھنے کی بات کی گئی تھی۔ تھوڑی دیر کے لیے ایسا لگا کہ گورننس کی ذمہ داری کے تحت حکومت راج دھرم نبھانے کے لیے آمادہ ہے۔ مگر جلد ہی حکومت نے سی اے اے اور پرسنل لا میں مداخلت اور آرٹیکل 370 کو ہٹانے کا فیصلہ لیا اور ان معاملات میں تمام جمہوری اقدار کو طاق پر رکھ کر متعلقہ پارٹیوں سے بات کرنے سے انکار کر دیا اس سے ظاہر ہو گیا کہ حکومت جمہوری اکثریت کے بجائے اکثریتی جمہوریت جس کو انگریزی میں Majoritarianism کہتے ہیں، اس میں یقین رکھتی ہے اور مطلق العنان طریقے سے یعنی Autocratic ڈھنگ سے حکومت چلانے کا فیصلہ کر چکی ہے۔ خاص طور سے اقلیتوں بالخصوص مسلمان اقلیت کو نظر انداز کر کے اور اس کو چھوڑ کر آگے بڑھنا چاہتی ہے۔ جس کا حالیہ اظہار کھل کر یوپی کے الیکشن میں ہوا جس میں یہ کہا گیا کہ یہ الیکشن اسی بنام بیس کا ہے۔ گویا 20% مسلم

آبادی کو درکنار کر80% آبادی کوکل ہندوستان مان لیا گیا اور اسی انداز سے حکمرانی کا ماڈل ترتیب دیا گیا جس میں مسلمانوں کے ساتھ غیر دستوری، غیر قانونی اور غیر جمہوری طریقے سے برتاؤ کرنے کوحکمرانی کا نیا انداز بتایا گیا، جس کو اکثریت کی خاموش حمایت حاصل ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ بھارت میں لاء اینڈ آرڈر کی مشنری فیل ہوچکی ہے۔ حکومت کا کرمنل لاء اور اس کے نفاذ کے عمل سے اعتماد اٹھ چکا ہے۔ لہٰذا وہ جوڈیشیل اور لیگل میتھڈ کے بجائے اکسٹرا جوڈیشیل لیگل میتھڈ میں یقین رکھتی ہے اور عوام کو ڈرا اور دبا کر رکھنا چاہتی ہے اس طرح اس نے قانون کے راج کے بجائے دہشت کا راج قائم کر رکھا ہے۔ جو لوگ حکومت کی حمایت نہیں کرتے یا اس کی مخالفت کرتے ہیں انہیں سیدھے طور پر ملک دشمن گھوشت کرکے ان کے خلاف NSA، UAPA اور اسی طرح کے دہشت گردانہ قانون لگا کر ان کو گرفتار کیا جاتا ہے، جس میں بغیر جرم ثابت کیے ان کو برسوں جیل کی سلاخوں کے پیچھے رکھا جاسکتا ہے، جہاں ان کی ضمانت بھی نہیں ہوتی۔ اور اب جنگل راج کے طرز پر معمولی معمولی جرم پر بغیر دلیل بغیر اپیل، بغیر وکیل کے بلڈوزر چلانے کا رواج چل پڑا ہے۔ جس میں مسلمانوں کو خاص طور پر نشانہ بنایا جارہا ہے۔ ہمارے یہاں عدالتی کارروائی اتنی دیر طلب ہے کہ جب تک معاملہ عدالت میں جاتا ہے تب تک توڑ پھوڑ کی کارروائی پوری ہوچکی ہوتی ہے بلکہ عدالتِ عظمیٰ کی طرف سے روک لگانے کے باوجود گھنٹوں اس پر عمل نہیں ہوتا۔ یہ نیا ہندوستان ہے جہاں حکمرانوں کے لیے الگ قانون ہے اور مسلمانوں کے لیے الگ۔

کیرالہ کے گورنر عارف محمد خاں نے ایک انٹرویو میں تین طلاق اور CAA پر ہونے والے احتجاج پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ یہ راجیو گاندھی کی طرح کمزور حکومت نہیں ہے جو اپنے فیصلے واپس لے لیتی ہے۔ اس حکومت نے جو فیصلہ لے لیا ہے اس کو کسی حال میں نہ واپس لیا جائے گا نہ اس میں کوئی تبدیلی کی جائے گی۔ مگر یہی حکومت جب تین کسان قانون لاتی ہے اور کسانوں نے اس پر زبردست احتجاج کیا اور حکومت کو اپنی کرسی کھسکتی نظر آئی تو نہ صرف ان قانونوں کو واپس لیا بلکہ ان سے معافی بھی مانگی۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ حکومت

جانتی ہے کہ اس وقت مسلمان کمزور ہیں اور ان کی حمایت میں اٹھنے والی آواز بہت دھیمی ہے اس لیے ان کے ساتھ جتنی سختی برتی جائے گی اتنا ہی ملک کا ایک طبقہ خوش ہوگا اور اس کا فائدہ اس کو ووٹ کی شکل میں ملے گا۔ اس لیے اس وقت حکومت کی USP وکاس نہیں بلکہ مسلم دشمنی ہے جس کو وہ Anti-Appeasement کا نام دیتی ہے۔ یہ ایسا آزمودہ نسخہ ہے جو آسام سے لے کر گجرات، مہاراشٹر، یوپی، ہریانہ، ہماچل، اتراکھنڈ اور ملک کی تمام دیگر ریاستوں میں کامیابی دلا رہا ہے۔ اس لیے جہاں کوئی مسلمان اینگل نہیں بھی ہے وہاں کوئی نہ کوئی ایسا اینگل نکالنے کی کوشش کی جاتی ہے تاکہ وہ الیکشن جیت سکے۔ مسلمان اس وقت وہ بلی کا بکرا ہے جس کو قربان کرکے ووٹ حاصل کیا جاسکتا ہے۔ کرناٹک میں حجاب، ذبیحہ کے خلاف مہم اور اذان پر پابندی اس کی واضح مثال ہے۔

اس وقت اقتدار کی جنگ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نہیں ہے۔ بلکہ ہندوؤں کی ہی مختلف پارٹیوں کے درمیان ہے یا پھر ہندوؤں میں فارورڈ، بیک ورڈ اور دلتوں کے درمیان ہے۔ کسی ملک گیر پارٹی کی قیادت کوئی مسلمان نہیں کرتا ہے۔ 95% کنسٹی چیونسی میں کوئی مسلمان کینڈی ڈیٹ بھی نہیں ہوتا پھر بھی سارا الیکشن ہندو مسلمان کے نام پر لڑا جاتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ پارٹیاں جو خود کو سیکولر اور اینٹی بی جے پی ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کا ووٹ لیتی ہیں وہ بھی مسلمانوں کی حمایت میں کھڑی نہیں ہوتیں اور ان کی حکومت میں بھی مسلمانوں کی حالت میں کوئی بہتری نہیں آتی۔ بی جے پی کو شکایت ہے کہ مسلمان اس کو ووٹ نہیں دیتے۔ بی جے پی جن لوگوں کا ووٹ لیتی ہے یا لینا چاہتی ہے ان کے ساتھ اس کا جو رویہ ہے اور جس طرح وہ ان سے اپروچ کرتی ہے ان کے مسائل کو سنتی ہے، اس کو حل کرنے کی کوشش کرتی ہے، اگر وہ مسلمانوں کے ساتھ اسی طرح پیش آئے تو مسلمان اس کو بھی ووٹ دیں گے۔ لیکن بی جے پی ایسا نہیں کرسکتی۔ یہ اس کے ہندو راشٹریہ کے تصور کے خلاف ہے۔ اس لیے وہ مسلمانوں کو ڈرا کر ان کا ووٹ حاصل کرنا چاہتی ہے۔ ظاہر سی بات ہے کہ کسی جمہوری عمل میں یہ حکمت عملی جمہوری تصور کے بالکل مخالف ہے۔ بی

جے پی کو یقین ہے کہ مسلمان دوستی کے مقابلے مسلم دشمنی سے اس کو زیادہ ووٹ ملیں گے کیونکہ بیسک ہندو سائکی اندر سے مسلمان مخالف ہے۔ لہٰذا وہ اس نفسیات کا استحصال کر کے اقتدار میں آئی ہے اور وہ اپنے اس موقف پر پوری طرح قائم ہے۔ آپ کو اس کی پوری تاریخ اور طرزِ فکر میں اس کی جھلک دیکھنے کو ملے گی اور اب تو کھلے عام اس کے ترجمان نیشنل ٹی وی پر برملا مسلم مخالف خیالات کا پوری جارحیت اور ڈھٹائی کے ساتھ اظہار کرتے نظر آتے ہیں۔ جس کا مطلب ہے کہ ان کی لیڈر شپ نے ان کو وہی موقف اور لب و لہجہ اختیار کرنے کا مشورہ دیا ہے اور اب تو بیشتر ٹی وی اینکر بھی اپنی نظریاتی وابستگی کی وجہ سے یا زیادہ سے زیادہ اشتہار حاصل کرنے کی لالچ میں بی جے پی ترجمان کی طرح بلکہ ان سے زیادہ سخت لب و لہجے بلکہ گالی گلوج کی زبان میں بات کرنے لگے ہیں۔

تمام مسلمان تنظیموں اور ان کے ذمہ داروں نے اس طرح کی ٹی وی مباحثہ سے خود کو الگ رکھا ہے۔ لیکن مسلمانوں میں کچھ ایسے بھی ہیں جو اپنی مفاد کی ٹوکری اٹھائے اقتدار کے گلیاروں میں گھومتے رہتے ہیں یا جن کو چند ہزار نذرانے کے عوض ان مباحثوں میں شریک ہونے کے لیے مدعو کیا جاتا ہے۔ ان میں سے زیادہ تر وہ لوگ ہیں جو اپنے سوا کسی کی نمائندگی نہیں کرتے مگر ایک جیبی تنظیم بنا کر خود کو مسلمانوں کا نمائندہ بنا کر پیش کرتے ہیں۔ ان کا آئی کیو بہت کمزور ہے۔ ان کی زبان دانی ناقص ہے۔ ان کو ملک کی تاریخ، جغرافیہ، سماج کی بناوٹ، حالات و مسائل لوگوں کے نفسیات، ملک کے دستور اور قانون اور جمہوری روایات کا کوئی علم نہیں ہے۔ ان کو ڈبیٹ کے آداب بھی معلوم نہیں ہیں جب وہ منہ کھولتے ہیں تو اینکر اور دوسرے شرکاء ان پر ٹوٹ پڑتے ہیں اور وہ دو چار گالی سن کر اور پوری قوم کو سنا کر جیب میں پانچ دس ہزار لے کر خوشی خوشی وہاں سے لوٹ آتے ہیں اور پھر کسی اور ڈبیٹ میں موجود ہوتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ یہی ان کا ذریعہ معاش ہے۔

بہر حال اکیسویں صدی میں بھارت کو تین ہزار سال پیچھے مہابھارت کال میں لے جانے کی تیاری ہو رہی ہے جہاں بھرے دربار میں دروپدی کا چیر ہرن کیا گیا تھا اور پانڈوں کو

پانچ گاؤں بھی دینے سے انکار کرکے پوری مہابھارت کی جنگ چھیڑ دی گئی تھی۔ آج مسلمانوں کو اپنے پورے دستوری اور شہری حقوق حرف وروح کے ساتھ مانگنے پر ایک دوسری مہابھارت کی دھمکی دی جارہی ہے اور ایک ایسے ہندو راشٹریہ کا تصور پیش کیا جارہا ہے جس میں مسلمانوں کی کوئی حصہ داری نہیں ہوگی۔ بقول موہن بھاگوت اکھنڈ ہندو راشٹریہ کی گاڑی کا بریک ہٹا کر اس کو فل ایکسیلیٹر پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ لہٰذا اب اس کو روکا نہیں جاسکتا بلکہ جو اس کو روکنے کی کوشش کرے گا وہ اس کو کچلتا ہوا آگے نکل جائے گا۔ دھرم سنسد میں کھلے عام مسلمانوں کے قتل عام کا اعلان، مسلمان عورتوں کی آبروریزی کی دھمکی، اذان اور نماز پر پابندی کا شاخسانہ، ذبیحہ کے خلاف مہم بازی، حجاب پر پابندی، جلسے اور جلوس میں کھلے عام گالی گلوج اور اشتعال انگیز نعرے، مسلمانوں کے معاشی بائیکاٹ کا اعلان اور حکومت کا دنگا روکنے میں ناکامی کے بدلے حکومت کا بغیر کسی قانونی کارروائی کے بلڈوزر کے ذریعہ مسلمانوں کے گھروں، دکانوں اور تجارتی مقامات کو تباہ برباد کرنا۔ پرنٹ، الیکٹرانک اور سوشل میڈیا کے ذریعہ نفرت اور تشدد کا ماحول بنانا اور تمام بڑے دستوری عہدوں پر فائز لوگوں کی مجرمانہ خاموشی بلکہ ان کی حمایت اس بے لگام ہندو راشٹریہ کی گاڑی کا مظہر ہے جو اکیسویں صدی کی تیسری دہائی کے ہندوستان کی وہ تصویر ہے جس کا دس سال پہلے تصور بھی نہیں کیا گیا تھا۔

سنگھ پریوار کا ایجنڈا

بھارت کے ہوم منسٹر امت شاہ تلنگانہ میں اپنے حالیہ بیان میں یہ اعلان کرچکے ہیں کہ اگر بی جے پی کی حکومت بنی تو مسلمانوں کو تعلیم اور روزگار میں ملنے والا ریزرویشن ختم کردیں گے، جو بی جے پی کی جارحانہ مسلم دشمنی کی غماز ہے۔ جہاں ایک طرف ملک کے بہت سے طبقات کو ریزرویشن کے دائرے میں لایا جارہا ہے یہاں تک کہ اعلیٰ ذات کے غریب ہندوؤں کو دس فیصد ریزرویشن دیا گیا ہے وہاں مسلمانوں کو حاصل شدہ ریزرویشن سے محروم کردینے کا اعلان سنگھ کی معاندانہ پالیسی کا مظہر ہے، جس سے پتہ چلتا ہے کہ مسلمانوں کے سلسلے میں حکومت اور سنگھ کی کیا سوچ ہے اور وہ کس طرح مسلمانوں کو کمزور اور حاشیہ پر رکھنا

چاہتی ہے اور وہ کس حد تک جانے کا منصوبہ رکھتی ہے۔

یوپی کے موجودہ وزیراعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ نے اپنی متعدد انتخابی ریلیوں میں برملا یہ اظہار کیا ہے کہ وہ مسلمانوں کو اس مقام پر پہنچا دیں گے جہاں وہ ہوٹلوں میں برتن مانجنے اور دیگر چھوٹے کام کے علاوہ کوئی اور روزگار نہیں کر سکیں گے۔ ہر ظالم حکمراں کا یہ دستور رہا ہے کہ وہ عزت دار لوگوں کو ذلیل کرتا ہے اور بے قصور اور معصوم لوگوں پر ظلم ڈھاتا ہے۔ اس وقت سنگھ پریوار اور بی جے پی کی حکومت جس ایجنڈے کے تحت کام کر رہی ہے اسے چند نکات میں اس طرح پیش کیا جا سکتا ہے:

(i) تاریخی طور پر بدنام کرنا

مسلمان عہد کی جھوٹی اور من گھڑت تاریخ بنا کر اس طرح پیش کرنا گویا مسلمانوں نے اپنے عہد حکومت میں ہندوؤں پر بے پناہ مظالم ڈھائے تھے۔ لہٰذا اب وقت آ گیا ہے کہ تاریخ کا حساب چکتا کر لیا جائے۔ تاریخ کے نصاب سے پورے مسلم عہد کو حرف غلط کی طرح نکال باہر کرنا تاکہ نوجوان نسل اس عہد کی تاریخ سے بالکل نابلد رہے اور وہ میڈیا اور دوسرے ذرائع سے جو فرضی تاریخ پیش کریں لوگ آنکھ بند کر کے اس کو صحیح مان لیں اور اسی کے مطابق عمل اور ردِعمل کا اظہار کریں۔

(ii) سیاسی اپارتھائڈ کی پالیسی بنانا

مسلمانوں کے خلاف اس طرح نفرت پیدا کر دیا جائے تاکہ کوئی ہندو کسی مسلمان کو ووٹ نہ دے۔ ہندوستان میں چونکہ کومن الیکٹوریٹ ہے اس لیے بہت کم کنسٹی چیونسی ایسی ہے جہاں کوئی امیدوار محض مسلم ووٹ سے الیکشن جیت سکتا ہے۔ الیکشن جیتنے کے لیے دوسری قوموں اور برادریوں کا ووٹ ضروری ہے۔ اس طرح پورے جمہوری عمل کے باوجود مسلمانوں کی ایوان میں نمائندگی کم ہوگی۔ اس وقت ملک کی بیس ریاستی اسمبلیوں میں ایک بھی مسلمان منسٹر نہیں ہے۔ ظاہر ہے جب سیاسی نمائندگی نہیں ہوگی تو حکومت میں بھی ان کی نمائندگی نہیں ہوگی۔ اس طرح بیس بائیس کروڑ کی ملت سیاسی طور

پر حاشیہ پر ہوگی جس کی کوئی آواز نہیں ہوگی۔ اس صورت میں حکومت جو چاہے گی اور جیسا قانون بنانا چاہے گی بلا روک ٹوک بنا سکتی ہے اور اس کو نافذ بھی کر سکتی ہے۔

جب ان سے یہ سوال کیا جاتا ہے کہ آپ مسلمانوں کو ٹکٹ کیوں نہیں دیتے۔ تو وہ کہتے ہیں کہ ہم جیتنے کے امکان کی بنیاد پر ٹکٹ دیتے ہیں۔ چونکہ مسلمان جیت نہیں سکتے، اس لیے ان کو ٹکٹ نہیں دیا جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا جن لوگوں کو ٹکٹ دیا جاتا ہے وہ سب کے سب جیت جاتے ہیں۔ ایک ہے جیتنا دوسرا ہے جتانے کی کوشش کرنا۔ اگر بھارتیہ جنتا پارٹی مسلمانوں کو ٹکٹ دے اور اس کو اسی طرح جتانے کی کوشش کرے جس طرح دوسرے امیدواروں کو جتانے کی کوشش کی جاتی ہے اور ہندوؤں کا ووٹ بھی مسلمان امیدوار کو دلائے تو یہ صورتحال بدل سکتی ہے۔ مگر ایسا کرنا اس کے نظریات کے خلاف ہے اس لیے وہ اس طرح کی دلیل پیش کر کے اپنی مجرمانہ ذہنیت پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتی ہے۔ اس وقت صورتحال یہ ہے کہ ملک کی جو نام نہاد سیکولر پارٹیاں ہیں وہ بھی مسلمانوں کو پوری نمائندگی نہیں دیتیں کیونکہ وہ اپنی ذات اور کیڈر کا ووٹ بھی مسلمان امیدوار کو ٹرانسفر کرنے میں ناکام ہوتی ہیں۔ اس طرح مسلمان سیاسی طور پر امتیازی سلوک کے شکار ہیں۔ ہر پارٹی یہ چاہتی ہے کہ مسلمان کا ووٹ اس کو ملے، مگر مسلمان کو اپنا ووٹ ٹرانسفر کرنے میں اس کا بخل اور ذہنی تحفظات کھل کر سامنے آجاتے ہیں۔

(iii) معاشی طور پر کمزور کرنا

مسلمان اس وقت معاشی طور پر ملک کی سب سے پسماندہ ترین سماجی اکائی ہیں۔ 95% فیصد مسلمان روز کے مزدور ہیں جو ماہانہ تین ہزار سے دس ہزار تک کی کمائی کرتے ہیں۔ مسلمانوں کی آدھی سے زیادہ آبادی خطِ غربت سے نیچے ہے۔ ہر حکومت غریب لوگوں سے وعدہ کرتی ہے کہ وہ ان کی معاشی حالت سدھارے گی جبکہ ایک چیف منسٹر کھلے عام یہ کہتا ہے کہ ان کی معاشی حالت اور خراب کی جائے گی۔ ذبیحہ کے خلاف مہم اور مسلمانوں کا معاشی بائیکاٹ کرنے کا اعلان اسی کا شاخسانہ ہے۔ فسادات میں فسادیوں کے ذریعے خاص طور پر

معاشی تنصیبات کو بالخصوص دوکان، مکان وغیرہ کونشانہ بنایا جاتا ہے اور جو کسر باقی رہ جاتی ہے اب سرکاری طور پر بلڈوزر چلا کر پورا کیا جارہا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو معاشی طور پر پسماندہ کرنے اور پسماندہ رکھنے کی ایک خاص حکمتِ عملی وضع کی گئی ہے جس پر پوری تندہی سے کام ہورہا ہے۔

(iv) سماجی طور الگ تھلگ کرنا

سنگھ پریوار کی مسلسل کوشش یہ رہتی ہے کہ سماجی طور پر ہندوؤں اور مسلمانوں کے بیچ کی کھائی کو مسلسل گہرا اور چوڑا کیا جائے تا کہ دونوں قومیں ایک دوسرے کی حلیف نہیں حریف بن کر ایک دوسرے کے سامنے کھڑی رہیں اور دونوں طرف نفرت، تعصب اور بدگمانی کا بازار گرم رہے۔ مسلمانوں کی بڑھتی آبادی کا ڈر، دھرم پریورتن کا شاخسانہ اور لو جہاد جیسی باتیں کر کے اکثریت کے ذہنوں میں مسلسل زہر گھولا جارہا ہے اور ان سے دوری بنا کر رکھنے کی تلقین کی جاتی ہے۔ جب سماجی طور پر دوری بڑھے گی تو ایک دوسرے کو بھڑکانا اور لڑانا آسان ہوجائے گا۔ شہروں میں لوگ ایسے ہی ایک دوسرے سے الگ تھلگ رہتے ہیں۔ پڑوسی پڑوسی کو نہیں جانتا پہچانتا ہے۔ لہٰذا وہاں بڑی آسانی سے بدگمانی پھیلائی جاسکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زیادہ تر دنگے شہروں میں ہوتے ہیں۔ اب دھیرے دھیرے یہ وبا گاؤں میں بھی پھیلتی جارہی ہے اور لوگ ملی جلی آبادی میں رہنے کے بجائے حفاظت کے پیشِ نظر گھیٹوز میں الگ تھلگ رہنا پسند کرتے ہیں۔ ہر مذہب، برادری اور ذات کی الگ الگ کالونی بن گئی ہے اور ان کے درمیان رابطہ نہ کے برابر ہے۔ اس طرح سماجی طور پر الگ تھلگ رہنے سے سماجی بندھن کمزور ہورہا ہے جو ایک خطرناک صورتحال کو جنم دے رہی ہے۔

(v) مسلم تہذیبی شناخت اور ثقافتی آثار کو دھندلا کرنے اور مٹانے کی کوشش

بھارت ایک ایسا ملک ہے جہاں قدم قدم پر مسلمانوں کے تہذیبی نشانات موجود ہیں۔ اس ملک میں سیکڑوں شہر، ہزاروں گاؤں، اسی طرح ہزاروں سڑکیں، ہزاروں محلے، ہزاروں ادارے، سیکڑوں ریلوے اسٹیشن اور اسکول، کالج، یونیورسٹیوں کے نام مسلمانوں کے

نام پر ہیں۔ علی گڑھ ایک چھوٹا سا شہر ہے جو مسلم یونیورسٹی کی وجہ سے ساری دنیا میں مشہور ہے اور اس کے فارغین ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ دیوبند خالص دیومالائی نام ہے مگر دارالعلوم دیوبند کی وجہ سے ساری دنیا میں جانا جاتا ہے۔ جس طرح مصر کا جامع ازہر ساری دنیا میں مشہور ہے اسی طرح دیوبند ساری دنیا میں مشہور ہے اور یہاں کے فارغین یورپ، امریکہ سمیت دنیا کے ہر خطے اور حصے میں موجود ہیں۔ اسی طرح بریلی کی شہرت بھی امام احمد رضا خاں رحمۃ اللہ علیہ کی وجہ سے ہے اور ان کے متعلقین بھی کم وبیش سب جگہ پائے جاتے ہیں۔ گویا یہ ادارے صرف ملک میں ہی نہیں بلکہ ساری دنیا میں اسلام اور مسلمان کی پہچان مانے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ساری دنیا کے مسلمان بھارت کو ایک اہم اسلامی مرکز کی طرح دیکھتے ہیں۔ بھارت کا عرب ملکوں میں اور دیگر مسلم ممالک میں جو اعتبار ہے اور اس کے تئیں جو نرم گوشہ پایا جاتا ہے اس کی وجہ یہی وہ آثار ہیں جس کی وجہ سے بھارت مسلمان ملک نہیں ہونے کے باوجود OIC میں مشاہد کا درجہ رکھتا ہے اور اس کی رکنیت کا دعویدار ہے۔ لیبیا میں کرنل قذافی کے عہد میں ایک بڑے پروجیکٹ کا ٹھیکہ دیا جانا تھا۔ پاکستان سمیت دنیا بھر کے بہت سے ممالک اس کے دعویدار تھے۔ جارج فرنانڈیز اس وقت بھارت کے وزیر صنعت تھے۔ ان سے جب بھارت کی دعویداری پوچھی گئی تو انھوں نے کہا کہ ہمارے پاس اس ٹھیکے کے 18 کروڑ وجوہ ہیں۔ قذافی نے پوچھا کیسے تو جارج نے جواب دیا بھارت میں اٹھارہ کروڑ مسلمان رہتے ہیں، اس ٹھیکے کے ملنے سے بھارت کے ہندو مسلم تعلق پر مثبت اثر پڑے گا، قذافی اس جواب سے خوش ہوا اور پاکستان کے مقابلہ وہ ٹھیکہ بھارت کو ملا۔ اس وقت 8.3 ملین یعنی پنچانوے لاکھ ہندوستانی گلف کنٹریز میں کام کرتے ہیں جس میں 36 لاکھ ہندو ہیں اور وہ سالانہ 35 بلین ڈالرز زرمبادلہ بھارت بھیجتے ہیں جو انگلینڈ، امریکہ اور دیگر یورپی ملکوں سے آنے والی رقم سے بہت زیادہ ہے۔ یہ رقوم بھارت کے معاشی استحکام میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ بھارت کی 95% تیل کی ضرورت بھی سعودی عرب اور دیگر ملکوں سے پوری ہوتی ہے۔

بھارت میں جب کوئی بیرونی سیاح آتا ہے تو سب سے پہلے وہ تاج محل، لال قلعہ،

قطب مینار، فتح پور سیکری اور ہمایوں کے مقبرے کو دیکھنے جاتا ہے۔ ملک میں جو بھی سربراہان مملکت تشریف لاتے ہیں انہیں ان مقامات کی سیر کرائی جاتی ہے۔ لال قلعہ تو آزادی کا ایسا نشان بن گیا ہے کہ وہاں آخری مغل بادشاہ پر انگریزوں نے مقدمہ چلایا، وہیں سے 1857 میں بھارت کی آزادی کا اعلان کر کے مغل بادشاہ کو ملک کا بادشاہ اعلان کیا گیا تھا۔ وہیں آزاد ہند کے فوجیوں پر مقدمہ چلا اور آزادی کے بعد وہیں سے 15 راگست 1947 کو آزاد بھارت کا جھنڈا پھیرایا گیا اور جہاں سے ہر سال وزیراعظم ملک کو خطاب کرتے ہیں۔ یہ روایت آج تک چل رہی ہے۔ یہ وہ نشانات ہیں جن کو مٹایا نہیں جاسکتا ہے۔ بھارت ایک مشترکہ تہذیب کا ملک ہے، جہاں ہندو، بودھ، جین، عیسائی، پارسی، یہودی، آدی باسی اور مسلم تہذیب وثقافت کے نشانات، باقیات، علامات، روایات بالکل زندہ اور جاوید ہیں جس کی بوقلمونی سے یہ ملک رنگ برنگے پھولوں کا گلدستہ نظر آتا ہے۔ مگر کچھ لوگ اس ملک کی اس رنگا رنگ تہذیب کو ختم کر کے سب کو یک رنگ کرنے کی ضد پر اڑے ہیں جو بھارت کے لیے نیک شگون نہیں ہے۔

اسکولی نصابوں سے ازمنہ وسطی کی تاریخ کو حذف کرنا، شہروں اور سڑکوں کے نام بدلنا، اردو زبان وثقافت کو مٹانا، اس کی ہمت شکنی کرنا، پرسنل لاء کے خلاف جدوجہد اور ملک میں یکساں سول کوڈ لانے کی کوشش، کیا کھانا اور کیا پہننا ہے اس پر پابندی، اذان اور حجاب کے خلاف مہم، کھلی جگہوں پر نماز پڑھنے پر روک، داڑھی، ٹوپی، اور مسلمانوں کے کرتا پائجامہ پر طنز، مسلمانوں کو دہشت گرد ثابت کرنے کی کوشش، جہاد کی غلط تشریح وتعبیر، تبلیغی جماعت پر کووڈ پھیلانے کا جھوٹا الزام اور ان کے لوگوں کو جیلوں میں بند کرنے اور پریشان کرنے کی سازش مسلمان نوجوانوں کو جھوٹے مقدمات میں پھنسا کر بے قصور ان کو برسوں جیلوں میں بند رکھنا یہ سب اسی تہذیبی جارجیت کی علامت ہے جو کھلے عام کی جارہی ہے۔

ہم اس وقت ایک کھلے سماج میں رہتے ہیں۔ ہر سماجی اکائی کے لڑکے لڑکیاں مخلوط تعلیمی اداروں میں پڑھتے ہیں اور مخلوط اداروں میں کام کرتے ہیں۔ سنگھ پریوار نے یہ بات زور وشور سے پھیلا رکھی ہے کہ کوئی شخص بغیر زور زبردستی کے مسلمان ہو ہی نہیں سکتا ہے۔ ان

کے نزدیک اسلام میں کوئی خوبی نہیں ہے یہ تو ظالموں اور لٹیروں کا دھرم ہے۔ لٰہذا کوئی اس کی طرف کیسے جا سکتا ہے؟! وہ مانتے ہیں کہ بھارت میں جو بھی مسلمان ہیں ان کے باپ دادا پر اتنا ظلم ہوا کہ وہ ڈر کر مسلمان ہو گئے تھے اس لیے اب وہ مسلمانوں سے کہہ رہے ہیں کہ اب وہ دور اور وہ ساشن ختم ہو گیا اس لیے وہ بنا ڈرے گھر واپسی کر سکتے ہیں۔ ظاہر سی بات ہے یہ اتنی بھونڈی بات ہے کہ مسلمان اس کا کوئی جواب دینا ضروری نہیں سمجھتے۔ سنگھ پریوار کے داعیوں کے پاؤں تلے سے اس وقت زمین کھسکتی نظر آتی ہے جب وہ دیکھتے ہیں کہ دو چار کی تعداد میں ہی سہی تمام حکومتی پابندیوں کے بعد بھی کچھ لوگ اسلام قبول کر رہے ہیں۔ یہ ٹرینڈ یوروپ اور امریکہ میں بھی ہے اور ہندوستان میں بھی۔ اب وہ وحشت زدہ ہو کر تمام دستوری ضمانتوں کو بالائے طاق رکھ کر اپنے زیر انتظام ریاستوں میں دھڑا دھڑ اینٹی کنورسن لاء لا رہی ہیں اور اس کو ایک غیر ضمانتی جرم کے طور پر دیکھتی ہیں۔ ان کو لگتا ہے کہ یہ سب یا تو پیسے کی لالچ میں کیا جا رہا ہے، یا پھر یہ محبت کا چکر ہے، جس میں نوجوان لڑکے لڑکیاں گرفتار ہو کر دھرم پری ورتن کر رہے ہیں۔ اسلام کی رو سے کسی مشرک مرد و عورت سے شادی کرنا حرام ہے۔ لٰہذا کوئی دیندار مسلمان لڑکا یا لڑکی کسی غیر مسلم مرد یا عورت سے شادی کرنے کے بارے میں سوچ ہی نہیں سکتا ہے۔ اسلام کھلے اور چھپے طور پر عشق کرنے کی اجازت بھی نہیں دیتا۔ لٰہذا اگر کوئی مسلمان لڑکا کسی غیر مسلم لڑکی سے عشق کرتا ہے تو 90% امکان اس بات کا ہے کہ اس کو نشو ونما اور پرورش کسی اسلامی ماحول میں نہیں ہوئی ہے اور اسلام سے اس کا واجبی تعلق بھی نہیں ہے۔ ہاں وہ مسلمان گھرانے میں پیدا ہو گیا ہے اور مسلمانوں جیسا نام رکھتا ہے۔ وہ اسلام کے اصول وعقائد پر یا تو ایمان نہیں رکھتا یا اس کی پرواہ نہیں کرتا۔ مگر اس طرح کے واقعات کو لو جہاد کا نام دیا گیا ہے گویا یہ مسلمانوں کی طرف سے ایک سوچی سمجھی سازش ہے کہ بھولی بھالی ہندو لڑکیوں کو پیار کے جال میں پھنسا کر ان سے شادی کر لی جائے اور پھر ان کو مسلمان بنا لیا جائے۔ میرے پاس اس طرح کا کوئی اعداد و شمار تو نہیں ہے کہ کتنے مسلمان لڑکوں نے ہندو لڑکیوں سے شادی کی ہے اور کتنی مسلمان لڑکیوں نے ہندو لڑکوں سے شادی کی ہے۔ مگر یہ ایک طرفہ عمل نہیں

ہے۔ جہاں بہت سے نام نہاد مسلمان لڑکوں نے ہندو لڑکیوں سے شادی کی ہے وہیں بہت سی مسلمان لڑکیوں نے ہندو لڑکوں سے شادی کی ہے۔ مگر اس شادی کو آج تک کسی مسلمان نے پریم یدھ کا نام نہیں دیا۔ اس طرح کی شادی کے واقعات میٹروپولیٹن شہروں میں زیادہ دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ان سب چیزوں کا بہت کچھ دار و مدار گھر کے ماحول اور بچوں کی پرورش پر ہے۔ اس کو محض آپ قانون بنا کر روک نہیں سکتے ہیں۔ اس کے لیے گھر کی تربیت پر زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ یہ کھلا پن کا وہ سائیڈ ایفکٹ ہے جس کو آپ کو تسلیم کر کے چلنا پڑے گا۔ اس کی وجہ سے بچوں کو نہ تعلیم سے محروم کیا جا سکتا ہے اور نہ تلاش روزگار میں باہر جانے سے روکا جا سکتا ہے۔

بہر حال سنگھ پریوار کی یہ کوشش ہے کہ اس ملک میں اسلامی اور مسلم ثقافت کے جو بھی نشانات اور علامتیں ہیں ان کو کھرچ کھرچ کر ایک ایک کر کے ختم کر دیا جائے۔ یہ ان کے وسیع تر ہندو راشٹر یہ کا وہ ایجنڈا ہے جس کو چھپانے کی وہ کوئی کوشش نہیں کرتے بلکہ جیسے جیسے ملک پر ان کی سیاسی پکڑ مضبوط ہوتی جارہی ہے وہ پوری بے باکی اور مضبوطی سے اس پر عمل کر رہے ہیں۔

(vi) مسلمانوں میں خوف کی نفسیات پیدا کرنا

مسلمانوں میں احساس عدم تحفظ پیدا کرنے سماجی، معاشی اور سیاسی طور پر حاشیہ پر رکھنے اور ان کو خوف زدہ رکھنے کی سیاست تو آزادی کے فوراً بعد سے شروع ہو گئی تھی اور وقت کے ساتھ یہ سیاست مضبوط ہوتی چلی گئی۔ دراصل مسلمان اس ملک کی دوسری بڑی اکثریت ہیں جن کی تعداد کم و بیش بیس کروڑ ہے اور یہ ملک کے ہر حصے اور خطے میں ہیں۔ اتنی بڑی تعداد کو نہ ختم کیا جا سکتا ہے اور نہ کسی ملک میں دھکیلا جا سکتا ہے۔ لہٰذا جو انتہا پسند قوتیں ہیں ان کی خواہش ہے کہ مسلمان کو کمزور اور ڈرا کے رکھا جائے تا کہ وہ ترقی نہ کر پائیں اور غربت، جہالت اور پسماندگی میں پڑے رہیں۔ کسی بھی ملک وقوم کو اور اس کے کسی طبقہ کو ترقی کرنے کے لیے پر امن اور خوف سے آزاد ماحول ضروری ہوتا ہے۔ جہاں ہر طرف بدامنی اور خوف کا سایہ ہوگا وہاں لوگ اپنی اور اپنے بچوں کی جان بچانے کی فکر کریں گے یا ترقی کے بارے میں سوچیں گے۔

بھارت میں فرقہ وارانہ فساد کا جو پیٹرن ہے اس میں یہ بات صاف جھلکتی ہے۔

فسادات میں جان و مال سے زیادہ نقصان نفسیاتی طور پر اپنی جڑ بنیاد سے اکھڑ جانے کا ہوتا ہے۔ لوگ اپنے پڑوسیوں سے ڈرنے لگے ہیں اور ایک دوسرے کو شک کی نگاہ سے دیکھنے لگے ہیں۔

فساد عموماً مسلم علاقے میں ہوتے ہیں۔ مذہبی جلوس کو مسلم علاقے سے لے جانے کی ضد ہوتی ہے۔ انتظامیہ کو یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اس میں شر پسندی کا عنصر غالب ہوتا ہے۔ اس کے پاس انٹلی جینس رپورٹ ہوتی ہیں۔ مگر اس کے باوجود انتظامیہ یا تو خود یا سیاسی دباؤ میں بغیر معقول بندوبست کے جلوس کو حساس علاقوں سے جانے کی اجازت دے دیتی ہے۔ جیسے ہی یہ جلوس مسلم علاقے میں داخل ہوتا ہے تمام دھارمک آچرن چھوڑ کر گالی گلوج اور اشتعال انگیز نعرے لگانے لگتا ہے اور خاص طور سے مسجدوں کے سامنے بے ہنگم ڈھنگ سے ایسی ایسی حرکتیں شروع کر دیتا ہے کہ لوگوں کے صبر و ضبط کا امتحان ہو جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ ان حرکتوں سے تنگ آ کر غصہ میں کوئی پتھر پھینک دے یا خود جلوس کے اندر ایسے لوگ ہوں جو اشتعال بازی کرنے کے بعد پتھر پھینکیں تا کہ اس کے بعد ان کو فساد کرنے، لوٹ پاٹ کرنے، مارنے کاٹنے اور مکان دکان چلانے کا جواز مل جائے۔ اس کے بعد باقی جو کارروائی ہوتی ہے وہ پولیس پوری کر دیتی ہے جس میں یکطرفہ گرفتاری اور مقدمات کے ذریعے اس علاقے کو تباہ کرنے کا پورا بلو پرنٹ تیار ہوتا ہے۔

اب تک پولیس اور انتظامیہ پر کوتاہی برتنے یا جانب داری دکھانے کا الزام لگتا رہا تھا۔ لیکن اب حکومت نے ان ساری ملمہ کاریوں کو بالائے طاق رکھ کر خود انہدام اور تباہی کا تانڈو مچانے کا کام اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے جو کام دنگائی نہیں کر سکتے ہیں اب حکومت کر رہی ہے اور وہ سیدھے بلڈوزر لے کر مسلمانوں کے گھر و مکان اور ان کے دیگر ٹھکانوں پر پہنچ کر ان کو تاراج کر دیتی ہے اور بڑے فخر سے اپنے اس کارنامے کا ذکر کرتی ہے تا کہ مسلمانوں کو معلوم ہو جائے کہ اب کوئی نام نہاد سیکولر حکومت نہیں ہے بلکہ خالص اکثریتی حکومت ہے اس لیے انھوں نے چوں بھی کی تو ان کو بلڈوزر سے کچل دیا جائے گا۔ خیریت اسی میں ہے کہ انتہا پسند گروہ جو کر رہے ہیں اور جو کہہ رہے ہیں چپ چاپ سر جھکا کر ان کو انگیز کیا جائے۔ حکومت

نے امن و قانون کی ذمہ داری سے توبہ کرلیا ہے اور اب اس ملک میں بھیڑ کا راج ہے۔ ہم سب ملی جلی آبادی میں رہتے ہیں، اس طرح کی حرکت سے آپسی بھائی چارہ کو زبردست نقصان ہوتا ہے اور باہمی اعتماد کی بحالی بہت مشکل ہو چکی ہے۔

شہری ترمیمی بل کا مقصد بھی مسلمانوں کی شہریت کو مشکوک بنا کر ان کے شہری حقوق تلف کرنا ہے۔ حکومت اگر کسی دوسرے ملک کے شخص کو شہریت دینا چاہتی ہے تو کیا موجودہ قانون اس کے لیے کافی نہیں ہے۔ اگر وہ ان ملکوں کے مسلمانوں کو شہریت نہیں دینا چاہتی ہے تو کیا کسی مسلمان نے یہ مطالبہ کیا کہ انہیں شہریت کیوں نہیں دی جارہی ہے۔ شہریت کا یہ قانون دراصل ان مسلمانوں بالخصوص غریب، اَن پڑھ اور پسماندہ مسلمانوں کو ان کے شہری حقوق سے محروم کرنے کی سازش ہے۔ کیونکہ حکومت یہ بات برسرعام کہہ چکی ہے کہ اگر ہندوؤں کے پاس اپنی شہریت ثابت کرنے کے ثبوت نہیں بھی ہوں گے تو انہیں پریشان نہیں کیا جائے گا اور ان کی شہریت نہیں جائے گی۔ اس کا مطلب ہے یہ قانون مسلمانوں کے خلاف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کو مذہبی بنیاد پر بنایا گیا ہے، ہندو، سکھ، جین، بودھ اور عیسائی ان سبھوں کو تو شہریت دے دی جائے گی مگر مسلمانوں کو نہیں دی جائے گی۔ یہ کوئی معقول تحدید نہیں ہے جس کا اختیار عموماً حکومت کو ہوتا ہے بلکہ یہ امتیازی تحدید ہے، جس کا واضح مقصد مسلمانوں کو پریشان کرنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں نے بالخصوص مسلم خواتین نے کھل کر پوری پامردی سے اس کے خلاف آواز اٹھائی۔ حکومت نے اس بل کو واپس تو نہیں لیا تاہم اس کے نفاذ میں تاخیر کررہی ہے۔ ممکن ہے 2024 کے الیکشن سے پہلے پھر ووٹرس کو پولورائز کرنے کے لیے اس مسئلہ کو چھیڑے جس کے امکانات ظاہر ہورہے ہیں۔ ہوم منسٹر نے اپنے حالیہ بیان میں اس بات کا اعادہ کیا ہے۔

مرکز میں اور متعدد ریاستوں میں بی جے پی کی سرکار بننے کے بعد گائے کے گوشت کے نام پر یا گائے کے خرید و فروخت اور اس کی تسکری کا بہانہ بنا کر وہ لوگ جو جانوروں کی خرید و فروخت کرتے ہیں ان کو گھیر کر بھیڑ نے مار دیا۔ نوئیڈا میں محمد اخلاق کو محض اس شبہ پر کہ اس کے فریج میں گائے کا گوشت ہے ایک بھیڑ نے گھر سے نکال کر بری طرح مارا یہاں تک

کہ اس کی موت ہوگئی جبکہ بعد میں فورسنک رپورٹ سے ثابت ہوا کہ وہ گائے کا نہیں خصی کا گوشت تھا۔ اس طرح کے واقعات ملک کے مختلف ریاستوں اور علاقوں میں ہوئے اور جن لوگوں نے ان واردات کو انجام دیا ان کو ہیرو بنا کر پیش کیا گیا۔ یہاں تک کہ جب ایک پولیس والے نے حالات پر قابو پانے کی کوشش کی تو بھیڑ نے اسے بھی پیٹ پیٹ کر مار ڈالا۔

ہندو بستی میں پھل اور سبزی بیچنے والے کو سبزی بیچنے سے منع کرنا اور اس کے سامان کو پھینک دینا۔ باحجاب لڑکیوں کو گھیر کر ان کو پریشان کرنا۔ مسجدوں اور مدرسوں کو دہشت گردی کی نرسری قرار دینا، مسلمان اگر سول سروسیز میں کامیاب ہوتے ہیں تو ان کو خطرے کی نظر سے دیکھنا اور ان کی پوسٹنگ میں امتیاز برتنا۔ غرض خوف کا ایک پورا ایکو سسٹم ہے جس میں مسلمانوں کے لیے آگے بڑھنے کے امکان بہت کم ہیں۔

دراصل اس وقت ملک میں جو فسطائی قوتیں سیاہ سفید کی مالک ہیں وہ ایک سوچی سمجھی اسکیم کے تحت ملک کو خانہ جنگی میں دھکیلنا چاہتی ہیں کیونکہ ان کو یقین ہے کہ اس معرکہ میں آخری جیت انہی کی ہوگی۔ کیونکہ ایک تو ان کے پاس بڑی افرادی قوت ہے اور بے پناہ وسائل ہیں۔ کارپوریٹ ہاؤسز نہ صرف اپنی میڈیا کے ذریعے ان کے ایجنڈے کو آگے بڑھانے میں دن رات لگی ہوئی ہیں بلکہ اس نے ان کے عزائم کی تکمیل کے لیے اپنے خزانے کا منہ بھی کھول دیا ہے۔ دوسرے ان کے پاس فن حرب میں ماہر ایک ٹرینڈ کیڈر موجود ہے جس کی تعداد لاکھوں میں ہے، تیسرے ان کو یقین ہے کہ پوری اسٹیٹ مشنری جن پر ان کا قبضہ ہے جس میں پولیس، سول ایڈمنسٹریشن اور ایک حد تک عدلیہ بھی ان کے ساتھ ہے۔ لہٰذا جو جہاں بھی سر اٹھائے گا اس کو بے رحمی سے کچل دیا جائے گا۔ ان کے پاس مختلف میدانوں کے ماہرین تیار ہیں جو ہر غلط کو صحیح ثابت کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں بلکہ ہر ظلم و جور کا جواز فراہم کر کے پوری ڈھٹائی اور بے شرمی کے ساتھ اس کے جواز کا فتویٰ بھی دینے کو تیار ہیں۔

لہٰذا ان حالات میں ہمیں اچھی طرح یہ بات ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ ہمارا مقابلہ نہ تو کسی چھوٹے سے شرپسند گروہ سے ہے اور نہ یہ کوئی شاذ اور مقامی واقعہ ہے بلکہ یہ سوچے

سمجھے وسیع تر پلان کا حصہ ہے جس میں حکومت کی پوری مشنری در پردہ شریک ہے۔ لہٰذا اس کے لیے ہمیں بہت سنجیدگی کے ساتھ غور وفکر کر کے ایک وسیع الاطراف حکمت عملی اختیار کرنی ہوگی۔ جذباتیت میں اٹھایا گیا کوئی قدم تباہ کن ثابت ہوسکتا ہے۔ پانی سر سے اوپر بہہ رہا ہے۔ ان حالات میں جن کو تیرنا نہیں آتا لازماً ان کے ڈوب جانے کا اندیشہ ہے۔

حرفِ انتباہ

سنگھ پریوار اور دیگر ہندو انتہا پسند تنظیموں نے پچھلے ایک سو سال میں مذہبی، ثقافتی، سماجی اور سیاسی طور پر اتنے فولٹ لائن ڈھونڈھ نکالے ہیں اور اتنے فلیش پوائنٹ بنا رکھے ہیں اور ملک کے طول وعرض میں اتنے لینڈ مائنس بچھا رکھے ہیں کہ وہ اپنی حکومت کو دوام بخشنے کے لیے ایک ایک کر کے ان کو عوام کے سامنے لائیں گے اور اس طرح عوام کے جذبات کو گرما کر اپنی حکومت اس وقت تک قائم رکھنا چاہتے ہیں جب تک ملک کا دستور اور اس کا پورا سیاسی اور سماجی ڈھانچہ نہ بدل جائے اس طرح وہ آئندہ پچاس سال تک ملک میں اپنی حکومت قائم رکھنے کا خواب دیکھ رہے ہیں۔ وہ لوگوں کے اندر اس قدر جنون بھر دینا چاہتے ہیں کہ لوگ بدحال ہوئی معیشت، آسمان چھوتی مہنگائی، روپے کی گرتی قیمت، غضبناک بے روزگاری، غربت، کرپشن، امیری اور غریبی کی بڑھتی کھائی اور عالمی برادری میں ملک کی گرتی ساکھ سے بے پروا ہوکر بس ہندو مسلم بنیاد پر ووٹ ڈالیں۔ انھوں نے اپنا پولیٹکل اور سماجی ایجنڈا کچھ اس طرح سے طے کیا ہے کہ جو دوسری سیاسی پارٹیاں ہیں وہ بھی طوعاً وکرہاً ان کے ایجنڈے کے مطابق کام کرنے پر مجبور ہوں۔ اس لیے ایک الیکشن میں یا کسی ریاستی اسمبلی میں بے جی پی کو ہار بھی ہوتی ہے تو اس سے اس کے ایجنڈے پر کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ اس لیے مسلمانوں کو اپنی حکمت عملی طے کرتے وقت ان باتوں کو دھیان میں رکھنا ہوگا اور وقتی منصوبہ بندی کے ساتھ ساتھ سو سال کی حکمت عملی بنا کر ملت کی تعمیر اور استحکام کی کوشش کرنی ہوگی۔

ہماری حکمت عملی

یہ ہے وہ صورتحال جو نوشتۂ دیوار کی طرح ہمارے سامنے ہے۔ اگر ہم اس کو پڑھنے

سے قاصر ہیں یا پڑھنا نہیں چاہتے تو قصور ہمارا ہے کسی اور کا نہیں۔ایک بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینے کی ہے کہ یہ افتاد کسی ایک مسلک،ایک گروہ،ایک جماعت،ایک طبقہ اور ایک فرقہ پر نہیں آئی ہے بلکہ پوری ملت اس کی زد میں ہے۔ایسا نہیں ہے کہ یہ مہم سنیوں کے خلاف ہے اور شیعہ اس سے محفوظ ہیں۔اور نہ ایسا ہے کہ یہ مہم سلفیوں اور اہل حدیث کے خلاف ہے، دیوبندی اور بریلوی اس سے محفوظ ہیں۔یا یہ صرف دیوبندیوں کے خلاف ہے، بریلوی اور خانقاہی لوگ اس کی زد میں نہیں ہیں۔بوہرہ، اسماعیلی اور خورجہ جو ہمیشہ سے مین اسٹریم اسلام سے الگ رہے ہیں وہ بھی ان کارستانیوں سے محفوظ نہیں ہیں۔اس لیے سب کو سر جوڑ کر بیٹھنا چاہیے اور اس مسئلہ کے حل کے لیے ایک مشترکہ حکمت عملی طے کرنی چاہیے۔میں کوئی محقق، فقیہ اور دانشور نہیں ہوں تاہم حالات کو کھلی آنکھوں سے دیکھتا ہوں اور کھلے ذہن سے سوچتا ہوں۔میرے خیال میں ہمیں جس حکمت عملی کے ساتھ آگے بڑھنا چاہیے میں غور و مشورہ کے لیے نکات وار تمام زعمائے ملت اور مسلمانوں کے صاحبِ فکر افراد کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں تاکہ ان پر غور کیا جائے اور یہ مشورے ہماری اجتماعی حکمت عملی کا حصہ بن سکیں تو مجھے بے حد خوشی ہوگی۔

(۱) ملت کو خوف کی نفسیات سے باہر نکالنا یہ سب سے پہلا بڑا کام ہے:

آزادی کے فوراً بعد سے ہی مسلمانوں کو خوف زدہ رکھنے، ڈیمولرائز کرنے اور حاشیہ پر رکھنے کی سازش شروع ہوگئی تھی۔تواتر کے ساتھ فسادات کرانا اور مسلم شناخت پر مسلسل حملہ اس کی واضح مثال ہے۔حالات میں صرف ایک فرق آیا ہے اور یہ ہے کہ اب حکومت اور اس کی مشنری بھی کھل کر اس مہم میں شامل ہوگئی ہے۔لہٰذا ہمارا مقابلہ صرف فرنج اپلیمنٹ سے نہیں ہے بلکہ مین اسٹریم اسٹیٹ مشنری سے ہے۔ہم کسی فسادی گروہ کا مقابلہ تو کر سکتے ہیں مگر حکومت اور اس کی مشنری کا مقابلہ کرنا مشکل ہے۔لہٰذا اس کے لیے بالکل نئی حکمت عملی درکار ہے۔جوش میں آکر پتھر مار دینا تو آسان ہے مگر پتھر کے مقابلے جب بلڈوزر چلے گا تو اس کو انگیز کرنا مشکل ہوگا۔دوسرے یہ کوئی وقتی اور مقامی مسئلہ نہیں ہے بلکہ یہ دائمی اور ملک گیر صورتحال ہے اس کے لیے ہمیں دوسرے انداز کی حکمت عملی اپنانی ہوگی۔اگر مسلمان حضورﷺ

کی اور آپ کے ساتھیوں کی مکی زندگی کا بغور مطالعہ کریں تو انہیں بہت سی رہنمائی ملے گی۔ ان میں سب سے اہم ہے بے خوفی، پامردی، صبر اور عزیمت۔ ڈرنا صرف اللہ سے ہے اور ہر حال میں اسی سے رجوع کرنا ہے۔ اس آزمائش سے نکلنے کا راستہ وہی دکھائے گا اس لیے صبر و استقلال کے ساتھ حالات کا مقابلہ کرنا ہے اور اپنے موقف پر پوری مضبوطی سے قائم رہنا ہے۔ موت و حیات، نفع نقصان سب اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ ہمیں اس بات کا یقین ہونا چاہیے کہ موت اور حیات کے فیصلے زمین پر نہیں آسمان پر ہوتے ہیں۔ ہمیں اس کا بھی یقین ہونا چاہیے کہ ہم پر جو آزمائشیں آرہی ہیں وہ خدا کی طرف سے ہیں اور یہ دراصل ہمارے ایمان اور یقین کا امتحان ہے۔ اللہ کا صاف صاف اعلان ہے کہ وہ کسی متنفس پر اس کی سکت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ ہمارے اندر موجودہ حالات کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت ہے لہٰذا حالات سے گھبرانا نہیں ہے بلکہ اس کا مردانہ وار مگر ہمت اور دانائی کے ساتھ مقابلہ کرنا ہے۔

یہ دراصل ایک اعصابی جنگ (War of Nerves) ہے۔ لہٰذا جان و مال سے زیادہ یہ نفسیاتی مسئلہ ہے۔ اس نفسیاتی جنگ میں جب کوئی قوم ڈر جاتی ہے، ہمت ہار جاتی ہے، صبر و عزیمت کا دامن اپنے ہاتھ سے چھوڑ دیتی ہے تو وہ بے مارے مرجاتی ہے ایک زندہ لاش ہوجاتی ہے۔ میں مسلمانوں کے تمام بہی خواہوں، اخبار نویسوں، دانشوروں، علما اور واعظین سے درخواست کروں گا کہ نہ تو وہ ری ایکشنری بننے کا مشورہ دیں اور نہ مسلمانوں کی مظلومیت کا اس طرح رونا روئیں کہ پوری قوم خوف و ہراس میں مبتلا ہوجائے۔ آپ کا کام جہاں ظلم کے خلاف آواز اٹھانا ہے مظلوموں کی مدد اور چارہ جوئی کرنا ہے وہیں ان کے حوصلہ کے بلند رکھنے کا بھی اہتمام کرنا ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی اب تک کی جو تاریخ رہی ہے اس میں بارہا ایسے حالات آئے ہیں جبکہ مسلمانوں پر ظلم و جور کے پہاڑ توڑے گئے، مگر ان تمام حالات کے باوجود مسلمان قوم زندہ ہے اور موجودہ حالات کے باوجود انشاء اللہ زندہ رہے گی۔ اس لیے پہلا م کام دل سے ہر خوف کو نکال کر اللہ کا خوف پیدا کرنا ہے۔ جس دن ہم خوف کی نفسیات سے آزاد ہوجائیں گے ایک نئے باب کی ابتدا ہوجائے گی۔

ہم ہندوستان میں رہتے ہیں ہندوستان میں گاندھیائی حکمت عملی ہمارے لیے بہت معاون ہوسکتی ہے جب اس ملک پر انگریزوں کی حکومت قائم ہوگئی تو کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ملک کے کسی نہ کسی حصے میں کسی نہ کسی طبقہ اور گروہ نے اس کے خلاف بغاوت کا علم بلند نہیں کیا۔ مگر اس عسکری جدوجہد میں ہمیشہ ہندوستانیوں کو منہ کی کھانی پڑی۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ جنگ ایک چھوٹے سے گروہ کی طرف سے تھی جن کے پاس افرادی قوت کم تھی، وسائل کم تھے، جنگی ساز وسامان کم تھے اور ان کو عوام کی حمایت حاصل نہیں تھی اس لیے وہ ایک منظّم ریاست اور اس کی اسٹیٹ مشنری کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ جب گاندھی جی ساؤتھ افریقہ سے واپس آئے تو انھوں نے محسوس کیا کہ عام عوام انگریزوں سے بہت ڈرے ہوئے ہیں۔ وہ سپاہیوں کی لال پگڑی دیکھ کر گھروں میں گھس جاتے ہیں اور دروازہ بند کر لیتے ہیں۔

ایسی صورت میں عسکری جنگی حکمت عملی سے انگریزوں کو پریشان تو کیا جاسکتا ہے، ان سے آزادی حاصل نہیں کی جاسکتی ہے۔ اس لیے گاندھی جی نے ستیہ اور اہنسا کا راستہ اپنایا اور پرامن اور جمہوری طریقے سے اپنی جدوجہد جاری رکھنے کا فیصلہ کیا اور حکومت کی طرف سے تشدد آمیز کارروائی پر بھی اپنی طرف سے تشدد نہ کرنے کی حکمت عملی پر سختی سے گامزن رہنے کی پالیسی اپنائی۔ انھوں نے سب سے پہلا کام عوام سے رابطہ پیدا کرنے کا کیا اور ان کے اندر بے خوفی پیدا کی جس نے انگریزوں کے ظلم وتشدد کے تمام ہتھیاروں کو کند کر دیا اور بالآخر ان کو ملک چھوڑ کر بھاگنا پڑا۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ حکمت مومن کی گم شدہ پونجی ہے۔ ہمیں اس حکمت کو اپنی حکمت عملی بنا کر دیکھنا چاہیے کہ یہ کس طرح کارگر ہوتی ہے۔ قرآن بار بار کہتا ہے نہ تم گھبراؤ نہ خوف زدہ ہو بلکہ صبر اور نماز سے کام لو۔ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ جب اللہ ہمارے ساتھ ہے تو ہم کو کسی اور سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ انجام کار تمام امور کا فیصلہ اللہ کے ہاتھ ہے اس لیے سب سے پہلا اور سب سے ضروری کام مسلمانوں کو خوف کی نفسیات سے باہر نکالنا ہے اور ان کے اندر بے خوفی، امید اور حوصلہ پیدا کرنا ہے۔ سارے مسئلے حل ہوں گے۔ آج نہیں تو کل ہوں گے۔

(۲) اکثریت سے وسیع البنیاد رابطے کی کوشش

ہندوانتہا پسند تنظیموں کا اس بات پر بہت زور ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے بیچ جو سماجی، ثقافتی، سیاسی اور معاشی روابط ہیں ان کو جتنا جلدی ممکن ہوتوڑا جائے اور ایک دوسرے کو الگ کردیا جائے۔ اس طرح مسلمان ہندوؤں سے الگ تھلگ رہنے پر مجبور ہوجائیں گے اور ان کو اپنے ایجنڈے پر عمل کرنا آسان ہوجائے گا۔ مسلمانوں کا سماجی اور معاشی بائیکاٹ کا نعرہ اس کی واضح مثال ہے۔ مسلم آبادیوں میں گھس کر اشتعال انگیز نعرے لگانے، گالی گلوج کرنے اور ہنگامہ کرنے کے پیچھے ان کی یہی حکمت عملی ہے۔ ہندوستان میں ہندو اور مسلمان سماجی اور ثقافتی طور پر اس طرح گھلے ملے ہیں کہ انہیں کسی بھی کیمیائی یا سیاسی عمل کے ذریعے ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ لہٰذا نفرت اور تشدد کی سیاست زیادہ دنوں تک چلنے والی نہیں ہے۔ یہ جوار بھاٹا جو اس وقت نظر آرہا ہے، بہت جلد تھم جائے گا۔ خطرہ اس وقت اس ملک کے مسلمانوں سے زیادہ بھارت کے آئین و دستور کو ہے۔ مسلمان تو ایک طبعی وجود ہیں جن کو مٹانا ناممکن ہے، مگر آئین تو کاغذ پر لکھا ایک ضابطہ ہے جس کو مٹانا یا بدلنا آسان ہے۔ لیکن جب بھارت کا موجودہ آئین و دستور مٹ جائے گا یا بدل دیا جائے گا تو اس کا نقصان ملک کی تمام کمزور آبادیوں کو ہوگا اور مسلمانوں کو بھی ہوگا۔

مسلمان اس ملک کی اکثریتی آبادی سے اس لیے جڑے رہنا نہیں چاہتے کہ اس کے بغیر ان کا کام نہیں چلے گا بلکہ وہ اس لیے جڑے رہنا چاہتے ہیں کہ یہ سماجی ایکتا، اندرونی امن اور دیش کی اکھنڈتا کے لیے ضروری ہے۔ آخر ہندو اور مسلمان دونوں کیسے الگ رہ سکتے ہیں۔ ملک میں کم وبیش چھ لاکھ گاؤں ہیں، بیس ہزار شہر ہیں اور ہزاروں قصبات ہیں۔ ان میں مشکل سے پچاس ہزار گاؤں ایسے ہوں گے جہاں مسلمان نہیں ہیں ورنہ وہ ملک کے ہر گاؤں اور ہر شہر میں ہیں۔ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کی آبادی ایسی ہے جو ایک دوسرے سے الگ اور خود کفیل ہوکر جی سکتے ہیں۔ لیکن کیا ایسا کرنا ملک اور سماج کے حق میں ہوگا۔ بالکل نہیں اس لیے اگر کوئی ایسی حماقت کرنا چاہتا ہے کرے، مسلمان اپنے ہوش وحواس میں ایسی کسی پالیسی کی

حمایت نہیں کرتے۔ یہ ان کے ایمان کے خلاف ہے، انسان دوستی کے خلاف ہے، ملک کے مفاد کے خلاف ہے۔ حضرت محمدﷺ نے فرمایا: میرے رب نے مجھے نو باتوں کا حکم دیا ہے جس میں چند باتیں یہ ہیں کہ جو مجھ سے کٹے میں اس سے جڑوں، جو میرا حق نہ دے میں اس کا حق دوں، ہر حال میں انصاف کی روش پر قائم رہوں اور کھلے اور چھپے ہر وقت اللہ سے ڈرتا رہوں۔

اس لیے ہمیں وسیع تر اکثریتی آبادی کے ساتھ خالص انسانی بنیادوں پر قریبی رابطہ بنا کر رہنے کی حکمت عملی پر غور کرنا ہے، اس لیے اکثریتی سماج کے ہر طبقے سے بھائی چارہ بڑھانے پر زور دینا چاہیے۔

جس طرح اکثریت کی فرقہ پرستی اقلیتی فرقہ پرستی سے زیادہ خطرناک ہے اسی طرح اقلیتی علیحدگی پسندی اکثریتی علیحدگی پسندی سے زیادہ نقصاندہ ہے۔ ہم دونوں قوموں کے اندر باہمی بے اعتمادی نفرت اور دوری کو کیسے کم کر سکتے ہیں۔ یہ آسان بھی ہے اور مشکل بھی۔ آسان اس لیے ہے کہ ہم سب ایک دوسرے کے پڑوس میں رہتے ہیں اور ہر وقت ایک دوسرے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ مشکل اس لیے کہ بدگمانی اتنی گہری اور ادارتی ہوگئی ہے جس کو دور کرنا مشکل ہے۔ تاہم شروعات تو کی ہی جاسکتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہندو سماج کی اکثریت آج بھی امن پسند ہے اور مل جل کر رہنا چاہتی ہے۔ اس لیے وہ لوگ جو تنگ نظر نہیں ہیں اور کسی انتہا پسند تنظیم سے وابستہ نہیں ہیں ان سے قریبی تعلق پیدا کر وسیع تر سماج سے جڑنے اور لوگوں کو جوڑنے کی حکمت عملی پر غور کرنا چاہیے۔ ہمارے سماج میں گاؤں اور محلے میں ایسے بہت سے لوگ ہیں جو ضرورت مند ہیں۔ لہٰذا بلا لحاظ مذہب و ملت ان تمام لوگوں کی مدد کرنے کا جذبہ پیدا کرنا چاہیے۔ کہاوت مشہور ہے ضرورت کے وقت کا ساتھی اصل ساتھی ہوتا ہے۔ جب آپ کسی ضرورت مند کی مدد کریں گے تو اس کے دل میں آپ کے لیے نرم گوشہ پیدا ہوگا۔

اس وقت جلسے جلوس میں ہنگامہ آرائی کا جو ٹرینڈ دیکھنے کو مل رہا ہے وہ یہ ہے کہ اس طرح کے جلوس میں جو بڑے لیڈران ہیں وہ سامنے نہیں آتے۔ وہ در پردہ بیک وارڈ اور دلت سماج کے بے پڑے لکھے اور کم پڑھے لکھے بے روزگار نوجوانوں کو فرقہ پرستی کی گھٹی پلا کر

بدمست کردیتے ہیں۔ اس کے عوض انہیں کچھ پیسوں کی لالچ دی جاتی ہے۔ ان کو دیش، دھرم اور سماج کا محافظ بنا کر ان کے جذبات بھڑکائے جاتے ہیں۔ ان کے اندر مسلمانوں کے خلاف باضابطہ نفرت پیدا کر کے متشددانہ جذبات سے بھر دیا جاتا ہے۔ ساتھ ہی ان کو یقین دلایا جاتا ہے کہ چونکہ ریاست اور مرکز میں ان کی سرکار ہے اس لیے ان پر کوئی قانونی کارروائی نہیں ہوگی اور اگر دکھاوے کے لیے کوئی کارروائی ہوگی تو انہیں بچالیا جائے گا۔ پھر انہیں مختلف طرح کے انعام واکرام سے نوازا جائے گا۔ یہ ۱۵، ۱۶ سال سے لے کر بیس پچیس اور تیس سال کے نوجوان ہوتے ہیں، جن کے جذبات کو بھڑکانا، فنِ نفرت انگیزی میں ماہر لوگوں کے لیے کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ یہ کام ایک دن اور ایک وقت میں نہیں ہوتا بلکہ یہ ہفتے کے ساتوں دن مہینے کے تیس دن اور سال کے ۳۶۵ دن ایک تسلسل اور تواتر سے چلتا رہتا ہے۔ نوخیز نوجوانوں کو ایسے ایسے سلائڈ، ویڈیو اور تقریریں سنائی اور تحریریں دکھائی جاتی ہیں جن کو دیکھ، سن اور پڑھ کر ان میں انتقام کی آگ بھڑک اٹھتی ہے۔ اس کام کو پوری فنی مہارت اور ہوشیاری سے انجام دیا جاتا ہے اور جب کوئی تہوار یا خاص موقع آتا ہے اس وقت گویا اپنی تربیت کا اثر دیکھنے کے لیے ان کو کھلا چھوڑ دیا جاتا ہے جس میں سیاسی پارٹی، حکومت اور اس کے اہل کار کی پشت پناہی شامل ہوتی ہے اس لیے وہ بے خوف ہو کر مجرمانہ حرکتوں کی حد سے گزر جاتے ہیں۔ اس کے بعد کا باقی کام حکومت اور انتظامیہ پورا کر دیتی ہے۔ یہ ہے اس وقت کی وہ صورتحال جس میں ہمیں اس زہر کا توڑ ڈھونڈنا ہے۔

(الف) اس سلسلے کی پہلی کوشش یہ ہونی چاہیے کہ ہم جس شہر، محلّہ، وارڈ اور گاؤں یا قصبے میں رہتے ہیں، اس میں جو شریف، بااثر اور امن پسند شہری ہیں ان سے رابطہ پیدا کریں اور وارڈ، محلّہ، گاؤں اور شہر کی سطح پر ایک امن کمیٹی اور فرقہ وارانہ میل ملاپ کی کمیٹی بنائیں۔ اس کمیٹی میں کوشش کریں کہ سماج کے ہر طبقے اور برادری کے لوگ شامل ہوں اور انہیں یہ ذمہ داری سونپیں کہ اپنی برادری اور محلّہ میں اگر کوئی شر پسند عنصر ہے تو اس پر کڑی نظر رکھی جائے اور اس کے حرکات وسکنات پر نگرانی رکھی جائے۔ پہلے تو اسے سمجھانے کی کوشش کی جائے اور وہ بات

ماننے سے انکار کردے تو پولیس اور انتظامیہ کو اس شخص یا ایسے افراد کی سرگرمیوں پر نظر رکھنے کی درخواست کی جائے تا کہ وہ اس علاقے کے امن وامان کو بگاڑنے میں کامیاب نہ ہوسکے۔

ہر ضلع میں ضلع انتظامیہ کی زیرنگرانی ایک امن کمیٹی ہوتی ہے جس کی بیٹھک عموماً تہوار کے موقع پر ہوتی ہے۔ اس میں پوری تندہی سے حصہ لیا جائے اور ضلع انتظامیہ کو امن و قانون کی صورتحال بنائے رکھنے میں اس کی مدد کی جائے۔ شہریوں کے ایک بااثر گروہ کا ضلع انتظامیہ بالخصوص کلکٹر، ایس پی اور مقامی تھانہ انچارج سے قریبی رابطہ اس معاملہ میں بہت مددگار ہوگا۔ لہٰذا ایسے رابطہ کو بنانے اور بڑھانے کی ضرورت ہے۔ کرائم برانچ اور انٹلی جینس کا جو شعبہ ہے وہ اس معاملہ میں اہم کردار ادا کرسکتا ہے۔ اس معاملے میں اخبار اور ٹی وی کے جو مقامی رپورٹر اور جرنلسٹ ہیں وہ بھی کلیدی کردار کر سکتے ہیں۔ لہٰذا ہمیں Pro-Active ہوکر اس طرح کے اقدام کرنے چاہئیں۔

(ب) سماج کی ضرورت سے جڑنا اور ضرورت کے وقت ان کے ساتھ کھڑے رہنا ماحول کو بہتر بنانے میں بہت مددگار ہوگا۔ کوئی یتیم ہے، بیوہ ہے، بے سہارا ہے، غریب ہے، معذور ہے، بوڑھا اور بیمار ہے، ایک طالب علم ہے جس کو کچھ مدد کی ضرورت ہے، ایک بے روزگار نوجوان ہے جو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی جدوجہد کر رہا ہے۔ کچھ غریب بچیاں ہیں جن کی شادی کا مسئلہ ہے، کسی کے گھر کوئی حادثہ ہوگیا ہے یا کوئی کمانے والا تھا وہ یا تو فوت ہوگیا ہے یا معذور ہے ایسی تمام صورتوں میں ہم بلا لحاظ مذہب وملت لوگوں کی مدد کے لیے آگے آئیں۔ جاڑے میں کمبل بانٹنا، آفات کے وقت کھانا، کپڑا، دوا، رہائش کا انتظام کرنا ہے۔ اس وقت ہم کسی سے پیچھے نہ رہیں بلکہ بڑھ چڑھ کر ان کی مدد کریں۔ اپنے محلے اور شہر میں سالوں بھر مہم چلا کر رقم جمع کریں تا کہ کسی بھی ہنگامی ضرورت میں فرسٹ ایڈ کے طور پر آپ کی طرف سے ان کو مدد پہنچے۔ اس طرح کے اقدام سماج کی سوچ کو بدلنے میں بہت معاون ہوں گے۔

(ج) خوشی اور غم انسانی زندگی کا لازمہ ہے۔ خوشی کے وقت کوئی نہ بلائے تو ظاہر ہے اس کے گھر جانا ذرا معیوب ہوگا خاص طور سے اس وقت جب بھوج بھات کا انتظام کیا گیا

ہے۔مگر غم کے موقع پر کسی بلاوے کی ضرورت نہیں ہے۔ لہٰذا اس وقت آپ کو وہاں موجود رہنا چاہیے اور کوئی ضرورت سامنے ہو تو اس میں مدد کرنی چاہیے۔ خاص طور سے ان کی جو غریب ہیں یا جن کے پاس وسائل کم ہیں۔ کسی خوشی کے موقع پر مثلاً تہوار ہے، یا بچے نے امتحان پاس کیا ہے، یا بچوں کی شادی ہوئی ہے، نیا مکان دوکان بنایا یا اور کوئی موقع ہے اس وقت مبارکباد ضرور دیجیے چاہے وہ فون یا واٹس ایپ کے ذریعہ ہی کیوں نہ ہو، یہ چھوٹی چھوٹی چیزیں جوہری اثر رکھتی ہیں جو ماحول کو بہتر بنانے میں مددگار ہوں گی۔

(د) سماج میں فرقہ پرستی، کرپشن اور ذات پات کی تمیز نیچے سے اوپر نہیں جاتی بلکہ اوپر سے نیچے آتی ہے۔ یہ سماجی مسئلہ نہیں ہے بلکہ یہ سیاست کا پیدا کردہ مسئلہ ہے۔ ہمارے سیاست داں اور سیاسی پارٹیاں اپنی ناکامی اور مجرمانہ حرکتوں کو چھپانے کے لیے سماج میں ذات پات اور فرقہ پرستی کا زہر گھول کر ماحول کو پراگندہ کرتی ہیں اور بے روزگار نوجوانوں کو اپنا آلہ کار بنا کر اپنے مذموم عزائم کی تکمیل کرتی ہیں۔ اس سے ان کو یہ فائدہ ہوتا ہے کہ عوام بغیر ان سے سوال کیے ان کے جال میں پھنس جاتی ہے اور ان کی ناکامیوں بلکہ مجرمانہ حرکتوں کے باوجود دوبارہ انھیں اقتدار کی کرسی پر بیٹھا دیتی ہے۔ لوگوں کے اندر سبھائیں، جلسے، سمینار، سمپوزیم کے ذریعے یا سوشل میڈیا اور اخبارات میں مضامین لکھ کر ان چیزوں سے عوام کو واقف کرانا ضروری ہے تاکہ عام عوام ایسے سیاست دانوں کے جھانسے میں نہ آئیں اور اپنا ووٹ جس سے دیش کی تقدیر اور تصویر بدل سکتی ہے ایسی پارٹی اور ایسے امیدوار کو دیں جس کا سیاسی ریکارڈ اچھا ہو اور جس نے سماج کی صحیح ڈھنگ سے خدمت کی ہے یا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس طرح ہمیں پورے سیاسی عمل میں پوری سمجھ داری اور ذمہ داری کے ساتھ حصہ لینا چاہیے اور وقتی اور مقامی حالات سے متاثر ہو کر نہیں بلکہ پورے ملک اور سماج کو دھیان میں رکھ کر اپنا ووٹ ڈالنا چاہیے۔ اس معاملے میں ہم صرف ووٹر نہ بنیں بلکہ لوگوں کی رائے بنانے اور ان کو بدلنے کی بھی کوشش کریں۔ سیاست سماج کی گاڑی کو کھینچنے والا انجن ہے۔ لہٰذا اس انجن کے چالک کا بہت سوچ سمجھ کر انتخاب کرنے کی ضرورت ہے ورنہ کہیں بندر کے ہاتھ میں ناریل

دے دیا تو وہ اپنا بھی سر پھوڑ سکتا ہے اور دوسروں کا سر بھی پھوڑ سکتا ہے۔ سیاست کی گاڑی کو ایکسیڈنٹ کرنے اور اس کو ڈریل ہونے سے بچانے کی ذمہ داری عوام پر ہے۔ اس لیے اس کے لیے عوامی بے داری مہم چلانے کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے سول سوسائٹی کو آگے آکر ایک مؤثر رول ادا کرنا ہوگا۔

ہم ہندوستانی سماج کی ناقابل تقسیم اکائی ہیں۔ ملک میں سیکولر جماعتیں، سیکولر لیڈران اور سیکولر سیاست ناکام نظر آتی ہے۔ یہ ناکامی ان پارٹیوں اور سیاست دانوں کی دوغلی نیتیوں اور کردار کی وجہ سے ہے۔ مگر بھارت میں سیکولرزم کو ناکام نہیں ہونے دینا ہے۔ بھارت میں سیکولرزم کی ناکامی کا مطلب بھارت کے تصور کی ناکامی ہے، اس کے بغیر بھارت نہ تو سیاسی طور پر زیادہ دنوں تک متحد رہ سکتا ہے اور نہ سماجی امن قائم رہ سکتا ہے۔ بھارت میں جو تنوع، اختلاف، تضاد اور رنگا رنگی ہے اس کو سیکولرزم ہی جوڑے رکھ سکتا ہے۔ اس لیے اس کی جگہ جن نظریات کو نافذ کرنے کی کوشش کی جارہی ہے وہ ملک کی اتحاد و سالمیت اور سماجی امن کے لیے خطرناک ہے۔ اس لیے ہمیں پورا وزن سیکولرزم کی دفاع کے حق میں ڈالنا چاہیے۔ بھارت میں مسلمانوں کی الگ سے کوئی سیاسی پارٹی ہونی چاہیے یا نہیں، اس پر بہت سے لوگ نظری طور پر سوچ رہے ہیں اور بہت سے لوگ عملی کوشش بھی کر رہے ہیں۔ بلکہ آزادی کے فوراً بعد سے یہ کوشش شروع ہوگئی تھی، مگر اب تک کے تجربات نے یہ ثابت کیا ہے کہ بیل مونڈھے چڑھنے کو تیار نہیں ہے اور یہ سیاست کامیاب ہوتی نظر نہیں آتی۔ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ ایسا تجربہ کرنے میں کوئی حرج نہیں تاہم اس طرح کی کوشش کامیاب نہیں ہوگی۔ اس لیے مسلمانوں کا سوادِ اعظم اس کے باوجود کہ سیکولر جماعتوں نے انہیں ٹھگا زیادہ ہے کیونکہ مسلمان سیاسی طور پر حساس اور بیدار نہیں ہیں۔ ان کے اندر سیاسی سمجھ کی کمی ہے۔ انہیں نہیں معلوم ہے کہ سیاست میں کیسی حکمت عملی اپنائی جاتی ہے اور کیسے حالات اور مسائل پر اثر انداز ہوا جاتا ہے۔ وہ محض ردِعمل میں بے سوچے سمجھے ووٹ دیتے ہیں اور اپنی قیمت اور اہمیت سمجھے اور سمجھائے بغیر ووٹ ڈالتے ہیں اس لیے ان کے حصہ میں صرف محرومی آتی ہے اور انہیں اپنے سیاسی فیصلے کا خمیازہ

بھگتنا پڑتا ہے۔ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلمانوں کے اندر صحیح سیاسی سمجھ پیدا کرنے کا اہتمام کیا جائے اور بھارت میں سیکولر سیاست اور سیکولرزم کو ناکام ہونے سے بچایا جائے۔اس سے صرف مسلمانوں کا نقصان نہیں ہوگا بلکہ اس کا نقصان پورے بھارت کو ہوگا۔ دیش کو اس بڑے نقصان سے بچانے کے لیے دیش بھگت مسلمانوں کو آگے آنے کی ضرورت ہے اور ایسے افراد اور پارٹیوں کے ساتھ مشترکہ پلیٹ فارم بنا کر جدوجہد کرنا ہے جو سیکولر اقدار میں یقین رکھتے ہیں۔

(ہ) ہم نے اوپر ذکر کیا ہے کہ فرقہ وارانہ امن اور خیر سگالی کے لیے ہر محلّہ، وارڈ، شہر اور گاؤں میں امن کمیٹی بنائی جانی چاہیے اور مسلمانوں کو اس سے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا چاہیے۔اگر آپ ہندوستان میں فرقہ وارانہ فسادات کی تاریخ اور اس کے پیٹرون پر نظر ڈالیں تو صاف معلوم ہوگا یہ فسادات منصوبہ بند ڈھنگ سے اور خاص انداز سے کیے اور کرائے جاتے ہیں، جس میں سب سے اہم یہ ہے کہ زبردستی مسلمان محلوں اور آبادیوں سے جلوس لے کر گزرنا، جیسے ہی یہ جلوس مسلمان آبادی میں داخل ہوگا اور مسجدوں کے پاس آتا ہے یکایک بہت جارج ہوجاتا ہے اور اشتعال انگیز نعرے لگانے لگتا ہے اور ایسی حرکتیں کرنا شروع کردیتا ہے تاکہ لوگ مشتعل ہوجائیں اور جلوس والوں سے الجھ جائیں۔بس دنگا بھڑکانے کے لیے اتنا کافی ہے۔ اس کے بعد پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق مسلمانوں کے گھروں اور دکانوں کو جلانے اور مارنے کاٹنے کا عمل شروع ہوجاتا ہے۔ بیشتر جگہوں پر پولیس دنگائیوں کے ساتھ نظر آتی ہے۔اس کے بعد گرفتاریوں اور جھوٹے مقدمات کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے۔ جب ہمیں ان کی حکمت عملی سمجھ میں آگئی ہے تو اس کے تدارک کے لیے کچھ نئے انداز سے سوچنے کی ضرورت ہے۔

عام طور پر ہندو تہواروں میں جلوس نکالنے کی روایت نہیں رہی ہے۔مگر آج کل ہر تہوار میں جلوس نکالنے کا چلن عام ہوگیا ہے جس کے پیچھے مذہبی سے زیادہ سیاسی مقصد کارفرما ہوتا ہے۔ ہر ضلع میں ضلع انتظامیہ کے تحت ایک امن کمیٹی ہوتی ہے جو ایسے تمام تہواروں کے

موقع پر لوگوں کو بلا کر امن و امان برقرار رکھنے کے لیے مشورہ کرتی ہے۔ ضلع انتظامیہ کو پولیس اور انٹلی جینس کی طرف سے تمام جانکاریاں رہتی ہیں اور نقض امن کے خطرے سے انہیں واقف کرایا جاتا ہے۔ ایسی صورت میں ضلع انتظامیہ پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ امن و امان برقرار رکھنے کی اپنی ذمہ داری پوری کرے تاکہ کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہ آئے۔ اس معاملے میں میں سمجھتا ہوں کہ ہر شہر کے مقامی مسلمانوں کو Pro-Active رول ادا کرنا چاہیے اور ہر تہوار سے پہلے ضلع انتظامیہ بالخصوص کلکٹر اور ایس پی سے مل کر یہ درخواست کرنی چاہیے کہ جو لوگ جلوس نکالنا چاہیے ہیں ان کے درمیان اور مقامی مسلمانوں کے درمیان مشترکہ میٹنگ ہو اور کب کس راستے سے اور کن کن علاقوں سے جلوس گزرے گا اس کی جانکاری ہونی چاہیے۔ مسلمان آگے بڑھ کر جلوس کے منتظمین کو اپنے محلے اور علاقے سے گزرنے کی دعوت دیں اور جلوس کا آگے بڑھ کر استقبال کریں اور ان کو پانی، شربت، کھانے پینے کی کوئی چیز اور فرسٹ ایڈ کی سہولت بہم پہنچائیں۔ مسلمان جلوس کے منتظمین سے درخواست کریں کہ جلوس کی قیادت پنڈت، پروہت اور ذمہ دار شہری کریں اور چونکہ وہ مذہبی جلوس ہے اس لیے بھجن کیرتن، رامائن، گیتا، وید، درگا استتی اور ہنومان چالیسا کا پاٹ کرتے ہوئے گزریں تو اس سے جلوس کی دھارمکتا بڑھ جائے گی اور امن و قانون کی فضا بنی رہے گی۔

جلوس جس علاقے سے گزرے اس کے راستے میں سی سی ٹی وی کیمرہ وافر مقدار میں لگایا جائے۔ پورے جلوس کی ویڈیو گرافی ہو، میڈیا پورے جلوس کو کور کرے اور جتنے حساس علاقے ہیں مثلاً جہاں پر مندر، مسجد، مزار، مدرسہ اور کوئی ایسی جگہ ہے جس کی اہمیت ہے وہاں پولیس فورس پوری تعداد میں پہلے سے تعینات ہو اور جلوس کے ساتھ آگے پیچھے وافر مقدار میں پولیس کی موجودگی ہونی چاہیے ساتھ ہی ایک اعلیٰ اختیار حاصل مجسٹریٹ کی نگرانی میں پورا جلوس نکلے اور اس کی پل پل کی جانکاری ضلع کنٹرول روم کو دی جائے۔ جس طرح کا انتظام الیکشن کے وقت ہوتا ہے اگر ضلع انتظامیہ اس کا انتظام کرے تو بہت سی انہونی سے بچا جاسکتا ہے۔ جلوس نکالنے والوں سے یہ ضرور درخواست کی جائے کہ وہ کوئی اشتعال انگیز نعرہ نہ لگنے دیں

جس سے کسی کا دل دکھے اور حالات بے قابو ہو جائیں۔ یہ بات پولیس کے علم میں ہوتی ہے کہ کون لوگ جرائم پیشہ ہیں اور کون حالات کو بگاڑ سکتے ہیں۔ اگر پولیس ان پر نظر رکھے اور ان کی نقل وحرکت کی نگرانی کی جائے تو بہت ساری ناخوشگوار صورتحال سے بچا جا سکتا ہے۔

ایک وقت تھا کہ مسلمان کسی مذہبی جلوس کو اپنے علاقے سے نکالنے کی مخالفت کرتے تھے۔ میری رائے میں اس طرح کی ضد اور مخالفت صحیح نہیں ہے۔ آپ کسی کو بھی اپنے راستے، گلی اور محلے میں آنے جانے سے نہیں روک سکتے ہیں۔ یہ غیر قانونی اور غیر دستوری بات ہوگی۔ آپ کو سوچنا اور دیکھنا یہ ہے کہ جس راستے سے کوئی جلوس نکل رہا ہے، وہ پرامن طور سے گزرے اور اس کو بلا وجہ چھیڑا نہ جائے بلکہ ان کا استقبال کیا جائے اور اپنے علاقے سے بخیریت گزرنے دیا جائے۔ جلوس نکالنے والوں کی جہاں ذمہ داری ہے کہ ان کی طرف سے کوئی اشتعال انگیزی نہ کی جائے اور بے تکے نعرے اور گالی گلوج نہ ہونے پائے وہیں جس علاقے سے جلوس نکل رہا ہے، وہاں کے لوگوں کی بھی ذمہ داری ہے کہ وہ صبر وضبط سے کام لیں اور جہاں تک ممکن ہو سکے جلوس سے الجھنے کی کوشش نہ کریں۔ میری اس فہمائش پر بہت سے لوگ یہ اعتراض کر سکتے ہیں کہ ہم گویا ڈر کر یہ بات کہہ رہے ہیں۔ نہیں یہ ڈرنے کی بات نہیں ہے بلکہ کمال درجہ کی سمجھ داری ہے۔ تاتاریوں نے جب بغداد پر حملہ کیا مسلم حکومت کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ مسلمان اس قدر مایوس اور خوف زدہ ہو گئے تھے کہ انھوں نے اپنا دفاع بھی کرنا چھوڑ دیا تھا۔ ایک تاتاری سپاہی راہ چلتے کسی مسلمان کو پکڑتا اور اس کو پٹخ دیتا پھر دیکھتا کہ وہ اپنی تلوار اپنے خیمہ میں چھوڑ کر آ گیا ہے تو وہ اس مسلمان شخص کو حکم دیتا کہ تو یونہی پڑا رہ میں خیمہ سے تلوار لے کر آتا ہوں تب تمہیں قتل کروں گا۔ وہ آدمی حالات کے ہاتھوں اس قدر مایوس ہو گیا تھا کہ اس نے اتنی دیر میں کہیں بھاگ کر جان بچانے کی کوشش نہیں کی بلکہ اسی جگہ پڑا رہا۔ پھر وہ تاتاری آیا اور اس نے اس کو قتل کر دیا۔ یہاں تک کہ کوئی تاتاری عورت بھی بڑی بے باکی سے کسی مسلمان کا قتل کر دیتی تھی اور وہ طاقت رکھنے کے باوجود اپنا دفاع نہیں کر پاتا تھا۔ جب کوئی قوم ہمت ہار دیتی ہے اور مایوسی میں گرفتار ہو جاتی ہے تو یہی ہوتا ہے۔

اس دور اور ان حالات میں امام ابنِ تیمیہؒ نے ایک جماعت کھڑی کی جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کام کرتی اور کسی کو غلط کرتے دیکھتی تو فوراً اس کو روکتی ٹوکتی تھی۔

ایک روز امام اور ان کے ساتھی گزر رہے تھے تو انھوں نے دیکھا کہ کچھ تاتاری سپاہی شراب پی رہے ہیں اور جوا کھیل رہے ہیں۔ ان کے ساتھیوں نے کہا چلیں چل کر ان کو منع کریں۔ امام نے ایسا کرنے سے روک دیا، کہا کہ انہیں ان کے حال پر چھوڑ دو۔ جب تک یہ شراپ پیتے رہیں گے اور جوا کھیلتے رہیں گے وہ اس وقت تک کسی مسلمان کا قتل نہیں کریں گے۔ مسلمان کا قتل کرنا شراب پینے اور جوا کھیلنے سے بڑا گناہ ہے۔ لہٰذا مسلمانوں کی جان بچانے کی خاطر انہیں اس طرح کے عمل میں مشغول رہنے دو۔ ہمارے لیے اس واقعے میں بہت سے حکمت کے موتی ہیں جن کو چن کر ہم ایسی حکمت عملی طے کرسکتے ہیں جس سے مسلمانوں کے جان و مال کی حفاظت کی جاسکتی ہے۔

ظاہر ہے یہ اس مسئلہ کا مکمل حل نہیں ہے کیونکہ شرپسند عناصر اپنی شرپسندی سے باز نہیں آئیں گے تاہم اس کے امکان کو ضرور کم کیا جاسکتا ہے۔

جس وقت جس کی حکومت ہوتی ہے چاہے ہم اس کو پسند کرتے ہوں یا ناپسند کرتے ہوں، چاہے ہم نے اس کو ووٹ دیا ہو یا نہیں دیا ہو۔ بہرحال اپنے مسائل کے حل کے لیے اس سے ملنا اور اس کے سامنے اپنی بات رکھنا ضروری ہوگا۔ ممکن ہے وہ آپ کی بات پر دھیان نہ دے یا آپ سے ملنے سے انکار کردے تاہم اتمامِ حجت تو ضروری ہے۔ آپ کھلے خط کے ذریعے اور میڈیا کے ذریعے بھی اپنی بات اس تک پہنچانے کی کوشش ضرور کریں۔

جمہوریت میں پریس، پارلیمنٹ اور عدالت تین ایسے ذرائع ہیں جہاں چارہ جوئی کے لیے رجوع کیا جاسکتا ہے۔ ہمیں ان تینوں ذرائع کا حکمت کے ساتھ استعمال کرنا چاہیے۔ ہم ہر چھوٹے بڑے مسئلہ میں فوراً عدالت میں چلے جاتے ہیں۔ عدالت کے اہل کار بھی اسی سماج سے آئے ہیں۔ لہٰذا ان پر بھی وقت کے غالب رجحان اور سیاست کا اثر ہوتا ہے۔ اس لیے جب تک ناگزیر نہ ہو اور تمام دیگر جمہوری ذرائع ناکام ہوگئے ہوں اس وقت تک عدالت

کو آخری چارہ کار مان کر رجوع کیا جاسکتا ہے۔ مگر عدالت نے حالیہ فیصلوں میں جو رخ اور رجحان دکھایا ہے اس سے انصاف میں یقین رکھنے والے شہریوں کو مایوسی ہوئی ہے۔

یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ جس کی حکومت ہوتی ہے اس کا ہر ادارہ پر قبضہ ہوتا ہے۔ اور کوئی ادارہ یا اہل کار اس سے الگ جا کر کام کرنے کی ہمت کر بھی نہیں سکتا۔ بہر حال ہمیں اپنا دفاع خود کرنا ہے اس لیے کوشش کرنا ہے کہ ہم اپنی طرف سے کوئی ایسا موقع نہ دیں جس سے فتنہ پروروں کو فتنہ پیدا کرنے کا موقع ملے۔ اس کے لیے میرا اصرار ہے کہ ڈرنا نہیں ہے بلکہ صبر، ہمت، اتحاد اور عزم محکم سے کام لینا ہے اور حالات کا پامردی سے مقابلہ کرنا ہے۔

(و) اگر آپ ہندوستان میں فسادات کا جائزہ لیں اور موب لنچنگ جس میں ہجومی تشدد کے ذریعہ کچھ شر پسند لوگ مل کر کسی کی جان لے لیتے ہیں پر غور کریں تو اس میں 70-80% معاملے کا تعلق گئوکشی، گائے کا گوشت، گائے کی اسمگلنگ اور گائے کی تجارت یعنی اس کی خرید و فروخت سے ہے۔ اس کے نتیجے میں اب تک ہزاروں لوگوں کی جان جا چکی ہے اور اربوں کی جائداد کا نقصان ہو چکا ہے۔ لہٰذا اس مسئلے پر سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمارے لیے گائے ان حلال جانوروں میں سے ایک ہے جس کا دودھ اور گوشت کھانا حلال ہے۔ لہٰذا جو حلال ہے اس کو ہم حرام تو نہیں کہہ سکتے لیکن جیسے بعض بیماریوں میں ڈاکٹر بعض چیزوں کو کھانے سے منع کرتے ہیں کیونکہ اس کا نقصان اس کے فائدے سے زیادہ ہے۔ اس لیے جب ہم کو معلوم ہو گیا کہ یہ چیز ہمارے جان و مال کو نقصان پہنچا رہی ہے اور اس کی وجہ سے ہم اکثر مجرموں کے کٹہرے میں کھڑے کر دیے جاتے ہیں تو ہمیں اس کے بارے میں سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے اور پوری ملت کے طور پر ایک واضح پالیسی اپنانی چاہیے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ گائے کوئی مذہبی مسئلہ نہیں ہے بلکہ اس کو مذہبی مسئلہ بنایا گیا ہے اور اسے ایک سیاسی ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ نارتھ انڈیا کے ہندو عموماً گائے کا گوشت نہیں کھاتے ہیں اور اس کو ایک مقدس جانور مانتے ہیں۔ اسے گئوماتا مانتے ہیں اور بعض موقعوں پر اس کی پوجا بھی کرتے ہیں۔ دستورِ ہند کے رہنما اصول کی

دفعہ 48 کے تحت ریاستوں کو ہدایت دی گئی ہے کہ وہ گائے، بچھڑے اور دیگر دودھ دینے والی اور نہیں دینے والے جانور کے ذبیحہ پر روک لگانے کی کوشش کرے۔ ساتھ ہی جانوروں کی افزائش کے لیے سائنٹفک طریقے استعمال کرے۔

برٹش عہد سے ہی ذبیحہ گاؤ کا مسئلہ ما بہ النزاع رہا ہے اور اس کی وجہ سے کئی بڑے فسادات اس عہد میں بھی ہو چکے تھے۔ مغل حکومت اس معاملے میں حساس تھی۔ بابر نے ہمایوں کو گئوکشی بند کرانے کی نصیحت کی تھی۔ اکبر نے اپنے عہد میں باضابطہ اس پر پابندی لگا دی تھی۔ برٹش عہد میں ہندو مسلم تنازعہ طول پکڑنے لگا تو ذبیحہ گاؤ کا مسئلہ زور شور سے شروع ہوا۔ اس کی وجہ سے پنجاب اور دیگر ریاستوں میں کئی بڑے فسادات ہوئے۔ مگر برٹش حکومت نے گئوکشی پر کوئی پابندی نہیں لگائی کیونکہ خود برٹش اہل کار گائے کا گوشت کھاتے تھے اور ان کے تجارتی مفادات اس سے وابستہ تھے۔ خلافت تحریک کے وقت جب ہندو مسلم اتحاد کا غلغلہ بلند ہوا اس وقت مسلمان رہنماؤں کی ایک بڑی تعداد نے گئوکشی پر پابندی لگانے کی مانگ کی جس کی تائید اس عہد کے بڑے علماء نے بھی کی تھی۔ کچھ لوگوں نے اس کی مخالفت بھی کی تھی۔

دستور ساز اسمبلی میں کچھ لوگوں نے گئوکشی پر پابندی لگانے کی مانگ زور شور سے اٹھائی مگر اس پر ان کو ضروری حمایت نہیں ملی۔ اس کے بعد اس مسئلہ کو رہنما اصول کے باب میں درج کر کے ان عناصر کو مطمئن کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ 1966 میں یہ مسئلہ ایک بڑی تحریک کی شکل میں ابھرا اور اس کے خلاف پارلیمنٹ کی گھیرابندی کرنے کی کوشش کی گئی جس کو حکومت نے سختی سے دبا دیا۔

اس تحریک کے نتیجے میں یہ بات طے پائی کہ مرکز اس سلسلے میں کوئی قانون نہیں بنائے گا۔ ریاستی حکومتیں چاہیں تو اپنے یہاں گئوکشی کے خلاف قانون بنا سکتی ہیں۔ لیکن ریاستی حکومتوں نے ہمیشہ لیت ولعل سے کام لیا۔ ادھر کچھ ریاستوں نے جہاں بی جے پی کی سرکار ہے گئوکشی کے خلاف قانون بنائے ہیں مگر اس میں واضح جھول ہے۔ دراصل بھارت میں صرف مسلمان ہی گائے کے گوشت کو حلال نہیں مانتے بلکہ ان کے علاوہ عیسائی، پارسی، یہودی، دلت

آدی باسی اور ہندوؤں کی ایک بڑی تعداد خاص طور سے بنگال، نارتھ ایسٹ اور ساؤتھ کی ریاستوں میں گائے کا گوشت کھاتی ہے۔ 12/جنوری 2022 کو ہندوستانی تجارتی اخبار منٹ میں شائع ایک رپورٹ کے مطابق ہندوستان میں 80 ملین لوگ گائے کا گوشت کھاتے ہیں جن میں 12 ملین ہندو ہیں۔

بی جے پی اترپردیش، ہریانہ، مدھیہ پردیش اور ہندی پارٹ لینڈ کی دیگر ریاستوں میں جہاں گئوکشی پر پوری پابندی لگاتی ہے اور اس کے خلاف سخت قانون بناتی ہے جس میں عمر قید اور سزائے موت تک شامل ہے وہیں نارتھ ایسٹ میں اور گوا میں جہاں اس کی حکومت ہے لوگوں کو اپنی طرف رجھانے کے لیے یہ اعلان کرتی ہے کہ وہ بی جے پی کو ووٹ دیں انہیں اعلیٰ قسم کا گائے کا گوشت فراہم کرایا جائے گا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ مسئلہ مذہبی نہیں بلکہ خالص سیاسی ہے۔ جہاں گئوکشی بند کرنے کے نام پر ووٹ مل سکتا ہے وہاں گئوکشی پر پابندی لگائی جاتی ہے اور جہاں اس کی اجازت دینے پر ووٹ مل سکتا ہے، وہاں اس کی کھلی چھوٹ دی جاتی ہے۔

ویسے بھی ہندوستان کی 90% آبادی گوشت خور ہے، صرف 10% لوگ ہیں جو خالص سبزی خور ہیں۔ ہندوستان دنیا میں گوشت برآمد کرنے والا دوسرا سب سے بڑا ملک ہے۔ 2020-2021 میں بیف ایکسپورٹ سے 3.17 بلین ڈالر کا زرمبادلہ حاصل ہوا تھا۔ جس میں یوپی کا کل برآمد 64% ہے۔ اس کے بعد پنجاب اور مہاراشٹر ہے۔ بھارت دنیا کے ستر ملکوں میں گوشت برآمد کرتا ہے۔ اس طرح بھارت کے برآمدات میں گوشت کا خاص طور سے بھینس کے گوشت کا بہت بڑا حصہ ہے۔

یہی وجہ ہے کہ بھارت سرکار گائے کے گوشت کے نام پر چاہے جتنی سیاست کرے گوشت پر پابندی لگانے سے گریز کر رہی ہے۔

سوال یہ ہے کہ اس سلسلے میں مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیے۔ میں ذاتی طور پر صدر جمعیۃ العلماء مولانا ارشد مدنی صاحب کی رائے سے اتفاق رکھتا ہوں جس میں انھوں نے بھارت سرکار سے گائے کو قومی جانور قرار دے کر پورے ملک میں گئوکشی پر مکمل پابندی لگانے کی مانگ

کی ہے۔حکومت چاہے گئوکشی پر پابندی لگائے یا نہ لگائے مسلمان ازخود اپنے اوپر یہ پابندی لگالیں کہ وہ نہ گائے پالیں گے، نہ اس کی خرید وفروخت کریں گے نہ اس کو ذبح کریں گے اور نہ اس کی قربانی دیں گے۔مسلمان اجتماعی طور پر ایسا کوئی فیصلہ لیتے ہیں تو گائے کے نام پر جو سیاست ہورہی ہے اور اس کی وجہ سے معصوم جانیں ضائع ہوتی ہیں اس پر قدغن لگے گی اور شاید فرقہ پرستی کا زہر جن بنیادوں پر بویا جارہا ہے اس کا تریاق ڈھونڈنے میں مدد ملے گی۔لہٰذا وقت آ گیا ہے کہ مسلمان اپنی طرف سے یہ پہل کریں اور حالات کو مزید بگڑنے سے بچائیں۔ اس وقت یہ صحیح حکمت عملی مانی جائے گی۔

مسلمانوں میں جو لوگ مویشی پروری کرنا چاہتے ہیں ان کو میرا مشورہ یہ ہے کہ وہ بھینس پالیں اور بھینس کی ڈیری کھولیں۔ اس کے ساتھ پالٹری فارمنگ، گوٹ اور شپ فارمنگ، برڈ فارمنگ اورفش فارمنگ کچھ ایسے ذرائع ہیں جس کو اپنایا جاسکتا ہے۔

دراصل بیف اور اس سے متعلق جو بھی تنازعہ ہے وہ سیاسی شعبدہ بازی ہے۔ بھارت میں جو چھ بڑے بیف ایکسپوٹر ہیں ان میں تین ہندو ہیں۔ایک کمپنی ہے جس کا نام عربین ایکسپورٹ پرائیویٹ لمٹیڈ ہے جس کے مال سنیل کپور ہیں۔دوسری کمپنی ہے ام کے ار فروزن فوڈ ایکسپورٹ اس کے مالک مدن ابوٹ ہیں اور تیسری کمپنی ہے پی ایم ایل انڈسٹریز اس کے مالک اے ایس بندرا ہیں۔ان لوگوں کے خلاف کوئی مہم نہیں ہے۔ بھارت میں خودرہ میٹ کا کاروبار زیادہ تر مسلمان کرتے ہیں، لہٰذا ان کو پریشان کرنے کے لیے اور ان کے کاروبار کو نقصان پہنچانے کے لیے یہ ساری شرانگیزیاں کی جارہی ہیں۔

ایک دوسرا تنازعہ لوگوں نے حلال اور جھٹکا کا کھڑا کر رکھا ہے۔سکھ صرف جھٹکا میٹ ہی کھاتے ہیں۔عیسائی جھٹکا اور حلال میں کوئی فرق نہیں کرتے ہیں۔صرف مسلمان اور یہودی ہیں جو باضابطہ ذبیحہ کے ذریعے ہی گوشت کو حلال کرکے کھاتے ہیں۔ ہندوؤں میں جو لوگ گوشت کھانے والے ہیں وہ بھی جھٹکا، حلال بلکہ مردار میں بھی کوئی فرق نہیں کرتے۔اس لیے کہ ان کے لیے یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ پھر کوئی کسی پر زبردستی تو کر نہیں رہا ہے کہ وہ حلال طریقے سے ذبح کیا

گیا گوشت ہی کھائے۔ ایسے بہت سے لوگ ہیں جو جھٹکا گوشت کا کاروبار کرتے ہیں بلکہ کچھ اسٹارٹپ کمپنی بھی جھٹکا گوشت کا کاروبار کرتی ہیں۔ اس لیے جن لوگوں کو حلال گوشت نہیں کھانا ہے وہ نہ کھائیں اور جو لوگ حلال گوشت کھاتے ہیں یا اس کا کاروبار کرتے ہیں ان سے تعرض نہ کریں۔ مگر جب مقصد شر پسندی ہو تو اس کا کوئی جواب نہیں ہے۔ ظاہر سی بات ہے کسی کی اتنی ہی بات مانی جائے گی جتنا ممکن ہے اب اس کی وجہ سے مسلمان حرام گوشت کی تجارت تو نہیں کر سکتے۔ لہٰذا اس معاملہ میں اپنا موقف پوری طرح واضح کرنے کی ضرورت ہے۔

مندروں کے آس پاس گوشت کی تجارت نہ ہو مخصوص دونوں میں گوشت پر پابندی لگا دی جائے۔ اس سلسلے میں حکومت کی طرف سے جو حکم نامہ جاری ہوتا ہے اس کی پابندی کی جانی چاہیے اور جو باتیں غیر معقول، غیر قانونی اور غیر دستوری ہیں پہلے تو ان کو جمہوری طور پر حل کرنے کی کوشش کی جانی چاہیے، بصورتِ دیگر عدالت سے بھی رجوع کیا جا سکتا ہے۔

بہر حال اس پوری بحث کا مقصد یہ ہے کہ اس مسئلہ میں جو منافقت ہے اس کو واضح کرنا ہے اور دوسرا یہ کہ لوگوں کو محتاط رویہ اختیار کرنے کی نصیحت کرنا ہے اور تمام متبادل پہلوؤں پر غور کرتے ہوئے اقدام کرنا ہے۔ مجھے معلوم ہے یہ سیاست زیادہ دن نہیں چلے گی۔ مسلمان اگر اپنی طرف سے تھوڑی حکمت کا مظاہرہ کریں تو اس غبارے کی ساری ہوا خود بخود نکل جائے گی۔

(ز) ان دنوں ہندو انتہا پسند بر گیڈ نے ایک آل آؤٹ جنگ کا اعلان کر رکھا ہے۔ اور وہ مسلم شناخت کی ہر ایک چیز پر پوری جارحیت کے ساتھ حملہ آور ہو رہے ہیں۔ ان میں ایک مسئلہ لاؤڈ اسپیکر پر اذان کا ہے، دوسرا کھلی جگہوں پر نماز ادا کرنے کا ہے اور تیسرا مسئلہ حجاب کا ہے۔ اذان پانچ وقت بمشکل پانچ منٹ کے لیے ہوتی ہے جس پر کسی طرح شور کا اطلاق نہیں ہوتا۔ پانچ وقت میں صرف صبح کا وقت ایسا ہے جس وقت جو لوگ مسلمان نہیں ہیں ان کو کچھ پریشانی ہو سکتی ہے جبکہ فجر کی نماز میں اذان لوگوں کو نیند سے جگانے کے لیے دی جاتی ہے۔ باقی اوقات میں جو دن بھر کی ہما ہمی رہتی ہے اس میں اذان سے کسی کو کوئی دقت نہیں ہونی چاہیے۔ مگر شرارت کے تحت اس مسئلہ کو بڑی شدت سے اٹھایا جا رہا ہے جس کا مقصد

لوگوں کے جذبات کو بھڑکا کر اس سے سیاسی فائدہ اٹھانا ہے۔ اگر کوئی ہندو وادی گروہ اذان کے اوقات میں مندروں میں لاؤڈ اسپیکر سے ہنومان چالیسا پڑھنا چاہتا ہے یا بھجن کیرتن اور آرتی کرنا چاہتا ہے تو اس سے مسلمانوں کو کیا شکایت ہوسکتی ہے وہ شوق سے ان اوقات میں عبادت کریں۔ لیکن مقصد عبادت نہیں ہے بلکہ شرارت اور شر انگیزی ہے اس لیے خواہ مخواہ کا تنازعہ کھڑا کرنے کے لیے وہ ان اوقات میں مسجدوں کے سامنے ہنومان چالیسا پڑھنے کی ضد کررہے ہیں تاکہ مسلمان بھڑکیں اوران کو فساد کرنے کا موقع مل جائے۔ سپریم کورٹ نے اس سلسلے میں جو گائیڈ لائن دی ہے اور حکومت نے جو احکامات صادر کیے ہیں مسلمان اس کو مان کر اس پر عمل کرنے کو تیار ہیں۔ مگر انتہا پسند گروہ کا مطالبہ ہے کہ لاؤڈ اسپیکر پر اذان بالکل بند کی جائے۔ لاؤڈ اسپیکر پر اذان نہ فرض ہے اور نہ لازمی ہے۔ اذان تو اس وقت بھی دی جاتی تھی جس وقت لاؤڈ اسپیکر نہیں تھا۔ اس لیے بلا لاؤڈ اسپیکر کے بھی اذان دی جاسکتی ہے۔ مسئلہ یہ نہیں ہے۔ آپ ایک شرارت کا تدارک کریں گے تو دوسری شرارت شروع ہوجائے گی۔ سوال یہ ہے کہ یہ بات کب تک اور کہاں تک جائے گی اور مسلمان کس کس بات پر اور کہاں کہاں کمپرومائز کریں گے۔ کھلی جگہوں پر نماز پڑھنے کی مخالفت کی جاتی ہے۔ اور یہ پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے کہ دراصل اس جگہ پر قبضہ کرنے کی سازش ہے۔ کیونکہ مسلمان جہاں ایک بار نماز پڑھ لیتے ہیں وہ مسجد ہوجاتی ہے۔ اس طرح ناجائز طریقے سے زمین پر قبضہ کرنے کے لیے وہ کھلی جگہوں پر نماز پڑھنے پر اصرار کرتے ہیں۔ جبکہ بات بالکل یہ نہیں ہے۔ جہاں مسجد نہیں ہے یا مسجد کے اندر اتنی جگہ نہیں ہے جہاں سارے لوگ مسجد کے اندر نماز ادا کرسکیں وہیں مسلمان کھلی جگہوں پر نماز پڑھتے ہیں اور خاص طور سے دو موقعوں پر ہوتا ہے۔ ایک ہفتہ میں جمعہ کے دن محض آدھ سے ایک گھنٹے کے لیے وہ سڑک، پارک یا اور کسی کھلے مقام پر نماز پڑھنے کو مجبور ہوتے ہیں یا پھر عید کے موقع پر۔ ورنہ عام دنوں میں جو پانچ وقت کی نماز ہوتی ہے اس میں یہ نوبت نہیں آتی ہے۔ اعتراض کرنے کے لیے مسلمان بھی اعتراض کرسکتے ہیں کہ بعض ہندو تہواروں کے موقع پر ایک ایک ہفتہ کے لیے پوری پوری سڑک بند کردی جاتی ہے مگر مسلمانوں

نے کبھی اس پر اعتراض نہیں کیا۔ دوسرے کسی کھلے مقام پر نماز پڑھنے سے وہ جگہ اس وقت تک مسجد نہیں ہوسکتی جب تک مسلمان باضابطہ اس کو خرید نہ لیں۔ کسی زمین پر ناجائز قبضہ کر کے مسجد نہیں بنائی جاسکتی ہے۔ ایسا کرنا قطعی جائز نہیں ہے۔ اس لیے کھلی جگہ پر نماز پڑھنے سے یہ خطرہ کبھی پیدا نہیں ہوگا۔ ہاں کھلی جگہ پر نماز پڑھنے سے یہ بات ضرور ثابت ہوتی ہے کہ جو لوگ مسلمانوں پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ وہ اس ملک کے وفادار نہیں ہیں یا ان کے دل میں حب الوطنی کا جذبہ نہیں ہے ان کے اس اعتراض کا قلعہ قمع ہو جاتا ہے کہ مسلمان اس ملک کے چپے چپے کو پاک مانتے ہیں۔ اس لیے کہ پاک جگہوں پر ہی سجدہ کیا جاسکتا ہے۔ تو جس ملک اور جگہ کو وہ مسجد کی طرح پاک مانتے ہیں اس سے محبت اور عقیدت نہ ہونے کا سوال کہاں سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ مسلمانوں کی اس ملک سے محبت اور عقیدت کی واضح دلیل ہے جس کو دیکھ کر انتہا پسند لوگوں کے اوسان خطا ہو جاتے ہیں اور وہ اس مظاہرہ پر روک لگا کر اپنے غلط پروپیگنڈہ کو پھیلانے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

بہرحال ان باتوں کی وجہ سے ہمیں اپنے مساجد کے نظام پر از سر نو غور کرنے کی ضرورت ہے۔ مسجد کی تعمیر کے وقت اس کی بنیاد ایسی رکھی جائے جس سے حال اور مستقبل کی ضرورتوں کا لحاظ کرتے ہوئے حسبِ ضرورت اس کی توسیع کی جاسکے تاکہ سڑکوں پر یا مسجد کے باہر نماز پڑھنے کی ضرورت پیش نہ آئے۔ مردوں کے ساتھ مسجد میں عورتوں کے لیے بھی گنجائش پیدا کی جائے تاکہ وہ کم از کم جمعہ اور عیدین کی نماز مسجد میں پڑھ سکیں۔ اس کے لیے عورتوں کی مخصوص مسجد بھی بنائی جاسکتی ہے۔ دوسری مسجد صرف نماز پڑھنے کی جگہ نہ ہو بلکہ وہ کمیونٹی سینٹر ہو اور اس کے ذریعہ فلاحی اور دیگر کاموں کو انجام دیا جائے اور مسجدوں کے آس پاس جو غیر مسلم آبادی ہے اس کو مسجد سے جوڑا جائے اور ان کی ضرورت کے وقت مسجد کے ذریعے ضروری سہولتیں فراہم کرائی جائیں۔ مثلاً مسجدوں کے ذریعے کھانا یا کپڑا تقسیم کرادیا جائے۔ دوا علاج کی سہولت بہم پہنچائی جائے۔ ایمبولنس اور دیگر سہولیات کا انتظام کیا جائے تاکہ مقامی آبادی مسجد کی سماجی اہمیت سے واقف ہو۔ مسجد میں چھوٹے بچوں اور بڑے لوگوں کے لیے دینیات

کی تعلیم کا نظم ہوتا کہ لوگ دین کی بنیادی باتوں سے واقف ہوسکیں۔غرض مسجد کو مسلمان آبادی کا دھڑکتا دل بنانے کی ضرورت ہے، جس میں غیر مسلموں کے لیے بھی گنجائش ہونی چاہیے۔ کووڈ کے درمیان بہت ساری مسجدوں کو علاج کا مرکز بنایا گیا تھا اور وہاں لوگوں کو آکسیجن فراہم کرایا گیا تھا۔ اس طرح کی کوششوں کو وسعت دینے کی ضرورت ہے۔ہمیں کسی حال میں Reactionary نہیں بننا ہے بلکہ Pro-active ہوکر حالات کا مقابلہ کرنا ہے۔

حجاب بالکل نجی مسئلہ ہے اور اس کا تعلق ایک عورت کی ذاتی پسند اور آزادی سے ہے کسی کی نجی آزادی پر قدغن لگانے کا حق کسی کو نہیں ہے۔مگر چونکہ حجاب مسلمان شناخت کی پہچان ہے اس وجہ سے لوگوں کو پریشانی ہورہی ہے۔ دراصل پہلے یہ پروپیگنڈہ کیا گیا کہ چادر اور چہار دیواری مسلمان عورت کو قید میں رکھنے کی کوشش ہے۔اب وہی عورت چادر کے ساتھ چہار دیواری سے باہر آکر تعلیم حاصل کررہی ہے اور زندگی کے مختلف میدانوں میں اپنی شناخت کے ساتھ آگے بڑھنا چاہتی ہے تو ان تمام لوگوں کے ذریعے بنائے گئے مصنوعی پروپیگنڈہ کی دیوار ڈھیتی نظر آرہی ہے تو ان کے پیٹ میں مروڑ اٹھ رہا ہے اور وہ اس Empowerment with Identity کو یعنی اپنی شناخت کے ساتھ اپنی طاقت وری کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔لیکن مسلمان لڑکیاں اس وقت خود اعتمادی سے بھرپور اپنی شناخت کے ساتھ جینے کا عزم کرچکی ہے اور وہ صرف ہندوستان میں نہیں بلکہ یوروپ اور امریکہ میں بھی اپنے حق کی لڑائی لڑ رہی ہیں جس میں آخری فتح ان کی ہوگی اور جو لوگ اسلاموفوبیا اور اسلام سے نفرت میں گرفتار ہیں وہ اپنے عزائم میں کبھی کامیاب نہیں ہوں گے۔ یہ دور بظاہر تو اسلام اور مسلمانوں کو دبانے کا دور لگتا ہے لیکن مجھے اس میں امید کی ایک کرن نظر آرہی ہے اور یہ اسلام کے ایمرجنس کا دور معلوم ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ چیزیں اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہیں۔ جب اسلام اور غیر اسلام کا کھلا مقابلہ ہوگا تو انشاءاللہ آخری فتح اسلام کی ہوگی۔ بقول شاعر

حضورِ حق سے ملی ہے عجیب سی فطرت
ذرا دبے تھے زیادہ ابھر گئے ہم لوگ

اور اقبال نے کہا:

مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفان مغرب نے

بلکہ اقبال نے یہاں تک کہہ دیا کہ

خدا تجھے کسی طوفان سے آشنا کر دے

کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

اس لیے حالات سے گھبرانے کی نہیں بلکہ بغیر کسی جارحیت کے اپنے موقف پر جمے رہنے کا وقت ہے، جس کو Passive Resistance کہتے ہیں۔

(ح) اسلام ایک نصیحت ہے جس کا جی چاہے قبول کرے جس کا جی چاہے انکار کردے۔ ہم کسی جبر کے قائل نہیں اور نہ کسی کا دین خریدنا چاہتے ہیں۔ ہم صرف اللہ کا پیغام اللہ کے بندوں تک بغیر کسی جبر دباؤ، لالچ اور رکاوٹ کے پہنچانا چاہتے ہیں۔ اس کا سب سے اچھا طریقہ یہ ہے کہ لوگوں کی زبان میں اسلام کی اصولی دعوت تحریری یا زبانی شکل میں بہترین دلائل، اچھی نصیحت، انتہائی اخلاص اور محبت کے ساتھ پہنچا دیا جائے اور لوگوں پر چھوڑ دیا جائے کہ وہ اس معاملے میں کیا موقف اختیار کرتے ہیں۔ یہ تاریخ کا سب سے بڑا جھوٹ ہے کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا۔ تلوار کے زور سے زمینوں پر قبضہ کیا جا سکتا ہے دلوں پر نہیں۔ اگر اس میں تھوڑی بھی صداقت ہوتی تو قریب ساڑھے چھ سو سال کی حکومت میں جن علاقوں پر مسلمان بادشاہوں کی حکومت تھی وہاں کی اکثریت مسلمان ہوتی۔ مگر دہلی اور اس کے آس پاس کی ریاستوں میں کبھی بھی مسلمانوں کی آبادی دس پندرہ فیصد سے زیادہ نہیں رہی۔ جو اس بات کا ثبوت ہے کہ جبر کی بات غلط ہے۔ بادشاہوں نے اپنے جنگی عزائم کے لیے مذہب کا استعمال ضرور کیا تھا مگر وہ صرف حکمرانوں تک محدود تھا عوام پر کوئی جبر نہیں کیا گیا تھا۔ اس سلسلے میں جو کہانیاں گڑھی گئی ہیں، وہ سب فرضی ہیں۔ اس وقت تاریخ کو جس طرح غلط انداز میں اور Selective طریقے سے پیش کیا جاتا ہے اس کے پیچھے سیاسی مقصد ہے اور تاریخ کو ایک سیاسی ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے۔ عام لوگ جو تاریخ سے پوری طرح واقف نہیں

ہیں ان کو غلط تاریخ بتا کر ان کے جذبات کو آسانی سے مشتعل کیا جاسکتا ہے اور یہ کام اس وقت بڑے پیمانے پر ہو رہا ہے۔ نصابی کتابوں سے عہدِ وسطیٰ کی تاریخ کو حذف کرنے کے پیچھے بھی یہی مقصد ہے تاکہ نئی نسل کو ایک ایسی فرضی تاریخ بتائی جائے جس سے ان کے ذہنوں میں مسلمانوں کے خلاف نفرت کے سوا اور کوئی دوسری بات نہ جائے۔

ہمارے بہت سے واعظین اور پر جوش مبلغین غیر مسلموں میں اسلام کی دعوت کو پہنچانے پر بہت زور دیتے ہیں بلکہ سوشل میڈیا، یوٹیوب اور دوسرے ذرائع سے اپنے کارناموں کی خوب خوب تشہیر کرتے ہیں۔ حقیقت بہت معمولی ہوتی ہے مگر اس کو اس طرح بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں جیسے انھوں نے ہمالیہ پہاڑ کی چوٹی سر کر لی ہو۔ نیتوں کا حال تو اللہ کو معلوم ہے۔ لہٰذا میں اس پر تبصرہ نہیں کروں گا مگر میرے خیال میں یہ ایک غیر حکیمانہ طرزِ عمل ہے جس سے بچنے کی ضرورت ہے۔

اس وقت غیر مسلموں سے زیادہ مسلمانوں میں تبلیغ دین کی ضرورت ہے۔ مسلمان مرد وخواتین کی غالب اکثریت غریب اور اَن پڑھ ہے جن کو کلمہ اور دین کی بنیادی باتیں بھی معلوم نہیں ہیں اور ہماری بڑی آبادی کفر اور اسلام کی سرحد پر کھڑی ہے اس لیے کسی اور طرف دیکھنے کے بجائے اپنے گھر کی فکر کرنے کی ضرورت ہے۔ قرآن نے کہا اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو جہنم کی آگ سے بچاؤ۔ مگر ہم اس سے بے پروا ہو کر کام کر رہے ہیں۔ ہم دوسروں کے گھر میں لگی آگ بجھانے کے لیے بے چین ہیں اور اپنے گھر میں جو آگ لگی ہے اس سے بے پروا ہیں۔ یہ ایک غلط اور غیر فطری ترجیح ہے۔ اس لیے اس وقت حالات کا تقاضہ یہ ہے کہ ہمارے پاس جو بھی صلاحیت ہے، وسائل ہیں، مردانِ کار ہیں ان کو جوڑ کر امت کی اصلاح اور تعمیر میں لگائیں جس کا پورے سماج پر ایک مثبت Percolating اثر پڑے گا۔ اس سے ہماری اپنی سماجی، ثقافتی حالت بہتر ہوگی، ساتھ ہی دوسرے سماج پر بھی اس کا مثبت اثر پڑے گا۔ میں یہ نہیں کہتا ہوں کہ اسلام سے لوگوں کو واقف نہ کرایا جائے مگر مجھے اس بات پر اصرار ہے کہ اس کے پیچھے کنورسن کا کوئی جذبہ نہیں ہونا چاہیے۔

یہ ایک عجیب طرفہ تماشہ ہے کہ اس وقت ایک غالب اکثریت کو جس کی ملک کے چند چھوٹے شہروں اور قصبات کو چھوڑ کر اور کشمیر گھاٹی کے علاوہ ہر جگہ، ہر ریاست میں واضح اکثریت ہے وہ اپنے سے چار گنا چھوٹی اقلیت سے جو ہر طرح کے حالات کی ماری انتہائی پسماندہ اور کمزور اقلیت ہے اس سے اس کو ڈرایا جاتا ہے۔ ایک طرف کہا جاتا ہے کہ مسلمان چار بیویاں اور چالیس بچے پیدا کر کے ہندوؤں کی آبادی کو کم کرنے میں لگے ہیں۔ وہ برتھ کنٹرول نہیں کرتے۔ اس طرح ان کی آبادی بڑھتی جارہی ہے اگر یہی رفتار رہی تو وہ ہندو آبادی سے زیادہ ہوجائیں گے اس طرح یہ ملک ہندو ملک نہیں رہ پائے گا اور اس ملک میں جمہوریت اور سیکولرزم بھی باقی نہیں رہے گی۔ دوسری طرف مسلمان لو جہاد کے ذریعے ہندو لڑکیوں کو پریم جال میں پھنسا کر ان کا دھرم پری ورتن کرار ہے ہیں اور تیسری طرف کنورسن کے ذریعہ اپنی آبادی بڑھا رہے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ تمام دستوری ضمانتوں اور ذہن وضمیر اور مذہب کی آزادی کے حق کے باوجود ریاستی حکومتیں دھڑا دھڑ کنورسن کے خلاف قانون بنا رہی ہیں اور ان لوگوں کو جنھوں نے تبدیل مذہب کیا ہے یا جن پر الزام ہے کہ انھوں نے مذہب تبدیل کرایا ہے ان کو جیلوں میں ڈال رہی ہے اور جھوٹے مقدمات میں پھنسا کر ان کو پریشان کر رہی ہے۔

کنورسن ہمیشہ سے ایک حساس مسئلہ رہا ہے۔ اب ماس کنورسن کا دور بیت چکا ہے۔ اکا دکا لوگ کل بھی آرہے تھے آج بھی آئیں گے۔ اسی طرح بہت سے لوگ اسلام سے نکل کر باہر جارہے ہیں۔ اس وقت کے سماج اور حالات میں یہ ایک ذاتی مسئلہ ہے جس کو جماعتی مسئلہ بنانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمیں اپنے سماج میں صحیح تعلیم و تربیت کے ذریعے حالات کو سدھارنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اگر ہم اپنے سوادِ اعظم کو سنبھالنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں تو پھر ہر خطرے اور چیلنج کا مقابلہ کرنا آسان ہوجائے گا۔ اس وقت پر جوش داعی بننے کی ضرورت نہیں ہے۔

ہم نے اس مضمون میں 2019 کے بعد جو حالات، مسائل، چیلنجز اور ایشوز ہیں اس

پر صلح حدیبیہ کی اسپرٹ کو سامنے رکھ کر ایک دفاعی صلح پسندانہ، نرم اور مبنی بر حقیقت حکمت عملی کی وکالت کی ہے۔ مجھ پر یہ الزام لگایا جا سکتا ہے کہ میں نے ڈر کر اور ایک شکست خوردہ ذہنیت سے یہ موقف اختیار کیا ہے۔ میں اپنی صفائی میں کوئی بات نہیں کہنا چاہتا۔ مگر یہ ضرور کہوں گا کہ موجودہ حالات کی جو بھی میری سمجھ ہے، میں نے پوری ایمانداری کے ساتھ اپنے موقف کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ملت کے زعماء، دانشور، اصحابِ فکر اس کو کس انداز سے دیکھتے اور سمجھتے ہیں یہ ان پر منحصر کرتا ہے۔ میں یہ باتیں کسی پر تھوپ نہیں رہا ہوں بلکہ غور وفکر اور وسیع بحث وتمحیص کے لیے پیش کر رہا ہوں۔ یہ وہ باتیں ہیں جو دفاعی حکمت عملی کے طور پر آپ کے سامنے پیش کی گئی ہیں۔ اب ہم خاص طور پر ان پہلوؤں پر نظر ڈالیں گے جو ملی تعمیر واستحکام کے لیے ضروری ہیں، جس کو ہم اقدامی حکمت عملی کہہ سکتے ہیں۔

اقدامی حکمت عملی

حدیث میں آتا ہے کہ قیامت قائم ہو چکی ہے اور تمہارے ہاتھ میں ایک پودہ ہو اگر اتنی مہلت میسر ہو کہ تم اس کو زمین میں لگا سکتے ہو تو زمین میں لگا دو۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انتہائی مایوس کن حالات میں بھی انجام سے بے پروا ہو کر امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹنے دینا چاہیے اور اپنی ذمہ داری ادا کرنے میں کوتاہی نہیں برتنی چاہیے۔

اوپر میں نے جن باتوں کا ذکر کیا ہے اس کے علاوہ اس وقت بھارت کی ہوا فضا میں چار باتیں اور سننے کو مل رہی ہیں جس کا مطلب ہے کہ بھارت کے اندر اور باہر سے بدلنے کی بھرپور کوشش ہو رہی ہے۔ اس میں ایک بات بھارت کو ہندو راشٹریہ بنانے کی ہے۔ جس کا مطلب ہے کہ بھارت کا جو سیکولر کردار ہے اس کو بدل کر اس کو ہندو غلبہ کی حکومت قائم کرنا جس کے تحت یہاں کی جو مذہبی اقلیتیں ہیں بالخصوص مسلمان اقلیت اس کے تمام شہری حقوق سلب کر کے اسے دوسرے درجہ کا شہری بنانا ہے۔

دوسری بات بھارت میں یکساں سول کوڈ کا نفاذ ہے۔ یعنی اس وقت جو آدھا ادھورا ناقص سا پرسنل لا نافذ ہے اس کو ختم کر کے اس کی جگہ پر یکساں سول کوڈ نافذ کرنے کی بات

بہت دنوں سے چل رہی ہے۔ اس معاملے میں بھارت کے سپریم کورٹ کا رخ بھی جارحانہ ہے، جس کا اظہار وہ کئی بار اپنے فیصلوں میں کرچکی ہے۔ بی جے پی کے ایجنڈے میں یہ مسئلہ بہت دنوں سے ہے اور اس کی کوشش رہی ہے کہ جب اسے ایوان میں واضح اکثریت حاصل ہوجائے گی تو وہ یکساں سول کوڈ کو نافذ کرے گی۔ اس وقت ایوان میں واضح اکثریت حاصل ہے۔ لہٰذا اس بات کا امکان غالب ہے کہ وہ 2024 کے الیکشن سے پہلے پہلے یکساں سول کوڈ کا بل پارلیمنٹ میں لے آئے۔ اس کے لیے تیاری شروع ہوچکی ہے اور کئی ریاستی حکومتوں نے جہاں بی جے پی کی حکومت ہے اس بل کو پاس کرنے کے حق میں مہم شروع ہوگئی ہے۔

تیسری چیز مسلمانوں کے جینوسائڈ یعنی قتلِ عام کی بات بھی کھلے لفظوں میں دھرم سنسد میں کی جانے لگی ہے اور حکومت نے نہ صرف ایسے لوگوں کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی ہے بلکہ ان کی پشت پناہی کی جارہی ہے بلکہ یہ سب حکمراں جماعت کے اشارے پر ہورہا ہے۔

اور چوتھی بات مسلمانوں کا معاشی بائیکاٹ کی ہے۔ جگہ جگہ پر مسلمانوں سے کوئی چیز خریدنے اور ان کو کوئی چیز بیچنے کے خلاف مہم چلائی جارہی ہے اور اس سلسلے میں باضابطہ حلف برداری کی جارہی ہے۔ مسلمان پھیری والے، سبزی والے، پھل والے اور چھوٹا موٹا کام کرنے والے لوگوں کو بعض علاقوں میں وہاں جاکر کوئی چیز بیچنے سے روکا جاتا ہے۔ ہمارا احساس ہے کہ وقت کے ساتھ ان تمام چیزوں میں اضافہ ہوگا کیونکہ اس کے پیچھے سیاسی عناصر ہیں، جو ان تمام معاملات کو ہوا دے رہے ہیں۔

حالات سخت اور چیلنج سے بھرے ہوئے ہیں لیکن یہاں پر جہاں ہمارے عزم اور حوصلہ کا امتحان ہے ہماری حکمت اور دانائی کا بھی امتحان ہے۔ میری رائے میں کوئی قدم جوکھم اور نقص سے پاک نہیں ہوگا۔ جوکھم اٹھانے میں جہاں ناکام ہوجانے کا اندیشہ ہے وہیں اس کا امکان بھی ہے کہ ہم کامیاب ہوسکتے ہیں۔ لیکن اگر ہم نے ہمت نہیں کی تو ناکامی ہماری مقدر ہوگی اور کوئی ہم کو اس سے بچا نہیں سکتا ہے۔ لہٰذا ہمیں ہمت کے ساتھ اقدام کرنا ہی ہوگا۔ میری رائے میں اس کا مندرجہ ذیل راستہ ہے:

(۱) اس کے باوجود کہ نام نہاد سیکولر سیاسی پارٹیوں نے اپنی منافقت کی وجہ سے سیکولرزم، لبرزم اور دستوری آئیڈیل کو بہت نقصان پہنچایا ہے مگر ملک میں سیکولرزم اور نظریہ ہند جس کو آئیڈیا آف انڈیا کہتے ہیں اس کو ناکام ہونے سے ہر حال میں بچانا ہے اس لیے کہ اس کا متبادل فاشزم ہے، جس سے بری کوئی چیز ہو نہیں سکتی ہے۔ اس لیے مسلمانوں کو اپنا پورا وزن ملک میں سیکولرزم اور لبرزم کے لیے کام کرنے والی جو قوتیں ہیں ان کے پلڑے میں ڈالنے کی ضرورت ہے، موجودہ وقت میں ڈیڑھ اینٹ کی الگ سے مسجد بنانے کا نہیں ہے۔ ہم سب ایک ہی کشتی میں سوار ہیں۔ ڈوبیں گے تو ایک ساتھ اور کنارے لگیں گے تو ایک ساتھ، اس لیے بہت سوچ سمجھ کر اور اجتماعی طور پر سیکولرزم کو بچانے اور اس کو مضبوط کرنے کی ضرورت ہے۔ ابھی بھی اس کا امکان موجود ہے۔ اس لیے بھارت کے دستور کو بچانا اور سیکولرزم کی حفاظت کرنا اس وقت ہماری پہلی ترجیح ہونی چاہیے۔

(۲) جہاں تک پرسنل لا کے دفاع کا سوال ہے۔ اس کا تعلق حکومت کے قانون سے زیادہ ہمارے عملی رویہ سے ہے۔ اگر مسلمانوں کے اندر صحیح اسلامی تعلیم دی جائے اور لوگ اس کو ایمانداری سے برتنے کے لیے تیار ہو جائیں اور اسلام نے عورتوں کو جو حقوق اور اختیارات دیے ہیں اس کا صحیح طریقے سے التزام کیا جائے تو اس کے باوجود کہ ملک میں یکساں سول کوڈ بنا دیا جائے آپ اپنے دین اپنی شریعت پر عمل کر سکتے ہیں۔ جب حق تلفی ہوگی اور معاملہ عدالت میں جائے گا وہاں یکساں سول کوڈ کا معاملہ پیدا ہوگا۔ اگر آپ اپنے مسائل اندرونِ خانہ اور اپنی سوسائٹی میں حل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو اس کا نقصان کم سے کم ہوگا۔ اس وقت یہی ایک راستہ ہے۔ لہٰذا پہلی ضرورت مرد و عورت کو اسلامی تعلیمات سے واقف کرانے کی ہے اور دوسری ضروری اس کے رضا کارانہ نفاذ کا ماحول بنانے کی ہے۔ یہ ہمارے سامنے ایک بڑا چیلنج ہے۔ ملت کے زعماء اور علماء کو اس سلسلے میں واضح روڈ میپ بنانا چاہیے تاکہ یکساں سول کوڈ کے مضمرات سے ملت کے مرد و خواتین کو بچایا جا سکے۔

(۳) جہاں تک مسلمانوں کے قتلِ عام کی بات ہے۔ ہمارا احساس ہے کہ یہ ایک

فرنج ایلیمنٹ ہے، جس کی تعداد 1% سے زیادہ نہیں ہے۔ 99% ہندو خواہ وہ بی جے پی اور آر ایس ایس کے حمایتی کیوں نہ ہو اس طرح کے انتہا پسندانہ اقدام کے حق میں نہیں ہیں۔ مگر شر پسند عناصر ہمیشہ تھوڑے ہوتے ہیں۔ جب وہ اپنی شر پسندی میں کامیاب ہوجاتے ہیں تو بہت سے لوگ دفاعی طور پر ان کے ساتھ ہوجاتے ہیں۔ تاہم ہمیں پوری طرح چوکنا اور ہوشیار رہنا ہے اور اپنی طرف سے ایسا کوئی موقع نہیں دینا ہے کہ کوئی شر پسند گروہ قتل و غارت گری میں کامیاب ہوجائے۔ حکومت چاہے جس پارٹی کی ہو اسے یہ یقینی بنانا ہوگا کہ ملک میں فتنہ فساد اور خانہ جنگی کی کیفیت پیدا نہ ہو۔ اس لیے کہ اس کا ایک طرفہ نقصان نہیں ہوگا بلکہ دوطرفہ نقصان ہوگا، بشرطیکہ حکومت خود اس میں پارٹی نہ بن جائے۔ اس سلسلے میں سب سے اہم اور ضروری بات یہ ہے کہ مسلمان جس شہر قصبہ اور گاؤں میں رہتے ہیں وہاں کی جو بھی مقامی آبادی ہے اس سے قریبی سماجی اور ثقافتی رشتہ استوار کرنے کی ہر ممکن کوشش کریں اور ان کے ساتھ مل کر سماجی امن کو برقرار رکھنے کے لیے عملی اقدام کریں۔ پولیس اور مقامی انتظامیہ سے قریبی ربط پیدا کر کے اس طرح کی کوئی ناخوشگوار صورتحال پیدا نہ ہو اس کا بھرپور اہتمام کریں۔ اس سلسلے میں ہم نے اوپر کئی طرح کے تجویزیں اور مشورے دیے ہیں جس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔

(۴) چوتھا مسئلہ معاشی بائیکاٹ کا ہے۔ اس پر ذرا گہرائی سے روشنی ڈالنے کی ضرورت ہے۔ یہ جگ ظاہر ہے کہ مسلمان ہندوستان میں معاشی اعتبار سے سب سے پسماندہ سماجی اکائی ہیں۔ مسلمانوں میں مشکل سے 0.1% انٹر پرینیر اور بڑے بزنس مین ہیں۔ مسلمانوں کی کم و بیش 96% آبادی چھوٹے دوکاندار، ریڑھی والے، پھیری لگانے والے اور فٹ پاتھ پر دوکان لگانے والے ہیں یا پھر دہاڑی مزدور ہیں۔ مشکل سے 4% مسلمان سرکاری اور نجی منظّم سیکٹر میں کام کرتے ہیں۔ اس طرح مسلمان صارف یعنی کنزیومر ہیں وہ نہ کے برابر پیداوار کرتے ہیں اس صورت میں اگر مسلمانوں کا معاشی بائیکاٹ کیا جاتا ہے تو مسلمانوں کو اس کا نقصان کم ہوگا اور دوسرے لوگوں کو زیادہ ہوگا۔ میں سمجھتا ہوں کہ جو لوگ اس طرح کی

بات کرتے ہیں وہ بھی اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہیں۔ اس طرح کے اعلان اور بیان سے کچھ مقامی جگہوں پر پھیری والے اور ریڑھی والے لوگوں کو پریشانی ہوسکتی ہے۔ اس اعلان اور بیان میں زیادہ دم نہیں ہے۔

تاہم جب یہ بات چھیڑ دی گئی ہے تو مسلمانوں کو اپنی معیشت کو از سرِ نو ترتیب دینے کے بارے میں سوچنا چاہیے تاکہ خدانخواستہ اگر کبھی اور کہیں کسی نے ایسی حماقت کی تو اسے اس کا نقصان بھی بھگتنا پڑا ہے۔ مسلمان پورے ملک میں کم وبیش 20 کروڑ کی آبادی رکھتے ہیں۔ دنیا میں ایسے ملک بہت کم ہیں جن کی آبادی بیس کروڑ یا اس سے زیادہ ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ اگر ہم چاہیں تو اپنی خود کفیل معاشی حکمت عملی پر غور کر سکتے ہیں اور اپنی ملی ترجیحات کے مطابق مارکیٹ پروڈکٹ بنا کر صرف مسلمانوں میں بیچ کر خود کفالت حاصل کر سکتے ہیں۔ اسی طرح اپنی کمیونٹی میں ایسے ڈاکٹر، انجینئر، وکیل، چارٹرا کاؤنٹنٹ اور دیگر میدانوں کے ایسے اعلیٰ صلاحیت کے لوگ پیدا کریں کہ ہمیں دوسری طرف جھانکنے کی ضرورت نہ پڑے۔ ساتھ ہی مختلف چھوٹے بڑے خدمات کے لیے اسکلڈ لیبر کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہم اپنے درمیان ایسے لوگ بڑے پیمانے پر تیار کریں جو بلو کالر جاب اچھی طرح انجام دے سکیں۔ ہمیں مسلمان نوجوانوں کو انٹر پرینیر شپ کی ٹریننگ دے کر اس لائق بنانا چاہیے کہ وہ خود کا کاروبار شروع کر سکیں۔ اس کے لیے پونجی، کچے مال، بازار اور تعلیم اور تربیت یافتہ مردانِ کار کی ضرورت ہوگی۔ ملت کو اپنے وسائل کو اس جانب منظّم انداز سے لگانے پر غور کرنا چاہیے۔ ہمارے درمیان جو این آر آئی مسلمان ہیں اور وہ یوروپ، امریکہ اور عرب ممالک میں کام کرتے ہیں، انہیں اپنا سرمایہ ہندوستان میں اس طرح لگانا چاہیے جس سے ملت کو معاشی استحکام حاصل ہو سکے اور ملت خود کفیل بن سکے۔

میں اس مسئلہ پر بہت تفصیل میں جانا پسند نہیں کروں گا۔ یہ اجتماعی غور وفکر کا بڑا میدان ہے۔ لہٰذا اس پر مثبت انداز سے غور کر کے متبادل معاشی بہتری کی صورت پر گہرائی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔

میں نے پوری کتاب میں تمام خطرات، اندیشوں اور چیلنج کا احاطہ کرتے ہوئے دو باتوں پر سب سے زیادہ زور دیا ہے۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ ہندوستان میں 25 سال اور اس سے کم عمر کے نوجوان 65% ہیں۔ مسلمانوں میں یہ تعداد 75% ہے۔ یعنی مسلمان ہندوستان کی عمر کے اعتبار سے سب سے جوان قوم ہے۔ اگر ہم نے ان انسانی وسائل کا صحیح ڈھنگ سے استعمال کرنا سیکھ لیا تو ملت میں ایک انقلاب پیدا ہو جائے گا اور اس کے اثرات بہت دور تک جائیں گے۔ اس کا مطلب ہے کہ ملت کے جو نوجوان مرد و خواتین ہیں ان کی صحیح، اچھی، معیاری اور وقت کی ضرورت کے لحاظ سے ایسی تعلیم دی جائے جو صرف ملک میں نہیں بلکہ پوری دنیا میں اپنی اہمیت کی بنیاد پر آگے بڑھ سکیں۔ اس میں صرف مذہبی تعلیم نہیں بلکہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی تعلیم پر سب سے زیادہ زور دینے کی ضرورت ہے تاکہ ہمارے یہاں اچھے ڈاکٹر، انجینئر، اچھے سائنسداں، اچھے ریسرچر اور ہر میدان کے ماہرین پیدا ہوں۔ جس دن ہم نے ملت کی تعلیمی ترجیح سدھار دی اور اس کا قبلہ درست کر دیا یقین جانیے ملت قعرِ مذلت سے باہر نکل کر عروج کی منزلیں طے کرنے لگی گی۔ اس معاملے میں نہ صرف ہمیں تعلیم پر زور دینا ہے بلکہ ہماری جو خواتین ہیں اور جو پسماندہ برادریاں ہیں اور غریب لوگ ہیں ان کی تعلیم پر زیادہ توجہ دینا ہے۔ نہ معلوم گدڑی میں کہاں کہاں کون سا لعل چھپا ہے جو پوری ملت کی تقدیر بدل دے۔

اسی کے ساتھ مسلمان بچوں، عورتوں، نوجوانوں کی صحت پر بھی زور دینا ہے جس کی وجہ سے ایک مسلمان ذہنی طور پر ذہین زیرک بن سکے اور فراست مومن کا آئینہ دار ہو اور جسمانی طور پر قوی اور طاقت ور ہو۔ قومی عزت و غیرت میں تعلیم یافتہ اور صاحبِ قوت مسلمانوں کی وجہ سے چار چاند لگ جائیں گے۔

اور دوسری ضرورت مسلمانوں کا اتحاد ہے۔ اتحاد کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ مسلمان جن فرقوں، جماعتوں، مسالک اور گروہوں میں بٹے ہیں ان کو چھوڑ دیں اور اپنے تمام اختلافات کو مٹا کر باہم شیر و شکر ہو جائیں۔ یہ نہ کل ممکن تھا اور نہ آج ممکن ہے۔ جو اختلاف اور

دھڑے بازیاں ہیں وہ اپنی جگہ رہنے دیجیے صرف اپنے رویے میں دو تبدیلی پیدا کر لیجیے۔ پہلا ہم ایک دوسرے کو اپنی تمام تر کمیوں اور اختلاف کے باوجود برداشت کرنے کا مادہ پیدا کریں اور اپنے موقف پر قائم رہتے ہوئے مشترکہ امور و مسائل میں ایک دوسرے کے ساتھ چلنے پر آمادہ ہو جائیں۔ اگر ہم نے اب بھی نوشتہ دیوار نہیں پڑھا اور جوتیوں میں دال بانٹنے کا سلسلہ جاری رکھا تو ہمیں ذلت کی موت مرنے سے کوئی نہیں بچا سکتا ہے بلکہ یہ چیز خدا کے غضب اور عذاب کو دعوت دینے والی ہوگی اور ہم نصرتِ خداوندی سے محروم ہو جائیں گے۔

سوال یہ ہے کہ تعلیم اور اتحاد جس کی ضرورت ہر کوئی محسوس کرتا ہے اس کے لیے کیا عملی اقدامات کیے جانے چاہئیں اور اتنے بڑے کام کے لیے وسائل کہاں سے آئیں گے۔ خضر کیوں کر بتائے کیا بتائے اگر ماہی کہے دریا کہاں ہے۔ ہمارے پاس وہ ضروری وسائل ہیں۔ ہم نے اس جانب توجہ نہیں دی ہے اور اس کو حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس پر کھل کر گفتگو کی جائے اور جو وسائل اس وقت موجود ہیں اور آسانی سے حاصل کیے جا سکتے ہیں اس کے حصول کی طرف توجہ دی جائے۔ اس میں تھوڑا سا اجتہاد کرنا ہوگا اور آؤٹ آف باکس جا کر سوچنے کی ضرورت ہوگی۔ ہمارے پاس اس وقت تین ایسے وسائل ہیں جن کا اگر حکیمانہ استعمال کیا جائے تو ہمارے بہت سے مسائل حل ہو سکتے ہیں۔ وہ ہیں:

(۱) وقف

(۲) زکوٰۃ

(۳) بنکوں میں پڑی مسلمانوں کے جمع کھاتے کا سود۔

ہم ان تینوں پر الگ الگ روشنی ڈالیں گے تاکہ اندازہ ہو سکے کہ ہمارے پاس کتنا بڑا سرمایہ موجود ہے۔ مگر جس کا صحیح استعمال نہیں کر پانے کی وجہ سے یہ چیزیں ضائع ہو رہی ہیں۔

مسلمان ایک غریب ملت ہے۔ مگر اس کے پاس وہ وسائل موجود ہیں جس کا اگر سمجھ داری سے اور ایک واضح منصوبہ بندی کے ساتھ استعمال کیا جائے تو ایک بڑی اور انقلابی تبدیلی

پیدا کی جاسکتی ہے۔ کے.رحمان خان کی قیادت میں بنی ایک جوائنٹ پارلیمانی کمیٹی کی رپورٹ کے مطابق بھارت میں 2009 تک چار لاکھ رجسٹرڈ وقف جائدادیں ہیں جس کے تحت چھ لاکھ ایکٹر وقف زمین ہے۔ سرکاری رپورٹ کے مطابق ریلوے اور وزارت دفاع کے پاس جتنی جائداد ہے اس کے بعد سب سے زیادہ جائداد وقف بورڈ کے پاس ہے۔ اتنی بڑی جائداد ہونے کے باوجود وقف بورڈ میں جو کرپشن، بے ایمانی، بدانتظامی اور بے جامداخلت ہے اس کی وجہ سے اتنی بڑی دولت ضائع ہورہی ہے۔ وقف جائداد پر سب سے بڑا قبضہ خود حکومت کا ہے اس کے بعد متولیوں اور وقف بورڈ کے ذمہ داروں کی تساہلی، بے ایمانی اور بدانتظامی کی وجہ سے بہت ساری جائدادوں پر ناجائز قبضہ ہو چکا ہے۔ لہٰذا اس وقت ہماری یہ پہلی ترجیح ہونی چاہیے کہ کیسے ان جائدادوں کی حفاظت کی جائے۔ ناجائز قبضوں سے اس کو چھڑایا جائے اور کس طرح اس کو ملی تعمیر اور بقا میں استعمال کیا جائے۔ اس سلسلے میں باتیں بہت ہوتی ہیں لیکن ابھی تک کوئی ٹھوس اور منصوبہ بند کوشش نہیں ہوئی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلمان جماعتیں سر جوڑ کر بیٹھیں اور ایک مشترکہ ٹاسک فورس تشکیل دیں جو وقف جائدادوں کی حفاظت اور بازیابی کے ساتھ ساتھ اس کا کس طرح تعلیمی، ثقافتی، صحت اور معاشی میدان میں استعمال کیا جائے اس پر غور کرے۔ اگرچہ حکومت نے وقف جائداد کی حفاظت کے لیے بہت اہم قانون بنائے ہیں۔ مگر اس کا صحیح ڈھنگ سے نفاذ نہیں ہو پارہا ہے۔ دوسرے سنگھ پریوار کے لوگ بھی وقف جائداد پر غلط نظر رکھتے ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کے قبضے سے اتنی بڑی جائداد کو نکالا جائے جس کے لیے انھوں نے سماجی، سیاسی اور قانونی سطح پر اقدام شروع کر دیا ہے۔ اس لیے اس سے پہلے کہ بہت دیر ہو جائے اس پر اولین ترجیح کے طور پر غور ہونا چاہیے اور ایک جامع منصوبہ کے تحت اس کے تعلیمی اور تعمیری کاموں میں استعمال پر غور ہونا چاہیے۔ اس وقت تعلیمی ادارہ کھولنے، اسکول، یونیورسٹی، ہسپتال، انڈسٹری کھولنے کے لیے زمین کی فراہمی سب سے بڑا مسئلہ ہے اور ہمارے پاس اتنی زمین ہے۔ اس کے باوجود ہم اس کا استعمال نہ کر پائیں اس سے بڑی بدبختی نہیں ہو سکتی۔ اس لیے سب سے پہلی ضرورت وقف جائداد کی حفاظت اور

ملی تعمیر میں اس کے بہتر استعمال کی ہے۔

زکوٰۃ ایک مالی عبادت ہے جس کی ادائیگی ہر صاحبِ نصاب مرد عورت پر 2.5% کے حساب سے سالانہ ایک بار نکالنا فرض ہے۔ بھارت میں کتنے مسلمان اور کتنا زکوٰۃ نکالتے ہیں اس کا باوثوق ڈاٹا موجود نہیں ہے تاہم بعض افراد اور تنظیموں نے اپنے اپنے اندازے سے سالانہ زکوٰۃ کی رقم کا اندازہ لگایا ہے جن کے مطابق بھارت کے مسلمان سالانہ ساڑھے سات ہزار کروڑ سے لے کر چالیس ہزار کروڑ تک زکوٰۃ نکالتے ہیں۔ چونکہ یہ رقم اجتماعی طور پر جمع اور خرچ نہیں کی جاتی ہے اس لیے اس کا اجتماعی فائدہ نہیں ہوتا ہے۔ زکوٰۃ کی رقم کا بڑا حصہ مدرسوں کے ذریعہ وصولا جاتا ہے۔ لہٰذا دینی تعلیم کی ضرورتوں پر خرچ ہوتا ہے۔ بہت سی دینی تنظیمیں بھی اپنی انتظامی اور فلاحی اخراجات کے لیے زکوٰۃ وصولتی ہیں اور زکوٰۃ کی رقم کا ایک بڑا حصہ لوگ مقامی طور پر اپنے ضرورت مند رشتہ داروں یا غریب لوگوں کو دیتے ہیں۔ یہ سب کام اہم ہیں اور ان پر زکوٰۃ کی رقم خرچ کرنا جائز ہے۔ مگر زکوٰۃ کے سلسلے میں تین اہم باتوں کی طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ پہلی یہ کہ زکوٰۃ چونکہ مالی عبادت ہے اس لیے اس کی ادائیگی صحیح ڈھنگ سے ہونی چاہیے۔ اس معاملے میں بے پرواہی گناہ ہے۔ لوگوں کو اپنی بچت اور دیگر چیزوں کی زکوٰۃ صحیح صحیح ناپ تول کر پورا پورا نکالنا چاہیے۔ دوسری بات یہ ہے کہ قرآن نے زکوٰۃ کے صرفہ کے آٹھ مدات گنائے ہیں۔ لہٰذا ان تمام مدوں پر اس کو خرچ کرنے کا اہتمام ہونا چاہیے۔ تیسری چیز یہ ہے کہ زکوٰۃ کا ایک بڑا مقصود زکوٰۃ کی مد سے لوگوں کی ایسی مدد ہے جس کے بعد وہ خود اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جائیں اور جو زکوٰۃ لینے والے ہیں زکوٰۃ دینے والے بن جائیں۔ زکوٰۃ کی رقم صرف دینی تعلیم حاصل کرنے والے طلباء پر ہی خرچ نہ کی جائے بلکہ ہر نافع علم حاصل کرنے والے ضرورت مند طلباء پر خرچ کیا جانا چاہیے۔ اسی طرح بیماروں کے دوا علاج پر خرچ کرنا بھی اہم ہے۔ جو لوگ ظلماً قید کیے گئے ہیں ان کو قید سے چھڑانے پر بھی اس رقم کو خرچ کیا جانا چاہیے۔ جو مقروض ہیں ان کی ذاتی یا کاروباری قرض کی ادائیگی میں بھی ان کو اس مد سے مدد کی جاسکتی ہے۔ ساتھ ہی لوگوں کو اپنا روزگار کھڑا کرنے میں

بھی زکوٰۃ کی رقم کا استعمال ہوسکتا ہے۔ اگر ہم زکوٰۃ کا جواب تک کا نظام قائم ہے اس میں زیادہ چھیڑ چھاڑ کیے بغیر ایک منصوبہ بنائیں اور طے کریں کہ ہم سالانہ ایک ہزار عام طلبا کو تعلیمی وظائف دیں گے، ایک ہزار افراد کی امراض میں مبتلا غریبوں کے دوا علاج میں مدد کریں گے۔ ایک ہزار قید و بند کی صعوبت جھیلنے والوں کی مدد کریں گے تاکہ جیل سے ان کی رہائی ہو اور ایک ہزار قرض داروں کی مدد کریں گے تاکہ وہ اپنا قرض چکا پائیں خواہ وہ نجی قرض ہو یا تجارتی۔ اور ایک ہزار نوجوانوں کو خود کا روزگار کھڑا کرنے میں مدد کریں گے۔ اس میں ہمیں سالانہ کتنی رقم چاہیے اس کا حساب کتاب لگا کر قوم کے سامنے پیش کیا جائے اور اس رقم کو وصولنے کی کوشش کی جائے تو ہم دیکھیں گے کہ چند سالوں میں مثبت تبدیلی پیدا ہوگی اور جو لوگ زکوٰۃ لینے والے ہیں وہ زکوٰۃ دینے والے بن سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں ایک منظّم کوشش کرنے کی ضرورت ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ معدنی خزانے صرف زمین کے اندر ہوتے ہیں۔ آج ٹکنالوجی نے ثابت کر دیا ہے کہ خلا میں بھی معدنی خزانے ہیں جس کا اگر استعمال کیا جاسکے تو کروڑوں اربوں ڈالر کی دولت کمائی جاسکتی ہے۔ اسلام میں سود حرام ہے۔ مگر ہم جس سسٹم میں رہتے ہیں اس میں سود لازمی ہے، ہم اس کے بغیر کوئی کام نہیں کر سکتے ہیں۔ اس سے بچنے کے لیے لوگوں نے بینک سے معاملہ کرنا بند کر دیا، جبکہ آج کے دور میں یہ ممکن نہیں ہے۔ بینک سے اگر آپ قرض لیتے ہیں تو لازماً آپ کو بینک کو سود دینا پڑتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ بینک میں آپ جو رقم جمع کرتے ہیں اس پر بینک تمام کھاتے دھاروں کو سود دیتا ہے، یہ رقم لینا جائز ہے یا ناجائز۔ اس سلسلے میں علماء کے درمیان اختلاف ہے۔ لیکن غالب اکثریت کی رائے ہے کہ اس پیسے کا ذاتی استعمال نہیں کرنا چاہیے بلکہ اس کو رفاہی کاموں پر خرچ کر دینا چاہیے۔ لیکن بہت سے مسلمانوں کو اس میں آج بھی تردد ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ وہ برسہا برس سے انھوں نے اس پیسے کو بینک میں چھوڑ رکھا ہے۔ دہلی مائنوریٹی کمیشن کے چیئرمین صفدر حسین خان نے ریزرو بینک کی رپورٹ کے حوالے سے بتایا ہے کہ ریزرو بینک کے مطابق 1.5 ٹریلین ڈالر یعنی 67 لاکھ پچاس ہزار کروڑ روپیہ مسلمانوں کا ملک کے بینکوں میں جمع ہے جس کا کوئی دعویدار نہیں ہے۔

کیرالہ میں 40ہزار کروڑ روپے اور جموں وکشمیر میں 50ہزار کروڑ روپے سود کے جمع ہیں۔ یہ اتنی بڑی رقم ہے کہ اگر اس کا صحیح ڈھنگ سے استعمال کیا جائے تو مسلمان ملت کی غریبی، جہالت، پسماندگی، بے چارگی سب دور کی جاسکتی ہے۔ یہ وہ سرمایہ ہے جس کا ملی بقا استحکام اور ترقی میں استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں ہونا چاہیے۔

میری رائے میں مسلم مجلس مشاورت اور مسلم پرسنل لا بورڈ کو اوپر پیش کردہ تینوں معاملوں میں ایک ٹاسک فورس بنانا چاہیے جو ان تینوں ذرائع وسائل کا گہرائی سے مطالعہ کرے اور قوم کے سامنے ان وسائل کے بہتر استعمال کا منصوبہ پیش کرے۔

بہت پہلے جناب شہاب الدین صاحب صدر مشاورت نے ایک تجویز رکھی تھی کہ مسلمان اگر ایک ایک روپیہ جمع کریں تو سالانہ کروڑوں روپے جمع کیے جاسکتے ہیں۔ مگر اس وقت ایسا کوئی ذریعہ موجود نہیں تھا جس میں یہ ممکن ہوتا۔ مگر آج کل موبائل ایپ کے ذریعے ایسا کرنا ممکن ہے۔ ہمیں ایک ملی نیشنل ایجوکیشن اینڈ ڈیولپمنٹ فنڈ بنانا چاہیے اور لوگوں سے اپیل کرنی چاہیے کہ وہ روزانہ ایک روپیہ سے لے کر زیادہ سے زیادہ ایک سو روپیہ اس فنڈ میں موبائل ایپ کے ذریعہ ڈونیٹ کریں۔ ایسا کرنا کوئی مشکل نہیں ہوگا۔ اسی کے ساتھ ملک کے تمام مساجد اور مزاروں پر جہاں لاکھوں لوگ آتے ہیں وہاں اس فنڈ کا ایک ڈونیشن باکس رکھوادیا جائے جہاں لوگ اپنی مرضی سے جتنی رقم چاہیں عطیہ کردیں۔ جب وہ رقم نکالی جائے تو اس کی رسید مسجد اور مزار کے ذمہ داروں کو دی جائے۔ اسی طرح ہر چھوٹے بڑے دوکاندار کے یہاں بھی ایک ڈبہ ڈالا جاسکتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ہم کوشش کریں گے تو بہت سے راستے کھل سکتے ہیں۔ ضرورت مثبت سوچ کی اور صحیح حکمت عملی کی ہے۔

اس وقت مسلمانوں کی منہ بھرائی کی بات بہت زور شور سے ہورہی ہے۔ ہمیں کسی Appeasement کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم تو بحیثیت شہری اپنا حق اور حصہ چاہتے ہیں۔ حکومت پورے ملک میں یکساں سول کوڈ لانا چاہتی ہے۔ شوق سے لائیے۔ مگر اسی کے ساتھ یکساں مواقع کمیشن بھی بنایا جانا چاہیے۔ Equal Opportunity Commission کی

مانگ بہت پرانی ہے۔ پوری مسلم لیڈرشپ کو ساتھ آکر اس پر زور دینا چاہیے کہ حکومت یکساں مواقع کمیشن تشکیل دے تاکہ سسٹم کی بے ایمانی دور کی جاسکے۔ دوسرے حکومت Prevention of Communal Roits, Rehabilitation & Compensation Act بھی پاس کرے، جس کے تحت سپریم کورٹ کے سیٹنگ جج کی نگرانی میں ایک پرمانٹ جوڈیل کمیشن تشکیل دیا جائے جو فرقہ وارانہ فساد کی از خود جانچ کرے اور جو مجرم ہیں ان کو قرار واقعی سزا دلائے اور جو متاثرین ہیں ان کی باز آبادکاری اور ان کے جان مال کے نقصان کی بھرپائی کے لیے ان کو معقول معاوضہ دلوائے۔

میرا خیال ہے کہ مشاورت اور مسلم پرسنل لا بورڈ کو مل کر ان امور پر غور اور مشورہ کرکے ایک متحدہ لائحہ عمل بنانا چاہیے۔ اگر وہ ایسا کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں تو ملی مسائل کے حل میں یہ تاریخ ساز قدم ہوگا۔ اگر ہم ایسا کر پاتے ہیں تو نہ صرف بندگلی کھلے گی بلکہ آگے کی راہ بھی ہموار ہوگی۔

پیش کر غافل اگر کوئی عمل دفتر میں ہے

حرفِ آخر

ہندو اور مسلمان دو الگ الگ قوم نہیں بلکہ وسیع تر ہندوستانی قومیت کی دو شاخیں ہیں جن کے عقائد، مذہبی عبادات اور ثقافت الگ ہیں مگر یہ دونوں قومیں ایک ہی پیڑ کی دو شاخیں ہیں۔ ایک ہی سماجی بندھن میں بندھے ہیں اور دستوری قانونی اور سیاسی طور پر بھارت کی ناقابل تقسیم اکائی ہیں۔ اس لیے مسلمانوں کے مسئلے کو وسیع تر ہندوستانی مسئلے سے الگ کرکے نہیں دیکھا جانا چاہیے۔ یہ بات مسلمانوں کو بھی سمجھنی ہوگی اور یہ بات ہندوؤں کو بھی سمجھنی ہوگی۔ ہندو اس ملک میں نسلاً جتنے قدیم ہیں، مسلمان بھی اتنے ہی قدیم ہیں کیونکہ وہ اسی قومی اکائی کا حصہ ہیں۔ محض مذہب کے فرق سے ان کی نسلی قدامت ختم نہیں ہوجاتی ہے، اس لیے مسلمانوں کو بدیسی یا باہری قرار دینا علم عمران (Anthropology) کے اعتبار سے غلط

ہےاور سماجی اور سیاسی طور پر گمراہ کن ہے۔ اگر کوئی مسلمانوں کی نسلی قدامت پر سوال اٹھاتا ہے تو گویا وہ اس تاریخی تسلسل کو جھٹلاتا ہے جس کا مسلمان ایک لازمی حصہ ہیں۔

ہندو اور مسلمان کے بیچ دراڑ پیدا کرکے اس وقت جو سیاست کی جارہی ہے وہ مسلمانوں کے لیے ہی نہیں ہندوؤں کے لیے بھی اور پورے ملک کی سالمیت، سماجی امن، ترقی اور بین الاقوامی برادری میں ساکھ کے لیے خطرہ ہے۔ لہٰذا مسلمان اپنی طرف سے ایسا کچھ نہیں کریں گے جو حالات کو بگاڑے مگر تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی۔ ہندوؤں کی جو سیاسی، مذہبی اور ثقافتی لیڈرشپ ہے اس کو بھی اس سلسلے میں اپنے رویے پر نظر ثانی کرنی ہوگی۔ ڈرانے اور دبانے کی سیاست ایک حد کے بعد ناکام ہوجائے گی۔ ابھی آپ بلڈوزر چلا کر لوگوں کو خوفزدہ کررہے ہیں کل کیا اپنی شہری آبادی پر ٹینک اور ہوائی حملے کریں گے۔ اس لیے لوگوں کو ڈرانا بند کیجیے۔ بانٹنے اور راج کرنے کی سیاست سے باز آجایئے۔ یہ دیش بھکتی نہیں ہے دیش دروہ ہے اور دیش کو نقصان پہنچانے والی سیاست ہے۔ مسلمان لیڈرشپ کو کھل کر یہ بات غیر مسلم لیڈرشپ کے سامنے رکھنے کی ضرورت ہے۔

ہمیں اپنے تمام خوف اور ذہنی تحفظات کو بالائے طاق رکھ کر جو اس ملک کی سماجی، سیاسی، مذہبی، ثقافتی اور کارپوریٹ لیڈرشپ ہے اس سے رابطہ پیدا کرنا چاہیے اور کھل کر ان کے سامنے اپنی بات رکھنی چاہیے۔ مقامی سطح سے لے کر مرکز تک ہر سطح پر رابطے کو مضبوط کرکے آگے بڑھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

ایک بڑا کام اپنے اندر ہر سطح کی اور ہر طرح کی لیڈرشپ کو فروغ دینا ہے اور منظّم جدوجہد کی خو پیدا کرنا ہے۔ اپنے اوپر اور اپنے لوگوں پر اعتماد پیدا کرنے کی عادت ڈالنی ہے اور ہر طرح کی منفی باتوں سے بچنا ہے۔ جو لوگ جس درجے میں جو خدمات انجام دے رہے ہیں ان کی خامیوں اور کمیوں کو نظر انداز کرکے ان کی خوبیوں کا اعتراف کریں اور ایک ایسا ماحول بنائیں جس میں لوگ ایک دوسرے سے جڑیں، ایک دوسرے سے دور نہ ہوں۔ اس کے لیے کچھ نہیں کرنا ہے بس تھوڑی سی اپنی ذہنی تربیت کرنی ہے۔ اگر ہم ایسا

کر سکتے ہیں تو بہت سے سماجی مسائل جس کی وجہ سے ہم ایک دوسرے کے قریب آنے سے ہچکچاتے ہیں دور ہوں گی اور آپسی قرب، اعتماد اور اتحاد کی فضا پیدا ہوگی، جس کا حالات اور مسائل پر مثبت اثر پڑے گا۔

ہم سب کسی اور کے سامنے نہیں صرف خدا کے سامنے جوابدہ ہیں۔لہٰذا اپنے قول اور رویے پر ایک بار اس پہلو سے بھی نظر ڈال لیں تو آپ کی خود کی اصلاح ہو جائے گی۔ ہماری جو متاع دین و دانش لٹ چکی ہے اس کو بچانے اور واپس لانے کی ضرورت ہے۔ملت میں بہت دم ہے۔اس ملک میں مسلمان ملت پچھلے تین سو سالوں سے سخت آزمائشی دور سے گزر رہی ہے مگر ملت نے ابھی تک ہمت نہیں ہاری ہے وہ ہر مشکل حالت میں سیدھے کھڑے ہونے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ملت کے اس حوصلہ کو ٹوٹنے سے بچانا، اور ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر ایک دوسرے کو تقویت دینا یہ وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔اس جذبے کو باقی رکھنا اور اس کو پروان چڑھانا ہماری سب سے پہلی اور سب سے بڑی ذمہ داری ہے۔اگر اس کی لیڈرشپ نے اس کو ناکام نہیں کیا اور وہ خود ناکام نہیں ہوئی تو ملت ہر آزمائش کا مقابلہ کرتے ہوئے سرخرو ہو کر ابھرے گی، انشاءاللہ!

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

☆☆

جہاں اہلِ ایمان صورتِ خورشید جیتے ہیں
اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے، اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے

■❖■